

عیدِ مبارک

نہایت دلکش
سینما
ماہنامہ
اگست 2015

پیشکش

PDFBOOKSFREE.PK

07
انشائیہ
جون ایلیا

آزادی کے احساس اور معنی
و مفہوم کا احساس بچکانی تحریر

08
آپ کے خط
مدیر اعلیٰ
16
موز شاہی
الباس سبکا پوری

سپنس کی مجلس شادرت قارئین کی تحفہ
شیریں باتیں مکمل شکوے اور شکوے مشورے
ماضی کا آئینہ اختیار اور بے اختیار انسانوں
کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

53
بچے سانجھے
کاشف زبیر
72
سودا جنت
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

خود غرض معاشرے میں ایک
جانور کی محبت اور نرم و فراست کا قصہ
اجلی رنگت اور کرد و چہ سروں والی
شیطان قوتوں کی بربریت کا لرزہ خیز منظر

105
نافا بل گرفت
تنویر ریاض
114
سفید پوش
ملک صفدر حیات

ایک معصوم کے ہاتھوں نافرمانی
گرفت جسم کا ارتکاب
دل کے ہاتھوں مجبور اپنی چادر سے پاؤں
نکلنے والے ایک سر پھرے عاشق کی دلیری

143
اجتاج شکن
ابو ضیا اقبال
152
محفل شعرو سخن
قارئین

دنیا میں کچھ اٹکھا کر دکھانے کے خط
میں مبتلا ایک اجتاج شکن کا قصہ
آپ کے ہاتھوں ہی ایک ٹھمن رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

155
پہیلی
ابراہیم جمالی

اپنی جاہت سے ترسانے والے
ایک شوہر کی برقی محبت کا قصہ

162
ماروی
محی الدین نواب
209
تحفہ
بابر نعیم

ایک سوچ بچی روپ بھی چھان بھی دھوپ محبت کی
عنائتوں رفائتوں اور تھانوں کا ایک نیا سلسلہ
منشی حسین نے کیا کو قصہ کرنے کے
جن جن میں تھانوں کا ایک ہنس نواز حسین کا ماجرا

217
مضبوط فیصلے
مریم کے خان
235
شیخ سما الدین
ضیاء نسیم بلگرامی

محبت کا انتہائی محبت سے لینے
والی ایک حسین کی فستوں کی انتہا
قافی دنیا اور باقی آخرت کے فلسفے کو دل میں
اٹھانے والی ایک برگزیدہ ہستی کی داستان

249
سراب
ڈاکٹر شیر شاہ سید
253
آخری قہقہہ
نور عباس

ایک حبان و دوست اب
جوڑے کی تنہائیوں کا قصہ
تھانوں میں شمش کر کے نواں
دیکھنے والے کی بے بس زندگی کا حوالہ

260
راگم
ناہید سلطان اختر
000
کنز ہنر
ادارہ

تہائی میں شیطانی کھیل کھیلنے
والے ہوس پرستوں کا انجام عبرت
دنیا بھرے ادھر ادھر سے لطیفے بچنے اوتھان
مسکرائیں اور قہقہے سب کچھ پاپ کیلئے

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ
ماہنامہ



میں نیا سحر انگیز طویل سلسلہ

شیش محل

ہر دل عزیز اور معروف قلم کار

اسما قادری

کے قلم سے ستمبر 2015ء کے شمارے میں منفرد صفحات پر ملاحظہ فرمائیں

کبھی خوش امید اور کبھی مایوس کن جذبات میں

ابھی زندگی کے تیکھے انداز... آپ کی دلچسپی کا ہر رنگ لیے

روشن خیالی

انشائیہ
جون الیسا

میرا امکان یہ ہے کہ زندگی میں خود کوئی معنی نہیں ہوتے بلکہ پیدا کیے جاتے ہیں۔ انسان کی ساری ہنرمندی، سارے خواب اور خیال اور ساری دانش، یہ سب کچھ زندگی میں معنی ہی کی تلاش ہے۔ سو چاہئے تو موجود ہو، بہت بڑی اذیت اور بہت بڑا عذاب ہے۔
موجود ہونا کیا ہے؟ دم بہ دم گزرتے رہنا اور گزر جانا۔ کیا یہ احساس ایک اذیت اور عذاب نہیں ہے کہ ہم گزر رہے ہیں اور ہم گزر جائیں گے۔ یہ کسی حسرت ناک راگانی ہے۔ اس راگانی کی اذیت اور عذاب کی کتنی کو کم کرنے کے لیے انسان نے اپنے وجود میں ایک نئی جہت تلاش کی، اپنے وجود میں اور اپنے وجود سے باہر۔ یہ معنی کی جہت ہے۔ مہمل میں مفہوم کی دریافت۔ اگر تمام انسان ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے ہوں اور ان کے دل ایک ساتھ دھڑک رہے ہوں مگر ان کے وجود میں معنی اور مفہوم ناپید ہوں تو دہشت سے ان کے سینے پھٹ جائیں۔ سو معنی اور مفہوم کی تلاش ہی میں نجات ہے۔ جو لوگ تمہارے لیے ہدایتیں، جھمکتیں اور زندگی کے حوالے لے کر آئے وہ معنی اور مفہوم ہی کی بشارتیں دینے والے تھے۔ معنی ہی وقت کے عذاب کو کم کرتے ہیں اور وقت تو انسان کو پاگل کر دے کہ وقت سب سے بڑا آشوب اور سب سے بڑی آشوب ناک ہے۔ فرد کی زندگی یا گروہوں اور قوموں کی زندگی، معنی کا یہ نکتہ دونوں ہی کے بارے میں درست ہے۔ یہ تو ایک بات ہوئی، دوسری بات یہ ہے کہ معنی کو زندگی کی حقیقتوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے کہ اس کے بغیر زندگی عداوت اور ملامت کے سوا کچھ بھی نہیں کما سکتی۔

بہتر یہ ہے کہ میں اس گفتگو کو پاکستان کی نسبت سے آگے بڑھاؤں کہ اب یہ ملک اپنی سال بہ سال سانگرہ منار ہے۔ اب سے پہلے کا زمانہ، پاکستان کی زندگی کا پہلا برس، آج سے کچھ زیادہ دشوار اور ناسازگار تھا مگر اس وقت پاکستان کے لوگوں کی زندگی با معنی تھی۔ وہ معنی کیا تھے؟ ایک مقصد کا احساس اور ایک مثالیے کا شعور، جس نے دلوں میں ایک تریک پیدا کر دی تھی۔ حیرت ہے کہ اس وقت کوئی واضح منصوبہ سامنے نہ تھا۔ پھر بھی وہ دور جہاں فراسرگرمیوں اور سرشاریوں کا دور تھا۔ اس لیے کہ زندگی با معنی تھی۔ اسی لیے شروع کے ایک دو برس اشتیاق اور خلش کے باوجود قریب سے گزر گئے۔ تم چاہو تو تین چار برس کہہ لو۔

پھر یہ ہوا کہ معنی کا خلا پیدا ہوا۔ وہ یوں کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد مسلم لیگ کا کام تمام ہو چکا تھا۔ وہ یوں کہ پاکستان ہی مسلم لیگ کا مقصد تھا۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ شاید اس کے بارے میں سوچنے کی مہلت نہ پائی جاسکی ہوگی۔ نہ کوئی منصوبہ تھا اور نہ کوئی منشور۔ اس صورت حال میں پاکستان کی سیاست نے جو تیرہ اختیار کیا، وہ سخت حسرت ناک اور انتہائی مضحکہ خیز تھا۔ مختلف معاملوں کے جو معنی دریافت کیے گئے، وہ یافت نہیں بلکہ معین کیے گئے۔ ان کا زندگی اور زمانے کی حقیقتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مگر اس اور سیاست داں ایسے ہمارے دار تھے جو بہار کوٹھنے تو بڑھ کر سنا میں مگر داناہ پلا میں۔

آنے والے زمانے میں پاکستان جن مشکلوں اور مہملوں سے دوچار ہوا، ان کی پیش گوئی بڑی آسانی سے کی جاسکتی تھی۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شروع کا زمانہ سخت دشوار اور ناسازگار ہونے کے باوجود ایک خاص اعتبار سے ایک بہت درخشنا زمانہ تھا۔ اس سرزمین میں ایک دوسرے کے لیے عام طور پر دردمندی، ہمساری، محبت اور ایثار کے جذبے موجزن تھے۔ یہاں کے پرانے رہنے والوں نے، آنے والوں کا بے حد دل انگیز اور بے مثال استقبال کیا تھا۔ اس سلسلے میں سرزمین سندھ نے اخوت اور برادر لوانی کا جو نمونہ پیش کیا، تاریخ میں اس کی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔ لاکھوں انسانوں کا استقبال کر کے انہیں اپنے دلوں اور اپنے دیاروں میں جگہ دینا داستانوں اور افسانوں کی بات گنتی ہے۔ ایسے بے مثال انسانی جذبوں اور دلوں کے استے کھرے رشتوں کی فضا میں انسانی سیاست اور شریطان ملک داری کے ذریعے ایک بے مثال معاشرے کی صورت گری کرنا بہت آسان تھا مگر بد قسمتی سے سیاست بھی غیر انسانی تھی اور حکومتیں بھی غیر شریطان۔ نتیجہ کیا ہوا کہ آنے والوں اور آنے والوں کا گرم جوشانہ استقبال کرنے والوں کے درمیان آہستہ آہستہ نفرت جبکہ پانے لگی۔ بہر حال یہ ایک لمبی کہانی ہے جسے سنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

میں پیشہ ورانہ سیاست کے شعور سے بکسر محروم ہوں لیکن ایک شاعر ہونے کی حیثیت سے خواہ مخواہ دخل در مقولات کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے عاجزانہ طور پر جو عرض کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مسلم لیگ کو اپنے دوسرے جنم میں اپنے پہلے جنم کی ایک بنیادی خصوصیت کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہیے اور وہ خصوصیت کیا ہے؟ وہ خصوصیت قائد اعظم کی روشن خیالی ہے جس کا کسی آمریت کے پس منظر سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔



عزیزان من السلام علیکم!

اگست 2015ء کا معیاری شمارہ آپ کے ذوق کی نذر ہے۔

14 اگست 1947ء کا دن، خون کی ہوئی کھیلنے لحات و واقعات اور توجہ خیز جدوجہد کا اختتام بھی نہ سننے کے لیے نہ صرف تاریخ کے اوراق پر رقم ہے بلکہ اس کے اثرات گزرنے والی نسلوں کی طرح آنے والی نسلوں کے ذہنوں سے بھی نہیں نکل سکیں گے مگر۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آج کے حالات ان اذیتوں کا ازالہ اور سکران ان لحات کا حق ادا کر رہے ہیں؟ کیا سکران اور عوام دونوں بانی پاکستان کے نظریات و مقاصد کی پاسداری کر رہے ہیں؟ تو جواب ہوگا "ہرگز نہیں" اور اس مایوسی کی صرف ایک وجہ سامنے آتی ہے کہ یہاں قانون بنانے والے ادارے تو ہیں مگر۔ قانون کی بالادستی نہیں۔ جس دن اس ملک میں قانون کا نفاذ اس کی اصل روح کے ساتھ ہو گیا تو یقین ہے کہ اندھیر مگر کی اور جو پٹ راج کا تاریک دور بھی ختم ہو جائے گا۔ ورنہ اپنے ہی گھر میں اجنبی ہونے والی کیفیت کو کوئی ختم نہیں کر سکتا اور بے شمار کھجوتوں میں ابھی یہ قوم ایک خوشگوار اور طاقتور معاشرے کی پروہش بھی نہیں کر سکی۔ یہ قدرت کا نظام ہے کہ ہر چیز اپنے وقت اور مقام پر ابھی گئی ہے مگر جب زندگی موت سے قتل ختم ہو جائے اور طاقت استبداد سے پہلے کمزور پڑ جائے تو شعور کی نگاہی سے آگاہ کرتا ہے جبکہ یہ ایک مکمل حقیقت ہے کہ طاقتور اور زرخیز ذہنوں کے لوگ ملک کی ترقی کا باعث بنتے ہیں۔ ویسے دور حاضر میں چند حکومتی اقدامات سے اس خوش آئند بات کا اندازہ تو ہوتا ہے کہ اب رفتہ رفتہ حالات میں سلجھاؤ کی صورت نکلتی جا رہی ہے۔ اگر اسی نیک نیتی سے اصول پرستی پر عمل کیا جاتا رہا تو امید ہے کہ جلد ہی معاشرتی ماحول کا قلع قمع ہو جائے گا اور عوام بھی سکھ کا سانس لیں گے۔ علمی طبقے کا کام ہے ہندو ذہنوں پر دستک دینے رہنا۔ سو ہم دیتے رہیں گے اس امید کے ساتھ کہ پانی کا قطرہ مسلسل سے نچے تو پھر میں سوراخ ہو سکتا ہے۔ پر سچ کی تیاری کے دوران میدانِ فطرت کی خوشیاں بھی ساتھ ہیں اگرچہ رمضان المبارک کے ابتدا میں گرم موسم کی شدتوں نے اپنا حلال دکھایا اور کئی معصوم جانوں کا بھی استحقاق لے لیا۔ تاریخ میں بھی کراچی کے موسم میں اتنی شدت اور حدت نہیں آئی جس کا مقابلہ تقریباً ناممکن تھا۔ اب تو اس قوم کے مہربانوں! یکسو سوچ لو۔ اگر انہیں پانی، بجلی اور طبی امداد جیسی بنیادی سہولتوں سے محروم نہ رکھا جاتا تو شاید ان میں سے بہت سے لوگ اس میدان پر ہمارے سک ہوتے۔ بہر حال اس میں ہم پوری قوم شریک ہے۔ اور میدان کے کھات میں اپنے ارد گرد ان غمزدہ لوگوں کی دلجوئی بھی ضروری ہے، اللہ انہیں صبر اور حوصلہ عطا فرمائے۔ اور اب میدان کے بہت سے بیانات لیے ہمارے دوست احباب ہمارے منتظر ہیں تو چلیے چلتے ہیں اپنی رنگارنگ مغل کی جانب۔

✽ اور یس احمد خان، عالم آباد کراچی سے مغل کی رونق ہے ہیں "اس ماہ کا سسٹن لانا گویا جوئے شیر لانے کے مترادف ثابت ہوا جس کی اصل وجہ ریکارڈ تو ذکر کری جس طرح لوگ چلتے ہوئے چھینرے تھے مگر دوسری طرف سوائے اشتیاق اور محبوب کی دیکھ کے لیے جھبہ مسلسل جس کے سبب سسٹن کا حصول ممکن ہو سکا۔ جن کے مہینے میں بیٹ میں غریب شہریوں کے لیے کوئی خوش خبری نہیں تھی۔ مگر سبب اسنو رک نے ایسی خوف ناک تھاپی مچا دی کہ دیکھتے ہی دیکھتے سیکڑوں جانوں کا نذرانہ لے گئی اور وہ چہرے حرارت بھی پیتا لیس ڈگری سے تھما ڈر گیا۔ ایسی گرمی کہ لالان الحفیظ۔ شاید ایسی گرمی مزی کی مشروں تک نہ ہو سکے۔ رمضان شریف کی بھی بابرکت ساتتیں ایسی گرمی کے دوران شروع ہوئیں مگر آفرین آفرین کہ ایسی قیامت خیز گرمی میں لوگ روزے بھی رکھ رہے ہیں اور کاروبار دینا سے بھی گئے ہوئے ہیں۔ احقر بھی شدید متاثر ہوا چونکہ پہلے سے ہی ہاسپٹل تڑہوں تھا اللہ نے بہتری پیدا کر دی۔ (اللہ آپ کو صحت کا لہر دے) اگرچہ کراچی میں بارش کے بادلوں نے زور باندھا مگر محسوس نہیں ہو رہی کی پیاس نہ بجھ سکی۔ ٹھنوں میں بھی گرم پانی آرہا تھا۔ گویا گیزر کی سہولت مفت میرا گئی تھی مگر گرمی کے موسم میں بیکار کس سے کوئی شک نہیں اٹھا سکتے۔ ناسل گرل بھی کھڑے کھڑے چہرے والی سکیل کانتوں سے لیس شاید آنے والے میدان کے چاند کی شکر ہے۔ جگہ گاتی روشنیوں میں عید مبارک بھی نظر آرہا ہے۔ ہماری طرف سے بھی تمام اہل اسلام اہل وطن سسٹن کے تمام دوستوں کو پر غلوں پیار بھری مبارک باد اور سلام۔ ڈاکر صاحب کو بھی بے غل خوش صورت بتانے پر مبارک باد۔ انٹا ہے پر دو لفظوں میں تبصرہ کروں گا کہ جس کو آگہی کا احساس ہے وہ تو سارے موسموں کو دیکھنے اور سمجھنے کی مس دھن ہے اور جس کو آگہی کا احساس نہیں وہ ہے جس ہے۔ ادارے میں بھی کوئی خوشی کی بات ہے تو وہ عید اور رمضان المبارک کی نیک ساتتوں کی۔ اپنی مغل میں اعجاز احمد راجیل صاحب کو مبارکباد۔ محمد قدرت اللہ نیازی سے اتفاق کرتا ہوں۔ اندرونی صفحات پر سرشت آدم پڑی۔ جس میں سخت حاصل کرنے کے لیے سکے رشتوں کی محبت بھی پٹی پشت چلی جاتی ہے۔ متعدد صرف اور صرف حصولِ امارت و حکومت ہوتا ہے۔ مگر ایسی ریشہ دوانیاں کرنے والوں کا غود کا بھی برا حشر ہوتا ہے۔ بے سادے میں جن کو بہت سے کام لینے پر مسکن سامگی کی رفاقت میر

ہوئی اور اسے دونوں جانی دشمنوں سے بھی نجات مل گئی۔ سودائے جنوں میں اسرائیلیوں کی سفاک اور مسلمانوں کی ایمان افروز کارروائیاں جاری ہیں۔ ہیرا پھیری بھی ایسے انداز میں لکھی ہوئی تھی۔ منظر امام کی کاش ایسے موضوع پر لکھی ہوئی تھی۔ مغل شعر و سخن میں معیاری اشعار نے مزہ دیا۔ فکار پور سے فکار کو تک واقعی فکار کو جانے کا اچھا فیصلہ کیا۔ حاصل بھی اچھی کہانی تھی۔ اقبال زریں پر محنت کتنی بھی علم میں اضافے کا سبب نہیں۔ وصیت نے بھی اچھا اثر ڈر دیا۔ جیسے بول سب سے بہتر اثر کرتے ہیں۔ اس میں اپنے برائے کی نگرانی نہیں۔ دلیوں کے حالات میں خواجہ ابوالاحمد کے حالات نے قلب کو روشنیوں سے منور کیا۔ مہم جو بھی اچھی تھی۔ طاہر جاوید مغل کی رات کا مسافر، بہت زبردست اور بہترین رہی۔ اس کے ساتھ ہی عید کی دوبارہ مبارک باد کے ساتھ رخصت۔

✽ رضوان تنولی گریڈ وی، اورچی ماڈن کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں "رات کی سیاہ بولیوں کا سینہ چاک کرنا سپید و سحر دست قدرت کی مٹائی اور رخت آمیزی۔ پردوں کی سرخی چھپا ہٹ اور پھولوں کی معطر مہکار کے ساتھ روشن چمکیلے دن کی نوید لاتا ہے۔ گزرتے شب و روز کے ساتھ سسٹن کا گھر تا معیار ادارے کے اعلیٰ حکام کا قابل ستائش اقدام ہے۔ کافی عرصے بعد خوب صورت بے غل چھاپا مگر برس کے سن بل چل کر گیا۔ خوب دو دو تیز و کے کان کا دل آویز جھکا اس دور کی یاد تازہ کروا گیا جب جذبے صادق اور محبت خالص ہوا کرتی تھی۔ جن ایلیا کو پڑنے والا پیش کے لیے ایلیا کے سانچے میں داخل جاتا ہے۔ ایلیا ایلیا جادوگر ہے جس کا جادو موت کے بعد بھی کارگر ہو کے اپنا سرمایہ بناتا چلا جا رہا ہے۔ مدیر اعلیٰ جی حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا زمانہ اور آقا مہر کا فرمان۔ شہر خرات کے کنارے اگر کوئی کتاب بھی بھوکا رہ گیا تو اس کا حساب مجھ سے لیا جائے گا اور آج مسلمانوں کی بستی کی وجہ ہماری اپنی کوتاہیاں اور دین سے دوری ہے۔ یاران من کو عید سعید کا سلام دوستان۔ بشری افضل رب کریم آپ کی مشکلات دور فرمائے اور مرحومین کو باغ بہشت میں اعلیٰ مقام نصیب ہو آمین۔ جیسے خان کا گول تبصرہ سات سروں کی راگنی کا لطف دے گیا کستوری لگا کے۔ مرحوم الیاس بیٹا پوری تاریخ سے اصول جوہر پارے منتخب کرتے تھے۔ ابتدائی صفحات مجھے بہت محبوب ہیں۔ انگریزی ادب سے کاشف زبیر نے عمدہ ترجمانی کی کاؤ بوائے جون اور رے تیری قسمت ایڈیٹر اور شارلی جیسے غوثی دشمنوں کے خاتمے کے ساتھ شہید مقتدر رہی۔ سودائے جنوں ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے نایاب لفظوں کا وافر ذخیرہ پڑھ کر روح سرشار ہو جاتی ہے۔ عوید ریاض کی ہیرا پھیری میں بروٹس کی جھانپوں سے برآمدگی یوں پر مسکراہٹ نکھیر گئی۔ مرزا امجد بیگ کی ڈائری سے لٹس پٹس سوا میر جاسوسی ملا جھٹوں کے مالک وکیل نے کمال مہارت سے محبت والے دروازے کی چابی کا مسئلہ حل کر کے متقول ساجد کے اصل قاتل داؤد کو چھاپ لیا (زبردست) ڈاکٹر شیر شاہ سید کی فکار پور سے فکار کو تک محمد وری۔ فاروق انجم کی دل پڑا اثر کرتی کہانی "حاصل" کتاب سبین کی سورۃ الناس میں شیطان کی پیمان یوں بیان کی گئی ہے۔ "جو لوگوں کے دلوں میں دوسرے اور غناں ڈالتے ہیں وہ جن وانس" کہانی میں فرناں شیطان ثابت ہوا۔ ماروی میں قبلہ نواب کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے۔ ابراہیم بھائی کی اسٹوری آف منصف و میت دل پر گہرا چرکا لگا گئی۔ مسز جیس واران جیسے تھائی کے روکی لوگ صرف مغرب تک محدود نہیں، انہوں کے ہوتے ہوئے بھی ایسے ہی مظلوم افراد ہمارے ارد گرد نظر آتے ہیں۔ جادوکار مصنف کی رات کا مسافر عاشقوں کے دلوں کو جگ کرتی اختتام پذیر ہوئی۔ بھٹوں کے سیر، بھٹوں کے تیب، بھٹوں کے رشتے اور میرے صیب پیارے طاہر جاوید مغل، قارئین کے من کے راج سکھان پر شہنشاہ محبت بن کر بلند و افروز ہو گئے ہیں۔ مغل شعر و سخن میں جیس خان اور رمضان پاشا کا انتخاب خوب رہا۔ کستوری لگا کے۔ آخری صفحات کے لیے ڈاکٹر ساجد امجد اور رزاق شاہ کوہل کی کہانی کی فرمائش کے ساتھ سرورق سے پس درق تک سسٹن اختتام پذیر ہوا۔"

✽ قرصاظم، خوشاب سے تشریف لاتے ہیں "تک تک تک سسٹن کی اس پیار بھری مغل میں اجازت چاہتا ہوں چونکہ مطالعہ کا شوق ورثے میں ملا ہے سو تقریباً پانچ پچیس جماعت سے ہی رسالے چاٹنا شروع کر دیے اور اب تو عمر تین سال سے سسٹن کا باقاعدہ مستقل مکتوبان قاری ہوں۔ اصل میں میری وابستگی سسٹن سے ہر ملک صاحب کی مسافر کے بعد ہوئی اور اب تک جاری وساری ہے۔ میرا تعلق ضلع خوشاب کی تحصیل قائد آباد کے ایک پس ماندہ علاقے (21 ایم پی) سے ہے۔ اس وقت (دم تقریر) بھی فصل کی جلتی دھوپ میں شیشم کی تاروں پڑتی چھاؤں میں پینا پینا شوق مطالعہ کی آگ لٹتی کر نے میں معروف ہوں۔ اب آتے ہیں ذرا تبصرہ کرنے۔ داہنی واہ انساگل ہے۔ کانوں میں ہارٹ چھپ چھپکے ڈالے۔ اوچی ستواں ہاک کے ساتھ، جیسے نیٹوں سے کے دھڑری ہیں؟ آج تو طاہر جاوید مغل کی "رات کا مسافر" کا کچھ یوں انکشاف تھا کہ سب سے پہلے آخری صفحات زیر نظر آئے۔ اس کے بعد تو میرا ب کا اس سودائے جنوں کو بخور پڑھا۔ اس وقت شہنشاہ مجاہدین کی کامیابی کا کتاب بہتر رہا۔ جتنی سسٹن خیز سودائے جنوں ہے، ایسی آج تک قارئین کی نظر سے نہ گزری ہوگی۔ ماروی بھی تھی بندھی ڈگر پر جا رہی ہے البتہ مراد نے درست فیصلہ کیا ہے۔ ایک امیر مردوں والا۔ امجد بیگ صاحب کی سوا میر بھی خوب رہی۔ ویسے ایک راز کی بات بتاؤں، اپنا جھکاؤ بھی دکالت کی جانب ہے۔ اعجاز بھائی مگر صدارت مبارک۔ بشری صاحبہ، اللہ عزوجل آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ طالب حسین طلحہ بھائی، قدرتے دیر سے کسی آواز دی کے شب و روز مبارک ہوں اور آخر میں سب قارئین مغل کو مبارک رمضان مبارک۔"



بھوریاں بتاتی تھیں۔ سودائے جنوں بھی خوب صورتی کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ فاروق انجم کم لکھتے ہیں مگر زبردست اور معیاری لکھتے ہیں۔ فراز نے اپنی ہی سہ سے کو پھونک کر شاکو اپنا چاہا پھر وہی ہوا جو ہوتا ہے۔ دھونی کا سنا گھر کا نہ گھاٹ کا ہنسی کے جھروکوں میں سرشت آدم اچھے تاثر میں لکھی گئی خوب صورت کہانی تھی۔ بھیرا پیمیری اور اہم جوئے بھی دل جیت لیا۔ ڈاکٹر شیر شاہ بھی حسب روایت حقیقت میں ڈوبی ہوئی بہترین تحریر لائے۔ اشعار بھی بہت زبردست تھے۔ کتر نہیں کم ہی تھیں۔ آخر میں سب تبصرہ نگاروں سے سبکی کہوں گا۔ چاروں کی زندگی ہے کیا کرو گے کسی سے انجو کر رہو تو پھولوں کی طرح اور بھر دو خوشبو کھاندا۔

بشری افضل، بہادر پور سے محفل میں شریک ہیں۔ 18 جون کو سسٹنس علامہ مبارک آپ نے ہم سب کو پہلے ہی دے دی۔ آپ کا شعر ہے۔ عکس کرل نے انسا نہ نہیں کیا انکل خوب صورت اور نازک اندام ہی کرل بتاتے۔ اپنی محفل میں پہنچنے ان کی باتیں سب انکل آپ ہی مہنگی کو پھینکی سے کاٹ دیں۔ (اگر ہمارے بس میں ہوتا تو پہلی فرمت میں کاٹ ڈالتے) اعجاز احمد راسل کرسی صدارت مبارک ہو۔ خدا آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ صبح کہتے ہیں نا اپنے ہی گراتے ہیں ٹھمنیں یہ بھلیاں۔ میرے تو اپنے دکھاتے ہیں کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔ پہلے بچن بھائی گئے اب بشری افضل کی باری ہے۔ زندگی اچھی نہیں لگتی۔ مایوس ہو گئی تھی کہ اندھیرے میں ایک روشن ستارہ سسٹنس میرے پاس پہنچا۔ اپنا تبصرہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا وہ دروہول مٹی۔ سسٹنس نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔ تمام ساتھیوں سے انتہا سے میرے لیے دعا کریں مشکلات ختم ہو جائیں۔ (اللہ اللہ سب مشکلات ختم ہو جائیں گی۔ اللہ پر بھروسہ رکھیں) تمام ساتھیوں اور اہل اسلاف کو عید کی دیریں خوشیاں نصیب ہوں۔ محمد قدرت اللہ نیازی آپ کو کوئی مسئلہ ہے۔ آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے حاصل میں فراز کو اپنے کے کی سزا مل گئی جو کسی کے لیے گڑھا کھودتا ہے خود ہی اس میں گر جاتا ہے۔ وصیت، ایسی اولاد کے لیے بہتر ہے کہ جامداد سے کوئی حصہ ان کو نہ ملے۔ نجس وارن کی وصیت پسند آئی۔ تصوف میں ایمان افروز واقعات نے دل و دماغ کو معطر کر دیا اور معلومات میں خاصا اضافہ ہوا۔ فکار پور سے شکا گوٹک، ستار نے اپنے دوست کو سمجھایا بہت مگر اس کا ضمیر برداشت نہ کر سکا۔ کسی کو جاب سے ہٹا کر اس کی جگہ لے۔ محفل شعر و سخن میں معیاری شعر تھے۔ امتیاز احمد انعام کے حق دار ٹھہرے، مبارک!۔

سید عبادت کاظمی، ڈیرہ اسماعیل خان سے پہلے آرہے ہیں۔ خلاف معمول اس وفد سسٹنس نے 18 جون کو درشن کرائے۔ عید کی مناسبت سے سہارنوردی دل کے تار چھیڑ گیا۔ سینہ کی اداس آنکھیں کسی کی یاد دلا گئیں۔ شاید اس کو بھی عید پر ساجن کے آنے کا انتظار تھا خیر سب سے پہلے محفل دوستان میں گئے۔ اعجاز احمد راسل بہت مبارک ہو۔ وکٹری اسٹینڈ پر براجمان ہونے کی لیکن آپ نے بتایا نہیں کہ آپ بچہ تھے خدا پاک آپ کو صحت دے۔ اپنا خط دیکھ کر بہت خوش ہوئی اتنی کربس۔ بشری افضل آپ کا دکھ دل پر محسوس ہوا۔ اللہ آپ کو سب تکلیفیں مٹا دے۔ اس مشکل وقت میں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ شعیب خان آپ ادھر بھی، بھئی مان گئے آپ کو۔ سحر یہ بخاری کو بھی یہاں دیکھ کر اچھا لگا۔ قدرت اللہ نیازی کا تبصرہ چھان گیا۔ سب سے پہلے رات کا مسافر پر مٹی۔ یہ کیا آخری قسط جھونکا سا لگا۔ خیر ابراہیم اور مہر کی لمن کی خوشی ہوئی۔ عشق انعام کو بہت کم پہنچتا ہے۔ سودائے جنوں میری فیورٹ نئی جاری ہے۔ زبیرہ کا حوصلہ قابلِ تحریف ہے۔ اسرا علی فوج کو خدا عافیت کرے۔ ماروی کی تو بکھر نہیں آئی۔ سرشت آدم تاریخ پر جی کہانی گرمیوں میں ٹھنڈی پھوار کا مزہ دے گئی۔ اما قادی کی کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔ کاشف زبیر آتے ہی چھان گئے۔ ویلڈن مٹی بے ساختہ لکھتے پر۔ ماسر ملک کی کہانی کا بھی انتظار ہے اور ماہا ایمان جو سسٹنس میں لکھتی تھیں کہاں غائب ہیں۔ (بھئی یہ تو ہمیں بھی نہیں پتا۔ وہ خود ہی بتائیں گی)

محمد قاسم رحمان، ابرار کالونی، ہری پور سے شریک محفل ہیں۔ طویل انتظار کے بعد سترہ جون کو دوسرے چکر پر جولائی کا سسٹنس ملا تو دل کو راحت ملی۔ اس ماہ بھی ناگل بہترین رہا۔ سروردی کی سینہ شاہی مستقبل کے سہرے پہنے بن رہی تھی۔ اشتہار کو چھلانگتے ہوئے کہانیوں کی فہرست میں آئے جو بہترین انداز میں بھی ہوئی تھی۔ انتہا یہ میں جن ایلانے قابلِ غور بات پر توجہ دلائی۔ ادارے میں ایڈیٹر صاحب نے بھی خوب باتیں کیں لیکن مہنگی کا زور ایک دن نوٹے گا انتہا اللہ۔ رات سختی ہی تاریک اور طویل کیوں نہ ہو، صبح ضرور ہوتی ہے۔ ہمارے وطن عزیز کے حالات بھی ایک نہ ایک دن ضرور بہتر... ہو جائیں گے اور سیاستدانوں کو محفل آجائے گی۔ اعجاز احمد راسل نے اس مرتبہ میدان مار لیا۔ مبارک ہو بھائی احمد مسعود معاویہ برادر کوئی بھی چیز خطرناک نہیں ہوتی۔ ہم خود اسے خطرناک بناتے ہیں۔ تبصرہ اچھا تھا۔ بشری افضل آپ نے تو ناگل کرل کا انٹرا سائڈ کر دیا۔ کہیں بھائی بنانے کا ارادہ تو نہیں۔ افتخار حسین اعوان جون کے ناگل کے حلق آپ کی رائے سے متعلق ہوں۔ قدرت اللہ نیازی ڈائجسٹ میں مجھے تین تین بار دیکھ کر کیا اور فیس بک پر اتنی رکھائی۔ رضوان تنولی کا تبصرہ بھی اچھا تھا، غالباً کستوری لگا کر لکھا گیا تھا۔ کہانیوں کی ابتدا اس مرتبہ رات کا مسافر سے کی۔ ابراہیم اور مہر کی محبت کے بارے میں پڑھ کر حیرت ہوئی کہ ایسی بھی ہوتی ہے یہ کم بخت محبت۔ انتقام خلاف معمول خوشگوار تھا۔ ماروی بھی اچھی جاری ہے۔ بشری تو سرینہ فنی جاری ہے۔ مراد کے بارے میں اتنا کہوں گا کہ میں تو لہ تو ملی میں ماش۔ کاش ماروی اور محبوب ایک ہو جاتے تو اچھا ہوتا۔ ویسے نواب صاحب نے صدریل یا صدریلہ کو غائب کر دیا کیوں جی امرزا امجد بیگ نے سچائی کو بے نقاب کیا۔ منزہ اور ساجد کے انٹریک وچ سے داؤد کو جیل میں چکی پستی پڑے گی۔ بے ساختہ لفٹاٹک رہی۔ کاشف زبیر ہمیشہ کہانی پر اپنی گرفت کو مضبوط کر رکھتے ہیں۔ کاش اور وصیت ایک ہی طرز کی تحریریں تھیں۔ جہاں وصیت میں بتایا گیا کہ اولاد کیسے ہے جس ہو کر والدین کو بھول جاتی ہے وہی کاش میں والدین کی



انجم فاروق ساحلی، لاہور سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں۔ اس بار خوشنما تیز رنگوں کے احراج سے سسٹنس کا ناگل ہے۔ حد خوب صورت اور جاذبِ نظر ہے۔ اس کی کشش نے بے اعتبار کھینچ لیا۔ محمد مسعود معاویہ صاحب تذکرہ قلم بند کرنے کا شکر ہے۔ خطوط کی محفل خوب بری بھری اور ساتھیوں کی دلچسپی سے بھر پور تھی۔ فاروق اور ادارے کو عید کی خوشیاں مبارک ہوں۔ سندھ و گراہی میں گرمی کی شدت سے ہونے والی ہلاتوں پر دلی افسوس ہے۔ پہلے روز سے والے دن شام کے وقت گرمی کی شدت سے میری اپنی طبیعت بھی مجزومنی

تمی یمن اب گرمی کا زور کم ہو چکا ہے اور اس وقت بارش ہو کر ختم ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے سسٹمز کے ماحول پر چاند ستارے اور عید مبارک کے الفاظ کو اچھے ذہن سے چن لیا۔ کہانیوں میں سرشت آدم، سوا سیر، کاش، حاصل اور رات کا سفر اچھی اور سحر شکن تھیں۔ محفل شعر و سخن میں اشعار کا انتخاب بھی خوب تھا۔ سوائے جنوں اور ماروی ابھی زیر مطالعہ ہیں۔

✽ غلام یاسین نوٹاری، چوک سرود شہید سے تیسرے گھر پر ہیں۔ "ماہل حسب معمول خوب صورت حسینہ کے حسن سے سجا ہوا محفل کی محفل اپنے جوتن پر نظر آئی۔ اعجاز احمد رائیل بھائی، ہماری طرف سے کرمی صدارت کی ہے حد مبارک با قبول ہو۔ آپ کا محفل دل کی آگ سے پڑھا۔ ایک ایک نقطہ سوتوں کے مانند لگا۔ آپ کا انداز بیاں آپ کی وسعت مطالعہ کو ظاہر کرتا ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ اعجاز بھائی ایک بات عرض ہے جو اپنے ہوتے ہیں وہ بھی تم دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ تو خوشیوں کے ڈھیر لگا دیتے ہیں اور جو غم دیں انہیں اچھا کہنا سرا سرا انسانی ہے۔ تو ہیں ہے ان انہوں کی جو آپ کے لیے اپنا تن من واد دینے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ سید عبادت کاظمی، شفقت محمود کی پہلی شرکت پسند آئی۔ ذریعہ مراد بھائی سے اپنے بھری دوست زبیر حسین خج کا نام محفل میں جگہ کرتے دیکھ کر دل خوشی سے مچا اٹھا۔ یہ میرا وہ دوست ہے جو دوستی کی روح کو پھیلاتا ہے۔ دوستی کر کے نبھاتا جاتا ہے۔ میری طرف سے زبیر حسین کول کی گہرائیوں سے محفل سسٹمز میں خوش آمدید۔ سرشت آدم میں ہماری خلافت کے خلیفہ مہدی، ملک خیر دان، بارون اور ہادی کا پرمختہ کردہ دلچسپ و خوب رہا۔ الیاس بیتا پوری کا انداز بیاں، برجستہ و گفتہ مکالمے اور طنز و مزاح کہانی کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ رات کا سفر میں طاہر جاوید محفل کا جادو سر چڑھ کر بول رہا۔ آلاب گل کی موت نے تم کو مسموم کر دیا۔ میرا دور ابراہیم کا ملا۔ پسند آیا۔ البتہ محفل صاحب کی یہ اسٹوری ان کی ساجد اسٹوریز سے قطعی مختلف تھی۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی لازوال تحریر سوائے جنوں کے آغوش جیسے کا مطالعہ کیا۔ کہانی اپنے جوتن پر ہے۔ سب کردار اپنی اپنی جگہ بہت خوب ہیں۔ یہ قطع بھی گزشتہ کی طرح ہنگامہ خیز رہی۔ ماروی میں مراد ماروی سے منظر ہو کر نئے مشن پر نکل گیا۔ مرید کو بھی چمکا دے گیا۔ دوسری طرف جادو اور بھی بگ سے چار ہے ہیں۔ کہانی ایک دم تیز رفتار ہو گئی ہے۔ محمد فاروق انجم کی تحریر حاصل میں فراز کی شیطانی اسے لے ڈوبی۔ اسے حاصل کیا ہوا تھا اپنا گھر بھی بر باد کر بیٹھا۔ ہوس انسان کو تباہ کر دیتی ہے۔ سوا سیر میں بیگ صاحب کی ذہانت و حکمت عملی سے بے گناہ ریاض چاٹھی کے پسند سے سے فحش کیا اور ساتھ ہی اصل بجرم داؤد قانون کے چھپنے میں آگیا۔ منظر نامہ کی تحریر کاش مختصر مگر موثر رہی۔ کاشف زیر کی کہانی بے ساختہ سحر انگیز ثابت ہوئی۔"

✽ محمد جاوید شیر بربر، علی پور مظفر گڑھ سے لکھ رہے ہیں۔ "جولائی کا شمار 16 جون کو مل گیا۔ ابھی کراچی و دیگر شہروں میں دوستوں کو نہیں ملا۔ ہمیں پہلے مل گیا۔ سارا دن دوستوں کو ان کے خطوط، اشعار کی مضمون سے سووی بنانا کر send کرتے رہے۔ جن میں ایک صدارت کی کرسی پر فائز اعجاز احمد رائیل صاحب بھی تھے۔ سرورق بہت ہی پیارا تھا۔ ڈاکٹر اگل کے کیا کہنے لیکن عید مبارک پڑھ کر چمکے بغیر نہ رہ سکے کیونکہ عید تو 19 جولائی کو ہوتی ہے اور سولہ جولائی کو اگست کا شمار آ جاتا ہے۔ عید سے دو دن پہلے ہماری عید کی خوشیاں دوبا لاکر آئے اور آپ ہمیں اگست کے شمارے میں عید مبارک کہیں۔ وہ ڈاکٹر اعجاز و مبارک ہو جائے گی۔ (بالکل آپ کی فرمائش پوری ہوگی) میری طرف سے آپ اور آپ کے تمام اسٹاف اور قارئین اور نگار یوں کو دل کی گہرائی سے عید مبارک قبول ہو۔ آپ کی گہری کھری باتیں پڑھ کر دل نے آپ کے لیے بسی گہری دعا کی۔ واقعی آپ اپنے ہم وطنوں کا دکھ دلی طور پر محسوس کرتے ہیں۔ آپ کی باتیں حقیقت ہوتی ہیں۔ پتا نہیں ہمارے سحرانوں کو کب محفل آئے گی کہ وہ اس دنیا کے لیے لوٹ مار کر کے پیٹ بھر رہے ہیں۔ اس دنیا کے لیے نہیں سوچتے جہاں ہم رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے۔ اعجاز احمد رائیل کا تبصرہ شاندار تھا۔ اعجاز بھائی صحت کا خیال رکھا کریں۔ سید عبادت کاظمی صاحب ہم سب آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اشفاق شاہین آتے رہا کریں۔ بشری افضل، بہن اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل دے۔ مایوس نہ ہوں اللہ کے پاس ہر کسی نے جانا ہے۔ یہ اہل حقیقت ہے حوصلہ رکھیں۔ سرشت آدم الیاس بیتا پوری کا لا جواب تاریخی ناول تھا۔ کاشف زبیر صاحب کی بے ساختہ بہت سی دلچسپ تحریر بھی پڑھ کر مزہ آگیا۔ نویر ریاض کی ہیرا پھیری کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ سوائے جنوں کی تو کیا بات ہے۔ عبدالرب بھٹی صاحب کی یہ شاہکار تحریر جب تک پوری قسط نہ پڑھ لیں بیٹے بھی نہیں ہیں۔ ماروی کا اب ایڈیٹ کر دیں۔ رات کا سفر اتنی جلدی تیسری قسط پر ختم نہیں آ رہا۔ ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ کافی لمبا سلسلہ ہوگا۔ واقعی سسٹمز کو مان گئے۔ اچانک سب پر اثر دینا کوئی آپ کے ادارے سے کیجئے۔ آپ اچانک حیران کر دیتے ہیں۔ بہت کمال کا سلسلہ قہار رات کا سفر ایک لازوال کہانی تھی۔ جو ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔"

✽ ریاض علی البغدادی، نیو سینٹرل جیل مٹان سے محفل میں شریک ہیں۔ "جولائی 15 کا شمار 17 جون کو دستیاب ہوا۔ اللہ نے میں محترم جون ایلیا صاحب دو سوال کے تحت دانش بھری باتیں کرتے ہوئے سوالات اٹھاتے نظر آئے۔ درحقیقت بات یہی ہے کہ محفل انسانیت سکھاتی ہے لیکن جب محفل کو بے لگام چھوڑ دیا جائے اور اللہ رب العزت کی طرف سے انسانیت کی راہنمائی کے لیے

تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا جائے تو پھر محفل انسانیت سکھانے کے بجائے فتنہ و فساد اور خرابی کا باعث بنتی ہے۔ محفل یاد اس میں برادر اعجاز احمد رائیل اور محمد منور معاویہ کا تبصرہ پسند آیا۔ اس کے بعد الیاس بیتا پوری کی سرشت آدم اور ضیا تنسیم بکرا کی تحریر نے دل و دماغ کو تازہ کر دیا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سوائے جنوں کا آغوش حصہ بہترین تھا۔ مرزا امجد بیگ کی سوا سیر، منظر نامہ کی کاش اور فاروق انجم صاحب کی تحریر حاصل مزید اچھی۔ محفل شعر و سخن میں اعجاز احمد، عبدالقدیر، جاوید اختر، سید یحیٰی، بطیس خان، مہتاب احمد، رمضان شاہ، محمد جاوید عیسیٰ، داؤد اشفاق، شاہین اقبال اور نایع شایا کا انتخاب شاندار تھا۔ برادر غالب حسین طلحہ کو آزادی کی فضا میں مبارک ہوں اور ان کے ہمراہی محمد مجاہد عیسیٰ کو بھی آزادی کی فضا مبارک ہو۔ خدائے بزرگ و برتر برادر محمد جاوید عیسیٰ کو بھی جلد آزادی نصیب فرمائے (آمین) تمام قارئین نے زور و شور سے رمضان المبارک کی برکتوں اور رحمتوں کو ضرور سمیٹا ہوگا۔ اللہ رب العزت آئندہ بھی سب کو رمضان المبارک کی مبارک سائیں نصیب فرمائے۔ آمین۔ بندہ عاجز کی طرف سے تمام قارئین کو اور بالخصوص میر محترم کو عید الفطر مبارک ہو۔ اللہ رب العزت سب کو ذمہ داریوں خوشیاں دے۔ (آمین)"

✽ محمد حنیف گبول، نیو سینٹرل جیل مٹان سے شریک محفل ہیں۔ "اس بار جولائی 15 کا شمار بندہ عاجز کو 18 جون کو ملا۔ آپ کے خطوط میں محمد منور معاویہ اور بھائی اعجاز احمد رائیل کا تبصرہ بہترین تھا۔ الیاس بیتا پوری اور ضیا تنسیم بکرا کی تحریر نے خصوصی مزہ دیا۔ ماروی نے تو ہر باری طرح اس بار بھی بہترین انداز اختیار کیے رکھا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سوائے جنوں، مرزا امجد بیگ کی سوا سیر، منظر نامہ کی کاش اور ڈاکٹر شیر شاہ کی شکار پود سے شکا گو تک بہترین تھی۔ محفل شعر و سخن میں محمد جاوید عیسیٰ، مسز انڈسٹری منور معاویہ، داؤد اشفاق، عبدالقدیر، سید یحیٰی اور شاہین اقبال کا انتخاب زبردست تھا۔ برادر محرم طالب حسین طلحہ کو آزادی کی نصیب عظمیٰ مبارک ہو۔ امید ہے کہ جس طرح جیل کی چار دیواری کے اندر اپنی مقبول دعاؤں میں یاد فرماتے تھے، اسی طرح آزاد فضاؤں میں بھی اپنی مقبول دعاؤں میں یاد فرماتے رہیں گے۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ تمام اسیران کو رہائی والی نصیب عظمیٰ عطا فرمائے۔ آمین، محمد آمین۔ تمام قارئین کو رمضان المبارک کی مبارک سعادتیں مبارک ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ بندہ عاجز کی طرف سے تمام قارئین کو عید الفطر کی ذمہ داری مبارک ہوں، بالخصوص میر محترم سیت تمام سسٹمز انتظامیہ کو بھی رمضان المبارک اور عید الفطر مبارک ہو۔"

✽ محمد خواجہ، کورنگی، کراچی سے میر پور تھیرے کے ساتھ حاضر ہیں۔ "گزشتہ 2 ماہ سے کچھ نہ لکھ سکا۔ اس دو ماہ میں بڑے بھائی کی وفات ہوئی۔ پھر ہمارے خیال میں صرف ایک ممانی تھیں۔ ان کا انتقال ہوا۔ صرف 15 دن بعد بڑی بھائی بھی دل کا دورہ پڑنے سے وفات پا گئیں (اللہ ان سب کی بخشش و مغفرت فرمائے اور آپ کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین) پھر رمضان شریف کی آمد کے ساتھ شدید گرمی کی لہر اور 10 گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ۔ رات کو 2 بجے لائٹ مٹی۔ چھب کی نماز پڑھ کر بیٹھا ہوں اور امیر جنسی لائٹ میں خط تحریر کر رہا ہوں۔ پتا نہیں بجلی کب آئے۔ ان تمام مشکل حالات میں ایک سسٹمز کا سہارا ہے۔ میں اس کو پڑھ کر ذہن کو پریشانوں سے کسی حد تک دور کر سکتا ہوں۔ جولائی کا شمار عید مبارک کے ساتھ موصول ہوا۔ خطوط کی محفل میں پیارے دوستوں اور بہنوں کی جانب سے اظہارِ تحریت اور بھائی کی مغفرت کی دعا کے لیے بہت ممنون ہوں۔ خاص طور پر بھائی رضوان خولی کی بڑی دی کے پیار بھرے انداز نے ایک دفعہ پھر آنکھیں نم کر دیں۔ جولائی کا ماحول عید کا چاند اور حسینہ کی بے ساختگی میں ہونٹوں کو پیچھو کر پڑا۔ نچرل لگا۔ سرشت آدم، الیاس بیتا پوری جب بھی کہانی کا انتخاب کرتے ہیں خوب کرتے ہیں۔ ایسا رنگ بھرتے ہیں کہ قاری پڑھتے ہوئے دم بخود ہوتا ہے۔ جیسکی ہوں یا کھائی سازشیں، بڑی تفصیل و کش انداز میں۔ بے ساختہ کا ڈیوڑھی کی مار دھاڑ سے میرا دھکم کا مزہ دیا اور آخر کار انجام بھی بہت عمدہ رہا۔ سوا سیر، امجد بیگ کے کارنامے اور بجرم کو اپنے مقام تک پہنچانا۔ ان کے کارنامہ جادو گہری کا حقیقت میں ہوتا۔ اس کہانی میں بجرم چالاکی کے باوجود بیگ صاحب سے نہ بچ سکا۔ ان کی تحقیق اور ذہانت شراک ہو سکی فرضی کہانیوں کا حقیقی روپ ہے۔ سوائے جنوں، اسرائیل کی خفیہ اور خطرناک تنظیم کا مقابلہ فلسطینی مسلمان مجاہدوں سے زور آزمائی اور جان بھیلی پر لے کر لڑا اور ان کو نقصان پہنچایا۔ دلوں کو گرما دینے والی داستان ہے۔ لکھنے والے کی عکاسی، حالات کا انتخابی تیزی سے چلنا کھانا، یہ سب لکھنے والے کا حسن ہے۔ ہیرا پھیری، نویر ریاض کی بہت افزا کوشش ایک مغربی معاشرے کی کہانی، بہت جان ڈالنے پر بھی ایک معمولی درجے کی کہانی ثابت ہوئی۔ کوئی چوکا دینے والا مگر کہیں تھا۔ کاش، ایک مظلوم عورت کی قربانی کی کہانی۔ ایک اولاد نافرمان، ضدی اور ناجبھ، کہانی پڑھ کر عورت کی مظلومیت پر ترس اور نافرمان اولاد پر غصہ آیا۔ کیسا بھی اولاد ہوتی ہے جو اپنی ماں پر تھوڑا سا رحم نہ لکھائے۔ شکار پود سے شکا گو تک، ڈاکٹر شیر شاہ نے ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی انہوں میں جینے کے اندرونی دشمن کی نشاندہی کی۔ ہزاروں لوگ پیش اور پیچھے مستقبل کی تلاش میں اپنی سرزمین کو چھوڑ کر پردیس چلے گئے۔ افسوس واپس آنے کا سوچتے ہیں تو یہاں رہنے والوں نے پیاری سرزمین کو جہنم بنا دیا۔ حاصل، ایک سرچر سے انسان کی کہانی۔ اس کہانی میں ہانگن کو ممکن بنانے کی کوشش کی گئی۔ وصیت، ایک دردناک کہانی، آخری عمر میں جب توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اولادیں تنہائی کی عذاب، ہاک سزا دے کر خود سب سے سنے میں کھو جاتی ہیں لیکن اس شخص نے بھی ایسی سزا تجویز کر دی جو دنیا کے لیے مثال بن گئی۔ ہم جو، ایک اچھی تیز رفتار کہانی۔ شکاری اور شکار کی جھاگ دوڑ۔ اس مرتبہ شکار۔ اپنی ذہانت سے شکار کی پہچان ہو گیا۔ رات

کامسافر ایک لاجواب کہانی، بلکہ کی سیر، مصنف کی جادوگر تحریر۔ قدم قدم پر آفتیں اور کامیابی، ناکامی کا سفر لاجواب۔ کہانی کا اختتام دل گرفتگی کے ساتھ، کہانی بہت جلد اختتام پذیر ہوئی۔ محفل شعر و سخن میں احمد حسن عریضی، وزیر محمد خان، خرم عزیز اور حنا عروج کا انتخاب زبردست رہا۔ ادارے اور قارئین کو عید مبارک۔

✽ فرح گل، درابن کلاں سے چلی آ رہی ہیں۔ سرورق پر حسینہ ماہ جیسے سرمائی دارگردن یا قوتی لب سحرانجیز آنکھیں ستواں ناک خوب صورت اسٹائل لیے عید کی شکر کھڑی تھی۔ محفل میں انہی رات کا مسافر کی وجہ سے ہے۔ کہانی کا اختتام ہوا اور ہم اپنی جتنی رائے سے ادارے کو نوازیں یہ تو ہوئیں سکتا۔ نہایت ہی بے تابی سے آخری صفحات نے ہماری آنکھوں کو روشنی بخشی۔ ایسی ضدک ٹلی کر دے گا احساس کم ہو گیا۔ پڑاؤ پر پڑاؤ نہایت ہی زبردست اسٹوری۔ طاہر جاوید محفل نے کمال کر دیا۔ ویلڈن محفل انکل۔ اس کے بعد ماروی کو اعزاز بخشا جو کہ نہایت الجھتی جا رہی ہے۔ حاصل، فاروق انجم ایک نئے انداز کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے۔ پہلے صفحات پر ہادی کے انجم پر افسوس ہوا۔ مغربی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ اعجاز احمد راضی کا خط پڑھ کر طے چلے تاثرات دل میں آئے، یہی بھی آئی اور صحت کی طرف سے فکر بھی ہوئی۔ اللہ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے (آمین) قاری وقاص کا شعر پسند آیا۔ آخر میں تمام اہل پاکستان کو رمضان مبارک ہو اور دل کی گہرائیوں سے ایڈوانس عید مبارک۔ آخر میں یہ کہنا چاہیں گے کہ ہمارا سسٹمز میں پہلا خط ہے، آدھا مضمون نہ کر جائے گا۔

✽ محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ڈاؤن خانیوال سے تشریف لائے ہیں۔ جولائی 2015ء کا شمار رمضان سے چند روز قبل موصول ہوا۔ حسینہ عید کی مناسبت سے تیار نظر آئی۔ ادارے کی جانب سے بھی محفل عید مبارک کے الفاظ سے سجا نظر آیا۔ دعا ہے کہ اللہ سب کے لیے رمضان اور عید ایمان و عافیت کا سبب بنائے۔ جون ایلیا انسان کی تعریف "حیوان ضائع" کے طور پر کرتے نظر آئے۔ جانور اپنے حریف جانوروں کو ہلاک کر کے فتح کا جشن نہیں مناتے۔ کیا دل چھو لینے والی بات کی ہے جون ایلیا نے۔ ادارے میں مدیرہ مہنگائی کا رد و ثباتی نظر آئیں۔ اس ہوشیار مہنگائی نے تو عوام و خواص کو بلبلانے پر مجبور کر دیا ہے۔ فردت مانیا جتنا سرگرم رمضان میں ہوئی ہے شاید ہی بھی ہوئی ہو۔ دینی بات بنیادی سکولیات کی فراہمی اور امن و سکون کی تو وہ ملک کے ہر گوشے میں پھیل رہی ہے۔ اعجاز احمد کربھی صدارت پر قابض نظر آئے، بپاری نے آپ کے خط کو شاید زیادہ ہی زوردار اور پراثر بنا دیا کہ صدارت کے حق دار گھبرائے گئے۔ مبارک ہو۔ وزیر باندہیر کا عہدہ میرے شہر کے حصے میں آیا۔ محمد صفدر معاویہ اپنے تیز رفتار تہرے میں سب کو نشانے نظر آئے۔ صفدر بھائی منظر امام کی سنجیدگی سے ہم بھی خوفزدہ ہیں۔ جب سنجیدہ ہوتے ہیں تو آخری صفحات کے لیے تحریر لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ آگے آپ خود سمجھا رہے ہیں۔ سید عبادت کا بھی خوش آمدید! کئی نئے تبصرہ نگار سوشل میڈیا کے سسٹمز میں کلب میں آنے کے بعد تبصرہ نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہارون بھروس، اسد عباس وغیرہ اس کی مثال ہیں۔ اشفاق شاہن! بروقت سسٹمز لٹے گا کہ ہمارے بھائی صفدر معاویہ کو بھی بتا دیں۔ بشری افضل! اللہ مرحومین کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور آپ کو صبر جمیل دے۔ زیب حسن لکھتے ہیں آپ ابھی چھڑے ہیں جو ایسا ماحول ترتیب دے لیتے ہیں۔ ہم تو بچوں کے شور میں بھی پڑھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ رمضان پاشا! یہ پڑ پڑاتی کہانی کیا ہوتی ہے جتنی؟ سعد یہ بخاری! ایڈیٹر سے گلہ ہے جا ہے کیونکہ صنف نازک میدان چھوڑ کر بھاگ چکی ہیں۔ رضوان تولی! ہم نے بھی تبصرہ نگاروں کے تبصرے پڑھ کر ہمت کھڑی اور تبصرے لکھنے شروع کیے۔ محمد جاوید شہیر! تجویز تو بہترین ہے آپ کی ہم اس میں آپ کے ساتھ ہیں۔ سب سے پہلے رات کا مسافر پڑھی ہارون وغیرہ کے ساتھ جو کچھ لایچ والوں نے کیا اور جو کچھ بعد میں ان پر بنی اس قسم کے واقعات کئی بار اخبارات کی زینت بھی بن چکے ہیں۔ ابراہیم اور مہر کے طمن نے ہارون کو بھی گھر والوں سے طوار یا۔ جعفر سے بے وقوفانہ ملاقاتوں نے آخر کار رنگ دکھا دیا۔ جعفر کے ہاتھوں ہارون کی پٹائی کچھ زیادہ ہی کروادی گئی ہے۔ سچی الدین خواب لکھتے ہیں میرے تبصرے شوق سے پڑھتے ہیں کہ ماروی میں ایک کردار کا نام ہی قدرت اللہ رکھ دیا ہے جلاور ملی کے انجمن اعلیٰ کے۔ مراد اور چیت راؤ کا دشمنوں کے خلاف جو زبردست رہا۔ ماروی اپنی ابتدائی کوفت ختم کرنے میں کافی کامیاب نظر آئی۔ کاشف زہیر کی ترجمہ شہبے ساختہ میں ٹھوڑوں پر فرار اور تھاقب نے مزہ دیا۔ جون کے اپنے بچاؤ میں کیے جانے والے کل ایڈگر اور شادی کی تباہی کا سبب بن گئے۔ مرزا امجد بیگ کی سوا سیر میں داؤد کا رد عمل بھرمانہ لیکن نفرتی تھا۔ ساجد کی نفرت کو ابھی طرح جاننے ہوئے داؤد کا فرض تھا کہ منظر کو اس سے بچائے تاہم بچاؤ کا طریقہ غلط تھا۔ حکار پور سے شکا گوئیک میں پاکستانی معاشرے کی حقیقت بیان کی گئی کہ سہولت حاصل کرنے کے لیے دیہی علاقے کا رہائشی سرینگیٹک بنایا جاتا ہے جبکہ اسی دیہی علاقے میں رہ کر اس کی ترقی کی کوشش نہیں کی جاتی۔ فاروق انجم کی حاصل میں فراز نہ تھا کہ حاصل کر سکا اور نہ ہی سعد یہ اس کے پاس رہی۔ شکا کو حاصل کرنے کی تک دو میں یہ بھی بھول گیا کہ اس کی غلط بیانی کسی بھی مرحلے پر مکمل کتنی ہے۔ فراز کے ساتھ وہی ماجرا ہوا۔ ادھر کے رہے، نہ ادھر کے۔

✽ سید محی الدین اشفاق، فتح پور، رہے سے چلے آ رہے ہیں۔ کراچی میں گری کی شدت کی وجہ سے ہونے والی اموات پر دل شکن ہے۔ مگر ہمارے عکسوں کو آپس میں ہونے والی سیاسی چالوں اور بینکٹوں سے فرصت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اچھے عکس کران

دے۔ سسٹمز عید کی مبارک دے رہا تھا۔ ڈاکٹر انکل نے کیا خوب بانیس گرل بنائی۔ سچ میں اتنی خوب صورت لڑکیاں نہیں نظر آتیں۔ انٹرنیٹ میں جون ایلیا کے دو سوال سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ادارے میں ایڈیٹر کی عید پر ہونے والی مہنگائی کی نشاندہی سے کئی طور پر متفق ہوں۔ رات کا مسافر میں طاہر جاوید محفل نے دینی و دنیاوی دونوں طرح کا منظر دکھا دیا۔ ہارون نے دو جہت کرنے والوں کو طوا دیا۔ لکھتا ہے جاسوسی سسٹمز کا لافانی دور پھر سے شروع ہونے والا ہے۔ طاہر جاوید محفل، اسماء قادری کی تحاریر آنے والی ہیں اگر تاہم ملک اور کاشف زہیر سے بھی سسٹمز میں قسط وار ناول کی فرمائش ہو تو؟ ماروی میں ایک کالم اچھا ہے تو دوسرا اور ہے۔ اس بار سوا سیر میں بیگ صاحب کا کارنامہ اچھا تھا۔ خطوط کی محفل میں اعجاز راضی بیمار ہو کر بھی چھائے ہوئے تھے۔ محمد صفدر آپ کی باتوں سے متفق ہوں۔ سید عبادت کا بھی جی آیا ہوں، اختراع و ان ایسا کیا مسئلہ تھا کہ محفل سے کنارہ کرنے کا سوچا؟ نیازی صاحب چھائے ہوئے تھے۔ سعد یہ بخاری اور رضوان تولی اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ کرتے نظر آئے۔ اس بار سسٹمز زبردست تھا۔ سب کو عید مبارک ہو۔

✽ قاضی عرفان احمد عاجز، آزاد، جو اسیدن شاہ سے محفل میں حاضر ہوئے ہیں۔ 1995ء سے سسٹمز کا قاری ہوں مگر کبھی آپ کی محفل میں شرکت نصیب نہ ہوئی۔ حالانکہ محفل شعر و سخن میں بھی کبھی حاضری لگواتا رہتا ہوں۔ سیانے کہتے ہیں ناک جس رستے پہ انسان چلنا چھوڑ دے، وہ رستے مٹ جاتے ہیں تو ہماری کوشش ہے کہ اپنے اور اپنے سسٹمز تک کا جو رستہ ہے وہ بھی مٹنے نہ دیں (بہت شکر یہ اس اپنایت کا) آج جس چیز نے خط لکھنے پر مجبور کیا، وہ ہے ہماری بہن بشری افضل صاحبہ کا دکھ اور ہمیں بھی یقین کریں بشری صاحبہ! آپ کے عزیزوں کی وفات کا بہت بہت دلی افسوس اور دکھ ہوا۔ اللہ آپ کے عزیزوں (مرحومین) کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور آپ کو صبر جمیل عطا کرے۔ یہ اللہ پاک کا نظام اور قانون ہے کہ ہر ذی روح نے موت کا ڈانڈہ چکھنا ہے۔ ہم سب کی دعا ہیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ پاک آپ کو صبر، ہمت اور حوصلہ عطا فرمائے۔ آمین۔ سرورق بہت ہی خوب صورت لگا۔ حسینہ ہونٹوں پر سرخی، آنکھوں میں کاجل اور کانوں میں خوب صورت دل کی شکل والے ٹاپس لٹکائے کچھ خوش، کچھ حسرت اور کچھ امید لیے عید کے چاند کو دیکھ رہی ہے۔ جون ایلیا نے حضرت انسان کو انسانیت کا مطلب سمجھایا۔ اب بھی انسان نہ سمجھے تو انسان اور حیوان میں فرق نہیں رہتا۔ محفل شعر و سخن کے کیا کہنے پر شعر لاجواب ہوتا ہے۔ سرشت آدم پڑھی۔ والدین اور اولاد کی محبت تو مثالی ہوتی ہے چلیں اولاد نافرمان کسی مگر ماں بھی اپنے بچے کے گلے پر چھری پھیر سکتی ہے۔ یہ اقتدار کی ہوس اور لالچ بہت ہی بری چیز ہے۔ سوائے جنوں میں سمجھی صاحبہ جڈ پے جہاد کو ابھار رہے ہیں۔ خدا کرے ہر مسلمان کا ذہن اور دل ملی، باقر، علی، خالد، دانیال، زبیرہ اور محسن کی طرح ہو جائے تو کفر ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو کر رہ جائے۔ مرزا امجد بیگ صاحب کی چالاکیاں پڑھیں۔ مرزا صاحب ایک بات تو بتائیں۔ فحیک ہے آپ بہت زیادہ ذہین، ہوشیار اور منجھے ہوئے وکیل کی مگر پھر بھی آپ انسان ہیں، کبھی کبھی کسی کو سمجھنے میں انسان سے غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ کیا بھی ایسا ہوا کہ آپ آخر تک اپنے منہ پر کھنکھرتے رہے مگر جب نتیجہ نکلا تو آپ کا منہ کھل گیا اور آپ ہار گئے ہوں۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ سسٹمز کی پوری ٹیم اور تمام قارئین کو دینی عید مبارک۔

✽ اطہر حسین، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ یوں تو ہم پڑھنے کے چور رہے ہیں لیکن کیا کریں اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ ڈائجسٹ پڑھنے کو نہ تو بے چینی رہتی ہے۔ وہ بھی سسٹمز یعنی پڑھنے کے لیے سسٹمز ہی ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس کے علاوہ کسی ڈائجسٹ کو پڑھنے کا دل نہیں چاہتا۔ خیر اس دفعہ ڈائجسٹ 16 جون کو خریدنا۔ مگر فوراً طور پر پڑھ نہیں پائے۔ اور پھر اسی دوران رمضان شروع ہو گئے۔ اس دفعہ تو سورج سر پر تھا۔ شدید گرمی نے لوگوں کو بے حال کر دیا۔ کئی لوگ گرمی کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بے۔ لوڈ شیڈنگ اسی طرح تواتر سے ہوتی رہی چلک مزید زیادہ ہو گئی۔ تقریباً پندرہ سو سے زائد افراد چل بے مگر ہمارے ارباب اقتدار کے کانوں پر جوں تک نہ رہی۔ ہم اسے سفاکی ہی کہیں گے۔ کیونکہ جو لوگ اپنے دل میں دوسروں کا درد نہیں رکھتے ہماری نظر میں وہ سفاک ہی کہنا ہیں گے۔ مزید برآں عوام پر اضافی مہنگائی کا بوجھ ڈال کر اسے ہر طرح سے چیلنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ حکومت کا بس نہیں چل رہا کہ وہ غربت کے بجائے غریب ہی کو ختم کر دے۔ ہر حال اللہ ہم سب پر رحم فرمائے اور اعلیٰ آواہوں میں بیٹھے والوں کو لوگوں کا درد محسوس کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس دفعہ کا سسٹمز پوری شان سے جلوہ گر تھا۔ سب سے پہلے سرشت آدم پڑھی۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ کاشف زہیر کی بے ساختہ میں کاؤ بوائے کو دکھایا گیا۔ یوں لگا کہ پرانی آنکھیں غم دیکھ رہے ہیں۔ منظر امام کی کاش سب سے بہترین کہانی تھی۔ مختصر مگر جامع..... ڈاکٹر شیر شاہ نے ایک مرتبہ پھر حقیقت کا سامنا کرایا۔ رات کا مسافر کا آخری حصہ پڑھا۔ ایسا لگا کہ کہانی کو جلدی سمیٹ دیا گیا۔ بہر حال کہانی بہت اچھی تھی۔ ماروی بس ہمیں کچھ خاص نہ لگی۔ بس چل رہی ہے۔ اس کے علاوہ مرزا امجد بیگ کی سوا سیر بھی فحیک تھی۔ باقی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں۔ اللہ اللہ زندہ کی رہی تو پھر حاضر ہوں گے۔ تمام قارئین کو اور ادارے کو ہماری طرف سے ڈھیر ساری دعا ہیں اور عید کی مبارکباد۔

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔
محفل الرحمن، کورنگی، کراچی، راضی نواب، ملتان، عظیم الدین، مار تھ کراچی، رؤف علی، لاہور۔ منیر حسن، سکھر، کبکشاں فاروقی، سیالکوٹ۔ منور حسین، سیالکوٹ۔ احمد خان، راولپنڈی۔ محمد حسن، کراچی۔ عامر حفیظ، دادو۔ صہبہ نسیم، ملتان۔ نسیم رضا، لاہور۔

تاریخ میں ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جن کو قول کے دہنی تو تھے لیکن حالات کے دھارے کے آگے زیادہ دیر ثابت قدم نہ رہ سکے، انہی لوگوں میں ہادی، خیزران اور ہارون کی مثلث بھی ایسی ہی گزری ہے جس کا ہر زاویہ ایک نئی داستان بیان کرتا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اور کڑی ہادی کے رفیق ابراہیم کی وفاداریوں سے وابستہ ہے۔ طائف کے شیعہ میں انسان جب عتاب بن کر کسی پر نازل ہوتا ہے تو ہستی کی کتنی گہرائی میں چلا جاتا ہے اس کا اندازہ اسے خود بھی نہیں ہوتا کیونکہ وہ تو حریف کے حوصلے آزمانے کی خواہش میں سرایت جنوں کی طرف گامزن ہو جاتا ہے جیسے کہ ہارون نے کیا... ہادی کے دوست احباب کو ایک تاریک اور گہرے کنویں میں قید کر کے اس نے گویا اپنی بادشاہت کو سجدہ کروا لیا تھا... اور اگر وہ ایسا نہ کرتے تو کھلے آسمان میں سانس لینے سے بھی ترس جاتے۔ ان تمام واقعات کے پیچھے ایک عجیب و غریب فطرت کی مالک ایسی ماں کا ہاتھ تھا جس کے دونوں ہی بیٹے سگے تھے مگر ایک دل سے اتر اتر اتر ہوا اور دوسرا دل پر چڑھا ہوا... جانے یہ سب کیسے اور کیونکر ہوا مگر... یہ حقیقت ہے کہ تاریخ میں ایسا ہوا...

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے غیرت اثر و اقتات

ابراہیم موسیٰ اپنے گھر کی چار دیواری میں مقید ہو گیا۔ اسے مرحوم خلیفہ ہادی کی نوازشیں یاد آ رہی تھیں۔ اس کو اپنی برگزیدہ قسمت پر فخر آ رہا تھا جس نے آج ثریا سے تخت الشری میں بیٹھ دیا تھا۔ اس نے کبریا کے بارے میں کسی کیسی خوش فہمیاں تو کر لی تھیں کیونکہ ہادی نے گزشتہ رات اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ اگر وہ اپنے منصوبوں اور ارادوں میں کامیاب ہو گیا تو اس خوشی میں کبریا اس کو بخش دی جائے گی لیکن ہادی کی غیر متوقع اور بے موقع موت نے اس کی امنگوں اور خوش فہمیوں کا خون کر دیا تھا۔ وہ بیسی ہانڈ کے قصر انیش میں مزید قیام نہ کر سکا اور کسی کو کچھ بتائے بغیر چپ چاپ بغداد چلا گیا۔ وہ اپنے گھر میں چوروں کی طرح داخل ہوا، اس کے آلات موسیقی قصر انیش ہی میں رہ گئے تھے۔ وہ سوگوار صورت لیے اپنی ماں اور بیوی کے سامنے پہنچا تو دونوں کے دل ہول گئے۔ ماں نے ابراہیم کے سبے ہوئے چہرے کو خوف زدہ نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔ "ابراہیم! کیا بات ہے تو سہا ہوا کیوں ہے؟" ابراہیم کے منہ سے نوازشیں نکل رہی تھیں، زبان لرز رہی تھی، دل بیٹھا جا رہا تھا، ماں کی پرسش نے زخمی دل کو گریہ کر رکھ دیا۔ آنکھیں پر آشوب ہونے لگیں اور موٹی لڑھک لڑھک کر رخساروں پر بہنے لگیں۔ مرثیہ آواز میں جواب دیا۔ "ماں! میں ایک بار پھر تہیم ہو گیا۔"

ماں نے پوچھا۔ "ابراہیم! مجھے گالی نہ دے۔ میں نے تیرے باپ کی وفات کے بعد پہاڑ جیسی جوانی بیگی میں گزار دی پھر تو دوبارہ کس طرح تہیم ہو گیا؟" ابراہیم نے ماں سے نظریں چرائیں، بولا۔ "ماں! امیر المومنین ہادی رات رات روتے رہے۔ میری قسمت اور ہادی کی موت نے مجھے میرے مرنے سے گرا کر دیا۔" بیوی نے منہ بنا کر کہا۔ "ایک ہادی مر گیا تو کیا ہوا، دوسرا آجائے گا۔ تیرا فن تیرا ہنر تو نہیں مر گیا، اس کو نہ روکے ایک کے بعد دوسرا مرنے پیدا ہو جائے گا۔" ابراہیم نے بیوی کو ڈانٹ دیا۔ "تو چپ رہ ناوان عورت۔ ہادی کے بعد جو شخص امیر المومنین کہلائے گا، وہ میرے خلاف کینہ و حسد رکھتا ہے کیونکہ میں نے ہمیشہ اس پر مرحوم ہادی کو ترجیح دی تھی اور اب جو شخص اس کا ورثہ رہے گا، میں نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی ہے، اس لیے میں ان دونوں سے اپنی فلاح و بہبود کی امید نہیں کر سکتا۔" ابراہیم نے اپنے ساتھ اپنی ماں اور بیوی کو بھی گھر مند کر دیا۔

تھکے پہلے ہی ہارون رشید کی سواری بغداد میں داخل ہو گئی۔ خلافت کے مناد بے امیر المومنین کی تشریف

تاریخ کے اوراق سے

رات کا بچھلا پہر تھا۔ دو آدمی اپنی قمیضیں قریبان کر کے شہر کا گشت لگا رہے تھے۔ ایسے میں انہیں چوک میں کوئی کھڑا نظر آیا، وہ سرکاری لیسپ کے نیچے کھڑا تھا، یہ اس کے نزدیک پہنچے تو معلوم ہوا وہ دس بارہ سال کا ایک لڑکا ہے اور اپنا سبق یاد کر رہا ہے۔

ان میں سے ایک نے کہا۔ ”تم دن کے وقت مدرسے میں نہیں پڑھتے کہ رات کے وقت یہاں کھڑے سبق یاد کر رہے ہو؟“

اس کی بات سن کر لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، کہنے لگا۔ ”میرے والد مسلمانوں کے بادشاہ کے ہمراہ جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گئے ہیں۔ میں اپنے والدین کی اگلی اولاد ہوں، میرے والد ہمارے لیے کوئی سرمایہ نہیں چھوڑ گئے، اس لیے میری والدہ سارا دن نوکریاں بناتی ہے میں ان کو بازار میں بیچتا ہوں، اس لیے دن میں میرے پاس پڑھنے کا وقت نہیں ہوتا، میں روزانہ صبح سویرے فجر کی نماز کے بعد محلے کے قاری صاحب سے سبق لیتا ہوں، رات کو یاد کر کے صبح انہیں سنا دیتا ہوں، میرا اور بادشاہ کا فیصلہ تو اللہ کی عدالت میں ہوگا میں وہاں بادشاہ کا گریبان پکڑ کر عرض کروں گا۔ یارب العزت اس بادشاہ نے تیرے راستے میں شہید ہونے والے مجاہد کے گھرانے کی ذرا بھی خبر گیری نہیں کی، اس کے محل میں تو ہزار ہا چراغ جلتے تھے لیکن مجھے گھر میں چراغ نہ ہونے کی وجہ سے سرکاری لیسپ کی روشنی میں پڑھنا پڑتا تھا۔“

ان دو آدمیوں میں سے ایک خود بادشاہ تھا، وہ بچے کی باتیں سن کر بہت شرمندہ ہوا، اس نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”میں ہی تمہارا بادشاہ ہوں مجھے معاف کر دو۔ اگر تم نے میری شکایت اللہ کے دربار میں کر دی تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا، ساتھ ہی بادشاہ نے فرمان جاری کر دیا، اس بچے اور اس کی والدہ کو شاہی محل میں جگہ دی جائے اور بچے کو شہزادوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کا حکم بھیجا جائے۔“

”دنیا اس بادشاہ کو محمود غزنوی کے نام سے جانتی ہے۔“
مرسلہ۔ رضوان خولی کریم زونی،
اورنگی ٹاؤن، کراچی

کوٹواٹھو ادھک جھیلنا پڑ رہے ہوں گے۔

وہ شام تک کمرے میں بند پڑا رہا۔ دنیا رات کی سیاہ چادر اوزھ رہی تھی۔ گھروں میں چراغ جل چکے تھے لیکن ابراہیم کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس کورات کی آمد اور کمرے کی تاریکی کا اس وقت علم ہوا جب کسی نے دروازے پر دستک دی۔ یہ دستک تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہوتی رہی اور اس کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوتی رہی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کے پاس کھڑے ہو کر سرگوشی میں پوچھا۔ ”کون ہے؟“

باہر سے جواب دیا گیا۔ ”میں ہوں تیری بیوی۔ یہ اندر اندھیرے میں کیا ہو رہا ہے؟“

دروازے کی درز سے روشنی کی کرنیں کمرے میں داخل ہونے لگیں۔ ابراہیم نے دروازہ کھول دیا۔ اس کی بیوی چراغ لیے اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔ ”یہ اندھیرے میں کیا ہو رہا ہے؟“

ابراہیم نے ہاتھ کے اشارے سے بیوی کو اپنے پاس ہی بٹھالیا، بولا۔ ”میں سوچ رہا ہوں کہ ان بدلے ہوئے حالات میں اپنی معیشت اور روزی کے لیے کیا کرنا چاہیے؟“
بیوی نے جواب دیا۔ ”میں تمہاری طرح نہ تو مہنتی ہوں اور نہ ہی کچھ اور لیکن میں تمہیں یہ رائے ضرور دے سکتی ہوں کہ تم نے امیر المومنین سے ملو اور اپنے لیے کوشش کرو۔“

ابراہیم تھلا گیا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو، بولا۔ ”اس شخص سے ملوں جس نے ہادی جیسے شخص اور ہنر پرور کو سازش سے ہلاک کر دیا۔ ایسا نہیں ہوگا۔“

اس دوران ابراہیم کی ماں بھی وہیں پہنچ گئی۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے کمرے کے دروازے پر کھڑی دونوں کی باتیں سنتی رہی پھر اندر داخل ہو گئی اور پوچھا۔ ”یہاں کون سا مسئلہ زیرِ غور ہے اس وقت؟“

ابراہیم نے جواب دیا۔ ”ماں! میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہادی کے بعد تو میں گاؤں گا اور نہ کوئی ساز بھاؤں گا۔“

ماں نے تعارت سے جھڑک دیا بولی۔ ”یہ عہد عقل و تدبیر کے خلاف ہے اور جب کسی عہد کا نبھانا ناممکن ہو تو اس سے پہلو چھو کر لیا ہی بہتر ہے۔ ابراہیم! میری بات ذرا غور سے سن، میں کہتی ہوں کہ تو نے اپنے آپ سے جو عہد کیا ہے اس پر زندگی بھر قائم نہیں رہ سکتا۔“

ابراہیم نے جواب دیا۔ ”لیکن ماں میں اس پر قائم رہ کر دکھاؤں گا۔“

ماں نے اٹل لہجے میں کہا۔ ”ناممکن، ایسا ناممکن ہے۔“

تھے۔ افسرانِ فوج کے بعد فقہاء، قضاہ، علما اور منصب دارانِ دربار کی سواریاں تھیں، یہ سب خوش اور بٹاش تھے۔ ابراہیم کو زمانے کی بے مہری اور بے وفائی پر رونا آ رہا تھا۔ اس کو ہالیان بغداد کی بے بسی اور احسان ناشناسی پر غصہ بھی آ رہا تھا اور افسوس بھی ہو رہا تھا جنہوں نے ہادی جیسی فن شناس اور مردم آگاہ ہستی کو چند گھنٹوں کے اندر ہی اندر اپنے ذہن اور حافظے سے نکال باہر کیا تھا۔ انہی سواروں میں یکنی برکی بھی دکھائی دیا۔ یہ پچاس سالہ ذہین اور فکر رسا کا حامل برکی مطمئن اور فاتحانہ شان سے سیاہ گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ بھی کبھی ادھر ادھر دیکھ کر مسکرا دیتا۔ ابراہیم اس جگہ میں محلِ بردار اونٹوں کی قطاریں تلاش کر رہا تھا جن میں قصرِ انیس کی کنیزیں قصرِ غلہ کی طرف تجسس ہو سکتی تھیں۔ دن میں سے کسی ایک میں کبہا بھی ہو سکتی تھی چنانچہ سب کے آخر میں اونٹوں کی قطار میں نمودار ہو گئیں۔ ان پر حمل کئے ہوئے تھے۔ سیاہ اور سفید حمل اونٹوں کی پشت پر کوہان کی طرح ابھرے ہوئے تھے جو اونٹ کی بے ہنگم چال سے جھکوں کے ساتھ اوپر نیچے ہو رہے تھے۔ ابراہیم نے ان حملوں کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی آنکھیں اور چند چہرے دیکھ لیے، وہ ٹپ گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنی قوتِ بینائی سے، ان جھانکتی آنکھوں اور نمودار چہروں میں کبہا کو دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ وہ بہت مایوس ہوا اور بارگم سے گردن جھکا لی۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا کہ کہیں کبہا ان میں شامل نہ ہو جن پر ہادی کی حمایت اور وفاداری کا الزام مائد کیا گیا ہوگا۔ اس کے خیال میں اگر ایسا ہوا ہوگا تو ان میں کبہا ضرور شامل ہوگی۔

دوپہر کے بعد جب وہ تھکا ہارا گھر میں داخل ہوا تو وہ اس قابل نہیں رہ گیا تھا کہ اپنی ماں یا بیوی کے پاس گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر دل بہلاتا، وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دروازہ اندر سے بند کر لیا اور اپنے سازوں کو حسرت و یاس سے دیکھنے لگا جو ہادی کی موت کے بعد ابراہیم کی طرح یتیم ہو گئے تھے۔ مایوسی اور جذبات کی شدت نے اسے اس پر آمادہ کر دیا تھا کہ وہ تمام آلات کو توڑ کر پیسے دے تاکہ ہادی کے بعد کوئی دوسرا ان سے لطف اندوز نہ ہو سکے۔ وہ ہارون اور یکنی سے بہت ناراض تھا اور اس نے یہ عہد کر لیا تھا کہ اب وہ کسی دربار سے کوئی تعلق نہ رکھے گا۔ اس تجلیے اور جگمگ حسرت و یاس میں بھی اگر کوئی اس کا ساتھی تھا تو وہ کبہا کا خیال تھا۔ اس کو یہ فکر بھی پریشان کر رہی تھی کہ کبہا

آوری سے پہلے ہی مطلع کر چکے تھے۔ ابراہیم کا خیال تھا کہ اہل بغداد ہادی کی اچانک موت کے پیچھے موجود سازش کو فہم دھنسنے سے محسوس کریں گے اور اس کا اظہارِ شورش اور ہنگاموں سے کریں گے۔ اس نے بغداد کی اس شاہراہ کے دونوں طرف، جس سے ہارون کی سواری گزرنے والی تھی، لوگوں کے سیل رواں کو ادھر ادھر بھاگتے دوڑتے دیکھا۔ شاہراہ کے متوازی مکانوں اور بڑی بڑی عمارتوں کی چھتیں عورتوں، مردوں اور بچوں سے اٹی ہوئی تھیں۔ سڑک کے کنارے درختوں کی موٹی موٹی شاخوں پر انسانوں کا جھگمکا مشرقی افق پر نظریں جمائے ہوئے اس نکتے کو دیکھ رہا تھا جو آہستہ آہستہ بڑا ہوتا جا رہا تھا اور جس کے اٹھے ہوئے تیروں کی چمک دار شعاعیں سورج کی شعاعوں سے نظروں کو خیرہ کر رہی تھیں۔ ابراہیم بھی ایک درخت پر چڑھ گیا۔ وہ ہارون رشید کی گزرگاہ میں اس لیے آ گیا تھا کہ شاید اس قافلے میں کبہا بھی موجود ہو اور وہ اس کی ایک جھلک دیکھ لینے میں کامیاب ہو جائے۔

کچھ دیر بعد ہارون اپنے ہمراہیوں کو لیے ہوئے قریب آ گیا۔ جگمگ بے قابو ہو گیا۔ ہر طرف سے عکس و عکس کی صدا نہیں بلند ہونے لگیں ابراہیم کی توقع کے برعکس جگمگنے غلیظہ کا جوش و خروش سے استقبال کر رہا تھا۔ بغداد کے اہل خانہ انصار کے بعد بنو عباس کی سربراہ آ رہا تھا اور معزز شخصیتیں نظر آنے لگیں۔ انہوں نے اس لیے جیسے جگمگ کو فخر و خوشی کے طے ملے جذبات سے دیکھا اور اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔ ان سربراہ آ رہے اور معزز شخصیتوں کے درمیان میں انہیں بائیس سالہ ہارون رشید سیاہ لباس میں ملبوس جو اہر دار دست کی تگوار لٹکائے سکراتا بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اس کا شاندار گھوڑا اس شان اور وقار سے چل رہا تھا گویا اس کو کان میں جتایا گیا تھا کہ اس کا راکب نوجوان، خوش جمال اور خوش قامت امیر المومنین ہے۔ نیزوں اور گواروں نے ہارون رشید کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ ہارون اپنے بے تاب استقبالوں سے بہت خوش تھا۔ ابراہیم نے ایسا محسوس کیا کہ گویا ہارون اس کو دیکھ لے گا۔ اس نے ستر مرغ کی طرح اپنے سر کو ہرے ہرے بتوں میں چھپایا۔ اس خیال سے کہ اگر وہ ہارون کو نہیں دیکھ رہا تو ہارون بھی اسے نہیں دیکھ سکے گا۔

ہارون کے بعد افسرانِ فوج کی قطاریں، جن کی گواروں اور نیزوں کی چمک سے تماشائیوں کی آنکھوں میں چمک چمک پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنے سفید چہروں پر درشتی اور شجاعت کی علامتیں لیے بڑی تمکنت سے گھوڑوں کو چلا رہے

اگر تو صاحب اختیار ہو تو میں کسی حد تک تیری بات پر یقین کر لیتی۔

ابراہیم نے عرض کیا۔ "ماں! کیا میں اپنے مہم میں صاحب اختیار نہیں ہوں۔ آپ نے یہ کیا بات کہہ دی؟" ماں نے جواب دیا۔ "تو میری بات سمجھنے کی کوشش کر۔ صاحب اختیار سے میری مراد یہ ہے کہ تو خلافت عباسی کا ملازم ہے، ہم خلافت کا بیٹے کا، وہاں تیرا مہم نہیں چلے گا۔"

ابراہیم نے درشتی سے جواب دیا۔ "ماں! میں نے جو مہم کر لیا ہے اس سے خلافت اور امیر المومنین بھی خوف زدہ ہو جائیں گے اور مجھے میری مرضی کے خلاف کسی بھی کام پر مائل نہیں کر سکیں گے۔"

ماں نے طنز یہ کہا۔ "ابراہیم! تجر بہ کاری کی باتیں نہ کر۔ امیر المومنین ہارون اور یحییٰ برکی تجھ کو جبراً اور حاکماً بلوائیں گے۔ اگر تو انکار کرے گا تو وہ قید کر دیں گے۔"

ابراہیم نے اپنی ماں کے آگے ہاتھ جوڑ دیے، بولا۔ "ماں! میں بے حد پریشان ہوں، مجھ کو کس پریشانی نہ سمجھیے۔"

ماں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر حکم دیا۔ "بیو! اس کو سمجھا، اگر یہ اپنے اس حال پر قائم رہا تو خود تو خسارے میں رہے گا، اپنے ساتھ ہمیں بھی پریشان کر دے گا۔ میں واپس جاری ہوں لیکن اپنی دوسری ملاقات میں، میں یہ ضرور سننا چاہوں گی کہ ابراہیم نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور خلافت سے منقطع استوار کر لیا ہے۔"

ماں چلی گئی اور ابراہیم اور اس کی بیوی میں بحث و مباحثہ شروع ہو گیا لیکن ابراہیم اپنی بات پر قائم رہا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ اگر دربار خلافت سے کوئی بلاوا آجائے تو اس کو صاف منع کر دیا جائے کہ میں نہیں مل سکتا۔ بیوی نے جاتے جاتے بیزارگی سے کہا۔ "اگر ایسا ممکن ہو تو درہم تو خود بات کر لینا۔"

دو دن گزر گئے مگر ابراہیم کمرے سے باہر نہ نکلا۔ ماں اور بیوی اس ضدی انسان کے پاس جاتیں اور آرزو اور اداس واپس آ جاتیں۔ تیسرے دن ایک سوار ابراہیم کے پاس پہنچا اور اس کی بیوی سے کہا کہ استاد ابراہیم کو امیر المومنین کے اتالیق اور خلافت عباسیہ کے سیاہ و سفید کے مالک یحییٰ برکی نے یاد فرمایا ہے۔

بیوی نے یہ خبر اپنے شوہر کو پہنچادی۔ ابراہیم نے جواب دیا۔ "اس سے کہہ دے کہ استاد ابراہیم تو اسی دن مر گیا جس دن امیر المومنین ہادی نے اس دنیا سے کوچ کیا تھا۔ اس گھر میں اس کا لاشہ رکھا ہے اور لاشے سے یحییٰ کو کوئی

کام نہیں ہو سکتا۔"

یحییٰ کے آدمی نے یہ عجیب و غریب جواب اپنے آقا کے گوش گزار کر دیا۔ یحییٰ نے اس کو دوبارہ بھیج دیا اور کہا۔ "جاء، اس سے کہہ دے ان فضول باتوں سے فائدہ؟ ابھی تو میں تجھ کو بلوار ہا ہوں لیکن اگر امیر المومنین کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ میں نے تجھ کو بلوایا اور تو نے آنے سے انکار کر دیا تو کسی ایسی مصیبت میں مبتلا کر دیا جائے گا جس کا ازالہ ناممکن ہو جائے گا۔ اس لیے تیری بہتری اسی میں ہے کہ تو چپ چاپ چلا آ اور امیر المومنین ہارون رشید سے تعلقات قائم کر لے۔"

جب یحییٰ کا پیغام ابراہیم کو ملا تو وہ چراغ باہو گیا اور یحییٰ کی وصی کا جواب دینے خود گھر سے باہر نکل پڑا۔ یحییٰ کے آدمی سے کہا۔ "اے شخص! میں جانتا ہوں کہ تو یحییٰ کا ادنیٰ ملازم ہے اور میں اس کے جواب میں جو کچھ کہوں گا تو اس کو اسی طرح یحییٰ تک نہیں پہنچا سکے گا لیکن اگر تو مسلمان ہے تو میں خدا، اس کے رسول ﷺ اور خدا کے کلام کا واسطہ دے کر تجھ سے کہوں گا کہ میں جو کچھ کہوں اس کو حرف بہ حرف یحییٰ کے گوش گزار کر دے۔"

یحییٰ کا خادم سمجھا، شاید ابراہیم کا دماغی توازن بگڑ چکا ہے اور وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ گوگو انداز میں کہا۔ "میں خائف نہیں ہوں، استاد ابراہیم کے جواب کو کسی کٹر بیعت اردو بدل، کی پیشی کے بغیر آقا کے گوش گزار کر دیا جائے گا۔"

ابراہیم نے زمین سے ایک پتھر اٹھایا اور یحییٰ کے خادم کو دیتے ہوئے کہا۔ "یہ پتھر یحییٰ کے حوالے کر کے کہہ دینا کہ ابراہیم پتھر کی طرح جامد اور بے حس نہیں ہے۔ میں انسان ہوں، وقار شعار اور احسان شاکس۔ میں نے اپنے فن اور زندگی کو ہادی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اب وہ ہم میں موجود نہیں تو کیا ہوا، میں اس کا مداح اور غم گسار تو موجود ہوں۔ اب میں نہ تو کسی اور کو اپنا گانا سناؤں گا اور نہ کسی اور کے لیے حرا میر بجاؤں گا۔ میں ہندو بیوہ کی طرح زندگی بھر ہادی کا ماتم گسار رہوں گا۔"

یحییٰ کے خادم نے کہا۔ "استاد ابراہیم! ہنرمند جذباتی ہوتے ہیں اور جذباتی لوگوں کے فیصلے پائیدار نہیں ہوتے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں یہ جواب اپنے آقا تک نہ پہنچاؤں اور تم اچھی طرح سوچ سمجھ کر چند دن بعد کوئی معقول اور غیر جذباتی جواب دینے کے لائق ہو جاؤ۔"

ابراہیم نے بگڑ کر کہا۔ "او ماشاء برادر انسان، میں

بیشک یہی جواب دوں گا اس لیے فضول باتوں میں ہمارا اور اپنا وقت ضائع نہ کر۔"

خادم چلا گیا اور ابراہیم کا جواب یحییٰ کو پہنچا دیا۔ یحییٰ کو غصہ تو بہت آیا لیکن ضبط و تحمل سے کام لیا، بولا۔ "اچھا۔ اس مغرور، سرکش اور جذباتی سر پھرے کے پاس میں خود جاؤں گا کیونکہ خوش قسمتی مسلسل دستک دے رہی ہے اور استاد ابراہیم کے کانوں تک اس دستک کی آواز نہیں پہنچ رہی۔"

کئی دن بعد جب یحییٰ، ابراہیم کے پاس جانے والا تھا۔ ہارون رشید نے یحییٰ کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔ "یہ استاد ابراہیم کہاں رو پڑا ہو گیا؟ وہ ہمارے دربار میں ابھی تک نہیں پہنچا۔ اس کی کمی سے دربار سوتا ہو رہا ہے۔ اس کو بلوایے۔"

یحییٰ نے جواب دیا۔ "امیر المومنین! اس وقت میں اسی کے پاس جا رہا تھا۔ میں یہ کام کسی اور سے بھی لے سکتا تھا لیکن میں جانتا ہوں کہ ابراہیم ایک جذباتی اور زود رنج ہنرمند ہے۔ وہ کسی معمولی آدمی کو اپنے در پر دیکھ کر مشتعل ہو سکتا ہے۔"

ہارون رشید نے کہا۔ "یا ابی! واللہ آپ رعایت سے کام لے رہے ہیں ورنہ میں اس کو گدی سے پگڑ کر اٹھوا سکتا ہوں۔ وہ یحییٰ کی طرح ہاتھ پاؤں خلا میں ملاتا اور چمکا دڑکی طرح پگڑ پگڑاتا میرے دربار میں حاضر ہو سکتا ہے۔"

یحییٰ نے عرض کیا۔ "امیر المومنین! اس کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ ہادی کی نوازشات اور رعایات کے بھاری بوجھ نے اس کو بے بس اور مجبور کر رکھا ہے۔ اب ہماری نوازشیں اور مہربانیاں ہی اس کو حرکت میں لائیں گی۔ میری کوشش ہے کہ میں اس کو آپ کے روبرو ہنستا مسکراتا ہوا پیش کروں۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "یا ابی! آپ جو چاہے کریں، میں خاموش ہوا جاتا ہوں۔"

یحییٰ دربار سے چلا آیا۔ اس کے خیال میں اب ابراہیم کی دربار میں حاضری ضروری ہوگئی تھی۔ وہ اپنے قصر میں واپس آ گیا اور بڑی دیر تک ابراہیم کو راضی کرنے کی تدبیریں سوچتا رہا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ ہارون کے دل میں ابراہیم کے خلاف کدورت پائی جاتی ہے۔ وہ ہارون کی سرشت سے خوب واقف تھا، وہ جانتا تھا کہ ہارون اپنے مخالفین اور حاسدین کو اپنے ذہن اور حافضے میں کس طرح محفوظ رکھتا ہے اور موقع ملنے ہی ان سے کس طرح فتنہ

ہے۔ وہ ابراہیم کی سادہ لوحی اور بھولپن سے بھی اچھی طرح واقف تھا اور یہ نہیں چاہتا تھا کہ عظیم اور یکا یک روزگار ہنرمند کو مسل کر رکھ دیا جائے۔

تحمل کے کسی حصے سے سادہ آواز کی لہریں اٹھنے اور پھسلنے لگیں۔ یہ کہہ باکی آواز تھی۔ اس آواز نے یحییٰ کے جسم میں توانائی اور دماغ و دل میں برنائی پیدا کر دی، وہ مسکرا دیا۔ وہ آہستہ آہستہ کہہ باکی طرف چل دیا۔ کچھ دیر بعد کہہ با اس کو اپنے پیچھے کھڑا دیکھ کر گھبرا گئی۔ احراما کھڑی ہوگئی اور ہونٹ بھیج کر عرض کیا۔ "بغیر اطلاع تشریف آدمی کا شکر یہ۔ خوش آمدید! ارشاد میرے لیے کوئی حکم؟"

یحییٰ نے شوخی سے کہا۔ "کہہ با! میں پچاس سال کی عمر میں بھی تیری آواز اور شباب کی کہہ بائیت کا اثر محسوس کرتا رہتا ہوں۔ اس وقت بھی جب میرے کانوں میں تیری آواز کا کوند الپکا تو میں بے اختیار گھنچا چلا آیا۔ شاید کہہ بائیت اور مقناطیسیت لازم و ملزوم ہیں ورنہ میں بے اختیار اور غیر ارادی طور پر یہاں تیرے پاس کس طرح آ جاتا۔"

کہہ با اس پچاس سالہ عقید اور زمانہ شناس سے اپنی تعریف سن سن کر بھولی نہ سار ہی تھی۔ اس نے اپنے سر میں بندھے ہوئے سرخ رومال کو کھول کر ہاتھ میں لے لیا اور زلفوں کو جھٹکا دے کر پشت پر بکھیر دیا۔ خوشبو کا بھگکا ناک میں داخل ہوا اور دل و دماغ کو معطر کر گیا۔ کن اکھیوں سے یحییٰ کی طرف دیکھا، بولی۔ "اے وہ شخص، جس کو امیر المومنین یا ابی (اسے میرے باپ) کہہ کر مخاطب کرتے ہیں، آپ کی تعریف مجھ کو مغرور کیے دے رہی ہے۔ میں کیا تھی اور اب کیا ہوں۔ ایک ذرہ جو آپ کے طفیل روشناس ثابت و سیار ہوا۔"

یحییٰ نے اپنا سیدھا ہاتھ کہہ با کی طرف بڑھا دیا۔ کہہ با نے ہاتھ پکڑ لیا اور یحییٰ کی پشت کو احراما چوم لیا۔ یحییٰ نے کہہ با کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ "کہہ با! کیا تو جانتی ہے کہ میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں؟"

کہہ با نے جواب دیا۔ "نہیں تو میرے آقا! اسے کش میں محض غیب سے آشا ہوتی۔"

یحییٰ نے کہا۔ "کہہ با! تجھ کو ایک بار پھر ابراہیم کے پاس جانا ہے۔ وہ ہر دماغ کو تو جواپنے ہنرمند بناتا ہے، ہادی نے غم میں ہندو بیوہ کی طرح، قہر گسار ہے۔ امیر المومنین اس کو اپنے دربار میں دیکھنا چاہتے تھے۔ دربار تک پہنچ دینا میری ذمہ داری اور فرض میں داخل ہے لیکن میں یہ کام تیری مدد اور اعانت کے بغیر نہیں انجام دے سکتا۔"

کہر بانے کہا۔ ”برکی آقا! میں دوسروں کی بہ نسبت اسے زیادہ جھٹکتی ہوں۔ قسمت کی برہمنگی اور حالات کی موافقت نے اسے چڑچڑا اور ضدی کر دیا ہے۔ اسے امیر المومنین کے لیے رضامند کرنا آسان کام نہیں ہے اور یہ کام اگر ممکن بھی ہوا تو دو چار بار کی کوشش سے ہرگز نہ ہوگا۔ بار بار اور مسلسل کوششوں کے بعد شاید ہو جائے۔“

یعنی نے جواب دیا۔ ”بہر حال کوشش تو کر کیونکہ تیری ہی کوششیں بار آور ہو سکتی ہیں۔“

کہر با سوچ میں ڈوب گئی، سر جھکائے سوچتی رہی۔ کچھ دیر بعد سر اٹھائے بغیر ہی بولی۔ ”میں کوشش کروں گی لیکن اس سے پہلے میں آپ سے ایک وعدہ لوں گی۔“

یعنی نے کہا۔ ”کوئی حرج نہیں اگر وعدہ نبھانا دشوار نہ ہوا تو میں وعدہ کر لوں گا۔“

کہر بانے عرض کیا۔ ”سچ بات تو یہ ہے کہ میں پہلے ہی بہت اکتا چکی ہوں۔ وہ مجھ سے عشق کرنے لگتا ہے اور مجھے وہ ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔ وہ گانے کے فن میں یکتا ہے میں اس کو ہنرمند ہونے کا احترام تو دے سکتی ہوں لیکن محبت نہیں کر سکتی۔ آپ آقا ہیں جو حکم دیں گے مان لوں گی لیکن آپ مجھ سے وعدہ کیجیے کہ آپ مجھ کو اس کے حوالے نہیں کر دیں گے۔“

یعنی نے نہایت پر رعب اور بھاری بھر کم لب و لہجہ اختیار کیا، بولا۔ ”کہر با! تو ابراہیم کے پاس جا اور اسے سمجھا دے کہ ہادی مرچکا، اب وہ واپس نہیں آئے گا۔ اس لیے مرے ہوئے کے سوگ میں شریف اور زندوں سے دور رہنا معقول بات نہیں۔ اس کو صاف صاف بتا دے کہ اگر امیر المومنین ضد کر لیں گے تو تجھے زبردستی بلوالیں گے۔“ اس کے بعد کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا پھر بولا۔ ”رہی یہ بات کہ میں تجھے ابراہیم کے حوالے کر دوں گا تو یہ احمقانہ اندیشہ ہے اور کچھ نہیں۔“

کہر بانے بے چون و چرا کہا۔ ”پھر آج ہی مجھے ابراہیم کے گھر پہنچا دیا جائے، میرا خیال ہے کہ میں ناکام واپس نہیں آؤں گی۔“

یعنی نے دو اونٹوں پر محاذ کسوا دیا۔ کہر بانے مشاطاؤں کی مدد سے سنگھار کیا۔ سر کے بالوں کو لال رومال سے چھپالیا اور قتالہ بن کر ابراہیم کے پاس چل دی۔ اس کے ساتھ دو کنیزیں بھی تھیں۔ ساربان دونوں اونٹوں کی مہار پکڑ کر آگے آگے چلنے لگا۔ محاذ کے دو موٹے موٹے بانس دونوں اونٹوں کی پشت پر نکے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ کہر با کے دل و دماغ پر ابراہیم مسلط تھا۔ معلوم نہیں کیوں وہ

ابراہیم سے بیزار تھی۔ اس نے محافے کے برابر، ساتھ ساتھ چند گداگروں کو بھاگتے اور بھیک مانگتے دیکھا۔ ان میں دو بوڑھے تھے اور ایک لڑکا تھا۔ یہ تینوں کہر با کے محافے کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے اور چند درہموں کا سوال کر رہے تھے۔ راہ گیر اس منظر کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ کہر بانے ساربان کو آواز دی۔ ”ساربان! اونٹوں کو روک دے۔“

ساربان نے گھبرا کر محاذ کو روک دیا اور محافے کے اٹھے ہوئے پردے کے نیچے کھڑے ہو کر پوچھا۔ ”آقا! برکی کی معزز خاتون! کوئی خاص بات؟“

کہر بانے تینوں گداگروں کو ساربان کی طرف آتے دیکھا۔ راہ گیر گھڑ سوار بھی سڑک کے کنارے، درختوں کے سائے میں اپنے اپنے گھوڑے روک کر سستانے لگے۔ وہ۔۔۔۔۔ کہر با ہی کو دیکھے جا رہے تھے۔ کہر بانے گداگروں کی طرف اشارہ کیا۔ ”ساربان! ان سے پوچھ یہ بھیک کیوں مانگ رہے ہیں؟“

کہر با کا سوال ساربان نے دہرا دیا۔ تینوں گداگر ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے پھر ایک بوڑھا گداگر آگے بڑھا اور کہا۔ ”رحم دل ساربان! اپنی مالکہ سے کہہ دے کہ ہم تینوں مسلمان نہیں ہیں جو تیرے سوال سے خوف زدہ ہو جائیں۔ ہم غیر مسلم ہیں اور بڑھاپے کی وجہ سے محنت مشقت نہیں کر سکتے، مجبوراً بھیک مانگ کر گزارہ کرتے ہیں۔“

کہر بانے کہا۔ ”ساربان! ان سے کہہ دو کہ وہ چند دن بعد مجھ سے میرے گھر پر ملیں۔ میں ان کی معاش کا مسئلہ مستقلاً حل کر دوں گی۔“ پھر اپنے پاس رکھی ہوئی تھیلی میں سے سو درہم نکالے اور ساربان سے کہا۔ ”انہیں یہ سو درہم دے دے تاکہ ان کا چند دنوں کا انتظام ہو جائے۔“

ساربان نے تینوں کو سو درہم دے کر اور کہر با کا پیغام پہنچا کر چلتا کر دیا۔ وہ دعا میں دیتے ہوئے چلے گئے۔ کہر با نے دیکھا کہ شوقین گھڑ سوار درختوں کے سائے میں اپنے اپنے گھوڑوں کی لگا میں پکڑے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی نظریں محافے کی چلمن پر گڑی تھیں۔ کہر بانے ساربان سے کہا۔ ”تو نے اور کچھ دیکھا؟“

ساربان نے سادہ لوحی سے جواب دیا۔ ”نہیں تو..... آپ نے کچھ دیکھا ہو تو بتائیے۔“

کہر بانے سواروں کی طرف دیکھے اور اشارہ کیے بغیر کہا۔ ”وہ سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے۔۔۔۔۔ گھڑ سوار مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ ان کو میری بابت بتا دے کہ میں کون ہوں اور کیاں ہوں اور میں کیا کچھ کر سکتی ہوں..... اور یہ بھی کہہ

دے کہ میں کہاں سے آ رہی ہوں اور کہاں جا رہی ہوں۔" ساربان سیدھا ان شوقیوں کے پاس چلا گیا۔ وہ ساربان کو دیکھ کر جھٹکے۔ ساربان نے کہا۔ "اے لوگو! کیا تمہارے دلوں اور دماغوں میں شیطان نے گھر کر لیا ہے؟ یہ تم کس کا چچا کر رہے ہو اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا کچھ جانتے ہو؟" ایک نوجوان نے جواب دیا۔ "ہم کسی کا چچا نہیں کر رہے۔ ہم نے بغداد کی اس شاہراہ پر ایک بے عابا چاند کو جو سفر دیکھا تو اس کی دید میں کھو گئے۔ ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہی نہیں کہ یہ کس آسمان کا چاند ہے، کہاں سے آ رہا ہے اور کہاں جا رہا ہے۔"

ساربان نے سختی سے کہا۔ "شیطان کے شاگردو! یہ امیر المومنین کے اتالیق، حکومت کے سیاہ و سفید کے ذمے دار اور خاندان برآک کے بزرگ یعنی بن خالد کی کنیز کبریا کی سواری ہے جو یک روز گرامفی ابراہیم موسلی کی خدمت میں کسی خاص کام سے جا رہی ہے۔ اگر تم چاہو تو تمہاری خاطر تواضع ہو سکتی ہے۔"

کبریا کے تفصیلی تعارف نے ان کے ہوش و حواس اڑا دیے اور وہ جگت میں گھوڑوں پر سوار ہو کر فرار ہو گئے۔ کبریا محاذ کے پردے سے ان کی بدحواسی دیکھ کر لطف اندوز ہو رہی تھی۔

تینوں کے چلے جانے کے بعد ساربان نے اونٹوں کی مہار پکڑی اور ابراہیم کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

دو اونٹوں پر کسا ہوا محاذ کبریا کو لیے ہوئے ابراہیم کے دروازے پر رک گیا۔ جب ابراہیم کو اطلاع ملی کہ محاذ نے کوئی معزز خاتون اس سے ملنے آئی ہے تو وہ خوش ہوا اور پریشان بھی۔ یہ سوچ کر خوش ہوا کہ ممکن ہے کوئی معزز خاتون اس سے فتنہ موسیقی سیکھنے آئی ہو اور اس اندیشے نے خوف زدہ بھی کر دیا کہ کہیں یہ فتنہ دربار خلافت سے نہ بھیجا گیا ہو جو بعد میں خطرناک رنگ لائے۔

کبریا کی ہم سفر کنیز محاذ سے نکل کر اندر چلی گئیں۔ ابراہیم انہیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور اہلا وسہلا مرحبا کہتا ہوا ان کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنے حافطے پر زور دیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ اس نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ کمرے میں غائب ہوا تھا۔ غائبی کے ایک طرف دباؤ کے پاس گاؤں تک دیکھا تھا۔ گاؤں تک کے پاس ادھر ادھر چند ساز گئے تھے۔

ابراہیم نے غائبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

کہا۔ "بغداد کی معزز خواتین! تشریف آوری کا شکر ہے۔ میں یہ نہیں جانتا کہ تم نے کس مقصد سے قدم رنج فرمایا ہے مگر ایک بات میں قیل از وقت ہی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر تم لوگ میرے پاس فتنہ موسیقی سیکھنے آئی ہو تو میں معذرت خواہ ہوں کیونکہ میں نے یہ مہر کر رکھا ہے کہ امیر المومنین ہادی کی وفات کے بعد میں یہ خود گاؤں گا اور نہ کسی کو سکھاؤں گا۔"

کبریا کی سامگی کنیزیں جھٹکیں، وہ غائبی سے دور ہی کھڑی رہیں۔ ایک نے کہا۔ "استاد ابراہیم! ہم نہ تو آپ کا گانا سننے آئے ہیں اور نہ ہی آپ سے فتنہ موسیقی سیکھنے آئے ہیں اور ہماری اس بات سے تو آپ اور زیادہ حیرت زدہ ہو جائیں گے کہ ہم آپ کے پاس نہیں آئے ہیں۔ آنے والا تو کوئی اور ہی ہے جس سے ابھی تک آپ کی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ ہم تو اس کے طفلی ہیں۔"

ابراہیم نے سوالیہ انداز میں جلدی جلدی چلکیں جبکہ انہیں پوچھا۔ "کیا مطلب؟ پھر وہ کہاں ہے جس کی تم سب طفلی ہو؟"

اس کنیز نے جواب دیا۔ "وہ باہر ہیں ابھی تک محاذ سے۔ یعنی برکی کی مشہور کنیز کبریا۔"

کبریا کا نام سننے ہی ابراہیم اپنے حواس میں نہیں رہا۔ اس نام میں ایک نشہ تھا، ایک کیف، سرور، لذت۔ بے اختیار پوچھا۔ "وہ کہاں ہے؟ کبریا کس کی کنیز۔ یعنی برکی کی؟ نہیں، وہ امیر المومنین ہادی کی کنیز تھی، میں اسے ابھی طرح جانتا ہوں، میں اس سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔"

اس کے بعد ابراہیم تیز تیز قدموں سے باہر پہنچا۔ اس وقت کبریا محاذ سے غرنے سے جھانک رہی تھی۔ وہ اس وقت تک محاذ سے نہیں اترنا چاہتی تھی جب تک خود ابراہیم اس کی پیشوائی کو نہ پہنچ جاتا۔ ابراہیم نے کبریا کی جھک دیکھ لی، محاذ کے سامنے نہایت عقیدت و احترام سے جا کھڑا ہوا۔ کبریا اس کو دیکھتے ہی مسکراتے لگی۔ بدن کے موتیوں جیسے دانوں کی چمک اور مسکراتے ہوئے ہونٹوں کی محرک انگیزی نے ابراہیم کا کام تمام کر دیا۔ اس کو کچھ ہوش نہ تھا کہ وہ فتنی میں وہ کیسی عامیانہ حرکتیں کر رہا ہے۔ اس نے محاذ کے پردے کے قریب کھڑے ہو کر کہا۔ "کبریا! تو مجھ سے قسم لے لے جو مجھے تیری آمد کی خبر ملی ہو اور میں نے تجھے زحمت انکار دی ہو۔ مجھے تیری آمد کی خبر ابھی ملی ہے۔"

کبریا نے لگاؤ کی بات کی۔ "استاد ابراہیم! میں تو یہ کچھ نہیں مانتی کہ آپ نے مجھ کو بھلا دیا ہے۔"

ابراہیم نے جلدی جلدی کہا۔ "یہ کیسی بات کر رہی

رہو یہ شاہی

ہے تو۔۔۔ میں اور تجھے بھلاؤں، یہ کس طرح ممکن ہے۔" کبریا نے کہا۔ "استاد ابراہیم! آپ نے تو مجھے یاد بھی نہیں کیا میں ہی تو آپ کو یاد کرتی ہوئی یہاں تک آ گئی۔"

ابراہیم نے مسکرتے آواز میں کہا۔ "کبریا! اچھی بات تو یہ ہے کہ امیر المومنین کی ناگہانی اور بے وقت رحلت نے تجھے بے حد غمزدہ کر دیا تھا۔ اس وقت بھی میرا دل اپنے مسکن کے غم میں پارہ پارہ ہو رہا ہے لیکن اس سے باوجود میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر تجھے یہ یقین دہا رہا ہوں کہ تو اس میرے پارہ پارہ دل کے ہر ٹکڑے میں موجود تھی۔ میں جب بھی آنکھیں بند کرتا تھا تو اپنے سامنے کھڑا ہوا دیکھتا۔ سارے دکھ، جملہ مصائب اور تمام مصیبتیں بھی تیرے خیال اور تیری محبت کو میرے دل سے دور نہ کر سکے۔"

کبریا نے مسکراتے ہوئے شرم کر کہا۔ "یہ ساری نہ دیکھے کی باتیں ہیں۔ اگر مجھ کو واقعی چاہتے ہیں تو بتائیے کہ میں آپ سے جو کہوں گی آپ ان جاؤں گے؟" ابراہیم نے جواب دیا۔ "بالکل مانوں گا، فوراً مانوں گا۔ کہہ کر تو دیکھ۔"

کبریا نے شوقی سے کہا۔ "دیکھیے ایک بار پھر سوچ لیجیے۔" ابراہیم نے پر جوش لہجے میں جواب دیا۔ "میں نے خوب اچھی طرح سوچ لیا ہے، سوچنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا۔"

کبریا نے کہا۔ "تب پھر آپ مجھ سے یہ پوچھیے کہ میں آپ کے پاس اس وقت کیوں آئی ہوں؟"

ابراہیم نے جواب دیا۔ "تجھ کو میری محبت سمجھ لائی ہے۔ میرا جذبہ صادق تجھے میرے پاس لے آیا ہے۔ میرا ہنر، میرا فن تجھ کو میرے پاس لے آیا ہے۔"

کبریا نے کہا۔ "شاید یہ بات بھی ہو لیکن میں آپ کے پاس اور ہی مقصد لے کر آئی ہوں۔"

ابراہیم نے کہا۔ "اگر یہ بات نہیں ہے تو بتا کہ تو میرے پاس کیوں آئی ہے؟"

کبریا نے جواب دیا۔ "میں یہ کہنے آئی ہوں کہ جو مر گیا وہ گیا۔ اس کا غم کرنا فضول ہے کیونکہ وہ واپس آنے سے رہا۔ جو موجود ہے اس کی مدد کرنی چاہیے اور اس کے لیے دعا گو رہنا چاہیے تاکہ وہ مدتوں زندہ رہے اور ہم اس کی نوازشوں کی بارش سے فیض یاب ہوتے رہیں۔"

ابراہیم نے کہا۔ "اچھا کبریا! کھڑے کھڑے بہت باتیں کر لیں۔ اب تو محاذ سے باہر آ تاکہ اندر چل کر باتیں کر سکیں۔"

کبریا نے جواب دیا۔ "میں اندر نہیں جاؤں گی اگر

آپ ہادی بھولیں گے امیر المومنین ہارون رشید کے دربار سے واپس اختیار کر لیں گے تو میں اندر چلی چلوں گی ورنہ جینک سے چلی جاؤں گی۔"

ابراہیم کچھ دیر کے لیے موقوفہ الدماغ ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کبریا کیا کہہ رہی ہے۔ جب ذرا ہوش میں آیا تو پوچھا۔ "کبریا! ایک بات تو بتا؟"

ابراہیم نے کہا۔ "ابھی تیری ساتھی خواتین نے مجھے بتایا کہ تو بھکی کی کنیز ہے، کیا یہ درست ہے؟"

کبریا نے جواب دیا۔ "ہاں، یہ درست ہے۔ یعنی برکی میرا آقا ہے۔ وہی بھکی برکی جو خالد کا بیٹا اور امیر المومنین ہارون رشید کا اتالیق ہے اور جو امیر المومنین کی ماں خیران کا سب سے زیادہ مستند علیہ ہے۔"

کبریا کی ایک ایک بات، ایک ایک لفظ سے ابراہیم کے دل پر چوٹ لگ رہی تھی۔ اس وقت کبریا کا جو روپ اس کے سامنے آ رہا تھا اس نے ابراہیم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے کہا۔ "تو بھکی برکی کی کنیز ہے، حالانکہ میں تجھے ابھی تک مرحوم امیر المومنین کی کنیز سمجھتا رہا ہوں۔ مجھے دھوکا ہوا، سخت دھوکا۔"

کبریا نے کہا۔ "اب ان باتوں میں کیا رکھا ہے، میرے ساتھ چلے تاکہ میں اپنے آقا یعنی برکی اور ان کے ذریعے امیر المومنین کے دل میں پائی جانے والی بدگمانیوں کو دور کر دوں۔ وہ آپ کو اپنے دربار میں وہی مقام دینا چاہتے ہیں جو چند دن پہلے آپ کو حاصل تھا۔"

ابراہیم ایک دم بھگ گیا تھا۔ اس کے اندر کا دکھ سیای بن کر پورے چہرے پر نمودار ہو چکا تھا۔ اس نے بڑی حسرت اور شامی نظروں سے کبریا کو دیکھا اور کہنے لگا۔ "کبریا! افسوس کہ میں نے آج سے پہلے تیرا کردہ چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ میں مرحوم امیر المومنین ہادی کی اچانک اور غیر متوقع موت کے بارے میں سوچتا رہا تھا اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا لیکن آج جب مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوئے کہ تو بھکی برکی کی کنیز ہے اور بھکی برکی خیران کا مستند علیہ ہے۔۔۔ اور جس رات امیر المومنین ہادی نے اس دنیا سے کوچ فرمایا، تو اور خیران قعر انیس ہی میں موجود تھیں تو ساری باتیں اچانک سمجھ میں آ گئیں۔ اب میں سب کچھ سمجھ چکا ہوں۔"

کبریا نے اس کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ "اب ان فضول باتوں پر غور کرنے سے آپ کو کیا ملے گا؟ ہادی ایک بددیانت اور اپنی ماں کا نافرمان بیٹا تھا جو اس کی بددعا

کر رہے ہو۔
یعنی نے جواب دیا۔ "امیر المومنین بجا فرماری ہیں میں امیر معاویہ کا ہم خیال ہوں وہ کہا کرتے تھے کہ جہاں کوڑے سے کام چل سکتا ہو وہاں کمزور کو کام میں نہیں لانا چاہیے۔ اس طرح جہاں باتوں سے کام لیں رہا ہو وہاں کوڑے سے استعمال سے بچنا چاہیے۔"

ہارون نے ماں کی طرف دیکھا اور یحییٰ سے کہا۔
"بہر حال میں اپنی اہانت مزید نہیں برداشت کر سکتا۔ ابراہیم اپنی اماں کی تسکین کی خاطر میری اماں کو اذیت پہنچا رہا ہے۔ اس لیے میں حکم دیتا ہوں کہ کل ابراہیم کو دربار میں حاضر کیا جائے۔ میں اس سے خود بات کر لوں گا۔" اس کے بعد اس نے ایک بار پھر خیزران کی طرف دیکھا اور اپنے فرمان کی تصدیق یاتائید چاہی۔

خیزران نے کہا۔ "بالکل درست۔ کل ابراہیم کو دربار میں جبراً بلوایا جائے اور اس کو اپنے طرز عمل کی تبدیلی پر مجبور کر دیا جائے۔"

یحییٰ نے جواب دیا۔ "بہتر ہے کل ابراہیم کو جبراً بلوایا جائے گا۔"

خیزران خوش ہو گئی اور ہارون سے کہا۔ "ہارون! جب تک تیری راہنمائی کے لیے یحییٰ موجود ہے تجھ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔" پھر یحییٰ سے کہا۔ "اور یحییٰ تم ان لوگوں پر گہری نظر رکھو جو ابراہیم کی طرح اب بھی ہادی کا دم بھرتے ہیں اور مرحوم ہاشمی میں زندگی کی سانس لے رہے ہیں۔"

یحییٰ نے عرض کیا۔ "امیر المومنین، مجھ کو اپنی ذمہ داریوں کا کہیں زیادہ احساس ہے۔ ایسے تمام آدمی میری نظر میں ہیں جو دل سے امیر المومنین ہارون کے ساتھ نہیں ہیں مگر خوف سے تائید کر رہے ہیں۔ اسی طرح میں ان لوگوں سے بھی واقف ہوں جو درپردہ فساد کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ میں اپنے ہر قسم کے دشمنوں سے واقف ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ان سے کسی طرح نمٹنا جائے۔"

خیزران نے ہارون سے کہا۔ "تو نے ہم دونوں کی باتیں سن لیں، اب یہ بتا کہ ہمیں اور کیا کرنا چاہیے تاکہ اس کا بھی انتظام کر لیا جائے۔"

ہارون نے یحییٰ سے کہا۔ "یا ابی! مادر محترم کی باتوں کا میں کیا جواب دوں؟ آپ ہی جواب دے دیجیے۔"

یحییٰ نے جواب دیا۔ "میں نے کہہ تو دیا کہ امیر المومنین کی ذمہ داریاں میں اپنی ذمہ داریاں سمجھتا ہوں اور ان سے بہر قیمت عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتا ہوں اور

بے خبری میں، میں آپ کا احترام بجالانے سے قاصر رہا۔ معذرت خواہ ہوں۔"

خیزران آگے بڑھ کر ایک مرصع چوکی پر بیٹھ گئی۔ یہ کمرے میں بچھے ہوئے دوسرے تختوں اور چھوٹی چھوٹی چوکیوں کے مقابلے میں زیادہ اونچی تھی اور اس پر بچھا ہوا غالیچہ نسبتاً زیادہ قیمتی تھا۔ خیزران نے ہارون کو اپنے برابر ہی بٹھالیا اور یحییٰ کو اپنے سامنے والی چوکی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

کنیزیں خیزران کے پیچھے کھڑی ہو گئیں۔ خیزران نے ریشمی گاؤں کے پردہ اپنی کبھی نکادی اور پھلتی پر شوڑی رکھ لی، یحییٰ سے پوچھا۔

"ہاں تو یحییٰ! ابراہیم موصی کا کیا حال ہے؟ وہ ابھی تک دربار کیوں نہیں آیا؟"

یحییٰ نے ایک بار پھر یہی کوشش کی کہ ابراہیم، خیزران یا ہارون کے عتاب سے محفوظ رہے۔ جواب دیا۔
"ملکہ عالیہ! میں نے کئی دن ہوئے جب کہہ رکھا کہ اس کے پاس بھیجا تھا اور اس کو خبردار کر دیا تھا کہ وہ جلد از جلد دربار میں حاضر ہو جائے کیونکہ اس کی غیر حاضری کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا جا رہا ہے اور اس طرح ابراہیم کی وقاداری مستحقر قرار پا گئی ہے۔"

خیزران نے پوچھا۔ "پھر اس نے کیا جواب دیا؟"

یحییٰ نے عرض کیا۔ "یہی بات تو یہ ہے کہ ابراہیم ابھی تک ہادی کی فیاضیوں اور نوازشوں کو یاد کر کے آنسو بہا رہا ہے اور معلوم نہیں کیوں اس کے دل میں یہ بات چبھ گئی ہے کہ ہادی کے ساتھ ہی فیاضی اور سخاوت بھی رخصت ہو گئی ہے۔"

خیزران نے سختی سے کہا۔ "ابراہیم باقی ہے۔ اگر وہ بخوشی نہیں آتا تو اسے جبراً بلوایا جائے۔ اس کو ہارون کے پاس آ جانا چاہیے۔ کم از کم میں ان کو تابیوں اور غلطیوں کو نہیں برداشت کر سکتی۔"

یحییٰ نے ابراہیم کی وکالت کی۔ "امیر المومنین! میرا خیال ہے ابراہیم کی ہادی سے اس درجہ شینگی اور وقاداری بڑی اچھی بات ہے۔ انسان کو اپنے محسنوں کا شکر گزار ہونا ہی چاہیے۔ اگر ہم ابراہیم کو دربار تک لانے میں کامیاب ہو گئے اور ہم نے اپنی داد و بخش سے ابراہیم پر یہ ثابت کر دیا کہ ابھی سخاوت اور جو دو سخا زندہ ہیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ امیر المومنین ہارون کا بھی اسی قدر مداح اور پرستار ہو جائے گا جتنا ہادی کا محسوس ہو رہا ہے۔"

خیزران نے کہا۔ "یحییٰ! تم ابراہیم کی طرف داری کر رہے ہو اور اس کو ہمارے عتاب سے بچانے کی کوشش

قدم دور بھی نہیں جاسکتا۔"

خیزران کو یہ بات بالکل ناپسند تھی کہ کوئی اس کی مرضی پر نہ چلے یا اس سے اختلاف رکھے۔ وہ ابراہیم سے بہت برہم تھی جو ہادی کا اب بھی قصیدہ خواں تھا اور اس کے جیبے پہنے ہارون سے متنفر اور گریزاں تھا۔ وہ یحییٰ برکی کی منتظر تھی۔ یحییٰ برکی ہر روز شام کو مغرب کے بعد خیزران کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا اور اہم معاملات میں اس کے مشورے اور رائے لیا کرتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی کام خیزران کی مرضی اور خواہش کے خلاف انجام پائے کیونکہ خیزران ایک عورت نہیں بلکہ ایک طاقت کا نام تھا۔ ایک ایسی اثر انگیز طاقت جس کو نظر انداز کر دینے کے خطرناک نتائج یقینی تھے اور ہادی اس کی سزا بھگت چکا تھا۔ مغرب کے بعد خیزران نے یحییٰ برکی کو قصرِ خلہ میں طلب کیا، یہیں ہارون کو بلا لیا۔ محل کا الف لیلوٰی ماحول بڑا سحر انگیز تھا۔ ہلکی ہلکی روشنی اور دھیمی دھیمی موسیقی کی لہروں سے محل کی فضا طبعی ہو گئی تھی۔ یحییٰ برکی کو ملاقاتیوں کے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ دیواروں کے حاشیے طلائی پھولوں کے علاوہ نقش و نگار سے آراستہ تھے اور ان کی مینا کاری میں بڑی مہارت اور ہنرمندی سے کام لیا گیا تھا۔ دیواروں کی سطح پر جگہ جگہ مختلف پرندوں کی شبیہیں بنی ہوئی تھیں جو فضا میں بوجہ پرواز تھیں۔ یہاں ایک بڑی سی تصویر ایسی بھی تھی جس میں ایک شیر کے سر پر عتاب کو اس طرح چبھتا ہوا دکھایا گیا تھا کہ اس کے دونوں خونخوار پنچے شیر کی آنکھوں میں ہیست ہو گئے تھے۔ اس شیر کی آنکھوں سے تازہ تازہ خون بہہ رہا تھا اور عتاب اس کے سر پر سوار غضب ناک نظروں سے شیر کو گھور رہا تھا۔

یحییٰ کو یہ منظر بہت اچھا لگا۔ وہ اس میں گم ہو گیا۔ وہ معصوم کے کمال فن کا قائل ہو گیا۔ یحییٰ کے کمرے میں خیزران کب داخل ہوئی اور خیزران کے داہنی طرف ہارون کب آکھڑا ہوا، اس کو کچھ پتا نہ تھا۔ دونوں یحییٰ کی محویت پر مسکرانے لگے۔ ان دونوں کے پیچھے کنیزیں کھڑی تھیں اور وہ بھی مسکرا رہی تھیں۔

آخر ہارون آگے بڑھا اور ٹھنکھار کر یحییٰ کو مخاطب کیا۔ "یا ابی! آپ کس خیال میں تھو ہیں؟"

یحییٰ چونک پڑا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سامنے خیزران، ہارون اور کنیزوں کو دیکھ کر پہ جھٹکھڑا ہو گیا اور خیزران سے عرض کیا۔

"آنسوؤں کے میں آپ کی تشریف سے بے خبر رہا۔ اس

سکراہٹ اور شباب کے شفق زاروں میں کھویا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اس وقت جو مناظر بند آنکھوں کے سامنے تھے ان کے نشے نے اس کو خیالوں کی راہ سے خوابوں میں پہنچا دیا۔ وہ خراٹے لینے لگا۔

کھریا نے جب یحییٰ کو اپنی ناکامی کی خبر دی تو وہ بہت جربز ہوا۔ ناکامی اور مایوسی اس کی چڑھی ہوئی۔ "کھریا! تو نے جھٹ سے کام لیا حالانکہ اگر تو دس پندرہ دن اس کے کمرے میں رہ جاتی تو شاید وہ راضی ہو جاتا اور تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی۔"

کھریا نے جواب دیا۔ "میرے آقا! آپ کو خدا نے جو سمجھ دی ہے اور جس اوراک اور فہم سے آپ کو ایک زمانے پر فوقیت اور برتری بخش رکھی ہے، اس کی مدد سے آپ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ابراہیم نری اور محبت سے قابو میں نہیں آئے گا۔ اس پر سختی کی ضرورت ہے کیونکہ میں نے اس کو اس حال میں دیکھا ہے کہ وہ فحشی فحش کی سانس لیتا رہتا ہے اور مرحوم ہادی کی شان میں قصیدے پڑھتا رہتا ہے۔ وہ معلوم نہیں کیوں ہادی کو اس عہد کا سب سے بڑا منحیر اور صاحبِ جود سمجھتا ہے۔"

یحییٰ چپ ہو گیا اور کھریا کے مشورے کو گروہ میں بانٹ لیا لیکن وہ اب بھی نہیں چاہتا تھا کہ ابراہیم کسی مصیبت کا شکار ہو جائے۔ اس نے اس مسئلے کو دبا دینے کا ارادہ کر لیا لیکن ہارون نے اس کو اپنی اماں کا مسئلہ بنالیا۔ وہ کئی دن تک خاموش رہا اور یحییٰ سے ابراہیم کی بابت کوئی بات نہ کی۔ اس کی ماں خیزران بھی ابراہیم سے خوش نہیں تھی۔ اس کو جب محل کی کنیزوں سے کسی طرح یہ بات معلوم ہوئی کہ ابراہیم اب بھی ہادی کا دم بھرتا رہا ہے اور ہارون سے نفرت کرتا ہے تو اس کو سخت ہنسا آیا اس نے ہارون کو حکم دیا کہ ابراہیم اگر فحشی خوشی دربار نہیں آتا تو جبراً بلوایا جائے۔

ہارون نے جواب دیا۔ "مادر محترم! میں اپنے بزرگ اتالیق یحییٰ کی وجہ سے خاموش ہوں کیونکہ ابراہیم کا سلسلہ انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور اس کو دربار میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر وہ اس میں ناکام ہو گئے تو پھر جبراً طاقت کا حربہ اختیار کیا جائے گا۔"

خیزران نے کہا۔ "اور اس دوران اگر وہ فرار ہو گیا تو؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "میں مادر محترم اور فرار نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے آس پاس پہرے بٹھا دیے گئے ہیں اور اس کی سخت نگرانی کی جا رہی ہے۔ وہ اپنے کمرے سے دس

ایسا ہمیشہ ہوتا رہے گا۔"

خیزران نے کہا۔ "بہر حال کل ابراہیم کو زبردستی بلوایا سب سے اہم ہے، میں اس سے خود بات کروں گی۔ وہ یا تو ہمارا مطیع و فرمانبردار ہو کر دربار سے واپس جائے گا یا پھر زندان کی سلاخوں کے پیچھے چلا جائے گا۔"

یعنی نے آہستہ سے کہا۔ "کوتیوں اور سطریوں سے امیر المومنین کا گفتگو فرماتا، ابھی بات نہیں ہے۔ یہ کام تو مجھ کو کرنے دیجیے۔ لوگ آپ کو ایک سطر سے جو گفتگو دیکھ کر چیخیں گئیں گی۔"

خیزران، یعنی کی باتوں سے خوش ہو گئی، بولی۔ "میں نے ہارون کے لیے تیرا انتخاب کر کے غلطی نہیں کی۔"

اس رات خیزران نے یعنی کو کھانے میں بھی شریک کیا۔ ہارون کھانے کے دوران بار بار اس پر زور دیتا رہا کہ مخالفین خلافت ہارون کا جلد از جلد خاتمہ کر دیا جائے اور یعنی اثبات اور تائید میں گردن ہلاتا رہا۔ کافی رات گئے یعنی قصر غلدے سے اپنے محل کے لیے روانہ ہوا تو اس کو خاصی پریشانی لاحق تھی۔ اسے ابراہیم سے ہمدردی تھی کیونکہ ابراہیم اس کی طرح بھی تھا۔ وہ ابراہیم کو بچانے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔

اپنے قصر میں داخل ہونے کے بعد اس نے اپنے بیٹے فضل کو طلب کیا اور اس سے مشورہ طلب کیا۔ فضل نے صاف صاف کہہ دیا کہ ابراہیم کا مسئلہ امیر المومنین کی انا سے تعلق رکھتا ہے اور خیزران بھی اس کو اسی نقطہ نظر سے دیکھتی ہے۔ اس لیے ابراہیم کو راضی کر کے امیر المومنین کے دربار میں پیش کر دینا چاہیے۔

پوری رات پریشانی میں گزرنی کو کہ یہ یعنی کا مسئلہ نہیں تھا مگر یعنی اسے اپنا مسئلہ سمجھ رہا تھا۔

کہہ رہا اپنے آقا کو بار بار یعنی باور کروا رہی تھی کہ ابراہیم، ہارون کے دربار میں نہیں آئے گا۔ یعنی سختی سے کہتا کہ وہ آئے گا کیوں نہیں۔ امیر المومنین کی انا کا مسئلہ ہے اس کی بہتری اسی میں ہے کہ ماضی کو بھلا کر حال سے تعلقات بحال کر لے۔

علی الصباح دوسرا ہی ابراہیم کے گھر پہنچ گئے اور اس کو یعنی کا یہ فرمان سنایا کہ وہ جس حال میں ہے، اسی میں قصر الطین چلا جائے۔ ابراہیم نے اپنے بیٹے اسحاق کو ساتھ لیا اور یعنی کے پاس پہنچ گیا۔ یعنی کا خیال تھا ابراہیم کسی مجرم کی طرح سر جھکا کر بیٹھ جائے گا اور آٹھویں ملاک بات نہیں کر سکے گا لیکن وہ اکڑا ہوا سینہ تان کر قصر الطین میں داخل ہوا اور یعنی سے آنکھیں ملا کر پوچھا۔ "اے برکتی سردار! تو

مجھے خواہ مخواہ کیوں تنگ کر رہا ہے؟"

یعنی اس کی جرأت سے بڑا متاثر ہوا، جواب دیا۔ "اور میں تجھ سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ آخر تو اپنی اور اپنے گھنے کی دشمنی پر کیوں آمادہ ہو گیا ہے؟"

ابراہیم نے کہا۔ "امیر المومنین اور میرا کوئی مقابلہ نہیں۔ وہ ایک اشارے میں مجھ کو بلا کر ختم کر دیا کرتے ہیں لیکن میں مجبور ہوں۔ میں مرجانا پسند کروں گا مگر امیر المومنین کی ملازمت نہیں کروں گا۔"

یعنی اچھل پڑا۔ "آخر کیوں، کیوں؟ یہ امیر المومنین کی انا کا مسئلہ ہے۔ تو یہ کیوں نہیں سوچتا کہ تیری ضد اور عاقبت نااندیشی سے تیرا خاندان تباہ و برباد ہو جائے گا۔"

ابراہیم نے جواب دیا۔ "میں خدا خواست امیر المومنین سے نفرت نہیں کرتا۔ میں اپنے بیٹے اسحاق کو امیر المومنین کی خدمت کے لیے تیار کر رہا ہوں۔" اس کے بعد اسحاق کو یعنی کے سامنے کھڑا کر دیا۔ "میرا یہ فرزند اتنا ذہین اور ہوشیار ہے کہ اس وقت بھی اس کا مقابلہ کرنے والا دور دور تک نہیں ملے گا اور اس کے لیے میرا یہ آخری اور قطعی فیصلہ ہے کہ ہمیشہ امیر المومنین ہی کی خدمت کرتا رہے گا۔"

یعنی نے اسحاق کی طرف دیکھا اور ابراہیم کی باتوں سے اس نتیجے پر پہنچا کہ شاید وہ کسی حد تک نرم پڑ گیا ہے اور آخر کار یہ خود بھی ہارون کے دربار کی ملازمت پر آمادہ ہو جائے گا۔ اس نے اسحاق سے پوچھا۔ "کیا تجھے رائیوں کا علم آتا ہے؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "بالکل آتا ہے، حکم ہو تو سناؤں؟"

یعنی نے کہا۔ "ستا۔"

اسحاق نے اپنے باپ کی طرف دیکھا، ابراہیم نے کہا۔ "ستا، میں نے اجازت دی۔"

اسحاق نے گانا شروع کیا۔ اس کی دھن میں نری تھی، بلا کی نری۔ ملائم آواز میں اشعار کا سوز یعنی کے دل میں آگ لگا چکے تھے کوہ وجد میں آ گیا۔ یعنی مست و بے خود دنیا و مافیہا سے غافل اسحاق کی آواز، اس کے زیر و بم اور دھن و فغاں میں ڈوب گیا۔ ابراہیم کا سر سفر سے تن گیا۔ کچھ دیر بعد جب اسحاق کا ختم کر چکا تو یعنی نے کہا۔ "ابراہیم! جب یہ اس عمر میں اتنا بڑا مفتی ہے تو آگے چل کر کیا بنے گا، میری تو عقل حیران ہے۔"

"میں نے اسے امیر المومنین کی خدمت کے لیے تیار کیا ہے۔"

رموزِ شاہی

یعنی نے کہا۔ "ممکن ہے امیر المومنین اس سے راضی ہو جائیں اور تیری گستاخی کو معاف کر دیں۔"

ابراہیم نے عرض کیا۔ "اور یہ اس صورت میں ممکن ہے جب آپ بھی ہماری سفارش فرمادیں۔"

یعنی سوچ میں پڑ گیا، کچھ دیر چپ رہا پھر بولا۔ "لیکن تو خود امیر المومنین کے دربار سے کیوں وابستہ نہیں ہو جاتا؟"

ابراہیم نے جواب دیا۔ "آپ مجھ کو امیر المومنین کے پاس لے چلے مجھے جو کچھ عرض کرتا ہے، ان کے سامنے عرض کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ میں انہیں مطمئن کر دوں گا۔"

یعنی نے کہا۔ "تجھے آج امیر المومنین کے دربار میں حاضری تو دینا ہی پڑے گی۔ میں نہیں سمجھتا کہ تو کسی طرح امیر المومنین کو راضی کر پائے گا کیونکہ میں صاف محسوس کر رہا ہوں کہ امیر المومنین نے تیرے مسئلے کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا ہے۔ وہ تیری کیا بات سے بھی راضی نہ ہوں گے۔"

ابراہیم نے آزدی سے کہا۔ "اگر وہ مجھ سے راضی نہ ہوں گے تو یہ میری قسمت۔ پتا نہیں، امیر المومنین کی برہمی کیا رنگ لائے گی۔"

پردے کے پیچھے کہہ رہا موجود تھی۔ اسحاق کے لہجے نے اس کو بے حد متاثر کیا لیکن وہ یعنی کی اجازت کے بغیر اندر نہیں آ سکتی تھی۔

ابراہیم معلوم نہیں کس طرح کہہ رہا کی بوجھوں کر رہا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ یعنی نے پوچھا۔ "یہ تو کس کو تلاش کر رہا ہے؟"

ابراہیم نے جواب دیا۔ "برکتی بزرگ! آپ کی وہ کنیز کہاں چلی گئی جو چند دن پہلے مجھے بلانے گئی تھی۔"

یعنی نے کہا۔ "ابراہیم! ان فضول باتوں سے کیا حاصل۔ افسوس کہ تو ابھی تک اس خطرے اور نقصان کا اندازہ از خود نہیں کر سکا جس میں تو گھرا ہوا ہے اور جس سے تو محتر بیدار ہو چار ہونے والا ہے۔ اگر تجھے اپنی بد بختی کا ذرہ بھر بھی احساس ہوتا تو اس وقت کہہ رہا یا نہ کرتا۔"

کہہ رہا خود بھی سامنے آنے کے لیے بے چین تھی، اس نے پردے کے پیچھے سے گنگنا شروع کر دیا۔ ابراہیم۔۔۔ بے چین ہو گیا اور اسحاق کے کان کھڑے ہو گئے۔ یعنی اٹھ کر اندر چلا گیا اور کہہ رہا کو ڈانٹ دیا۔ "یہ بے وقت کی راکنی بند کر۔ کیا تو ابراہیم کو پسند کرتی ہے؟"

کہہ رہا چپ ہو گئی اور آہستہ سے جواب دیا۔ "نہیں، میں ابراہیم کو ذرا بھی پسند نہیں کرتی۔"

یعنی نے پوچھا۔ "پھر یہ گنگناہٹ کس کے لیے تھی؟"

کہہ رہا نے جواب دیا۔ "ابراہیم کے بیٹے نو عمر مفتی اسحاق کے لیے۔"

یعنی فحش دیا۔ "تو یہ بات ہے۔ وہی تو میں کہوں کہ جب تو ابراہیم کو پسند ہی نہیں کرتی تو یہ گنگناہٹ کس کے لیے تھی۔"

کہہ رہا نے عرض کیا۔ "میرے آقا! میں نے اسحاق کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اس کے گھر میں اس کے ساتھ رہ چکی ہوں لیکن میں یہ کبھی بھی نہ جان سکی کہ اسحاق کے اندر اتنا بڑا ہنرمند، مفتی مہیا ہوا ہے۔"

یعنی نے پوچھا۔ "تو تجھے بھی اسحاق پسند آیا؟"

کہہ رہا نے جواب دیا۔ "بے حد پسند آیا۔ اسے کاش یہ راز پہلے محل چکا ہوتا میرے آقا! کیا آپ اسحاق کو دوبارہ بلوایا کرتے ہیں یہاں؟"

یعنی مسکراتے لگا۔ "ویسے میں نے ابھی ابھی یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسحاق کو ملازم رکھ لوں۔ میں جانتا ہوں کہ ابراہیم پر امیر المومنین کا بھیا تک عتاب نازل ہونے والا ہے۔ ان نازک اوقات میں اسحاق اپنے کنبے کی کفالت تو کر سکے گا۔"

اسی وقت یعنی کو ایک کنیز نے مطلع کیا کہ قصر خلافت کے چند ہرکارے ابراہیم کو تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آچکے ہیں۔

یعنی کہہ رہا کو چھوڑ کر ابراہیم کے پاس پہنچا اور اعلان کیا۔ "ابراہیم! امیر المومنین کی چلی کا فرمان آچکا ہے۔ دربار چلنے کے لیے کھڑا ہو جا اور دورانِ سفر اپنے معاملے پر اچھی طرح غور کر لے۔"

باہر خلافت کے ہرکارے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ مختصر سا قافلہ قصر الطین سے قصر غلدے کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں جو بھی ملا، یعنی کو دیکھ کر احراما سلام کرتا گزر گیا۔ حاجت مندوں نے راستے میں روک روک کر یعنی کے روبرو اپنے معروضات پیش کیے اور خاطر خواہ عنایات حاصل کر کے اپنی راہ ہو لیے۔ ابراہیم اور اسحاق، یعنی کی اقبال مندی اور اختیارات دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ یہ لوگ قصر غلدے کے قریب پہنچ گئے اور جامع مسجد بغداد کے مینار سے ابھی طرح نظر آنے لگے۔

قصر غلدے کے صدر دروازے پر یعنی کے سوا کبھی کو روک لیا گیا۔ یعنی اندر چلا گیا۔ وہاں ہارون رشید گئے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور اس کے سامنے چند خاص آدمی بیٹھے تھے۔ ہارون نے یعنی کو دیکھا تو تسکین کر بیٹھ گیا، بولا۔ "یا ابی! خبریت؟ آپ تنہا ہیں یا کوئی اور بھی ہے آپ کے ساتھ؟"

خبریت؟ آپ تنہا ہیں یا کوئی اور بھی ہے آپ کے ساتھ؟"

یعنی نے جواب دیا۔ "امیر المومنین! میرے ساتھ ابراہیم موصیٰ اور اس کا بیٹا اسحاق دونوں ہی آگئے ہیں۔ وہ صدر روزانہ سے پرکھنے کے اذن باریکی کے طلب گار ہیں۔" ہارون نے تجویز پر عمل ڈال کر پوچھا۔ "یہ اسحاق کیوں آگیا؟"

یعنی نے جواب دیا۔ "امیر المومنین! ابراہیم اس کو آپ کے لیے تیار کر رہا ہے اور میرا خیال ہے، وہ اس وقت بھی بہت بڑا مفتی ہے۔ اگر یہی حال رہا تو ایک دن میرا باپ پرست لے جائے گا۔"

ہارون نے پوچھا۔ "خود ابراہیم کیا کہتا ہے؟"

یعنی نے جواب دیا۔ "امیر المومنین! خود ہی معلوم فرمائیں، اس کی باتیں کم از کم میری سمجھ میں تو آتی نہیں۔ معلوم نہیں کیا کچھ بکرا رہا۔ میری سمجھ میں تو خاک نہیں آتا کہ وہ آخر چاہتا کیا ہے؟"

ہارون نے آہستہ آہستہ تین بارتالی بھائی کی آواز پر کئی خدمت گار ہارون کے قدموں میں آکھڑے ہوئے۔

ہارون نے حکم دیا۔ "دیکھو صدر روزانہ سے پر ایک چھوٹا سا قلعہ کھڑا ہے، انہیں عزت و احترام سے میرے پاس لے آؤ۔"

یعنی نے جلدی جلدی عرض کیا۔ "امیر المومنین! ابراہیم پر سختی نہ کی جائے تو بہتر ہے۔"

ہارون نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر بعد حاجب اس طرح حاضر خدمت ہوا کہ ہمیں پردے کے پیچھے ہارون چلا گیا تھا اور یعنی اور دوسرے امراء باریک پردوں کے سامنے کھڑے تھے۔

انہی میں خلافت کے خدمت گار ابراہیم اور اسحاق کو لیے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ ابراہیم نے عرض کیا۔۔۔

"امیر المومنین! غلام حاضر ہے۔ جو سزا چاہیں دے دیں، میں تیار ہوں۔"

ہارون نے پردے کے پیچھے سے... یعنی کو مخاطب کیا۔ "یا ابی! آپ ابراہیم سے میرے سامنے یہ معلوم فرمائیں کہ آخر کیا وجہ ہے جو ابراہیم ابھی تک میرے دربار سے وابستہ نہیں ہوا؟"

یعنی نے یہی سوال ابراہیم سے کر ڈالا۔ حاجب کے ذریعے پوچھا۔ "ابراہیم! امیر المومنین جاننا چاہتے ہیں کہ آخر وہ اب تک دربار سے دور کیوں ہے؟ کیا ابراہیم تاریک دنوں کی پیداوار ہے جو ہمیشہ درخشاں عہد سے راہ فرار اختیار کرتا رہا ہے۔"

ابراہیم نے دور ہی سے پوچھا۔ "برگئی سردار! کیا میں اپنی بات بڑھاپا کر دوں؟"

یعنی نے امیر المومنین کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "امیر المومنین! ابراہیم کو بولنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔"

ہارون نے حاجب کی طرف دیکھ کر اثبات میں گردن ہلا دی۔ حاجب نے یہ آواز بلند کیا۔ "ابراہیم مفتی کو امیر المومنین نے بولنے کی اجازت مرحمت فرمادی ہے، وہ بول سکتا ہے۔"

ابراہیم اپنی جگہ کھڑا ہو گیا اور پردے کے پیچھے موجود ہارون رشید کی جھلک دیکھ کر لرز گیا، بولا۔ "حاجب! امیر المومنین سے فرمادیجئے کہ میں بہت زیادہ پریشان ہو رہا ہوں اس لیے مجھے گھر جانے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔"

ہارون رشید نے حاجب سے کہا۔ "حاجب! اس سے کہہ دو کہ پہلے وہ ہمیں چند گانے سنا دے، اس کے بعد ہم سے پروا نہ تقرری وصول کر لے۔"

ابراہیم نے عرض کیا۔ "امیر المومنین! افسوس کہ میں نہ تو آپ کو کوئی گیت سنا سکوں گا اور نہ ہی اپنے لیے پروا نہ تقرری حاصل کروں گا۔"

"آخر کیوں... آخر ایسا کیوں؟" اس کے بعد ہارون چراغ پا ہو گیا، بولا۔ "ابراہیم سے کہہ دیا جائے کہ وہ میری سزا سے نہیں بچ سکے گا۔ آج وہ ہمیں گانے سنائے گا اور دربار کے لیے پروا نہ تقرری حاصل کرے گا یا پھر وہ قید خانے میں چلا جائے گا۔ جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ جیتے جی موت کے مزے چکھتا رہے گا۔"

دربار پر سناٹا طاری ہو گیا، ابراہیم کی روتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "امیر المومنین! رحم کیجیے۔"

ہارون رشید نے حاجب سے کہا۔ "اس کو بے سے کہہ دو کہ میں نے جو کہا تھا کہہ دیا۔ آخر وہ ہادی کو کب تک روتا رہے گا؟"

ابراہیم نے عرض کیا۔ "جب تک ہادی کے احسانات حافظے میں تازہ رہیں گے۔"

ہارون نے حاجب سے کہا۔ "اب ابراہیم اپنے گھر واپس نہیں جائے گا۔ کل میں رقبہ جارہا ہوں۔ یہ میرے ساتھ جائے گا۔ یہ بھی اور شاعر ابو العتبیہ بھی کیونکہ ابو العتبیہ بھی بھائی ہادی کا اتنا ہی مرثیہ خوان ہے جتنا یہ ابراہیم۔ اور میں نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ ان دونوں کو راہ راست پر لے آؤں۔"

یعنی نے پوچھا۔ "امیر المومنین! اسحاق کے لیے کیا حکم ہے؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "اس کو، اس کے گھر واپس بھیج دیا جائے۔"

ابراہیم حیران و پریشان ہر اس شخص کی صورت دیکھ رہا تھا جو وہاں موجود تھا لیکن ہر شخص نظریں چارہا تھا کیونکہ کوئی بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ ابراہیم سے نظریں ملا کر اپنے دل میں موجود جذبہ ہمدردی کا دوسروں پر اظہار کر دے۔ خدمت گاروں نے آگے بڑھ کر ابراہیم کو دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا اور دربار سے کھینچتے ہوئے زنداں میں لے گئے۔ اسحاق کو گھر جانے کی اجازت مل گئی۔

یعنی نے ایک بار پھر ابراہیم کی سفارش کی۔ "امیر المومنین! ابراہیم اس عہد کا مومنین ہے اور ہنرمند غیر معمولی حساس ہوتے ہیں۔ زندان میں ابراہیم اپنے فن سمیت مر جائے گا۔ اگر جسم میں جان باقی بھی رہی تو کیا، ابراہیم مفتی باقی نہیں رہے گا۔"

ہارون نے ترشی سے جواب دیا۔ "یا ابی! آپ ابراہیم کی سفارش نہ کیجیے کیونکہ میں اس کو بالکل معاف نہیں کروں گا۔"

یعنی خاموش ہو گیا۔ ہارون اندر چلا گیا۔ یعنی دربار خلافت سے اٹھ کر اسحاق سے ملا اور کہا۔ "اسحاق! تو گھر واپس جا، تیرا خدی اور عاقبت تا اندیش باپ اپنے کیے کی سزا پانے کا لیکن تجھ کو یا تیرے گھروالوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تیری کنالٹ کروں گا۔"

اسحاق نے شکر گزار نظروں سے یعنی کو دیکھا اور دربار سے چلا گیا۔

یعنی نے سوچا کیا ابراہیم کے سلیبے میں خیزران سے مل لیا جائے لیکن دل و دماغ نے حنفیہ طور پر اس تجویز کو مسترد کر دیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ خیزران ہادی کے کسی بھی مداح یا پرستار سے سخت نفرت کرتی ہے اور وہ اس بار سے نہیں اپنے بیٹے ہارون سے ذرا بھی مختلف نہیں۔

یعنی فکر مند، کم مہم قعر الطین روانہ ہو گیا۔ وہ اپنی عقل و ذہانت کو ابراہیم کے معاملے میں ناکام محسوس کر رہا تھا۔ وہ ایرانی اور رومی طرز کے مکانات کے درمیان سے گزرتا ہوا اندر میں داخل ہو گیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں برآکھ نے اپنے متوسلین کو مکانات بنوا دیے تھے۔ اماطوں کے اندر بنے ہوئے مکانات اور ان کے خوب صورت رتبے کسی نئے آنے والے کو بہت متاثر کرتے تھے۔ یعنی نے سوچا، ابراہیم اگر مان جاتا تو وہ اس کو اپنے دربار میں ملازم رکھ لیتا اور اندر میں اس کے لیے ایک شاندار مکان تعمیر کروا دیتا لیکن بد نصیبی

معلومات عامہ

وہ کون سی خاتون ہیں جو ایک نبی کی بیٹی۔ ایک نبی کی بہن۔ ایک نبی کی بیوی اور ایک نبی کی ماں۔ یہ عالم اسلام کی پہلی اور آخری خاتون جن کی 4 نبیوں سے رشتہ داری ہے۔

اس عظیم خاتون کا نام حضرت لیلا ہے۔

(1) حضرت یعقوب کی بیٹی

(2) حضرت یوسف کی بہن

(3) حضرت ایوب کی بیوی

(4) حضرت ذوالفقار کی ماں

☆☆☆

قرآن میں چار مسجدوں کے نام ہیں

(1) مسجد حرام

(2) مسجد اقصیٰ

(3) مسجد قبا

(4) مسجد زرار

☆☆☆

قرآن میں 3 شہدوں کے نام ہیں۔

(1) مکہ

(2) مدینہ

(3) یثرب

☆☆☆

4 دھاتوں کے نام ہیں

(1) سونا

(2) چاندی

(3) تانبا

(4) لوہا

☆☆☆

4 پردوں کے نام ہیں

(1) پردہ

(2) اہانتیل

(3) کوا

(4) تیر

مرسلہ۔ محمد خواجہ، کورنگی، کراچی

ابراہیم کی پشت پر تھی اور وہ اس کی پشت پناہی میں کسی کو خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

ہارون کچھ عرصے کے لیے رتہ جارہا تھا۔ یہ بڑے دھوم دھام کا سفر تھا۔ اس سفر میں خیر دان کے علاوہ ہر اہم شخص ساتھ تھا۔ اس کی چینی بیوی زبیدہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ یحییٰ نے بھی اپنی کیزوں کو ساتھ لے لیا اور کہہ با ان میں سرگرمی تھی۔ بلدا سے ایک منزل دور جب کاروان خلافت نے پڑاؤ کیا تو ویرانہ ایک شاندار سستی میں تبدیل ہو گیا۔

یحییٰ برکی اور اس کی کیزوں کے خیمے، محافظوں کے سرے پر تھے۔ اس کے بعد دوسرے امراء کے خیمے تھے۔ امراء کے بعد فوجوں کے خیمے تھے اور سب کے آخر میں وکنداروں کے خیمے تھے جو ضروریات زندگی کا ذخیرہ لیے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

شام کو جب ان خیموں میں مضمیں اور مشعلیں..... جلیں تورات گئے تنگ ایک جھلٹا تا حسین و جمیل شہر جو دمیں آ گیا۔ یحییٰ برکی نے اپنی کیزوں کو بننے سنورنے اور محفل موسیقی آراستہ کرنے کا حکم دیا اور یہ حیرت انگیز اعلان کیا کہ آج کی رات امیر المومنین ہارون رشید اس کے مہمان بنیں گے اس لیے اس کے رو برو ایسے کمال فن کا مظاہرہ کیا جائے کہ وہ اشک اشک کر اٹھے۔ اس کے بعد یحییٰ کہہ با کو ایک گوشے میں لے گیا اور سرگوشی میں کہا۔ "کہہ با! آج تجھے اپنی آواز کا جادو جگانا ہے کیونکہ میں امیر المومنین سے ایک ایسا کام لینا چاہتا ہوں جو ان کی مرضی کے خلاف ہے۔"

کہہ با نے عاجزی سے درخواست کی۔ "میرے آقا! مجھ کو آزمائش میں نہ ڈالے کیونکہ میں بھی ایک انسان ہوں جو خطا اور لغزش کے خیر سے وجود میں لایا گیا ہے۔"

یحییٰ برکی نے جواب دیا۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ اگر ہارون خطا اور لغزش کا شکار ہو گیا تو میں اس سے ابراہیم مفتی کے حق میں کوئی اچھا سا حکم حاصل کر سکوں گا۔"

کہہ با اس ہو گئی۔ "میرے آقا! اس منور نادان کو تپے کی خاطر مجھ کو خوار نہ ہونے دیجیے۔"

یحییٰ نے جواب دیا۔ "جس طرح ابراہیم مفتی مفور اور نادان ہے اسی طرح ہارون بھی مفور اور نادان ہے۔ میں بڑے توسل سے ایک نادان کو دوسرے نادان کے قہر و غضب سے بچانا چاہتا ہوں۔"

کہہ با خاموش ہو گئی۔ یحییٰ نے بطور خاص ہدایت کی۔ "ہارون کو تیری آواز بہت پسند ہے۔ اس نے کئی بار

اپنی اس پسندیدگی کا ذکر بھی کیا ہے لیکن حرم و احتیاط نے اس کو بے بس کر رکھا ہے۔ اگر تو چاہے تو ہارون تنگ کی طرح تیرے قدموں میں گر جائے گا اور تو اس سے ابراہیم کے لیے امان نامہ حاصل کر سکتی ہے۔"

کہہ با ہنس و خیش میں پڑ گئی، پوچھا۔ "اس سلسلے میں مجھ کو کیا کچھ کرنا ہوگا؟"

یحییٰ نے جواب دیا۔ "مشاطاؤں کی مدد سے شاندار آرائش و زیبائش۔ ناز و ادا کی پوجھاڑ سے ہارون کو حواس باختہ کر دینا پھر جب وہ گانے کی فرمائش کرے تو ابراہیم کی دھن میں ابوالعقاب کا جہرے انگیز کلام سنا۔ اس کے بعد ہارون ہارمان لے گا اور تیری مدد سے میں ابراہیم اور اس کے ساتھ ابوالعقاب کو زنداں سے نکلوانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

کہہ با کو رونا آ گیا، سر جھکا کر عرض کیا۔ "میرے آقا! جو آپ کا حکم، تعمیل کروں گی۔"

مشاطاؤں نے کہہ با کو بنا سنوار کر رکشہ چور بنا دیا اور رقص و غناء کے خیمے میں ہارون کے لیے ایک شاندار نشست بنادی گئی۔ چند دوسری کیزوں کے ہاتھوں میں ساز چھادے گئے۔ اس کے بعد یحییٰ ہارون کے پاس پہنچا اور عرض کیا۔ "امیر المومنین! دوران سفر نکان اور سلسلندی نے تو ہلکان کر دیا ہوگا؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "بے شک یا ابی۔" یحییٰ نے کہا۔ "پھر اس ناچیز غلام نے نکان اور سلسلندی سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایک محفل طرب منعقد کی ہے۔ امید ہے اس طرح ہم سب اپنی نکان اور بد مزگی کو خوشگوار اور فرحت میں بدل دیں گے۔"

ہارون نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔ "یا ابی! آپ کی اس کیز کا کیا نام تھا جس کی آواز اور شکل میں۔"

یحییٰ نے اداکاری کی اور کچھ سوچے ہوئے پوچھا۔ "کون سی کیز امیر المومنین؟"

ہارون نے جھنجھلا کر کہا۔ "ارے وہی جس میں آسانی بجلی جیسی چمک اور بے یحییٰ پائی جاتی ہے اور جس کی آواز کا کرکراہن اور گری پتھروں کو پھٹا سکتے ہیں۔"

یحییٰ نے جواب دیا۔ "امیر المومنین کی مراد غالباً کہہ با سے ہے۔"

ہارون نے بے اختیار کہا۔ "یا ابی! بے شک، بے شک۔" اس کے بعد ہارون نے اپنے ارد گرد کچھ سرگوشی میں کہا۔ "لیکن اسوس معلوم نہیں کیوں زبیدہ کو کہہ با کے نام ہی سے چ ہے۔ وہ

کہہ با کو ذرا بھی پسند نہیں کرتی۔ معلوم نہیں کیوں؟"

یحییٰ نے جواب دیا۔ "امیر المومنین! میری تو ملکہ عالیہ زبیدہ تک رسائی ہی نہیں، میں تو انہیں کچھ بتانے سے رہا۔"

ہارون نے کہا۔ "تب پھر میں چلوں گا، ضرور چلوں گا۔" شام کو یحییٰ ہارون کو اپنے ساتھ لے کر اپنے خیمے میں پہنچا جہاں محفل طرب آراستہ کی گئی تھی۔ ہارون کو اس کی مخصوص نشست گاہ پر بٹھا دیا گیا۔ اس کے سامنے مغنیہ کیزیں قطاروں میں کھڑی تھیں لیکن ان میں کہہ با شامل نہیں تھی۔ ہارون نے اس کو نظروں ہی نظروں میں تلاش کیا اور مایوس ہونے پر۔ یحییٰ سے پوچھا۔ "یا ابی! وہ آواز کی سارو کہاں ہے؟"

یحییٰ نے جواب دیا۔ "امیر المومنین! جب میں نے اس کو آپ کی تشریف آوری کی خبر سنائی تو وہ بہت خوش ہوئی مگر جب محفل سے میں یہ کہہ بیٹھا کہ امیر المومنین تیری آواز کو بے حد پسند کرتے ہیں مگر ملکہ عالیہ زبیدہ کو تجھ سے نفرت ہے، بس یہ سننے ہی وہ یہاں سے چلی گئی۔ جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو اس نے کہہ دیا کہ جب ملکہ عالیہ زبیدہ مجھے پسند کرتی ہیں اور یہ نہیں جانتیں کہ میں امیر المومنین سے ملوں تو میں بھی احتیاط کروں گی اور امیر المومنین کو بھی میری حاضری اور موجودگی پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔"

ہارون نے مایوسی سے کہا۔ "یا ابی! یہ آپ نے کیسی بات کہہ دی؟ چاہیے اور اس کو لے کر آئیے۔"

یحییٰ اس خیمے میں چلا گیا جہاں کہہ با بنی سنوری، سبائی بیٹھی تھی۔ یحییٰ نے اس سے کہا۔ "کہہ با! میں نے امیر المومنین کی آتش شوق بھڑکا دی ہے۔ مجھ کو تیرے پاس اس لیے بھیجا گیا ہے کہ تجھے منکر محفل طرب میں لے جاؤں لیکن میں یوں ہی دابیں جاؤں گا اس کے بعد تیرے پاس امیر المومنین خود آئیں گے۔ تجھ کو محفل طرب میں جانا تو ہے مگر امیر المومنین کے اصرار اور خوشامد کرنے پر۔ آج میں دیکھوں گا تو یہ بڑا اور نازک کام کس طرح انجام دیتی ہے۔" کہہ با ہنسنے لگی، یولی۔ "میرے آقا! آپ کی بیج جگہ وہ ہے جہاں امیر المومنین تشریف فرما ہیں کیونکہ آپ کو خدا نے علم، عقل اور حکمت سے یکساں نوازا ہے۔ خدا آپ کو نظر بد سے بچائے کیونکہ آپ بروقت حاسدوں کی نظر بد کی زد میں ہیں۔ عروج و اقبال کی اس سر بلندی پر جس کی دوسری طرف زوال اور ادبار کی گہرائیاں ہیں۔"

یحییٰ نے سسکا کر جواب دیا۔ "کہہ با! میں زمانے کو تجھ سے زیادہ جانتا اور سمجھتا ہوں۔ میں حاسدوں اور ان کی

نظروں سے بھی آشنا ہوں۔ میں اپنے عروج و اقبال کی بلند ہوں کے پیچھے زوال اور ادبار کی گہرائیاں بھی دیکھ رہا ہوں لیکن تجھ کو ایک بات معلوم ہونا چاہیے۔ میں اپنے عروج و اقبال پر ذرا بھی نازاں نہیں۔ میں اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچانا چاہتا ہوں۔ اب اگر میں کسی طرح زوال و ادبار اور نکبت و افلاس کی گہرائیوں میں گر بھی گیا تو میں اس سے نہ تو خوفزدہ ہوں اور نہ لرزاں و ترساں۔ میں اپنے حصے کی ہر چیز کو مقدر سمجھ کر فشی خوشی اور شکرگزاری سے قبول کر لوں گا۔"

کہہ با نے احسان مندی کی نظروں سے یحییٰ کی طرف دیکھا اور مختصر ا عرض کیا۔ "امیر المومنین کو میرے پاس بھیج دیجیے، میں انہیں سنبھالنے اور اپنی مرضی کی جبری کرنے پر مجبور کر دوں گی۔"

یحییٰ منہ لکائے ہارون رشید کے پاس جا کھڑا ہوا۔ ہارون اس کو تنہا آتے دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا۔ وہ بار بار یحییٰ کے عقب میں کہہ با کو دیکھنے کی کوشش کرتا مگر جب کچھ نظر نہ آیا تو پریشان ہو کر پوچھا۔ "یا ابی! وہ کہاں ہے، وہ آئی کیوں نہیں؟"

یحییٰ نے جواب دیا۔ "امیر المومنین! میں نے بڑی کوشش کی کہ اس کو منا کر لے آؤں مگر وہ نہیں مانی۔ ابھی بھی کہہ رہی تھی کہ امیر المومنین کو میری آواز اتنی ہی پسند ہے اور وہ مجھے اپنی محفل طرب میں دیکھنا ہی چاہتے ہیں تو میرے پاس آنے کی خود حمت فرمائیں۔ اس طرح میرے مجروح دل پر گویا مرہم لگ جائے گا اور امیر المومنین کی تشریف آوری کا اعزاز میری زندگی کا سب سے بڑا اعزاز ہوگا جس کے سہارے میں زندگی بھر شاداں و فرحان رہوں گی۔"

ہارون چپ ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ ان حالات میں اس کو کیا کرنا چاہیے۔

کچھ دیر بعد ہارون اٹھا اور یحییٰ سے کہا۔ "یا ابی! مجھ کو وہاں تک لے چلے، میں اس کو منالوں گا۔"

یحییٰ نے کہا۔ "بسم اللہ امیر المومنین! تشریف لائیے۔"

ہارون کو ایک خیمے سے نکل کر دوسرے خیمے میں جانا پڑا۔ اس کا دل غلامت کر رہا تھا کہ ایک مغنیہ کی خاطر وہ یہ سنگی برداشت کر رہا ہے جو کسی طرح بھی من سب نہیں لیکن کہہ با کی آواز کا سحر ہارون کو اپنی طرف مچھنچ رہا تھا۔ جب وہ یحییٰ کے ساتھ کہہ با کے خیمے میں داخل ہوا تو اس نے دور ہی سے کہہ با کو خیمے کے در کی طرف پشت کیے بیٹھا دیکھا۔ اس کے بالوں کو نال رومال سمیٹے ہوئے تھا۔ یحییٰ نے اس کی

طرف دیکھنا تک گوارا نہ کیا۔ منہ پھیر کر خیمے کے در پر ہی رک گیا۔

بارون نے یحییٰ کو دور کھڑے سے دیکھا تو اشارے سے پاس بلا لیا اور پوچھا: "یا ابی! آپ دور کیوں کھڑے ہیں؟" یحییٰ نے جواب دیا: "امیر المومنین! اس وقت کبریا کی اتار اور اس کا احساس حسن و فن پیدا ہے جس سے یہ خود بین و خود آرا ہو گئی ہے اور امیر المومنین کو یہاں تک آنے کی زحمت دے دی ہے۔ اب آگے کیا پیش آنے والا ہے، میں اس سے بھی واقف ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ اس وقت امیر المومنین میری موجودگی کو شرمندگی اور فحالت سے محسوس فرمایاں۔"

بارون نے کہا: "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا یا ابی؟ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" یحییٰ نے جواب دیا: "کبریا نے آپ کو یہاں تک آنے کی زحمت اس لیے دی ہے کہ وہ آپ کو خوشامد اور منت و نزاری پر مجبور کرے اور میں نہیں چاہتا کہ یہ باتیں میری موجودگی میں ہوں اور آپ اس میں شرم و ندامت محسوس فرمایاں۔"

بارون واقعی شرمندہ ہو گیا، گھبرا کر بولا: "تو کو کیا مجھ کو یہاں نہیں آتا چاہیے تھا؟"

یحییٰ نے جواب دیا: "امیر المومنین! میں دوسرے کمرے میں جا رہا ہوں، آپ اس سے بات کر لیجئے اور اس الجھن میں نہ پڑیے کہ کیا ہونا چاہیے تھا اور کیا نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

بارون کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہاں سے ہٹ گیا۔ بارون غصہ کا رہ گیا۔ شرم و ندامت نے اس کو جامہ و ساکت کر دیا تھا۔ کبریا منہ پھیر سے بدستور بیٹھی تھی۔ کسی جیسے کی طرح خاموش، پرسکون، منجمد۔ بارون آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا اور اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ وہ کبریا کی زلفوں پر محیط سرخ رومال کو غور سے دیکھتا اور اپنے اندر بیجان محسوس کرتا رہا۔ اس نے اپنے گرد و پیش کا نہایت احتیاط سے جائزہ لیا اور داہتا ہاتھ کبریا کے سر پر رکھ دیا۔

"کبریا! یہ تو نے کیا کیا؟" کبریا تڑپ کر مڑ گئی۔ "امیر المومنین آپ؟" بارون نے کہا: "ہاں میں۔ تو آئی کیوں نہیں؟ کیا یحییٰ نے تجھ کو یہ نہیں بتا دیا تھا کہ میری محفل طرب میں تیری شرکت ضروری ہے۔"

کبریا نے جواب دیا: "امیر المومنین! میری کیا مجال کہ امیر المومنین مجھ کو طلب فرماتے اور میں نہ آتی۔ میرے نہ آنے کی صرف ایک ہی وجہ ہے اور وہ یہ کہ آج میں

امیر المومنین کو اپنے فن اور آواز سے محفوظ نہ کر سکوں گی، یہی ناکامی کا احساس مجھ سے انکار کر رہا تھا۔"

بارون نے پوچھا: "اس ناکامی کی وجہ؟" کبریا نے جواب دیا: "امیر المومنین پر یہ بات ظاہر ہے کہ میں نے یہ فن جن استادوں سے سیکھا ہے، ان استادوں میں استاد الاساتذہ ابراہیم کا نام سر فہرست ہے۔ میں جب یہ سوچتی ہوں کہ جس محفل طرب میں میں امیر المومنین، ان کے نام اور اسراہ کو اپنے فن اور آواز سے لطف اندوز کر رہی ہوں گی تو وہیں کہیں آس پاس استاد ابراہیم قید میں پڑے اپنی تیرہ بختی پر آنسو بہا رہے ہوں گے۔ بس یہ احساس مجھ کو پریشان اور مضطرب کر دے گا اور میں اپنی کوششوں میں ناکام ہو جاؤں گی۔"

بارون نے کہا: "کم سے کم لفظوں میں بتا کہ تو چاہتی کیا ہے؟" کبریا نے جواب دیا: "استاد ابراہیم پر رحم کیا جائے، انھیں معاف کر دیا جائے۔"

بارون نے کہا: "اور کچھ۔ مزید؟" کبریا نے عرض کیا: "انھیں اس محفل طرب میں شریک کیا جائے۔"

بارون نے جواب دیا: "میں تیری دونوں درخواستیں مان لوں گا لیکن ایک کام تجھ کو بھی کرنا ہوگا۔"

کبریا خوشی سے پاگل سی ہو گئی۔ بے چینی سے بارون کے آگے جھک گئی۔ "امیر المومنین! ارشاد فرمائیے۔"

بارون نے کہا: "آج جب ابراہیم محفل طرب میں آجائے تو تو اس کو اس پر آمادہ کر لے کہ وہ بھائی ہادی کا خیال اپنے دل سے نکال دے اور میری ملازمت میں آجائے۔"

کبریا نے جواب دیا: "میں استاد کو آمادہ کرنے کی کوشش کروں گی۔"

بارون نے کہا: "کبریا! جس تدبیر سے تو نے مجھ کو یہاں تک بلا لیا ہے اور مجھے منت و خوشامد پر مجبور کر دیا ہے، کسی ایسی ہی تدبیر سے تو استاد ابراہیم کو بھی بدل دے۔"

کبریا نے عرض کیا: "یا امیر المومنین! میں کوشش کروں گی۔"

بارون نے جواب دیا: "پھر میری معافی شروط ہے، میں ابراہیم کو محفل طرب میں ہاتھوں کا لیکن معاف اس وقت تک نہیں کروں گا جب تک کہ اس کے دل میں بھائی ہادی کی محبت اور مجھ سے نفرت موجود ہے۔"

کبریا نے جواب دیا: "امیر المومنین تشریف لے

رموز شاہی

چلیں، میں لباس بدل کر آ رہی ہوں۔"

بارون نے کہا: "کبریا! میں تیرے پاس بار آؤں گا اور تیرے نامہ انداز کی پرستاری کروں گا۔ کیا تو جانتی ہے کہ ایسا کیوں ہوگا؟ میں اپنے مرتبے کا خیال کیے بغیر اتنا عاجز اور حقیر کیوں بن جاؤں گا؟"

کبریا نے جواب دیا: "یا امیر المومنین! میں نہیں جانتی۔"

بارون نے کہا: "مجھ کو تیری آواز کے سحر نے بے قابو کر دیا ہے۔ تیرا فن ایک طرف جب تو بولتی ہے تو میں بے چین ہو جاتا ہوں اور میرا پورا وجود تیری آواز کی دہکشی اور سحر آفرینی کا شکار ہو جاتا ہے۔"

کبریا خوشی سے پھوٹی نہ سہائی، بولی: "امیر المومنین! میں خود پر نازاں رہوں گی اور اپنی قسمت پر ہمیشہ فخر کرتی رہوں گی۔"

بارون نے کہا: "میں واپس جا رہا ہوں۔ تو لباس بدل کر فوراً آ جا۔"

اسی وقت یحییٰ اندر داخل ہوا۔ بارون نے مسکرا کر کہا: "یا ابی! کبریا نے محفل طرب میں شمولیت پر آمادگی ظاہر کر دی ہے۔ میں واپس جا رہا ہوں یہ لباس بدل کر آ رہی ہے۔ آپ ابراہیم کو بھی محفل طرب میں شامل کر دیجیے۔"

بارون کے چلے جانے کے بعد کبریا نے شرب (باریک، از حسن زب) کا لباس پہنا۔ لباس زیریں میں دمیاط کا رنگین چست کرت تھا اس کے اوپر شرب کا لباس، جو قیمتی زردوزی کے کام سے مزین تھا۔ تیاری اور آرائشی کے بعد جب کبریا نے خود کو آئینے میں دیکھا تو خود بھی حیرت زدہ رہ گئی لیکن اس خیال نے ذرا غم زدہ کر دیا کہ امیر المومنین بارون کو اس کا سراپا نہیں، صرف آواز پسند ہے۔ اس نے سوچا، اگر بارون اس کے سراپا اور حسن سے متاثر نہیں ہوتا تو نہ وہ، استاد ابراہیم کے دل پر تو بجلیاں گریں گی۔

☆ ☆ ☆

محفل طرب میں ابراہیم کو مغنیہ کیزوں اور ساز بجانے والوں میں نمایاں جگہ دی گئی لیکن ان میں کبریا سب پر چمکائی ہوئی تھی۔ ابراہیم نے اس قاتل جہاں سوز کو دیکھا تو دل پکڑ کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے اس کو یہ بات بھی نہ یاد رہی کہ وہ امیر المومنین کی محفل طرب میں بیٹھا ہے۔ کبریا بھی اس کو کون انھیں سے دیکھ کر مسکراتی رہی۔

سانے باریک کپڑے کا پردہ پڑا ہوا تھا جہاں بارون رشید بیٹھا تھا۔ وہ اپنے اور گانے والوں کے درمیان اس باریک پردے کو حائل رکھنا چاہتا تھا۔ یہیں ایک طرف

خواجہ غلامت بھی موجود تھیں۔ یہ بھی پردوں کی آڑ سے گانے سننے کے لیے جمع ہو چکی تھیں۔ بارون کے سامنے دائیں بائیں تھیں۔ امیر المومنین کی صفیں تھیں۔ ان میں بارون کا حاجب، یحییٰ اور آل برکت سب سے آگے تھے۔ ابراہیم نے کئی بار بارون اور اپنے درمیان حائل پردے کی طرف دیکھا اور منہ بنا کر سر جھکا لیا۔

کبریا نے ابراہیم کے پاس جا کر سلام کیا اور سڑن پر ہی کی۔ ابراہیم نے سر آہ بھری اور کہا: "کبریا! میں یہاں کیوں لایا گیا ہوں؟"

کبریا نے جواب دیا: "ایک مدت کی حیثیت سے۔ میں نے امیر المومنین سے خواہش کی تھی کہ آپ کو ضرور جانا جائے ورنہ میں نہیں شریک ہوں گی۔"

ابراہیم خوش فہمی میں جتا ہو گیا: "کبریا! مجھ کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن تیرے دل پر میری محبت کا اثر ضرور ہوگا لیکن افسوس کہ اب میں امیر المومنین کا قیدی ہوں اور میرے لیے تیرا عشق فضول ہے۔ نہ میں تجھے حاصل کر سکتا ہوں نہ تو مجھے۔"

کبریا نے ہنس کر جواب دیا: "یہ آپ نے کس طرح سمجھ لیا کہ میں آپ پر مائل ہو گئی ہوں۔ ہاں میرا آقا یحییٰ برکتی آپ پر بہت مہربان ہے اور وہ ہر وقت اسی فکر اور تدبیر میں لگ رہتا ہے کہ آپ کو کس طرح رہائی دلائے اور امیر المومنین کا دل کس طرح صاف کرے۔"

ابراہیم نے بڑے کرب سے کبریا کی طرف دیکھا، پوچھا: "کیا ج؟"

کبریا نے جواب دیا: "میں جھوٹ کیوں بولوں گی؟" ابراہیم نے کہا: "اگر یہ بات ہے تو میں اس محفل سے اٹھ کر خود زندان میں چلا جاؤں گا۔"

کبریا نے کہا: "آپ محفل سے کیوں نہیں کام لیتے؟" امیر المومنین کو سمجھنے کی کوشش کیجیے اور سرے ہوؤں کے ماتم سے باز آجائیے۔"

ابراہیم نے بارون اور گانے والوں کے درمیان حائل پردے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "کبریا! تو نے بھی ہادی کا زمانہ دیکھا تھا۔ کیا وہ ہم سے اس طرح دور رہتا تھا؟ کیا اس وقت بھی یہ پردہ حائل رہتا تھا؟ پھر ہادی نے ہم پر جو احسانات کیے ہیں انہیں بھلایا جاسکتا ہے؟"

امیر المومنین ہمیں احسانوں سے تو اپنی طرف مائل کر سکتے ہیں، احکام اور طاقت سے ہرگز نہیں۔ شاعر ابو العباس بھی میری ہی طرح زیر قباب ہے اور اس کا جرم بھی وہی ہے جو

☆ ☆ ☆

میرا۔ یعنی ہادی کا احسان مند ہونا اور ہادی کے احسانوں کو ہمیشہ یاد رکھنا۔“

کہریا نے کہا۔ ”آپ جو چاہیں سوچیں لیکن یہ سٹ ہے کہ آپ دونوں اپنی بے جا اور فضول ضد پر قائم رہ کر امیر المومنین کو قاتل اور ماکل نہیں کر سکتے۔ آپ امیر المومنین کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“

ہارون پردے کے پیچھے سے دونوں کو ہم کلام دیکھ رہا تھا اور انہیں باتیں کرنے کا موقع دے رہا تھا۔ اسے کچھ کچھ امید ہو گئی تھی کہ ابراہیم کو راضی کر لیا جائے گا۔

آخر کچھ دیر بعد یحییٰ نے حکم دیا کہ گانے کا آغاز ہو۔ پہلے تو معمولی گانے والوں نے گانا شروع کیا۔ اس کے بعد کہریا کو موقع ملا اور اس نے گانا شروع کیا۔ وہ پردے کے پاس چلی گئی۔ چنگ کو ہاتھ میں لیا اور نہایت ہوشیاری اور مہارت سے اس کو بجانا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ کی مشاتی اور مہارت نے تقریباً سبھی کو مست و سرشار کر دیا۔ اس کے بعد اس نے ابو العتاہیہ کا کلام لے کر شروع کر دیا۔

ابو العتاہیہ کے کلام اور کہریا کی پرسوز آواز نے سبھی کو متاثر کیا۔ ہارون کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ابراہیم سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ ہارون نے پردے کے پیچھے سے کہلوایا۔ ”کہریا سے کہہ یہ محفل طرب ہے، مجلس تعجب نہیں۔ اس نے پوری محفل کو سوگوار اور اشک بار کر کے رکھ دیا ہے۔“

کہریا نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین! عربوں میں مثل مشہور ہے کہ سچا دوست وہ ہے جو سچی بات کہہ کر رلا دے۔ کیا میں نے سچی باتیں نہیں کیں اور کیا میں نے اپنی باتوں سے امیر المومنین کو رلا نہیں دیا؟“

ہارون نے کہلوادیا۔ ”بہر حال میں خوش رہنا چاہتا ہوں۔ اگر تو میرے غمزدہ دل کو خوش نہیں کر سکتی تو اسے مزید آزرہ نہ کر۔“

کہریا ہارون کو آزرہ نہیں کرنا چاہتی تھی اور یہ جو کچھ اس نے کیا تھا، اپنے آقا یحییٰ برکی کی خواہش اور حکم پر کیا تھا۔ اس نے یحییٰ کی طرف دیکھا۔ یحییٰ نے نظریں چرائیں اور ابراہیم موصلی سے کہا۔ ”استاد ابراہیم! تیرے لیے یہ بہترین موقع ہے کہ تو امیر المومنین کو کسی خوشگوار نغمے سے راضی کر لے۔“

ابراہیم موصلی نے یحییٰ پر ایک سرسری نظر ڈالی اور جواب دیے بغیر ہی منہ پھیر لیا۔

کہریا نے ابراہیم سے سرگوشی میں کہا۔ ”استاد! موقع سے فائدہ اٹھائیے۔ آپ کی سفارش کے لیے میرا آقا یحییٰ

برکی موجود ہے۔“

ابراہیم نے بیزاری سے جواب دیا۔ ”اگر امیر المومنین کے دربار سے وابستگی اسی شرط پر ہو سکتی ہے کہ میں اپنے محسن ہادی کو بھلا دوں اور اس کے احسانات کو فراموش کر دوں تو یہ ناممکن ہے۔“

کہریا نے کہا۔ ”استاد! آپ نے ابو العتاہیہ کا آخری شعر غور سے سنایا نہیں؟ جس میں اس نے شاید آپ ہی جیسے لوگوں کو مخاطب کیا ہے کہ اے شخص! اس دنیا سے جو کچھ لے سکتا ہے، لے لے کیونکہ اس کا انجام بہر حال موت ہے۔“

ابراہیم نے جواب دیا۔ ”کہریا! اگر میرے دل میں تیری محبت جاگزیں نہ ہوتی تو اس وقت میں اس محفل میں ہرگز نہ ہوتا۔ کیا تو نہیں جانتی کہ ابو العتاہیہ اور ابراہیم موصلی اس وقت ایک ہی کشتی میں سفر کر رہے ہیں۔ وہ بھی قید میں ہے اور میں بھی قید میں ہوں۔ جس جرم میں وہ قید ہوا ہے، اسی جرم میں، میں قید کر دیا گیا۔ تو ابو العتاہیہ کے پاس جا اور اس کو اس کا یہ شعر سنا کر ہارون کے دربار سے وابستہ ہو جانے پر مجبور کر۔۔۔۔۔ پھر دیکھ وہ کیا جواب دیتا ہے؟“

ہارون پردے کے پیچھے سے کہریا اور ابراہیم موصلی کی گفتگو کا حاصل جان چکا تھا۔ اس نے غصے سے یحییٰ برکی کو حکم دیا۔ ”یا ابی! آپ معلوم نہیں کیوں اس ذلیل گویے پر مہربانیاں کر رہے ہیں۔ کہریا سے کہہ دیجیے کہ ابراہیم سے باتیں نہ کرے اور ابراہیم کو اسی وقت دوبارہ قید میں ڈال دیجیے۔ یہ عاقبت نااندیش احمق اسی کا مستحق ہے۔“

یحییٰ نے محفل طرب میں موجود خدمت گاروں کو حکم دیا کہ ابراہیم کو دوبارہ قید کر دیا جائے۔ حکم پر فوراً ہی عمل کیا گیا اور ابراہیم دوبارہ قید کر دیا گیا۔

اس کے بعد ایک بار پھر محفل طرب میں ساز و آواز کا شورا اٹھا اور پوری محفل مست و سرور ہو گئی لیکن ہارون کے دل پر بوجھ آ گیا۔ اگر کہریا کی آواز میں ہارون کے لیے ایک خاص دلکشی اور سحر نہ ہوتا تو وہ اس محفل کو فوراً ہی برخاست کر دیتا لیکن کہریا کی آواز نے کسی حد تک ہارون کو بے خود اور بے ہوش سا کر دیا۔ زبیدہ اس کی بے خودی اور وارفتگی کو بڑی بے چینی اور پریشانی سے محسوس کرتی رہی۔ اس نے ہارون کی نظروں میں وہ شوق اور اشتیاق بھی محسوس کر لیا جو ہارون کہریا کو دیکھ دیکھ کر اور پہلو بدل بدل کر ظاہر کر رہا تھا۔

دوسرے دن علی الصباح ہارون نے یحییٰ سے خواہش کی کہ اس کو کہریا کے پاس لے چلے کیونکہ اس کی آواز کا رس کانوں کو مضطرب و بے چین کیے ہوئے ہے۔ یحییٰ ہارون

کوسے کھربا کے پائے چلا گیا۔ ہارون کھربا کے پاس دیر تک سوہو رہا۔ خود کھربا کو بولتے رہنے کا حکم دے دیا۔ اس بات کا چرچا ہونے لگا اور جب یہ خبر قید خانے میں ابراہیم کو سنائی گئی تو اس کو بہت غصہ آیا اور اس کو بدگمانی ہوئی کہ شاید ہارون اس کو جھانسنے کے لیے ایسا کر رہا ہے۔

رقہ پہنچ کر ہارون نے ایک بار پھر ابراہیم اور ابو العتیبہ کو موقع دیا کہ وہ اپنے دل صاف کر کے دربار سے واپس ہو جائیں لیکن دونوں کو خدشہ ہوئی تھی صاف انکار کر دیا۔ ہارون نے یحییٰ کو حکم دیا کہ ایک کنوارا کھدوایا جائے۔ یحییٰ نے کنوئیں کی کھدائی شروع کر دینی۔

ہارون رقبہ پہنچ کر بھی ہر روز کھربا کے پاس ضرور جاتا تھا۔ اس کی باتوں اور آواز سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ یحییٰ برقی نے کئی بار یہ فیصلہ کیا کہ کھربا کو ہارون کے نوالے کر دے مگر زبیدہ کی تاراضی کے خیال سے باز رہتا تھا۔

رقہ ہارون کا گرہائی صدر مقام تھا جو فرات کے کنارے آباد تھا۔ یہاں وہ بغداد سے دور میث و عشرت میں اپنا وقت گزارتا تھا۔ رقبہ میں تقریباً ہر دور ہی محفل طرب منعقد ہوتی اور ہارون ان سے لطف اندوز ہوتا رہتا۔ اس نے کھربا سے بہت کچھ سنا اور اس کا بہت زیادہ اثر لیا۔ یحییٰ ایک دن کسی مغنیہ کنیز نے اس عہد کے مشہور شاعر ابو یونس کا کچھ کلام سنایا اور ہارون کو خوش کر دیا۔ ہارون نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ ابو یونس کا کلام کھربا سے سنے گا۔

حسب دستور صبح فجر کے بعد ہارون کھربا کے پاس جانے لگا تو اس کی چابی بیوی زبیدہ نے روکنا چاہا مگر ہارون نہیں رکا۔ اس نے ہارون کے جاتے ہی یحییٰ کو طلب کر لیا۔ یحییٰ کو اپنے سامنے دیکھتے ہی زبیدہ برس پڑی۔ "یا ابی! آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کیا کھربا بہت زیادہ خوب صورت ہے؟"

یحییٰ نے بات مان چاہی مگر زبیدہ اپنی بات پر اڑی رہی اور۔۔۔ یحییٰ سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہارون کا ہر روز علی الصباح کھربا کے پاس جانا اس کو ذرا بھی پسند نہیں۔ اس لیے کسی ترکیب سے ہارون کو کھربا کے پاس جانے سے باز رکھا جائے۔

یحییٰ نے وعدہ کر لیا کہ انشاء اللہ ملکہ عالیہ کو دوبارہ شکایت کا موقع نہیں ملے گا لیکن جب وہ اپنے خیمے میں واپس پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہارون کھربا سے باتیں کر رہا ہے۔ ہارون نے یحییٰ پر نظر پڑتے ہی پوچھا۔

"یا ابی! آپ کہاں عذاب ہو گئے تھے؟" یحییٰ نے جواب دیا۔ "مجھ کو ملکہ عالیہ زبیدہ نے طلب کر لیا تھا۔"

ہارون نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیوں؟" یحییٰ نے عرض کیا۔ "وہ ایک خاص بات تھی کسی وقت خیمے میں عرض کر دوں گا۔"

ہارون نے ہر کوئی خاص تو یہ نہیں دی اور ایک کنیز کو حکم دیا۔ "گنا شروع کیا ہے۔"

کنیز نے کھڑے ہو کر رپا ہوا۔ "امیر المومنین کس شاعر کا کلام سننا پسند فرمائیں گے؟" ہارون نے جواب دیا۔ "اسامہ ابو یونس کا۔"

کنیز نے گنا شروع کر دیا۔ ہارون نے کھربا سے کہا۔ "کچھ کلام یہ ہے جس کا مزدورگ وہی میں خون کی طرف اشارہ کرے گا۔"

یحییٰ نے کھربا کو آنکھ سے اشارہ کیا کہ وہ کسی بہانے سے اٹھ کر اس کے پاس آجائے۔ ہارون نے کن کنکھوں سے یحییٰ کا اشارہ دیکھ لیا مگر چشم پوشی اختیار کی۔ یحییٰ باہر چلا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے کھربا کھنکی۔ یحییٰ نے کہا۔ "میرے پاس تجھ سے بات کرنے کا زیادہ وقت نہیں ہے۔ اگر تجھ کو کچھ سنانا ہی پڑے تو ابو العتیبہ ہی کا کلام سنانا کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ امیر المومنین یہاں سے بس اٹھیں تو ان کے دل میں ابو یونس کی آگ بھڑک رہی ہو اور زبیدہ کو مزید شکایت کا موقع ملے۔"

کھربا یحییٰ کی بات پوری حرا نہیں سمجھ سکی۔ یحییٰ نے اس کو فوراً ہی واپس پہنچا دیا۔ ہارون نے اس کو دیکھتے ہی کہا۔ "کھربا! کیا بات ہے تو کہاں پہلی گئی تھی؟ کیا میں تیرے آواز میں کچھ نہیں سن سکوں گا؟"

کھربا نے جواب دیا۔ "امیر المومنین! سیری کیا مجال کہ میں انکار کروں؟" ہارون نے دروازوں اور کھڑکیوں پر پڑے ہوئے خنک کے پردوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ خنک ہو رہے ہیں ان پر پانی چھڑکوا دیا جائے۔"

ہارون کی آواز یحییٰ کے کان میں پڑی تو اس نے اسی وقت پردوں پر پانی چھڑکوا دیا۔ اس کے بعد جب ہوا میں بھٹکے پردوں سے نکل کر اندر داخل ہو گئیں تو خنک موسم نے انہیں مست و سرشار کر دیا۔ ہارون نے کھربا سے کہا۔ "ہاں کھربا! اس خوشحور اور خنک موسم میں ابو یونس یا اسی جیسے کسی اور شاعر کے کلام سے دل و دماغ کو سرشار

کر دے۔" کھربا نے عرض کیا۔ "امیر المومنین! مجھے اجازت دیجیے کہ میں ایسا کلام سناؤں جس سے سرشاری دور ہو جائے اور آپ ہوش و حواس میں آجائیں کیونکہ حکمرانوں کو نشہ یا سرشاری زیب نہیں دیتی۔"

ہارون مسکرا دیا۔ "میں تیرا مطلب سمجھ گیا۔ تو ایک بار پھر ابو العتیبہ کا کلام سنا کر مجھے خم زدہ کر دے گی۔ خیر سنا۔"

کھربا نے ہتھکڑیاں کر پہلے تو گھاسا صاف کیا، اس کے بعد ممکنہ کر حمن بنانے لگی۔ ہارون متکنا بہت ہی سے وجد میں آنے لگا پھر آہستہ آہستہ کھربا کی آواز بلند ہونے لگی۔ کھربا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھیں بھی پوری کھل جاتیں، بھی نیم وا ہو جاتیں، کبھی بالکل بند ہو جاتیں۔ وہ ابو العتیبہ کا کلام گا کر سارے ہی گئی۔

"سوچی روٹی کا ٹکڑا جس کو تو ایک کونے میں بیٹھ کر کھائے غصہ سے پانی کا پیالہ جسے تو پیے ایک ٹکڑا جس میں تو یکہ دہن بیٹھا ہو یا ایک مسجد جس میں تو تمام دنیا سے علیحدہ بیٹھ کر ان لوگوں کے حال سے صبرت بکھڑ رہا ہو جو پرانے زمانوں میں گزر چکے"

ان چند گھڑیوں کے سائے اور سکون سے بہتر ہے جو بلند بالا کمالات کے نیچے چھ کر حاصل ہوتا ہے۔"

ہارون نے ایک سرد آہ صہنی اور شاکی نظروں سے کھربا کو دیکھا، بولا۔ "کھربا! میں تیرا مطلب سمجھ گیا، اگر... ابو العتیبہ کے کلام میں میرے لیے یہ اشارہ موجود ہے کہ میں تیرے پاس نہ آیا کروں تو میں نے تیرا مطلب پالیا اور کل سے میں نہیں آؤں گا۔"

کھربا گھبرا گئی، جلدی سے بولی۔ "امیر المومنین! بھڑا میری یہ فٹائٹیں۔ آپ ہر روز خشریف لائیں، یہ تو میری خوش قسمتی ہے۔"

ہارون چپ ہو گیا۔ سر جھکائے کچھ سوچتا رہا پھر اچانک سوال کیا۔ "کھربا! ایک بات تو بتا؟"

کھربا نے جواب دیا۔ "پوچھیے۔"

ہارون نے پوچھا۔ "کیا ابراہیم موصلی تجھ کو پسند کرتا ہے؟" کھربا نے گراہیت سے جواب دیا۔ "شاید، لیکن ہے یساعی ہو۔"

ہارون نے مزید سوال کیا۔ "اور تو... کیا تو بھی اسے پسند کرتی ہے؟"

کھربا نے جلدی جلدی جواب دیا۔ "امیر المومنین! یہ بالکل غلط ہے۔ اگر کسی نے ایسی کوئی بات آپ کے گوش گزار کی ہے تو یہ مجھ پر تہمت ہے، الزام ہے۔"

ہارون نے پھر سوال کیا۔ "تو گویا یہ درست ہے کہ ابراہیم تجھ سے محبت کرتا ہے؟"

کھربا نے کھنی کھنی آواز میں جواب دیا۔ "لیکن امیر المومنین! اس پر میرا کیا اختیار؟"

ہارون نے کہا۔ "میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ تیرا ابراہیم کے دل پر اختیار ہے یا نہیں۔ میں تو بس یہ جانتا چاہتا ہوں کہ ابراہیم تجھ سے محبت کرتا ہے یا نہیں؟" کھربا نے سادگی سے جواب دیا۔ "شاید وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔"

ہارون نے کہا۔ "اگر تو یہ کہتی ہے کہ ابراہیم تجھ سے محبت نہیں کرتا تو میں تیری بات نہ مانا۔ وہ مفنی ہے، اس کا دل مجھ سے زیادہ گداز اور حسن پرست ہوگا۔ میں قسمیہ کہہ سکتا ہوں کہ اہل دل اور حسن پرست اگر تجھ سے ایک بار بھی مل لے تو وہ تیرے جاوے سے نہیں بچ سکتا۔ تیرے سحر سے محفوظ سے نہیں رہ سکتا۔ تو صد اقلن ہے، جس کو چاہے شکار کر لے۔"

ہارون کے احساسات سے وہ پھولی نہیں سار رہی تھی، خاموشی سے سختی اور مزے لیتی رہی۔

ہارون ذرا سی دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ کھربا کو گمان گزرا شاید ہارون اب نہیں بولے گا لیکن ہارون نے کچھ دیر بعد کھربا کو مخاطب کیا۔ "کھربا! میں چاہوں تو تجھے تیرے آقا سے لے لوں لیکن غیرت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ ابراہیم موصلی تجھ سے محبت کرتا ہے، بس یہ عیب میری غیرت کے حق میں تازیانہ ہے۔"

کھربا نے جواب دیا۔ "لیکن امیر المومنین! میں تو اس سے محبت نہیں کرتی۔"

ہارون نے کہا۔ "کھربا! میں نہیں چاہتا کہ جب تو میرے قصر میں داخل ہو تو باہر لوگ سرگوشیوں میں یہ بتے پھریں کہ مغنی ابراہیم موصلی کی محبوبہ امیر المومنین کے قصر میں داخل کر لی گئی۔"

کھربا ابھی جواب بھی نہ دے سکی تھی کہ یحییٰ برقی ان دونوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ ہارون دل برداشتہ اندر اندر کھڑا ہوا اور اپنے قصر روانہ ہو گیا۔ یحییٰ اور ہارون کے سامنے اندیمہ اور امرا اس کے ساتھ ہو لیے۔ قصر خلد میں زبیدہ اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ ہارون نے اندر جانے سے پہلے یحییٰ سے کہا۔ "یا ابی! آپ ابھی گھبراہٹ سے

اور اس وقت تک کہیں گے جب تک کہ میں جانے کی اجازت نہ دوں۔"

یعنی رک گیا اور ہارون حرم میں چلا گیا۔ وہاں اس کو یہ تشویش تک خبر ملی کہ اس کی چیتکی بیوی زبیدہ کی طبیعت تاساڑ ہے اور کنیزوں کی ایک فوج اس کی حصار داری اور دیکھ بھال میں مشغول ہے۔ ہارون، زبیدہ کے پاس چلا گیا۔ امیر المومنین کو اپنی طرف آمادہ کچھ کنیزوں کا پراکالی کی طرح پھٹ گیا اور ہارون کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ کنیزیں دور وہ ادب سے سر جھکا کر کھڑی ہو گئیں۔ ہارون ان کے پیچ سے گزر کر زبیدہ کے معطر بستر تک پہنچ گیا۔ زبیدہ اپنے سر کو معال سے باندھے آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ کسی کنیز نے زبیدہ کو مطلع کیا۔ "ملکہ عالیہ! آنکھیں کھولیں امیر المومنین تشریف لائے ہیں۔"

زبیدہ نے ادھ مٹی آنکھوں سے ہارون کی طرف دیکھا اور آنکھیں دوبارہ بند کر کے دوسری طرف کر دے لی۔ وہ ہارون سے بہت ناراض تھی۔ ہارون کو زبیدہ کی سرد مہری اور کج اخلاقی کر اس گزری مگر برداشت سے کام لیا۔ کنیزوں کو حکم دیا۔ "تم سب باہر چلی جاؤ، میں زبیدہ سے بات کروں گا۔"

کنیزیں سانسے سے ہٹ گئیں۔ ہارون زبیدہ کے پاس پہنچ گیا اور آواز دی۔ "زبیدہ! ادھر میری طرف دیکھو۔ طبیعت کیسی ہے؟"

زبیدہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسری طرف منہ کیے پڑی رہی۔

ہارون نے زبیدہ کا چہرہ زبردستی اپنی طرف کر لیا اور اس کے چہرے پر جھک گیا۔ "کیا بات ہے؟ کیا واقعی تمہاری طبیعت خراب ہے یا کوئی اور بات ہے؟"

زبیدہ نے ایک بار پھر دوسری طرف کر دے بلنا چاہی لیکن ہارون نے ناکام کر دیا، بولا۔ "زبیدہ! میرا خیال ہے تو مجھ سے ناراض ہے اور طبیعت کی خرابی محض ایک بہانہ ہے۔"

زبیدہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور پھر یکا یک ہارون کی گود میں سر رکھ کر رونے لگی۔

ہارون نے زبیدہ کی زلفوں سے کھیلنا شروع کر دیا اور اس کی پیشانی چوم لی۔ "زبیدہ! کیا بات ہے تو رو کیوں رہی ہے؟"

زبیدہ نے کہا۔ "امیر المومنین کے حرم میں ان دنوں کتنی ہی کنیزیں موجود ہیں جو خفا میں لاتی ہیں؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "شاید تین سو۔۔۔ مگر کیوں؟"

زبیدہ نے پوچھا۔ "میں نے بھی امیر المومنین پر اشارہ بھی یہ بات ظاہر کی کہ میں ان کی موجودگی سے خوش نہیں ہوں؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "نہیں تو ایسا تو کبھی نہیں ہوا مگر یہ کیوں؟"

زبیدہ نے کہا۔ "اگر ان میں اور اضافہ ہو جائے تو کیا آپ کا خیال ہے کہ میں کوئی اعتراض کروں گی؟"

ہارون نے ایک بار پھر اس کی پیشانی چوم لی اور بالوں کی لٹ سے کھیلنے لگا۔ "نہیں تو اعتراض نہیں کرے گی، میں جانتا ہوں۔"

زبیدہ نے کہا۔ "کیا یہ درست ہے کہ امیر المومنین روزانہ یحییٰ برکی کے پاس ملے جاتے ہیں؟"

ہارون کی سمجھ میں کچھ کچھ بات آگئی، مسکرا کر بولا۔ "ہاں، میں ہر روز یحییٰ کے پاس چلا جاتا ہوں۔"

زبیدہ نے تڑپ کر پوچھا۔ "میں پوچھتی ہوں آخر کیوں؟ امیر المومنین ہر روز وہاں کیوں ملے جاتے ہیں؟"

ہارون نے کہا۔ "لیکن تو یہ سوال کیوں کر رہی ہے؟ اگر میں اس کا جواب نہ دوں تو؟"

زبیدہ نے کہا۔ "جب پھر میں یہ سمجھوں گی کہ اس میں کوئی ایسی بات ضرور ہے جو ناگفتنی ہے اور امیر المومنین اس کو ظاہر کر دینے میں کسی قسم کی سبکی محسوس کرتے ہیں۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "میں تیرا مطلب سمجھ گیا۔"

زبیدہ جیسے کبریا کی آواز بے حد پسند ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بات نہیں اور تو معلوم نہیں کس مخالف لے کا شکار ہو گئی۔"

زبیدہ نے کہا۔ "امیر المومنین! آپ کو اس کی آواز پسند ہے۔ میں آپ پر اعتبار کرتی ہوں لیکن لوگ سرگوشیوں میں معلوم نہیں کیا کچھ کہتے پھرتے ہیں۔ میں غیرت سے سر جاتی ہوں جب لوگ کہتے ہیں کہ امیر المومنین مفتی ابراہیم موصلی کی محبوبہ کبریا پر عاشق ہو گئے ہیں اور ابراہیم کو قید خانے میں ڈال کر اس کی محبوبہ پر قبضہ جمانا چاہتے ہیں۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "واللہ یہ بہت بڑا اور بہت برا اتہام ہے جو کوئی شخص مجھ پر لگا سکتا ہے، ایسی کوئی بات نہیں۔"

زبیدہ نے کہا۔ "امیر المومنین! اولوں کا حال خدا جانتا ہے۔ لوگ تو وہی کہیں گے جو دیکھیں گے یا سنیں گے۔"

ہارون نے ایک بار پھر زبیدہ کو یقین دلایا۔ "زبیدہ! میں تجھ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ میں اس کی آواز کا عاشق ہوں، مجھے اس کی ذات سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں۔"

زبیدہ نے ہارون کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں۔

"امیر المومنین! اگر یہ بات ہے تو محض آواز سننے کی خاطر بدنام ہونے سے حاصل؟"

ہارون نے زبیدہ کو آغوش میں لے لیا اور وارفتگی میں کہا۔ "زبیدہ! اگر تو اس سے خوش ہو جائے گی کہ میں کبریا کے پاس نہ جاؤں تو میں اس کے لیے تیار ہوں۔"

زبیدہ نے سر سے عقاب کھول دیا اور پر جوش لپکے میں کہا۔ "جب پھر میں بھی بیمار نہیں پڑتی۔ میں اچھی ہو گئی۔ اب کسی دوا کی بھی ضرورت نہیں۔"

ہارون کو ہنسی آگئی اور پھر دونوں ہی بے ساختہ ہنسنے لگے۔ ان کے زور زور سے ہنسنے کی آوازیں کنیزوں نے سنیں تو ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر مسکرائے لگیں۔

☆ ☆ ☆

اس کے بعد کبریا، امیر المومنین کا انتظار ہی کرتی رہی۔ اسی دوران یحییٰ نے ہارون کو مطلع کیا کہ ایک گہرا کنواں تیار ہے۔ ہارون نے کہا۔ "کیا اس کی چابی تک پہنچ کر دی گئی ہے؟"

یحییٰ نے جواب دیا۔ "جی امیر المومنین۔"

ہارون نے کہا۔ "یا ابی! آپ کنویں کے چمچ میں اس طرح دیوار کھڑی کر دیجیے کہ وہ دو حصوں میں تقسیم ہو جائے۔"

یحییٰ نے جواب دیا۔ "یہ کوئی بڑا اور دشوار کام نہیں ہے۔ دو دن کے اندر ہو جائے گا۔"

ہارون نے پوچھا۔ "یہ کنواں کہاں ہے؟"

یحییٰ نے جواب دیا۔ "میرے قعر کے ایک حصے میں۔"

ہارون نے فکر مندی سے کہا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے ایک بار اور آپ کے پاس آنا پڑے گا۔"

یحییٰ نے تعجب سے کہا۔ "امیر المومنین! ایک بار اور آنے کا میں مطلب نہیں سمجھا؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "یا ابی! زبیدہ کو یہ بات نا پسند ہے کہ میں کبریا سے ملوں اور میں نے اس سے وعدہ کر لیا ہے کہ اب میں کبریا کی آواز سننے آپ کے گھر نہیں جاؤں گا۔"

یحییٰ نے عرض کیا۔ "امیر المومنین! آپ میرے گھر کبریا کی آواز سننے نہ آئیں، کسی اور غرض سے تو آئی سکتے ہیں۔ اس کو میں اپنی بد قسمتی سمجھوں گا کہ آپ میرے گھر محض اس لیے نہیں آسکیں گے کہ وہاں کبریا رہتی ہے۔"

ہارون نے مسکرا کر جواب دیا۔ "آج سے تیسرے دن کنویں کے پاس ایک شاندار تقریب ہوگی۔ آپ انتظام

کر دیجیے۔ میں اپنے ندیموں اور امراء کے ساتھ آجاؤں گا۔"

یحییٰ نے پرست لہجے میں عرض کیا۔ "یہ میری خوش قسمتی ہے۔ خدا آپ کو ہم سب پر بیشمار سلام قلمن رکھے۔"

یحییٰ چلا گیا اور کنویں کے چمچ میں دیوار تعمیر کروانے لگا۔ کبریا بڑی بے یقینی سے ہارون کا انتظار کرتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہارون نے ایک دم آمد و رفت کیوں بند کر دی ہے۔ یحییٰ اس کی بے یقینی اور انتظار کو شدت سے محسوس کرتا رہا۔

تیسرے دن صبح ہی سے یحییٰ نے کنویں کے قریب قعر کے احاطے میں شامیانے کھڑے کر دیا۔ فرش پر خوب صورت اور صاف ستھری چاند نیاں بچھا دی گئیں۔ آخری سرے پر ایک تخت پر پھول دار مینی چادریں بچھا دی گئیں اور ایک بڑے گاؤں کیجے کے ساتھ دو چھوٹے کیجے بھی رکھ دیے گئے۔ نیچے چاند نیوں پر بھی جگہ جگہ گاؤں کیجے رکھ دیے گئے۔ یحییٰ یہ کام اپنی نگرانی میں انجام دلواتا رہا۔

ظہر کے بعد ہارون بھی اپنے ندیموں اور امیروں کے ساتھ اس شامیانے کے نیچے پہنچ گیا۔ یحییٰ نے ہارون کو وہ کنواں دکھایا جس کے افتتاح کے سلسلے میں یہ محفل منعقد ہوئی تھی۔

ہارون نے کنویں میں جھانک کر دیکھا۔ یہ خاصا چوڑا کنواں تھا اور چمچ کی دیوار سے تقسیم شدہ دونوں حصوں کی چابی تک جانے کے لیے دونوں طرف ذیبنے بنا دیے گئے تھے اور زینوں کے اوپر انہیں دروازوں سے بند کر دیا گیا تھا۔ ہارون یحییٰ کے ساتھ باری باری دونوں طرف سے اندر اترتا اور پختہ فرش پر بیٹھ کر گردن اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا۔ اوپر قعر کی صحت نظر آ رہی تھی۔

ہارون نے لمبی سانس لیں اور گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ یحییٰ سے کہا۔ "یا ابی! بہت خوب، بالکل فیک۔ میں آپ کے کام سے مطمئن ہوں۔"

پھر وہ یحییٰ کو ساتھ لے کر باہر آ گیا۔ حاضرین نے ہارون کو آتے دیکھ کر کھڑے ہو کر استقبال کیا۔ ہارون نے یحییٰ کو حکم دیا۔ "ابراہیم اور ابو العباس کو حاضر کیا جائے۔"

وہیں معلوم نہیں کس طرح کبریا بھی پہنچ گئی۔ ہارون اس کو دیکھ کر بہت شیشیا۔ کبریا سر سے پاؤں تک نقش و نگار والی ریشمی چادر اچھی طرح۔۔۔ اوڑھے کھڑی تھی۔ ہارون نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ یحییٰ گھبرا ہوا کبریا کے پاس پہنچا اور پوچھا۔ "کبریا! تو یہاں کیوں آ گئی؟"

کبریا نے جواب دیا۔ "میرے آقا! آپ مجھے یہیں

کیا آپ شوگر سے مستقل نجات

آج کل تو ہر انسان شوگر کی مرض سے سخت پریشان ہے۔ کیونکہ شوگر انسان کو اندر ہی اندر کھوکھلا اور اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ ہم نے ایسی طبی یونانی قدرتی جزی بوٹیوں پر سرج کر کے خاص قسم کا ایک ایسا شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے جس کے استعمال سے ان شاء اللہ شوگر سے مستقل نجات مل سکتی ہے شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ شوگر کے وہ مریض جو آج تک اپنی شوگر سے نجات حاصل نہیں کر سکے وہ ایک بار ہمارا شوگر نجات کورس بھی آزما کر دیکھ لیں۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر اپنی تمام علامات بیان کر کے بذریعہ ڈاک وی پی شوگر نجات کورس منگوائیں۔

المسلم دار الحکمت رجسٹرڈ
ضلع حافظ آباد۔ پاکستان
0300-6526061
0301-6690383

فون اوقات
صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

ابو العتبیہ کا ساتھ چھوڑ کر صاف صاف احساں کر کے کہہ دیا۔ اپنی خدمت سے باز آیا اور امیر المومنین کی دستِ اغتیار کی کیونکہ اس طرح یہ امید پیدا ہو جاتی تھی کہ شاید کبیر حاصل ہو جائے لیکن شاعر ابو العتبیہ کا مضبوط کردار اس کے حوصلے پرست گرد ہوا تھا۔

بارون نے کنوئیں کے اوپر مقفل دروازوں کو کھلوا دیا اور ابراہیم مفتی اور شاعر ابو العتبیہ کو ان میں داخل کر دیا۔ وہ دروازے پر قدموں سے زینوں پر بیٹھے اور ہر شخص کو اپنے گزرتے چہ گئے۔ بارون نے دروازوں کو دوبارہ مقفل کر دیا اور اوپر سے جہنم کو حکم دیا۔ "واللہ تمہیں اس وقت تک نہیں دے گا جب تک تم دونوں مجھ سے راضی نہ ہو جاؤ۔"

اس سے پہلے جہنم کا تو ابراہیم اور ابو العتبیہ کو اوپر کی طرف دیکھتے پایا۔

کنوئیں نے یہ آواز بند دونوں سے کہا۔ "افسوس کہ امیر المومنین نے ہمیں دینے کی حد درجہ سختی لیکن نادانوں کی کج فہمی میں یہ بات نہ آئی۔"

بارون نے مقفل دروازوں کے پیچھے سے دشت در اندام کا جہنم دیکھا تھا۔

دروازے مقفل کر دیے گئے اور جہنم ایک بار اپنی اپنی جگہ پر چلا گیا۔ بارون کا دل نہیں مانتا، اس نے کنوئیں سے کہا۔ "یانی اگر زبیدہ نے کبیر سے نہ ملنے کا مہذبہ نہ ہوتا تو میں آج کبیر کی دشت اور خوب صورت آواز ضرور سنا۔"

کنوئیں نے عرض کیا۔ "امیر المومنین کو مہذبہ نہ ہونے میں جہد نہیں کرنی چاہیے۔ ویسے آپ کبیر سے نہ فرما لیں کریں۔ نہ حکم دیں۔ وہ میرے حکم پر اپنی آواز کا سحر سمیرے گی اور فضا کو ساز و آواز سے لبریز کر دے گی۔"

اس کے بعد کنوئیں کبیر کے قریب گیا اور اس کو کانے کا حکم دیا۔ کبیر باہم خود سکتے کے مریض کی طرح چپ چاپ کھڑی رہی۔ کنوئیں کا حکم اس طرح سنا گیا کہ وہ سن ہی نہیں رہی۔ کنوئیں نے ایک بار پھر کہا۔ "کبیر! تو کیا سوچ رہی ہے؟ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ اپنی آواز کا سحر اس فضا میں گھونٹ دے۔"

کبیر باہم کے مریض کی طرح تھڑکی اور آنکھیں بند کر کے چلائی۔ "خدا کے لیے انہیں کنوئیں سے نکال لو۔ ان بازگ مزاج اور حساس ہنرمندوں پر رحم کرو۔ میں یہ سب نہیں برداشت کر سکتی۔"

کنوئیں نے اس کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔ "کبیر! ہوش میں آ۔ تیرا جو کام ہے وہ کر، فضول باتوں میں نہ پڑ۔"

اور یادداشت میں محفوظ رہ جائیں گے پھر کیا کوئی بھی دانا دیتا یہ پسند کرے گا کہ موت کے بعد اس کو عید شکلوں اور فاسقوں میں شامل کر دیا جائے۔"

بارون نے سختی سے کہا۔ "عاجب! ان دونوں سے کہہ دو کہ ہادی کی موت نے انہیں ان کے عہدوں کی پابندی سے آزاد کر دیا ہے۔ انہیں آج کے دن یہ آخری موقع دیا جا رہا ہے۔ یہ جاؤں تو دربار سے وابستگی اختیار کر کے عزت و مقام حاصل کر لیں ورنہ انہیں بیٹھ کے لیے قید کر دیا جائے گا۔ اب کے ان کا قید خانہ نو تعمیر کنوئیں ہے جس کے دو حصے ہیں۔ اس کے ایک حصے میں شاعر ابو العتبیہ رہے گا اور دوسرے میں ابراہیم۔"

ابراہیم کو خوف سے پھینکا گیا، اس نے ابو العتبیہ سے پوچھا۔ "ابو العتبیہ! تو نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

ابو العتبیہ نے جواب دیا۔ "میں اپنا فیصلہ سنا چکا ہوں، مجھے کنوئیں کا زندان خوف زدہ نہیں کر سکتا۔"

ابراہیم نے عاجب کو جواب دیا۔ "غالباً میرا جواب تو پہنچ چکا ہوگا، ہمیں عہد شکنی منظور نہیں۔"

بارون نے درستی سے کہا۔ "انہیں کنوئیں میں اس وقت تک قید رکھا جائے جب تک کہ یہ میری پیشکش قبول نہ کر لیں۔"

کبیر با ابراہیم کے پاس پہنچ گئی، بولی۔ "افسوس کہ آپ دونوں مقفل سے عاری ہیں ورنہ امیر المومنین کی پیشکش قبول کر لیتے۔"

کنوئیں نے ان دونوں کو ایک بار پھر موقع دیا۔ "نادانو! امیر المومنین کی بات مان لو، ورنہ پچھتاؤ گے۔"

ابراہیم نے کبیر کی طرف دیکھا۔ "میں تنہا نہیں ہوں ابو العتبیہ کی مستقل مزاجی میرا حوصلہ بڑھا رہی ہے۔"

بارون نے سختی سے کہا۔ "یابی! آپ کو تامل کیوں ہے؟ دونوں کو چاندناں میں ڈلواد دیجیے۔"

کنوئیں اٹھا اور چند خدمت گاروں کی مدد سے ان دونوں کو کنوئیں کی طرف لے چلا۔ بارون بھی تخت سے اٹھ کر آیا اور اپنے ندیموں اور امیروں کو ساتھ لے کر کنوئیں کی طرف چل دیا۔ کبیر باہم جہنم میں خود کو بالکل تنہا محسوس کر رہی تھی۔ ریشمی نقش و نگاروں کی چادر سر سے ڈھلک کر شانوں پر رک گئی تھی۔ اس کی سیاہ زلفیں چمک رہی تھیں۔ بارون نے سرسری نظروں سے کبیر کی طرف دیکھا اور خوف زدہ انداز میں نظریں پھیر کر آگے بڑھ گیا۔ ابراہیم بھی اس جہنم میں صرف کبیر باہم کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کئی بار جی چاہا کہ وہ

رہنے دیں، وہاں ہی پر مجبور نہ کریں۔ میں امیر المومنین سے چند باتیں کر کے چلی جاؤں گی۔"

بارون نے اپنے عاجب سے کہا۔ "اس مغنیہ سے کہہ دے کہ میں اس سے بات نہیں کروں گا کیونکہ میں نے زبیدہ سے اس کا عہد کر لیا ہے۔"

کبیر نے عرض کیا۔ "امیر المومنین ایک با اختیار انسان ہیں۔ انہیں اس قسم کے عہد کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی جبکہ حرم سرا میں کئی سو کنیزیں پہلے ہی سے موجود ہیں۔ کیا امیر المومنین نے ان کنیزوں کے خلاف بھی کوئی عہد کیا ہے؟"

بارون نے عاجب سے کہا۔ "اس سے کہہ دے کہ میں اس کے سوالوں کے جوابات کا پابند نہیں۔ ہر چند کہ میں اس کی آواز کا عاشق ہوں مگر میری غیرت اس پر آمادہ نہیں ہوتی کہ میں ایسی کنیز کو اپنی تربت اور صحبت بخشوں جو ابراہیم مفتی کی محبوبہ کہلاتی ہے۔ اگر اس کے دامن حسن و ذات پر یہ داغ نہ ہوتا تو میں اپنی صد ہا کنیزوں میں اس کو بھی شامل کر لیتا۔"

کبیر نے جواب دیا۔ "یہ میری بد قسمتی ہے کہ میں ایک ایسے داغ سے جہنم کی جا رہی ہوں جس کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔ ویسے مجھے حرم کی کنیزوں میں شامل ہونے کا ذرا بھی شوق نہیں۔"

اسنے میں کنوئیں کے ملازم ابراہیم مفتی اور شاعر ابو العتبیہ کو لے کر حاضر ہو گئے۔ بارون کے حکم پر انہیں اس کے تخت کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ بارون نے کنوئیں کو اپنے دائیں جانب بٹھالیا۔ کبیر با جہاں کھڑی تھی وہیں رہی۔ بقیہ جو جہاں تھا وہیں موجود رہا اور سب کی توجہ ابراہیم مفتی اور شاعر ابو العتبیہ کی طرف ہو گئی۔

بارون نے عاجب سے کہا۔ "ان دونوں سے پوچھو کہ انہوں نے اپنے فیصلے بدلے یا نہیں؟"

ابراہیم نے عاجب کے سوال پر جواب دیا۔ "امیر المومنین سے کہہ دیجیے کہ عہد شکنی کرنے والوں کو خدا پسند نہیں کرتا۔ ہم نے امیر المومنین کے بھائی ہادی مرحوم سے یہ عہد کیا تھا کہ ان کے علاوہ کسی کو گمان نہیں سنائیں گے چنانچہ ہم اس عہد کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ ورنہ ہمیں امیر المومنین سے بھڑکون ملے گا۔"

بارون نے عاجب سے کہا۔ "شاعر ابو العتبیہ سے پوچھو، وہ کیا کہتا ہے؟"

شاعر ابو العتبیہ نے جواب دیا۔ "انسان فانی ہے۔ آتا جاتا رہے گا لیکن اس کے اعمال اور کردار دنیا کے حافظے

لیکن کبریا نہ زور زور سے رونے لگی، چٹکیاں لے لے کر۔ اس کی آنکھیں برس پڑیں۔ حلق کی پانسری سرکھیرنے لگی۔ ہارون نے گریہ زاری میں بھی ترنم محسوس کیا۔ اس نے بھی گواہی دے دیا اور کہا: "کبریا کو رونے دیجیے یا ابی۔ میں اس میں بھی ترنم اور دلکشی محسوس کر رہا ہوں۔"

یعنی نے کھیا نے لہجے میں کہا: "ویسے یہ بہت بری حرکت ہے یا امیر المومنین! مگر کبریا بھی کیا کرے، شاید اس وقت وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ خدا اس پر رحم کرے۔"

کبریا کے رونے کی آواز کنوئیں کے اندر ابراہیم اور ابو العتّاب یہ تک پہنچی رہی تھی۔ ابراہیم کی کچھ میں نہیں آیا کہ کبریا کیوں رورہی ہے؟ وہ بے چین ہو کر ابو العتّاب سے کہنے لگا: "میرے زندانی رفیق! کیا تو کسی کے رونے کی آواز سن رہا ہے؟"

ابو العتّاب نے جواب دیا: "ہاں یہ کبریا ہے، معلوم نہیں کیوں رورہی ہے؟"

ابراہیم نے کہا: "ہاں، یہ کبریا ہی ہے جو میرے لیے رورہی ہے۔ صرف میرے لیے۔"

کبریا روئی ہوئی کنوئیں کے قریب پہنچی اور اس کے ایک دروازے کے پاس بیٹھ کر دیر تک روئی رہی۔

ہارون اور یحییٰ رقد میں کئی ماہ رہ کر بغداد واپس چلے گئے۔ ابراہیم اور ابو العتّاب کنوئیں میں قید رہے۔ کبریا بدرجہ مجبوری بغداد چلی گئی۔ اب کبریا میں پہلی جیسی تیزی طراری نہیں رہی تھی۔ یعنی نے کبریا کو بار بار یہی سمجھایا کہ امیر المومنین سے گستاخی نہ کر، کیونکہ اگر ان کے دل میں کسی طرح گمراہی پڑ گئی تو پھر کوئی نہیں جاسکے گی۔

کبریا نے جواب دیا: "میرے آقا! میں ابو العتّاب اور ابراہیم کی قید سے بہت غمزدہ ہوں لیکن میں ان کے لیے کچھ کر نہیں سکتی۔ افسوس صد افسوس۔"

یعنی نے کہا: "بہر حال کبریا! میں رقد جانے والا ہوں تاکہ ان امتوں کو راضی کرنے کی کوشش کروں۔"

کبریا خاموش ہو گئی۔ ہارون نے ایما پر یحییٰ رقد کیا اور ابراہیم مفتی اور شاعر ابو العتّاب کو راضی کرنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ آخر یہ کہہ کر واپس چلا آیا: "تم دونوں اپنی شوخی قسمت کے امیر ہو۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

کئی سال کی قید نے ابراہیم کو اداس اور مضمحل کر دیا۔ ابو العتّاب تو پہلے ہی سے مضمحل تھا۔ وہ جھیل گیا اور اپنے کسی

انداز یا لفظ سے یہ بات نہیں ظاہر ہونے دی کہ وہ اپنی اس قید سے پشیمان اور گم بہت ہو رہا ہے۔

شب و روز کا سلسلہ جاری رہا۔ موسم آتے جاتے رہے۔ ماہ و سال کا چکر چلتا رہا مگر ابراہیم اور ابو العتّاب اپنے مستشف و دیوار کے علاوہ کچھ بھی نہ دیکھ سکے۔ ان کا بہت زیادہ دل گھبراتا توڑنے پر چڑھ کر دروازے تک چلے جاتے اور ایک پتلی دروازے میں دیر تک کوئی درزا یا سوراخ تلاش کرتے رہتے جس سے وہ کنوئیں کے باہر کی دنیا کی ہلکی سی جھلک ہی دیکھ سکتے۔ ناکامی سے ان کے دل سے ایک ہوک سی افٹنی اور دل اختلاج کا شکار ہو جاتا۔ دونوں طرف کے زینوں کی آخری دو سیزیاں ابراہیم اور ابو العتّاب کو آسنے سانسے کر دیتی اور وہ دونوں باتیں کر کے اپنے دلوں کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرتے۔

ابراہیم نے حسرت و یاس سے اوپر چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "ابو العتّاب! کیا اس چھت کے اوپر آسمان اب بھی موجود ہے؟"

ابو العتّاب نے سرد آہ بھری۔ بولا: "پہلے تو ہوا کرتا تھا، اب پتا نہیں۔"

ابراہیم نے اس کے چہرے پر چھائی ہوئی مردنی اور جھریوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا: "ابو العتّاب! تو تو بوڑھا ہو رہا ہے۔ دکھوں اور غموں نے جھریوں اور سیاہیوں کی شکل میں بسیرا کر لیا ہے۔ ذرا آئیے میں اپنی شکل تو دیکھ۔" لیکن پھر فوراً ہی احساس ہوا کہ یہاں آئینہ کہاں۔ بولا: "میں آئینہ کہاں میر۔ تیرا آئینہ تو میں ہوں۔ آئیے کی طرح میں بھی جھوٹ نہیں ہوں۔"

ابو العتّاب نے ابراہیم کو کھڑکھٹو طعن سے دیکھا: "جو کچھ تو نے میرے چہرے پر دیکھا ہے، وہی میں تیرے چہرے پر دیکھ رہا ہوں اگر تیری بیوی تجھے اب دیکھ لے تو خوفزدہ ہو جائے۔ تیری ڈانگی اور سر کے بالوں پر برف باری ہو رہی ہے۔"

ابراہیم نے کہا: "ابو العتّاب! کنوئیں کی انتہائی محدود اور تنگ فضا سے میں بہت عاجز آچکا ہوں۔ آخر اس یکسانیت کو کس طرح دور کیا جائے؟"

ابو العتّاب نے جواب دیا: "اے کاش ہم دنیا کا شور و غل ہی سن سکتے۔"

ابراہیم نے حسرت سے کہا: "ہم جب یہاں سے نکلیں گے تو بری بری خبریں سنیں گے۔ ہمارے کتنے ہی ساتھی مر چکے ہوں گے اور کتنے ہی جانے کی تیاریاں کر چکے

ہوں گے۔" ابو العتّاب نے جس کر جواب دیا: "لیکن ہم یہاں سے نکلیں گے ہی کیوں؟ کیسے اور کب نکلیں گے؟ اس خیال است و محال است! جنوں۔"

دونوں بڑی دیر تک مایوسی اور حسرت سے باتیں کرتے رہے۔ باتیں کر کے جب دوبارہ کنوئیں کی چٹکیاں پر پہنچے تو دونوں پر ہول کا دورہ پڑا اور دونوں کچھ دیر کے لیے جاں کنی کی اذیت میں مبتلا ہو گئے۔

ابو العتّاب نے اس ہول کا علاج دریافت کر لیا۔ اس نے قوت تجلید کے سہارے ماضی کے پر لطف اور حسین واقعات کو سمجھ بھلا دیا اور ان کی محفل سجا کے مزے لینے لگا۔ کچھ دیر کے لیے کنوئیں کی تنگ دیوار کے گوشے دور چلا گیا۔

ابراہیم نے گفتگو شروع کیا اور ابو العتّاب نے عبرت آموز کلام سے دل بہلاتا رہا۔

صبح و شام ایک سن رسیدہ سفید ڈانگی والا انیس کھانا پہنچا دیتا۔ شام کو یہی بوڑھا روٹی کا انتظام کرتا۔ پھر ایک دن اس بوڑھے کی جگہ دوسرے نے لے لی۔ ابو العتّاب نے پوچھا: "وہ بوڑھا کہاں چلا گیا؟"

بوڑھے نے جواب دیا: "مر گیا۔"

ابو العتّاب کے دل پر چوٹ سی گئی۔ آہستہ سے بولا: "ایک دن ہم بھی مر جائیں گے۔"

لیکن یہی خبر جب ابراہیم نے سنی تو وہ ہنجرے میں قید پرندے کی طرح ہنسنے لگا۔ وہ بار بار زینے سے چڑھنے اترنے لگا۔ اس دن دونوں ایک بار پھر زینے کی اوپری آخری سیزمی پر آسنے سانسے بیٹھ کر دنیا کی فانی باتیں کرنے لگے۔

ابو العتّاب نے کہا: "ابراہیم! میں نے اس تنگ و تاریک فضا سے نکلنے کا راستہ دریافت کر لیا ہے۔"

ابراہیم نے بے چینی سے پوچھا: "وہ راستہ کدھر ہے؟ کہاں سے ہے؟ تجھے بھی پتا۔"

ابو العتّاب نے جواب دیا: "میں تو جب گھبراتا ہوں تو خیالوں کی محفل سجا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ ماضی کی حسین اور پر لطف شامیں، بے تکلف اور ہم شرب و ہم مذاق دوستوں کے ساتھ پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہو جاتی ہیں اور میں سرور و شادماں اپنے رگ و پے میں زندگی دوڑتی محسوس کرنے لگتا ہوں۔"

ابراہیم نے سرد آہ بھری، کہا: "افسوس کہ اب تو ماضی کی حسین یادیں بھی یکسانیت کا شکار ہو گئیں۔ کبریا کا

رموز شامی رہنمائی تصور میرا آخری سہارا تھا۔ اب یہ آخری سہارا بھی فرسودگی کا شکار ہو گیا۔ میں ان سے بھی اتنا محبت نہیں کر سکتا۔ اس کی تنگ و تاریک اور خوفناک فضا حسن اور تھیر کی دشمن ہے۔ یہاں کی عمر گزیدہ فضا روشنی کی بجلی سی کرن تک کو برداشت نہیں کر سکتی۔"

دونوں اپنے اپنے سروں کو مزے ہوئے محفلوں پر رکھ کر آرام و انکار کی دنیا میں پھنس گئے۔

ابراہیم نے اس رات خواب میں کبریا کو اس حال میں دیکھا کہ وہ ہارون کی محفل طرب میں ابونو اس کا کلام

نہایت دلکش و مہن میں سن رہی ہے۔ ابونو اس نے اپنے اشعار میں معاملہ بندی کا اتنا حسین اور سرور انگیز سماں کھینچا تھا کہ ابراہیم نے ہارون اور یحییٰ برکی کی پروا کیے بغیر بھری محفل میں کبریا کو سینے سے لگا لیا۔ کبریا کے لباس کی خوشبو نے دل و دماغ کو معطر کر دیا اور شباب کی گرمی اور مستی نے

پورے جسم میں پہچان اور انتشار پیدا کر دیا۔ ہارون نے منہ پھیر لیا اور یحییٰ برکی نے ان دونوں کو محفل سے نکلوا دیا۔

ابراہیم نے مزید دیکھا کہ وہ کبریا کے ساتھ اپنے گھر میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے یحییٰ برکی آیا اور ابراہیم کے دروازے سے ذرا دور گھڑا ہو گیا اور ایک آدمی کو بھیج کر کبریا کو واپس بلوایا۔ ابراہیم اپنے دروازے پر کھڑا ہو گیا اور کبریا کو یحییٰ برکی کے ساتھ واپس جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

بیداری کے بعد خواب کا نقش طاری ہو گیا اور وہ خواب کو خیال اور حافظے میں قید کر کے لطف اندوز ہونے لگا۔ علی الصباح وہ اوپر کے آخری زینے پر بیٹھ کر خوش الحانی میں گانے لگا۔ ابونو اس کا لبو و لعل آمیز کلام، جس میں شاعر نے اپنی ان حسرتوں کا ماتم کیا تھا جو پوری نہ ہو سکیں اور ان بوالبوسوں پر فخر کیا تھا جو خواب و خیال کی حد سے روپے عمل لائی گئی تھیں۔ ابراہیم کی خوش الحانی نے ابو العتّاب کو بیدار کر دیا اور وہ آنکھیں ملتا ہوا اوپر پہنچا، یہ دلچسپ منظر دیکھا کہ ابراہیم آنکھیں بند کیے دنیا و مافیہا سے غافل گانے میں مشغول ہے۔ ابو العتّاب یہ چپ چاپ بیٹھ گیا۔ گانے کے بعد ابراہیم جیسے ہی خاموش ہوا ابو العتّاب نے کہا: "ابراہیم، میرے دوست! اگر تجھ کو گانا ہی تھا تو میرا عبرت انگیز و پر عظمت کلام گاتا۔ ابونو اس کا کلام تو محفلوں اور وصل کی راتوں میں گائے جانے کا مستحق ہوتا ہے۔"

ابراہیم نے ٹھنڈی سانس بھری اور مایوسی سے کہا: "ابو العتّاب! سوچ تو کسی ہم دونوں کب تک یہاں قید رہیں گے؟"

ابو العتبیہ نے جواب دیا: "جب تک ہارون راضی نہیں ہو جاتا۔"

ابراہیم نے دل چلے سجدے میں کہا: "ابو العتبیہ! واللہ وہ ہمیشہ راضی رہے گا اور ہم دونوں ہمیشہ سب سے رہیں گے۔"

ابو العتبیہ نے سر آہ بھری: "آہ، شوکی قسمت کا کوئی علاج نہیں۔"

ابراہیم نے جواب دیا: "مگر میں نے اس کا علاج تلاش کر لیا ہے۔"

ابو العتبیہ نے حیرت سے پوچھا: "کیا... واقعی؟"

ابراہیم نے کہا: "ابو العتبیہ! میں نے عہد کیا تھا کہ ہادی کی موت کے بعد میں بھی نہیں گاؤں گا۔ مگر آج رات کے ایک حسیں اور پر کیف خواب نے مجھے بے اختیار گانے پر مجبور کر دیا اور میں نے نادانگی اور بھول میں اپنا عہد توڑ دیا۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ جو عہد نادانگی میں نوٹ کیا، اس کو جوڑنے سے فائدہ؟ کیوں نہ ہارون کو راضی کر لیا جائے۔"

ابو العتبیہ نے مایوسی سے کہا: "تو نے عہد توڑ دیا، میں نے تو نہیں توڑا۔ افسوس کہ اب تو بھی یہاں سے چلا جائے گا، میں تمہارے جاؤں گا۔"

ابراہیم نے عربی کا ایک شعر پڑھا: "جتنا ہو سکے دنیا سے فائدہ اٹھالے کیونکہ بالآخر موت کے ذریعے آرام و آسائش کے سب اسباب چھن جائے وائے ہیں۔" پھر ابو العتبیہ سے پوچھا: "یہ کس کا شعر ہے؟"

ابو العتبیہ نے جواب دیا: "یہ میرا شعر ہے۔"

ابراہیم نے کہا: "تب پھر اپنے اس شعر پر عمل کیوں نہیں کرتا؟"

ابو العتبیہ نے پوچھا: "میں اس پر کس طرح عمل کروں؟"

ابراہیم نے جواب دیا: "تو ہارون کی شان میں ایک قصیدہ لکھ۔ میں اس کے لیے ایک دھن تیار کروں گا اور پھر ان کے توسط سے ہم دونوں ہارون کے دربار میں پہنچ جائیں گے اور ہم دونوں تیرے شعر کے مصداق ممکنہ حد تک مل دنیا سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے کیونکہ وہ دن دور نہیں جب موت تمام آرام و آسائش چھین لے گی۔"

ابو العتبیہ خاموش ہو گیا اور کچھ دیر گھٹس کا شکار رہا۔ پھر جیسے غمی کی شکست ہو گئی اور اثبات نے فتح پائی۔ ابو العتبیہ سچ کی طرح تازہ اور خوشگوار کیفیت میں اوپر کے

آخری رہنے پر ہی ہارون کی شان میں قصیدہ کہنے لگا۔ دو شعر موزوں کر چکے کے بعد ابراہیم کو سنا دیے تاکہ وہ ان کے لیے ایک بہترین دھن بتالے۔

اب وہ دونوں ہی اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ ابو العتبیہ بہترین خیال، اعلیٰ مضمون، شاندار اور پر کیف نغموں کی فکر اور انہیں شعر کے وزن میں قید کر دینے کی کوشش میں لگ گیا اور ابراہیم انہیں اپنی اثر انگیز اور کانوں میں رس مگھول دینے والی دھن اور آواز میں ڈھال رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

رقہ سے بغداد تک یہ خبر مشہور ہو گئی کہ مشہور شاعر ابو العتبیہ اور معنی ابراہیم نے اپنے اپنے عہد توڑ دیے اور وہ ہارون کے دربار سے واپس چلے گئے پر آدھ ہو گئے ہیں۔ ہارون نے ان دونوں کے لیے ایک وفد رخصت بھیج دیا جس نے انہیں نہایت عزت و احترام سے قید سے نکالا۔ باہر کی آزاد فضا نے ان دونوں کو مدہوش کر دیا اور وہ لڑکھڑاکر گر گئے لیکن کچھ دیر بعد جب ہوش میں آئے تو ان کے دل خوشی سے لبریز تھے اور ان کا انگ انگ مسکرا رہا تھا۔

قصر الذہب میں ایک شاندار دربار لگا۔ ہارون شجر ریشی پردے کے پیچھے بیٹھا تھا۔ اس کی ایک طرف شہزادے اور دوسرے خوشی رشتے دار بیٹھے تھے اور دوسری طرف عیسیٰ، حاجب اور چند خدمت تھے۔ پردے کے باہر دوسرے امراء اور منصب دار موجود تھے۔ ابو العتبیہ اور ابراہیم کو ہارون سے اتنا قریب رکھا گیا کہ وہ انہیں اچھی طرح دیکھ سکے اور ان کی آوازیں بھی سن سکے۔ دربار میں غضب کا سناٹا تھا۔ یکا یک اس ستارے کو دربار کے ایک منصب دار نے توڑ دیا اور اعلان کیا: "عہد حاضر کے دو ہنرمند اپنی اپنی غلطیوں پر تادم و شرمسار دربار میں حاضر ہیں، دونوں ہنرمند یکا یک روزگار اور عدیم المثال ہیں۔ ان میں سے ایک تو شاعر ابو العتبیہ ہے اور دوسرا بے مثل معنی ابراہیم موسلی۔ ان دونوں نے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر ندامت کا اظہار کیا ہے۔ شاعر ابو العتبیہ نے اپنی ندامت کو اپنے اشعار میں قید کر دیا اور ابراہیم معنی نے اپنی غلطیوں... معذرتانہ دھن اور اثر انگیز آواز میں بارگاہ خلافت میں پیش کرنے کی درخواست کی۔ حاضرین گوش بر آواز ہو جائیں۔"

ہارون نے اشارے سے حکم دیا کہ ابراہیم شروع کرے۔ ابراہیم نے ابو العتبیہ کا قصیدہ اپنی خاص دھن

میں گانا شروع کر دیا۔

"خدا نے انسانوں کو خاص خاص صلاحیتوں سے نوازا ہے۔

خوش قسمت ہے وہ شخص جس نے خود کو پہچان لیا اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق کام کیا۔

اور بد قسمت ہے وہ جو زندگی بھر لامبلی میں رہا اور اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا رہا۔

اے ابو العتبیہ! خدا نے تجھے شاعرانہ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔

تیرے اشعار عبرت آمیز ہوتے ہیں۔

تو چاہے تو اپنے اشعار سے سوئے ہوؤں کو بیدار کر دے۔

اور نہیں تو غافلوں کو غافل ہی رہنے دے۔ حیرتی صلاحیتیں خدا کا قرض ہیں۔

اپنی صلاحیتوں سے انسانوں کی اصلاح کر اور انہیں خواب غفلت سے بیدار کر دے۔

جب تو نے ہادی کی موت کے بعد شاعری سے توبہ کر لی تو خدا کے نیک بندے اور خلیفہ المسلمین اور امیر المومنین ہارون نے تجھ کو توبہ کرنے کا حکم دیا۔

کیونکہ روشن ضمیر خلیفہ کو اٹھا ہو چکا تھا کہ خدا کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کام نہ لیتا، خدا سے کیے ہوئے عہد کو توڑ دینے کے مترادف ہے۔

میں نے نادانی اور جہالت کے زیر اثر امیر المومنین کا کہنا نہیں مانا اور قید کر دیا گیا۔

یہاں تک کہ آخر زنداں سے مجھے مہم فیضی نے بتایا کہ امیر المومنین ہارون کی بات مان لے۔

اور شاعری سے عبرت و عظمت کا کام لے کر خدا سے کیے ہوئے عہد کو استوار کر لے۔

میں نے اپنی غلطی مان لی اور امیر المومنین کے روبرو تادم و شرمسار ہو گیا۔

اے امیر المومنین! میں تو آپ پر ہر بات عیاں ہے مگر چند نصیحتیں مجھ سے بھی سن لیں۔

آپ کہہ دیں کیا گناہوں سے توبہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں؟

دلوں کی اصلاح کس طرح ہوگی، وہ تو پھوڑے بن چکے ہیں۔

فقریب آدمی کا جسم روح سے خالی ہو جائے گا اور برزخہ شخص اپنی آنکھوں کے سامنے موت کا میخند الہرا ہوا

رہتا ہے۔

ابو العتبیہ نے جواب دیا: "ابو العتبیہ! میں نے عہد کیا تھا کہ ہادی کی موت کے بعد میں بھی نہیں گاؤں گا۔ مگر آج رات کے ایک حسیں اور پر کیف خواب نے مجھے بے اختیار گانے پر مجبور کر دیا اور میں نے نادانگی اور بھول میں اپنا عہد توڑ دیا۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ جو عہد نادانگی میں نوٹ کیا، اس کو جوڑنے سے فائدہ؟ کیوں نہ ہارون کو راضی کر لیا جائے۔"

ابو العتبیہ نے مایوسی سے کہا: "تو نے عہد توڑ دیا، میں نے تو نہیں توڑا۔ افسوس کہ اب تو بھی یہاں سے چلا جائے گا، میں تمہارے جاؤں گا۔"

ابراہیم نے عربی کا ایک شعر پڑھا: "جتنا ہو سکے دنیا سے فائدہ اٹھالے کیونکہ بالآخر موت کے ذریعے آرام و آسائش کے سب اسباب چھن جائے وائے ہیں۔" پھر ابو العتبیہ سے پوچھا: "یہ کس کا شعر ہے؟"

ابو العتبیہ نے جواب دیا: "یہ میرا شعر ہے۔"

ابراہیم نے کہا: "تب پھر اپنے اس شعر پر عمل کیوں نہیں کرتا؟"

ابو العتبیہ نے پوچھا: "میں اس پر کس طرح عمل کروں؟"

ابراہیم نے جواب دیا: "تو ہارون کی شان میں ایک قصیدہ لکھ۔ میں اس کے لیے ایک دھن تیار کروں گا اور پھر ان کے توسط سے ہم دونوں ہارون کے دربار میں پہنچ جائیں گے اور ہم دونوں تیرے شعر کے مصداق ممکنہ حد تک مل دنیا سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے کیونکہ وہ دن دور نہیں جب موت تمام آرام و آسائش چھین لے گی۔"

ابو العتبیہ خاموش ہو گیا اور کچھ دیر گھٹس کا شکار رہا۔ پھر جیسے غمی کی شکست ہو گئی اور اثبات نے فتح پائی۔ ابو العتبیہ سچ کی طرح تازہ اور خوشگوار کیفیت میں اوپر کے

دیکھ لے گا۔

ہم سب محنت میں ہیں لیکن موت صبح و شام پتھر کا پتی رہتی ہے۔

جب نزع کا وقت آپہنچے گا اور سانس سینے کے اندر گزر جائے گی۔

اس وقت تجھے اس بات کا علم ہو گا کہ اب تک تو اندھیرے اور دھندلے میں رہا۔

پردے کے پیچھے سے بچکیوں کی آواز آنے لگی۔

ہارون زار و قطار رو رہا تھا۔ ابراہیم کی پرسوز لے اور ابو العتبیہ کے درد و اثر میں ڈوبے ہوئے اشعار نے ہارون کے دل کو ہلکا کر دیا تھا۔ عیسیٰ برکتی کا بیٹا فضل، ابراہیم کے پاس پہنچا اور کہا: "کیا تو اس لیے یہاں آیا تھا کہ امیر المومنین کو رادے؟" تجھ کو تو اس موقع پر کوئی خوشی کا لمحہ چھیننا چاہیے تھا۔"

ہارون نے دوری سے فضل کو ڈانٹا: "فضل! ابراہیم کو کچھ نہ کہہ، کیونکہ اس کی توبہ آواز اور لے ہے۔ کام تو ابو العتبیہ کا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ابو العتبیہ نے جو کچھ کہا، سچ کہا۔"

اس دن ہارون نے دونوں کو ایک ایک لاکھ درہم نقد اور ایک ایک سو مائیس انعام میں دے دیں۔

ابراہیم درہموں اور خلیفوں سے لدا پھندا مہر پہنچا تو درود و بار سے خوشیاں منگنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

قید کی پریشانیوں اور محرومیوں نے حریف ابراہیم کو اور زیادہ حریف کر دیا تھا۔ عیسیٰ برکتی نے اس کو مبارک باد دی کہ وہ راجہ راست پر آ گیا لیکن نقد کچھ بھی نہ دیا۔ ابراہیم کو خوب معلوم تھا کہ عیسیٰ اگر چاہے تو ہارون سے زیادہ نواز سکتا ہے۔ وہ مغرب کے بعد، رات کے اندھیرے میں قصر العین روانہ ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کو اتنی دولت اور شہ جائے کہ ایک شاندار قصر کا مالک ہو جائے اور اس میں امیرانہ شان سے رہے۔

دکانوں میں مہنگی مہنگی تھیں۔ مکانات کے اندر سے کبکس تھیں روشنی چھن کر باہر آ رہی تھی۔ راستے ہی میں اس نے مسجد سے عشا کی اذان سنی، مسجد کے بلند و بالا میناروں میں روشنیوں ہورہی تھیں۔

عیسیٰ کو جب یہ معلوم ہوا کہ ابراہیم معنی اس سے ملنے آیا ہے تو اس نے فوراً ہی شرف بازیابی بخشا اور دارالفیض میں عزت و احترام سے بٹھایا۔ اس نے

ابراہیم کے سر جھانے ہوئے چہرے اور تباہ حال صحت کو غور سے دیکھا اور کہا۔ "ابراہیم! قسمت میں مہنتی پریشانیاں کبھی تھیں بھرت لیں۔ اگر تو نے میری بات مان لی ہوتی تو آج تیری حیثیت ہی کچھ اور ہوتی۔"

ابراہیم نے جواب دیا۔ "بہر حال میں نے بد پرستی لیکن آپ کی بات مان لی۔ اب آپ بھی میری تالیف قلب کے لیے کچھ کیجیے اور میری دعا میں کیجیے۔"

ابراہیم نے کہا۔ "اگر تو نے میری بات مان لی ہوتی تو اتنے دن روتے کے کنوئیں میں نہ رہتا پڑتا۔ میں تالیف قلب کیوں کروں؟ امیر المومنین سے درخواست کر، ممکن ہے کچھ اور مل جائے۔"

ابراہیم کو یکنی سے اس جواب کی امید نہیں تھی۔ وہ حسرت و پاپا سے یکنی کی صورت دیکھنے لگا۔ کمرے میں کئی فہمیں روشن تھیں اور ان کی تیز روشنی میں اس نے یکنی کے چہرے پر طمانیت اور مضبوط ارادوں کی جھلک محسوس کی۔ ابراہیم کو یہ یقین کرنے میں دیر نہیں لگی کہ یکنی نے جو کچھ دیا، اس میں ترمیم نہیں کرے گا۔ بڑی حسرت سے بولا۔ "برکتی بزرگ! میں تو اس یقین کے ساتھ یہاں آیا تھا کہ پامراد اور شادمان واپس جاؤں گا لیکن اب سوچتا ہوں کہ انسانی اندازے کتنے لظا اور بے بنیاد ہوتے ہیں۔"

یکنی نے درشتی سے جواب دیا۔ "ابراہیم! اگر تو نے میری بات مان لی ہوتی تو شاید میں بہت مہربان ثابت ہوتا اور پھر تیرا تو یہ عقیدہ رہا ہے کہ سخاوت، دریا دلی اور الطاف و اکرام کا ہادی پر خاتمہ ہو گیا۔"

ابراہیم نے عرض کیا۔ "برکتی سردار! آپ کے انکار سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ سخاوت اور بخشش کا ہادی پر خاتمہ ہو گیا۔ میں نے تو آپ کے در پر یوں حاضری دی تھی کہ اللہ نے مجھ جیسوں کے لیے آپ جیسوں کو تالیف قلب کا حکم دیا ہے۔ سو اگر آپ اللہ کے اس حکم کی تعمیل میں کچھ کر گزریں گے تو میں دعا میں دوں گا کہ وہ کوئی شکوہ نہیں۔"

یکنی نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "میں جانتا ہوں کہ خدا نے کس کو کیا حکم دیا ہے۔ اگر میں تمہارے لیے کچھ کر سکا تو ضرور کروں گا لیکن سردست میں مجبور ہوں۔"

ابراہیم بحالت مجبوری کھڑا ہو گیا، بولا۔ "اچھا میں چلا، اجازت دیجیے۔"

لیکن یکنی نے خوش اخلاقی سے ابراہیم کا ہاتھ پکڑ لیا، بولا۔ "ابراہیم! ایسی بھی کیا جلدی، آئے ہو تو کچھ دیر رکھو اور مجھے خاطر تواضع کی عزت بخشو۔"

ابراہیم انکار نہ کر سکا اور دوبارہ بیٹھ گیا۔

رات کا کھانا دونوں نے ایک ساتھ کھایا۔ پھر نیب کا دور چلا اور یکنی نے فرمائش کی کہ وہ کچھ ستائے، نیب کے سردار نے ابراہیم میں ترنگ پیدا کر دی تھی۔ اس نے گانا شروع کر دیا۔ گانے کی آواز اندر پہنچی تو ابراہیم کے اس پاس قصر کے دوسرے لوگ بھی جمع ہو گئے۔ کچھ بڑے قابو ہو کر دروازے سے جھانکنے لگی۔ ابراہیم اس کو دیکھتے ہی اپنے حواس کھو بیٹھا اور گانا بھول گیا۔ یکنی نے بے یکنی سے کہا۔ "استاد ابراہیم! اور اور۔ خاموش کیوں ہو گئے۔"

ابراہیم نے کچھ بڑی طرف اشارہ کیا۔ "برکتی بزرگ! اس سے کہیے کہ میرے سامنے نہ آئے۔ جس چیز کو میں حاصل نہیں کر سکتا، اس کے خیال تک سے بچنا چاہیے۔"

یکنی نے کچھ بڑی کھم دیا۔ "تو اندر جا اور خبردار جو بغیر اجازت پھر بھی ادھر آئی۔"

کچھ یاغیے میں اندر چلی گئی۔ اس کے بعد ابراہیم غلبان، بیجان اور انتشار کا شکار ہو گیا اور وہ کوشش کے باوجود کچھ اور نہ سنا سکا۔ یکنی نے بھی زیادہ اصرار نہ کیا۔ رات زیادہ ہو گئی تھی، اس لیے یکنی نے ابراہیم کو روک لیا اور صبح فجر کی نماز کے بعد رخصت کر دیا۔

☆☆☆

یکنی کے پاس مصر سے کچھ لوگ اس لیے آئے ہوئے تھے کہ وہ خلافت سے اعلیٰ منصب حاصل کریں اور یہ کام یکنی کی مرضی اور منظوری کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ قصر الطین ہی کے ایک حصے میں ٹھہرے ہوئے تھے مگر یکنی کو راضی نہ کر پا رہے تھے۔

ان میں ایک احمد نامی شخص بہت چالاک تھا۔ معلوم نہیں کس طرح اس کو یہ معلوم ہو گیا کہ یکنی ابراہیم منفی کو بہت مانتا ہے۔ اس نے ابراہیم سے ملاقات کی اور کہا۔ "استاد ابراہیم! اگر تم یکنی سے میرا یہ کام کرادو تو میں اس کے عوض تمہیں پچیس ہزار درہم پیش کر دوں گا۔"

ابراہیم کے منہ میں پانی بھر آیا اور جی نہ چاہنے کے باوجود وہ یکنی سے ملا اور احمد کی سفارش کر دی۔ یکنی نے پوچھا۔ "تم اس کو کس طرح اور کہاں سے جانتے ہو؟"

ابراہیم کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ بات بنانے کی کوشش کی مگر بن نہ سکی۔ یکنی نے حقارت سے کہا۔ "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ احمد نے تمہیں رشوت کی پیشکش کی ہے۔"

ابراہیم نے گھبرا کر جواب دیا۔ "ایسی کوئی بات نہیں برکتی بزرگ۔"

یکنی نے کہا۔ "اگر ایسی کوئی بات نہیں تو میں یہ کام نہیں کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ اس کام کے عوض احمد سے کچھ حاصل کر لو۔"

لیکن ابراہیم کو شبہ گزرا کہ شاید یکنی اس طرح اس سے کئی بات انگوٹھا چاہتا ہے بولا۔ "میں ایسا کام نہیں کر سکتا برکتی بزرگ۔ آپ یقین کیجیے۔"

یکنی نے جواب دیا۔ "ابراہیم! تم نے کچھ عرصہ پہلے تالیف قلب کے نام پر کچھ مانگا تھا۔ اگر تم چاہو تو احمد سے اپنی سفارش کے عوض کچھ حاصل کر لو۔"

ابراہیم اب بھی شک و شبہ میں مبتلا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور چپ رہا۔

یکنی کچھ دیر تو ابراہیم کے جواب کا منتظر رہا اس کے بعد کہا۔ "اس سلسلے میں، میں نے ایک تدبیر سوچی ہے۔ میں احمد سے کہوں گا کہ استاد ابراہیم کے پاس کچھ بات نامی ایک کنیز ہے۔ اگر تو اس کو خرید کر میرے حوالے کر دے تو میں تیرا کام کروں گا اور تم کچھ یاغیے کے عوض پچاس ہزار درہم طلب کر لینا۔"

ابراہیم نے مایوسی سے عرض کیا۔ "لیکن اسے برکتی سردار! کچھ یاغیے سے پاس ہے کہاں؟ میں احمد کے ہاتھ اس چیز کو کس طرح بیچ سکتا ہوں جو میرے پاس ہے ہی نہیں۔"

یکنی نے کہا۔ "میں تیری خاطر، محض تیری خاطر کچھ یاغیے کو تیرے گھر بجاؤں گا۔ پھر جب احمد رقم دے کر کچھ یاغیے لے جائے تو تم خاموش ہی رہنا اور رقم اپنے کام میں لاتا۔ کچھ یاغیے بارہ میرے پاس آجائے گی۔"

اب ابراہیم کو یکنی کی باتوں پر کچھ کچھ یقین آ چلا تھا۔ وہ جب رخصت ہونے لگا تو یکنی نے اس کو روک لیا اور بطور تنبیہ کہا۔ "اور ابراہیم! دیکھو امیری طرف سے یہ بات بھی ذہن نشین رکھنا کہ کچھ یاغیے ہمارے گھر میں میری امانت ہوگی۔ اگر مجھ کو بددیانتی یا خیانت کا شبہ بھی ہو گیا تو میں بہت بری طرح پیش آؤں گا۔"

ابراہیم نے امانت اور دیانت کا وعدہ تو کر لیا مگر وہ اندر سے بہت خوفزدہ تھا۔

چند ساتوں بعد جب ابراہیم گھر پہنچا تو وہاں کچھ یاغیے دیکھ کر حیران رہ گیا لیکن دونوں ہی ایک دوسرے سے بچ رہے تھے۔ رات کو ابراہیم خود لے کر بیٹھ گیا اور طرب سے گیت گانے لگا۔ کچھ یاغیے کی آواز سن کر اس کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر بعد ابراہیم نے یہ محسوس کر لیا کہ کوئی اس کے پیچھے موجود ہے چنانچہ جب وہ مڑا تو کچھ یاغیے کو دیکھ کر لڑکھڑا

کہا۔ ابراہیم نے آنکھیں بند کر لیں اور گہرا سے کہا۔ "کیا تو جانتی ہے کہ تو یہاں یوں بیٹھتی کئی ہے؟"

کچھ یاغیے نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "جانتی ہوں۔ خوب اچھی طرح جانتی ہوں اور میرے آقا برکتی سردار نے مجھے بطور خاص سمجھائی ہے کہ میں تم سے دور دور اور بے تعلق رہوں اور میں اس پر عمل کر دوں گی۔"

کچھ یاغیے نے کئی گھر ابراہیم کا صبر و سکون بے یکنی۔ اس نے اپنے کمرے کو اندر سے بند کر لیا اور بدقسمتی پر آنسو بہاتی رہی۔

کچھ یاغیے دن ابراہیم کے گھر میں رہی اور ابراہیم کے ارمانوں کو آگ لگاتی رہی۔ پانچویں دن احمد آ گیا اور ابراہیم سے پوچھا۔ "بھائی! کیا کچھ یاغیے کوئی کنیز بھی آپ کے ساتھ رہتی ہے؟"

ابراہیم نے اداکاری سے جواب دیا۔ "ہاں رہتی تو ہے، کیوں؟"

احمد نے گھبرا کے پوچھا۔ "استاد! اگر اس لڑکی کو تم میرے ہاتھ فروخت کر دو تو بڑی مہربانی ہوگی۔ یکنی اس لڑکی کو پسند کرتا ہے اور رشوت میں کچھ یاغیے کو طلب کیا ہے۔"

ابراہیم نے بے غرضی سے جواب دیا۔ "میں کچھ یاغیے کے عوض پچاس ہزار درہم لوں گا۔"

لیکن احمد نے منہ بنایا اور قیمت کم کرانا چاہی۔ ابراہیم سختی سے ڈنکار مارا اور آخر احمد نے پچاس ہزار درہم ادا کر کے کچھ یاغیے کو حاصل کر لیا اور وہاں سے چلا گیا۔ ابراہیم کو ایک جھوٹا ساگ اور وہ ایک کونے میں جا کر درتک آنسو بہاتا رہا۔ اس نے یکنی کے پاس جانا بھی چھوڑ دیا لیکن ایک ہفتے کے بعد یکنی ابراہیم کے پاس خود ہی پہنچ گیا اور پوچھا۔ "استاد ابراہیم! میں نے احمد کا کام کر دیا، کچھ یاغیے کو کتنے میں فروخت کیا تھا؟"

ابراہیم نے جواب دیا۔ "پچاس ہزار درہم میں۔"

اس کے بعد ایک کوٹھری کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ درہم اس کوٹھری میں رکھے ہیں اگر فرمایا میں تو نکلواؤں۔"

یکنی نے ہنس کر کہا۔ "وہ رقم تالیف قلب کے حساب میں اپنے پاس ہی رکھو، اس وقت تو میں اس لیے آیا ہوں کہ احمد نے کام ہو جانے کی خوشی میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا ہے۔ وہاں محفل طرب بھی ہوگی جس میں تمہاری شرکت ضروری ہے۔"

ابراہیم نے بیزاری سے جواب دیا۔ "برکتی سردار! آنسوؤں کے میں شریک نہیں ہو سکتا۔"

دکھایا جا رہا تھا۔ اس میں کوئی درجن بھر بالغ اور کوئی تین درجن بچے کھڑے تھے۔ وہ آپس میں کھیل رہے تھے اور شرارتیں کر رہے تھے۔ مرد عورت سے کہہ رہا تھا۔ "یہ سب کس قدر خوب صورت ہے۔ اس جانور میں ایک خاندان ہونے کا کتنا احساس ہے۔"

"جو ہم انسانوں میں قسم ہو گیا ہے۔" عورت نے بوجھلہا اور لڑکی کی طرف دیکھا جو چپ کی پھیلی نشست پر بیٹھی بے نیازی سے اپنے ٹیپ میں گم تھی۔ اس نے کانوں پر ہیڈ فون چھار دکھا تھا اور میوزک پر سر ہلاتے ہوئے گم کھیل رہی تھی۔ مرد نے کہا۔

"یہ جانور بل کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کے کام آتے ہیں اور اگر ایک کھڑے ہو تو باقی سب اسے چھوڑ کر نہیں جاتے۔ حد یہ کہ اگر ایک ماں کہیں شکار پر گئی ہو اور اس کے بچے بھوکے ہوں تو دوسری مادہ اس کے بچوں کو دودھ پلاتی ہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔"

"اس کے باوجود کھڑے ہونے کا ایک خطرناک جانور ہے اور خطرے کے وقت یہ حملہ کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ اس کے بچے خطرناک ہوتے ہیں مگر اس کا اصل ہتھیار اس کا جڑا ہے۔ اس سارے جانوروں میں کسی جانور کا جڑا اتنا مضبوط نہیں ہوتا جتنا کہ کھڑے ہونے کا ہوتا ہے۔ حد یہ کہ بھیڑیے کا جڑا بھی اتنا مضبوط نہیں ہوتا۔"

مرد بہت جوش سے کہہ رہا تھا۔ عورت اس کی تائید کر رہی تھی اور دونوں اس ڈائیو میٹری کے حوالے سے بہت خوش تھے کیونکہ وہ اسے تیار کر رہے تھے جبکہ میں دور جھازوں سے انہیں یہ غور دیکھ رہا تھا۔ انسان ہم کھڑے ہونے کے لیے مامول نہیں ہیں۔ ہم ہزاروں سال سے ساتھ ساتھ رہتے آئے ہیں۔ جس صحرائیں ہم رہتے ہیں اس میں جگہ جگہ انسانی آبادیاں بھی ہیں مگر ہم ایک دوسرے کی حدود کا احترام کرتے ہیں۔ جیسے انسان بلاوجہ ہماری حد میں آنے سے گریز کرتے ہیں اسی طرح ہم بھی انسانی حدود میں جانے سے گریز کرتے ہیں لیکن انسانوں کی طرف سے کبھی کبھی ہماری حدود کی خلاف ورزی ہو جاتی ہے اور وہ غیر قانونی شکار کے لیے جب جنگل میں آتے ہیں تو ان جانوروں کو مارتے ہیں جو ان کے لیے نفع بخش ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ان جانوروں کو بھی مار دیتے ہیں جن کی انہیں ضرورت نہیں ہوتی۔

شروع میں ہم تمیز نہیں کر پاتے تھے کہ کون سے انسان ہمارے درپے ہیں اور کون سے ہمارے لیے....

بڑے ضرر ہیں اس لیے ہم دھوکے میں مارے جاتے تھے۔ اصل میں جانوروں کا غیر قانونی شکار کرنے والے جو جانور مارتے تھے ان کی باقیات چھوڑ جاتے تھے۔ خاص طور سے انہی اور گینڈوں کو مار کر ان کے صرف دانت اور سینک لیتے تھے۔ اسی طرح دوسرے جانوروں کی کھال اور سر وغیرہ لے جاتے اور باقی جسم چھوڑ جاتے تھے جو ہمارے کام آ جاتا تھا۔ ہم کھڑے ہونے کے سبب ہوتے ہیں۔ صفائی کرنا اور سڑنے والی لاشوں کو کھار کا حول کو صاف رکھنا ہمارا اصل کام ہے۔ پھر رفتہ رفتہ تجربے نے ہمیں سکھادیا کہ کون سے انسان خطرناک ہیں اور کون سے بے ضرر ہیں۔

یہ تین افراد جو یہاں موجود تھے، وہ بے ضرر تھے۔ اگرچہ ان کے پاس بھی رائفل تھی مگر میں جانتا تھا، وہ یہاں شکار کرنے نہیں بلکہ جنگلی حیات کو دیکھنے آئے ہیں۔ میری توجہ کامر کڑی تھی۔ عورت مرد کے پاس سے ہٹ کر اس کی طرف آئی اور اس نے کھڑکی سے کہا۔ "جولی تم نیچے کیوں نہیں آتی ہو؟"

"میں کیوں نیچے آؤں؟" جولی نے بدتمیزی سے کہا تو مجھے اس کا لہجہ اچھا نہیں لگا۔ ہم کھڑے ہونے میں حفظہ مراجم کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ بڑوں کا احترام کیا جاتا ہے۔

"جولی میں تمہاری ماں بھی ہوں۔"

"تم میری ماں نہیں ہو۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "تم صرف میرے ذہن کی بیوی ہو۔"

وہ دونوں بہت آہستہ سے بول رہی تھیں تاکہ مرد نہ سن سکے۔ مگر میں سن رہا تھا۔ ہم کھڑے ہونے کے کان بہت تیز ہوتے ہیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ لڑکی اس عورت کی بیٹی نہیں تھی۔ اس لیے وہ اس سے درشت اور اجنبی انداز میں پیش آ رہی تھی۔ عورت محل سے کام لے رہی تھی۔ مرد نے آواز دی تو عورت اس کی طرف چلی گئی۔ آج صبح جب میں اپنے خاندان کے ساتھ آرام کر رہا تھا میری چھٹی حس نے اشارہ دیا کہ کچھ لوگ یہاں آئے ہیں اور میں اس سمت چل دیا جس طرف سے مجھے اشارہ مل رہا تھا۔ میری چھٹی حس درست ثابت ہوئی جب میں نے ان تین انسانوں کو جھازوں کے ساتھ موجود پایا۔ یہ جھاز یاں ہمارا مسکن تھیں اور ہمیں شہر، چھتے اور ان جیسے دوسرے بڑے جانوروں سے بچانی تھیں۔ میں نے مرد اور عورت کی گفتگو سنی تو مجھے اچھا لگا۔ اپنی تعریف کے بری لگتی ہے۔ خاص طور سے اس صورت میں کہ جب انسان ہمیں نہایت برا جانور خیال کرتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے انسانوں کی دنیا میں ہم کھڑے ہونے کو ایک

منفی کردار کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ چالائی، مکاری، چالوئی اور سفاکی ہم کھڑے ہونے کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔ لیکن ہے ان میں سے کچھ خصوصیات واقعی ہم میں ہوں مگر دوسرے جانوروں کے مقابلے میں ہم کھڑے نہایت گھٹیا اور گمراہ ہوئے سمجھے جاتے ہیں۔ اس لیے جب اس جوڑے نے ہمیں اچھا کہا تو مجھے خوش ہوئی تھی۔ میں ان کی طرف سے مطمئن ہو گیا تھا لیکن چونکہ وہ مجھے اچھے لگ رہے تھے اس لیے میں جانے کے بجائے وہیں رک کر انہیں دیکھنے لگا۔

میں اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا مگر میں سمجھی جھازوں میں تھا اس لیے وہ میری موجودگی سے بے خبر تھے۔ لڑکی جواب تک چپ میں بیٹھی تھی اچانک نیچے اتر آئی اور اس نے ان جھازوں کا رخ کیا جہاں میں تھا۔ وہ میوزک سنتے ہوئے بے خیالی میں ٹپکتی ہوئی اس طرف آ رہی تھی۔ میں مشکل میں پڑ گیا تھا۔ اگر وہ میرے پاس آ جاتی تو میری حیوانی جبلت مجھ پر غالب آ سکتی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ لوگ مشکل میں پڑیں۔ اس لیے میں دے قدموں پیچھے ہٹنے لگا مگر لڑکی کی رفتار خاصی تیز تھی اور وہ کچھ ہی دیر میں ان جھازوں کے پاس آ گئی جہاں میں چھپا ہوا تھا۔ اب میں حرکت کرتا تو اس کی نظروں میں آ جاتا۔ جھازوں کا رنگ میں دبا ہوا تھا۔ اس لیے مجھے امید تھی کہ لڑکی مجھے نہیں دیکھ سکے گی مگر اتنے قریب سے اس کی موجودگی میری حیوانی جبلت پر ناگوار گزر رہی تھی۔ اگر مجھے یہ مرد اور عورت اچھے نہیں لگتے ہوتے تو شاید میں فریاد اور اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتا۔ لڑکی بالکل پاس آ گئی تھی اور اس نے ہانک سیکڑی۔

"اف کتنی گندی بو ہے۔"

میں جانتا تھا یہ بو میرے جسم سے اٹھ رہی تھی۔ جیسے ہمیں انسانوں اور دوسرے جانوروں کی بو ناگوار گزرتی ہے اسی طرح انسانوں اور دوسرے جانوروں کو ہماری بو ناگوار گزرتی ہے۔ اسی لیے مرد کی آواز آئی۔ "جولی تم کہاں ہو؟"

میں لینے ہونے کی وجہ سے مرد عورت کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مگر ان کی اپیل اور بے چینی کی لہر میں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ اب عورت کی آواز بھی مرد کی آواز میں شامل ہو گئی تھی۔ جولی نے زیر لب کہا۔ "شٹ۔"

پھر وہ وہاں سے گئی مگر اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ آگے گئی تھی کہ مرد نے اسے دیکھ لیا اور پک کر اس کے پاس آیا۔ "تم بتائے بغیر چپ سے کیوں اتریں؟"

"میں جسم دھو رہا تھا۔"

"تو ہمارے پاس آئیں۔" عورت تیز لہجے میں بولی۔ "ان جھازوں میں جانے کتنے خطرے چھپے ہوتے ہیں۔" مرد نے نرمی سے کہا۔ "جولی میری بات سنو، جنگل میں آدمی کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔ وعدہ کرو اب بتائے بغیر کہیں نہیں جاؤ گی۔"

"اے کے پراس۔" جولی نے ہنراری سے کہا اور جیب میں جا کر بیٹھ گئی۔ مرد عورت باہر تھے۔ عورت بولی۔ "کرس یہ بہت مشکل لڑکی ہے۔"

"میں جانتا ہوں این مگر یہ میری بیٹی ہے۔"

اب میں اٹھ گیا تھا اور ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ عورت کے چہرے کے تاثرات رفتہ رفتہ نرم پڑ گئے پھر اس نے مسکرا کر کہا۔ "ہاں یہ تمہاری بیٹی ہے اس لیے مجھے بھی عزیز ہے۔"

کرس نے یوں سکون کا سانس لیا جیسے کوئی تنازعہ حل کیا ہو۔ اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے ہمیں کیمپ چلنا چاہیے۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ یہ لوگ یہاں رکنے کے ارادے سے آئے تھے۔ یہاں ایک مستقل کیمپ تھا جو اسی قسم کے لوگوں کے لیے مخصوص تھا۔ عام طور سے اس کیمپ میں کم ہی لوگ ٹھہرتے تھے اور بیشتر وقت یہ خالی پڑا رہتا تھا۔ میں خود کئی بار اس کا پورا معائنہ کر چکا تھا مگر وہاں ہمارے مطلب کی کوئی چیز نہیں تھی اس لیے میں نے کسی چیز کو کبھی بھیڑا نہیں تھا۔ کیمپ کو چاروں طرف سے خاردار تاریں لگا کر محفوظ کیا ہوا تھا مگر ان میں ایسے رخنے تھے جن سے میں اور میری جسامت کا جانور اندر گھس سکتا تھا۔ انہوں نے اپنا سامان سمیٹا اور جیب میں رکھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ انہیں جیب کے لیے مخصوص راستے سے جانا تھا جو خاصا طویل اور کھوم پھر کر جاتا تھا۔ میں ایک شارٹ کٹ کے ذریعے ان سے پہلے وہاں پہنچ گیا تھا۔

کیمپ تین ٹیموں پر مشتمل تھا۔ ایک بڑا پہلے رنگ کا موٹے کپڑے کا بنا ہوا خیمہ تھا۔ یہاں تمام اہم چیزوں کا ذخیرہ تھا اور یہاں وہ آلات تھے جن سے انسان دور کے لوگوں سے بات کرتے تھے۔ باقی دو خیمے رہائش کے لیے تھے۔ کچھ دیر بعد جیب آئی اور کرس نے اتر کر تاروں سے بنا ہوا دروازہ کھولا اور جیب اندر لے جا کر دروازہ پھر سے بند کر دیا۔ مجھے اندر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں باہر سے ہی سب دیکھ اور سن رہا تھا۔ کرس اور این سامان اتارنے اور اندر رکھنے لگے جب کہ جولی اتر کر ایک درخت کے موجود کرسی پر آ بیٹھی اور اپنے ٹیپ میں گم رہی۔ اس

نے ان لوگوں کی مدد کی قطعی کوشش نہیں کی۔ جانے کیوں ان
اخلف لڑکی پر میرا غصہ بڑھ رہا تھا اور اگر وہ کسی دوسرے نکل
بچے کی اولاد بھی ہوتی تب بھی میں اسے سزا دے چکا ہوتا۔
مگر میں مجبور تھا کہ وہ انسان بھی اور میں اس کے پاس بھی
نہیں جاسکتا تھا۔ سارا سامان اندر رکھ کر اور سیٹ کر کے کرس
نے کھانے کا سامان نکالا اور آگ جلا کر پکانے لگا۔ این
آلات واسے خیمے میں کچھ کر رہی تھی پھر وہ باہر آئی اور اس
نے آکس بکس میں رکھی سوئی بوتلیں نکالیں اور ایک خواہ
گردوسری کرس کو دی۔ جولی نے کہا۔

"مجھے بھی چاہیے۔"
"تم ابھی سولہ سال کی ہو اور اس میں الکحل
ہے۔" کرس نے انکار کیا۔ "تم کو لڈز تک لے لو۔"
جواب میں جولی نے منہ بنایا اور خاموش ہو گئی۔ اس
نے کو لڈز تک نہیں لی تھی۔ کرس گوشت کے پار پے بھون
رہا تھا اور اس کی خوشبو سے مجھے کچھ ہونے لگا تھا۔ ہم
لوگوں کو بہت کم کھانے کو ملتا ہے اس لیے ہم ہر وقت ہی
بھوکے رہتے ہیں۔ دو دن پہلے ہمیں ایک مردہ ہانسی ملا تھا اور
ہمارے جھنڈے اسے دل کھول کر کھایا تھا مگر جھنڈے بڑا تھا اور
پھر دوسرے جانور بھی آگئے تھے اس لیے نصف ان سے بھی
پہلے سوائے ہانسی کی ہڈیوں کے اور کچھ نہیں بچا تھا۔ اس کے
بعد سے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا اور اب میری تہوں میں
ش سے پڑ رہے تھے۔ میں نے منہ سب سمجھا کہ مفت میں
ال بھانے کے بجائے یہاں سے کھنک لوں اور جا کر
کھانے کو کچھ تلاش کروں۔ مجھے اپنے بچوں کا خیال آتا
تھا۔ میری مادہ نے بھی وہاں پہلے کھایا تھا۔ ان دونوں میں
انے ہمارے بچوں کو خوب... پلایا تھا مگر اب اس کے
مگی پیٹ خالی تھا۔ وہاں اپنے کھانے کی طرف جاتے
ہوئے میں حد سے وہ کہہ... تھا کہ مجھے کھانے کا کچھ
پائے اور شاید یہ وقت قریب کا تھا۔ مجھے مزہ بد کی
جھینے کے بارے میں... تھی۔ نزدیک سے م...
خلف میل یا اس سے بھی زیادہ دوری سے آتی تھی۔ میں
ن طرف بڑھتا مجھے امید تھی کہ جھینے کا کسی جانور نے کھا
ہوگا۔ جھینے کا شکار مہر سے شہری کرتے ہیں۔ وہ بھی
کئی شیریں کر ایک جھینے ہوتے ہیں۔ یہ نومند اور خفا
بیکوں و... جانور ایک شیر سے اس کی بات نہیں تھی۔ میر
ہ اندر درست نکلتا کرتے ہوئے جھینے کو کوئی نو بوس شیر اور
شیریاں چھنے ہوئے تھے اور اس کی کھال اتارنے کی تیاری
کر رہے تھے۔ ایک شیر نے جھینے کا منہ اپنے منہ میں

دبوچا ہوا تھا تاکہ اس کا دم گھٹ جائے اور وہ جلدی م
جائے۔ شیروں کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا اور جھینے کے
مرتے ہی وہ اسے کھانے میں لگ گئے۔
میں شیروں سے غاصے فاسیل پر بھاریوں میں تھا۔
اگر میرے... اتھ جھنڈ ہوتا تو سم جھینے کے آس پاس ہی
منڈا اتے رہتے اور... شیروں کو انتظار کرتے کہ وہ
پیٹ بھرنے کے بعد وہاں سے چلے جاتے اور باقی شکار
ہمارا ہوتا۔ لوگ لکڑ بھگوں کو بڑا دل قرار دیتے وقت یہ بھول
جاتے ہیں کہ شیروں سے شکار پھینچ ہر کسی کے بس کی بات
نہیں اور یہ کام ہم جان پر کھیل کر کرتے ہیں۔ اس وقت
میں اکیلا تھا اور شیروں کے سامنے مانہ خود کشی ہوتی۔ اس
لیے میں مہر سے انتظار کر رہا تھا۔ شیروں کو بھی شاید بہت
دونوں بعد شکار ملا تھا وہ کھانے جا رہے تھے۔
نصف رات کے قریب جا کر انہوں نے شکار کی جان
چھوڑی۔ اس کے بعد بھی جھینے میں بہت کچھ بچا ہوا تھا اور
شاید اسی کی حفاظت کے لیے وہ اس پاس لٹ گئے۔ میں
سوچ رہا تھا کہ کیا کروں پیٹ بھرنے کے بعد شیر زیادہ
بھاگ دوڑا لگا نہیں کر پاتے۔ وہ مجھے ڈراتے مگر میرے
پیچھے بھاگنے سے گریز کرتے۔ یہی سوچ کر میں جھینے کے
پاس... جس کا سارا اوپری گوشت نہ بچ تھا اور بغیر نظر آ رہا
تھا۔ میرے نزدیک آتے ہی شیر غرے لگے اور میں فوراً سر
جھکا کر اپنا منہ اگست ہو گیا۔ جب شیر بارود جیسے سوتے تو
میں منڈائی... میں ان سے روٹھ مت کرنے لگا کہ مجھے
کھانے کے بجائے میں بھوکا ہوں۔... دست کے ساتھ ہی
میں... بے قدموں شکار کی طرف بھی... تھا۔ اس پر ایک
شیر نے مجھ کو میری طرف آئی اور میں... پیچھے منڈ گیا۔
... شیر... ہمیں اپنی جگہ بچھو تو میں دو... شکار کی
طرف بڑھ گئی مارا یہاں ہوا کہ کسی شیر... شیر نے کی مداخلت
پر مجھے... اس کا... مگر تاخیر نہ ہوئی... ہر دو...
انہوں نے مجھے اجازت دینا ہی مناسب سمجھا۔ میں شکار کے
پاس... خالی ہستی سے مجھے... شیر نے... میں جلدی
جلدی کچھ... نہ... حاصل کرنے کے لیے میں تھوڑا سب
سے آگے بڑھا... بھگتی ہوتی ہے جو چاہے... شیروں سے کیے
پائی گئی تھی۔ میں نے جلدی جلدی... نکلے لیکن شروع
کے... نکلے ہوئے وقت میں پانچ سے چھ کھوٹ... شکار
سکتا ہے اور یہ بھگتی اتنی ہی دھن دھن... خرمیں میں نے دل پر
جبر کر کے کھایا... میرا پیٹ بھیننے... مورہا تھا اور مجھے
خوف تھا کہ بھگتی کی شیر کو میرا خیال... میرا... بھی

نہیں سکوں گا۔ اس لیے بھگتی ختم کرتے ہی میں وہاں سے
دبے قدموں پیچھے ہٹا اور شیروں سے دور آتے ہی پوری
رفتار سے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گیا۔
لکڑ بھگے سرکنڈوں اور اونچی گھاس کے ہموار
میدانوں میں گڑھے کھود کر ان میں رہتے ہیں۔ اگر جھنڈ
شکار پر گیا ہو تب بھی پیچھے بچوں کی حفاظت کے لیے کچھ
بڑے چھوڑ جاتے ہیں اور ان کے لیے کھانا بھی لے کر آتے
ہیں جیسے بڑے ہونے والے بچوں کے لیے لاتے
ہیں۔ میں ٹھکانے کے پاس پہنچا تو میرا سامان پھولا ہوا تھا۔
میری مادہ میری فکر میں گڑھے کے نزدیک ایک اونچی جگہ
کھڑی تھی۔ اس نے مجھے آتے دیکھا تو خوشی سے ہنسنے لگی
آواز نکالی۔ یہ آواز سن کر میرے بچے بھی باہر آ گئے تھے۔
میں ان کے نزدیک آیا اور انہیں پیار کیا، میری مادہ آگئی تھی
اور وہ بے تابی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی بے چینی محسوس
کرتے ہوئے میں شروع ہو گیا اور اہکاکی لے کر بھگتی کے
نکلے جو ابھی ختم نہیں ہوئے تھے وہ باہر نکال دیے۔
مادہ جلدی جلدی انہیں کھانے لگی اور بچے اس کے
تھنوں کے پاس منڈا لے گئے۔ ہم لکڑ بھگے پیچھے رہ جانے
والوں اور بڑے ہوتے بچوں کو اسی طرح کھانا دیتے ہیں جو
ابھی خود شکار پر جانے کے قابل نہیں ہوتے۔ میں نے تقریباً
سارا ہی گوشت نکال دیا تھا بس جو باقی رہا تھا وہی رو گیا
تھا مگر میں خوش تھا کہ میری مادہ نے کھالیا تھا اور اب میرے
بچوں کو کوئی وقت دودھ ملے گا۔ میں نے اسی لیے اپنی جان کا
خطرہ مول لیا تھا اور کامیاب رہا۔ اسی سرشاری میں میں لینا
تو مجھے خبر نہیں ہوئی اور میری آنکھ اگلی صبح سورج کی تیز روشنی
سے کھلی گئی۔ میری آنکھوں میں ایک بار پھر انہیں ہو رہی
تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید اس جھینے میں کچھ بچا ہو جسے کل
شیروں نے مارا تھا مگر جب میں وہاں پہنچا تو شیر جاچکے تھے
اور جھینے کے بچہ کو چاروں طرف سے بڑے خطرناک
گدھوں نے گھیر رکھا تھا۔
ان گدھوں کی چونچ میرے جڑے سے کم مضبوط
اور خطرناک نہیں ہوتی۔ یہ چونچ مار کر مضبوط ترین ہڈی میں
سوراخ کر دیتے ہیں تاکہ اندر موجود گوشت کھا سکیں۔ درختوں
کی تعداد میں ان گدھوں کے ہوتے ہوئے میرے لیے کوئی
موقع نہیں تھا کہ میں بچہ کے نزدیک بھی جاسکوں۔ اب مجھے
کھانے کی کسی اور چیز کی تلاش تھی۔ مایوس ہو کر ابھی میں
واپس جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ مجھے ان تینوں کا
خیال آیا۔ میں کیسپ کی طرف روانہ ہو گیا اور جب وہاں

پہنچا تو کرس اور این ایک بار پھر بے تابی سے جولی کو تلاش کر
رہے تھے۔ انہوں نے شاید پورا کیسپ کھنگال لیا تھا اور اب
وہ باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے جب کہ میں نے دیکھ لیا
تھا کہ وہ کہاں بھی ۱۰۰ جیب کی پیمت پر بنی ہوئی کانوں سے
ہیڈ فون لگاے میوزک سن رہی تھی۔ اس نے کرس اور این کی
پکاریں سنی ہی نہیں تھیں۔ وہ باہر نکلنے والے تھے کہ این کی
نظر اس پر پڑ گئی اور اس نے فیسے سے کرس سے کہا۔
"یہ رہی۔"
این اندر چلی گئی تھی اور کرس جولی کے پاس آیا، اس
نے جیب کی پاؤی پر ہاتھ مارا تو جولی چوکی، اس نے ہیڈ
فون اتارا۔ "نیں ڈیڈ؟"
"تم سے کہا تھا کہ خاموشی سے ادھر ادھر مت ہوا کرو۔"
"لیکن میں تو یہاں دھوپ لے رہی تھی۔" جولی نے
کہا۔ کرس اپنے فیسے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جولی
بچنے اتر آئی اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "میری کچھ میں نہیں آتا
کہ مام نے مجھے یہاں کیوں بھیجا ہے۔"
"کیونکہ اسکول کی چینیوں میں تمہاری سرگرمیاں
مشکوک ہو گئی تھیں تمہاری دوست نئے کی گولیاں استعمال
کرتی تھیں۔"
"میں نے تو نہیں کیں۔"
"آدی صحبت سے زیادہ دیر بچنا نہیں ہے۔"
"میں یہاں بور ہو رہی ہوں۔"
"میں ہوں این ہے تم ہم سے بات کر سکتی ہو۔"
"مجھے اس سے بات نہیں کرنی۔"
"تب مجھ سے بات کرو میں تمہارا باپ ہوں اور تم
مجھ سے سب کہہ سکتی ہو۔"
جولی کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔ "آپ
اور مام کیوں الگ ہوئے؟"
"تم جانتی ہو ہمارے مزاج میں فرق ہے تمہاری ماں
کچھ تو کرنے والی عورت نہیں ہے اس لیے ہم الگ ہو گئے۔"
"آپ دونوں نے میرا نہیں سوچا صرف اپنا سوچا۔"
جولی کا انداز الزام دینے والا تھا۔
"ہم نے تمہارا بھی سوچا بھی اتنے عرصے ساتھ رہے
اور نہ بہت پیسے الگ ہو جاتے۔ اب تم بچکر ہو رہی ہو اور چند
سادوں بعد تمہاری اپنی زندگی ہوگی جس کا ہم سے بہت کچھ
ہوگا۔ اس لیے اب ہمیں اپنی اپنی زندگی گزارنے کا حق ہے۔"
جون کھینچے واسے بچوں میں سے کسی بھی وہ پاؤں
ہوئی اندر اپنے خیمے میں چلی گئی۔ کرس اور این بھی اب اندر

تھے۔ ان کے لحاظ سے گرمی تھی لیکن میرے لحاظ سے موسم بہت شاندار تھا۔ سورج پوری آب و تاب سے نکلا ہوا تھا اور ہلکی سی ہوا جیسے ہند کے جھونکے لاری تھی۔ میں وہیں جھانپوں میں لیٹ گیا اور کچھ دیر بعد سو گیا۔ پھر میری آنکھ کھلی تو رات... ہو چکی تھی۔ وہ لوگ خیموں کے درمیان آگ جلا کر بیٹھے تھے۔ جولی نے کرس سے کہا: ”مجھے مام سے بات کرنی ہے۔“ ”اوکے۔“ کرس نے ایک آلہ اس کی طرف بڑھایا۔ ”یہ سیلائٹ فون ہے جلدی بات کرنے کی کوشش کرنا۔“ جولی آلہ لے کر اس طرف آئی جہاں میں زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ جولی نے ماں کو کال کی۔ اس کی ماں نے کال ریسیو کی تو مجھے اس کی آواز بھی صاف سنائی دی تھی۔ جولی نے کہا: ”پاپے مام۔“ ”جولی تم کیسی ہو؟“

”مام میں بور ہو رہی ہوں مجھے یہاں سے بلا لیں۔“ عورت نے تیز لہجے میں کہا۔ ”میں بلاؤں تاکہ تم پھر ان ای لڑکیوں کے ساتھ رہو جو نشیات استعمال کرتی ہیں۔“ ”مام میں وعدہ کرتی ہوں اب میں ان سے نہیں ملوں گی میں گھر میں رہوں گی۔ پلیز مجھے بلا لیں۔“ ”اوکے اپنے باپ سے بات کراد۔“

جولی نے خوش خوشی آلہ لے جا کر اپنے باپ کو دیا اور وہ اس کی ماں سے بات کرنے کے لیے اٹھ کر اندر خیمے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا اور اس نے جولی سے کہا: ”میں تمہیں کل لے جاؤں گا اور طیارے پر بٹھا دوں گا۔ میا تمہیں ایئر پورٹ سے لے لے گی۔“ جولی خوش ہو گئی اور اچھلتی کودتی اپنے خیمے میں چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد این نے کہا: ”میں بھی چلوں؟“ ”نہیں تم رکو۔ اور آرام کرو۔ بلا وجہ سفر سے فائدہ، کسی ہنگامی صورت حال میں تمہارے پاس سیلائٹ فون ہے تم ایئر جیسی کو کال کر کے مدد طلب کر سکتی ہو۔“

این نے سر ہلایا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی اٹھ کر خیمے میں چلے گئے۔ کرس خیمے سے نکلا اور اس نے ایک شاپر تاروں کے باہر پھینکا۔ اس میں بچا ہوا کھانا تھا اور میں نے شکر ہے کے ساتھ یہ شاپر قبول کر لیا۔ اس میں کچھ گوشت، پیٹی ہوٹی ہڈیوں کے ساتھ دوسری چیزیں بھی تھیں مگر سب ہی کھانے والی تھیں اور میں نے سوائے شاپر کے سب ہی کھا لیا تھا۔ اب مجھے کھانے کی تلاش میں کہیں جانے کی ضرورت نہیں تھی اس لیے میں وہیں لیٹ گیا۔ نصف رات کے قریب اچانک جولی کی تیز آواز آئی۔ ”ڈیڈ... ڈیڈ...“

کرس اور این سو بیٹھے تھے۔ جولی کی آواز پر وہ اٹھ بیٹھے۔ کرس نے پوچھا: ”کیا ہوا؟“ ”ڈیڈ... بند ہو گیا ہے۔“ جولی نے اپنا ٹیپ دکھایا۔ ”اس کا چارج ختم ہو گیا ہے۔“ ”ڈیڈ سو جاؤ صبح دیکھیں گے۔“ این نے نرم لہجے میں کہا مگر اس کی تپ میں بھی جھٹکا بہت دکھائی دے رہے تھے۔ ”مجھے ابھی اور اسی وقت چاہیے۔“ ”اوکے تم جیب میں جاؤ۔“ کرس نے اپنی قمیص پہنتے ہوئے کہا۔

جولی جیب کی طرف گئی تو این نے آہستہ سے کہا: ”یہ کیا حثاکت ہے۔ اب تم آدھی رات کو اس کے خیمے جا کو گے۔“ ”تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گی کیونکہ ابھی تم ماں نہیں بنی ہو۔“ کرس نے آہستہ سے کہا اور اٹھ کر خیمے سے نکل آیا۔ اس نے جیب اسٹارٹ کی اور جولی کا ٹیپ اس کے چارج سے لگا کر چارج کرنے لگا۔ جولی اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی اور کچھ شرمندہ ہو رہی تھی۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا: ”سوری ڈیڈ۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ کرس نے اسے پیار سے دیکھا۔ ”تم میری بیٹی ہو۔ تمہارا ہر مسئلہ میرا ہے۔“ جولی نے اس کے شانے سے سر لگا دیا۔ ”آئی لو یو ڈیڈ۔“ ”نی نو جولی۔“ کرس نے اس کے سر پر پیار کیا۔ ”کوشش کرنا آج جلدی سو جاؤ۔ کل طویل سفر کرنا ہے۔“ جولی نے سر ہلایا۔ جب اس کا ٹیپ چارج ہو گیا تو وہ جیب سے نکل کر اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے۔ کیونکہ مجھے ایک بار یہاں سے کھانا مل چکا تھا اس لیے میں نے فی الحال یہیں رہنے کا فیصلہ کیا۔ یہ لوگ یقیناً اپنا بیج جانے والا کھانا باہر پھینک دیتے ہوں گے اور اس سے میرا گزارہ ہو جاتا۔ صبح کے قریب میں نے مزید کھانا تلاش کیا مگر انہوں نے اگر کوئی شاپر پھینکا تھا تو اسے کوئی دوسرا چانور لے گیا تھا۔ میرے نصیب میں جو تھا مجھے وہی ملا۔ روشنی ہوتے ہی کیپ میں سر گرمیاں شروع ہو گئیں۔ ناشتے کے بعد جولی اپنا سامان باندھ کر جیب کے پچھلے حصے میں رکھنے لگی اور اس کے انداز میں خوشی نمایاں تھیں۔ اس سارے عرصے میں پہلی بار میں نے اسے کچھ کرتے دیکھا تھا۔ البتہ این اور کرس اداس تھے۔ کرس اس لیے اداس تھا کہ اس کی بیٹی جا رہی تھی اور این کرس کے جانے سے اداس تھی۔ ساری تیاری کے بعد وہ لوگ جیب کی طرف آئے۔ کرس نے این سے کہا: ”اپنا خیال رکھنا اور کوئی بھی مشکل ہو مجھے یا ایئر جیسی

کو فوراً کال کرنا۔“ ”تم فکر مت کرو۔“ این بولی۔ ”میں بہت بار جنگل میں اکیلے رہی ہوں۔“ ”میں تمہیں رائفل دے جاتا ہوں۔“ ”اس کی ضرورت نہیں ہے تمہیں راستے میں مشکل ہو سکتی ہے یہاں میں محفوظ ہوں۔ اگر کوئی خطرہ ہو تو میں ناوڈ پر چلی جاؤں گی۔“ ”کیپ میں ہی ایک ٹکڑی سے بنا ہوا اونچا اور مضبوط ٹاور تھا۔ یہ یقیناً جانوروں سے محفوظ رہنے کے لیے بنایا گیا تھا۔“ اپنا خیال رکھنا۔“ کرس نے جیب اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کوشش کروں گا کہ پرسوں تک آ جاؤں۔“ این نے سر ہلایا اور جولی سے بولی۔ ”بائے تم بھی اپنا خیال رکھنا۔“

جولی نے اس کی طرف دیکھے بغیر سر ہلایا تھا۔ کرس نے جیب آگے بڑھادی۔ جیب نکلنے کے بعد این نے گیت بند کر دیا۔۔۔ آج گرمی زیادہ تھی۔ جیب چلی گئی اور میں وہیں رہا تھا۔ مجھے اس عورت کے حوصلے پر رشک آیا جو اکیلی اس جنگل میں رہ رہی تھی۔ میں جھانپوں میں آرام کر رہا تھا کہ میرے حساس کانوں نے فائر کی آواز سنی۔ فائر بہت دور ہوا تھا اور میں بھی بس معمولی سی آواز سن سکا تھا۔ این کے سننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میری چھٹی حس اشارہ کرنے لگی کہ اس فائر کا کرس اور اس کی جیب سے کوئی تعلق ہے۔ اگرچہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں جتا تھا بلکہ ہم لکڑی کے اس جگہ سے مخالف سمت بھاگتے تھے جہاں فائر ہوا ہو مگر جولی کا خیال آیا تو میں بے چہین ہو گیا اور میں نے اس طرف جانے کا فیصلہ کیا۔

جھانپوں میں دوڑتا ہوا میں سوچ رہا تھا کہ اگر کرس اور جولی کو کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو گا تو میں ان کی مدد کیسے کروں گا؟ خاصی دور نکلنے کے بعد ایک ویرانے میں مجھے جیب اپنی نظر آئی۔ وہ پہلو کے ٹل گری تھی اور صاف لگ رہا تھا اس نے متعدد دفعا بازیاں بھی کھائی تھیں۔ اس کا حلیہ بگڑ گیا تھا اور ڈھانچا بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا تھا۔ میں ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آیا تو سیٹ بیلٹ سے لٹکا ہوا کرس یقیناً مر چکا تھا کیونکہ اس کے ماتھے میں سوراخ تھا اور میں نے جو فائر سنا تھا وہ اسی پر کیا گیا تھا۔ جیب میں اس کا خون بکھرا ہوا تھا۔ ونڈ اسکرین میں گولی کا سوراخ بھی تھا۔ فی الحال یہاں کوئی اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں جولی کو دیکھ رہا تھا مگر وہ مجھے نظر نہیں آئی۔ کم سے کم پچھلی سیٹ پر نہیں تھی۔

جب میں اچھلتی طرف آیا اور یہاں میں نے اسے سامان میں دبے پایا۔ اس کے سر سے ٹون بید رہا تھا مگر اس کی سانس پل رسی تھی اور وہ بے ہوش تھی۔ اچانک ہی پاس سے انسانوں کی آواز آئی اور میں بھڑکا۔۔۔ میں فوراً نزدیکی جھانپوں میں غصہ کیا۔ جب میں نے ایک ٹیپ سے دو سٹخ آدمیوں کو نمودار ہوتے دیکھا۔ ان میں سے ایک شکل سے سٹاک بجرم نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں رائفل تھی جبکہ دوسرا گئی قدر مقول تھا۔ اس کے پاس بھی ہسٹول تھی اور وہ رائفل واسے سے کھد رہا تھا۔ ”تم نے بلا وجہ کا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ اب اس کی لاش ملے گی تو یہاں پوچھیں آئے گی۔“ ”کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“ بجرم صورت نے کہا۔

دوسرا اسے کچھ دیر ٹھہرتا رہا پھر اس نے کہا: ”اپنا کام مکمل کرؤ ہمیں ابھی آگے بھی جانا ہے۔“ وہ دوبارہ اسی ٹیپ میں اتر گئے جو راستے کے ساتھ تھا مگر اپنی جیب سے خاصے فاصلے پر تھا۔ میں جھانپوں سے ہوتا ہوا ان کے نزدیک جانے کی کوشش کرنے لگا۔ بالآخر میں ان کے اتنے نزدیک پہنچ گیا کہ دیکھ سکوں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ میری توقع کے عین مطابق وہ غیر قانونی شکاری ثابت ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی خوفناک رائفلوں سے فائرنگ کر کے ایک گینڈے کو ہلاک کر دیا تھا اور اب اس کا سینگ کاٹ رہے تھے۔ معاملہ میری سمجھ میں آنے لگا۔ جب انہوں نے گینڈے کو ہلاک کیا تو اسی وقت کرس جولی کے ہمراہ یہاں سے گزرا اور انہوں نے اپنا جرم چھپانے کے لیے اسے بھی ہلاک کر دیا۔ کرس ہلاک ہوا تو اس کی جیب بے قابو ہو کر الٹ گئی اور جولی بھی زخمی ہوئی تھی۔ انہوں نے اب تک سامان میں دبی جولی کو دیکھا نہیں تھا یا پھر اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی وہ جلد از جلد یہاں سے اپنا کام کر کے فرار ہونا چاہتے تھے۔

ان کے پاس سینگ کاٹنے کے لیے مشینی آری تھی۔ اس کی مدد سے انہوں نے کچھ ہی دیر میں گینڈے کے دونوں سینگ جڑ سے کاٹ لیے اور انہیں بیگ میں ڈال کر اپنی جیب میں روانہ ہو گئے۔ جیب کے جاتے ہی میں جولی کے پاس آیا وہ بدستور بے ہوش تھی اور اپنی مدد خود نہیں کر سکتی تھی۔ اگرچہ گینڈے کی لاش کی صورت میں کھانے کا ایک بہت بڑا ذخیرہ مجھے مل رہا تھا۔ اگر میں اپنے جھنڈ کو لے آتا تو ہم کئی وقت کا کھانا کھا سکتے تھے۔ مگر اس صورت میں یہ لڑکی بغیر مدد کے مر جاتی۔ یہ صورت حال میرے لیے ایک

آزمائش سے تم نہیں تھی۔ ایک طرف میری برادری اور میرے بھائی تھے اور دوسری طرف یہ ایک انسان کی بیٹی تھی۔ میں انسانوں سے زیادہ مانوس تھا اور مجھے روہ کر اس مرد کا خیال آ رہا تھا جس نے ہم کنگز بنگلوں کو چھوڑ کر تار دیا تھا۔ یہ اس کا ہماری برادری پر احسان تھا اور میں اس کا احسان اسی طرح ادا کر سکتا تھا کہ اس کی بیٹی کی مدد کروں۔ مدد ایک ہی جگہ سے آ سکتی تھی۔ میں وہاں کیسب کی طرف روانہ ہوا اور بھانجروں میں بھانجنا ہوا کیسب تک پہنچا تو لین تاور پر چڑھی ہوئی دو تین سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ میں یہاں تو آ گیا تھا مگر میری کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس عورت کو اس گاڑی تک کیسے لے کر جاؤں۔ ظاہر ہے میں اس کے سامنے آ نہیں سکتا تھا اور اگر سامنے جاتا تو وہ محتاط ہو جاتی اور میری بات نہیں سمجھ سکتی تھی۔ میں غار دار تاروں کی پاڑ میں موجود رہنے سے اندر گھسا اور آلات اور ذخیرے والے خیمے میں آیا۔ یہاں سب کچھ تھا کھانے کا سامان بھی، پانی بھی اور وہ آلہ بھی جس سے یہ باہر رابطہ کرتے تھے۔

اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے اپنے طاقتور جڑوں سے پانی کے کین توڑنا شروع کیے۔ یہ چار عدد خاصے بڑے کین تھے۔ میں نے باری باری سب کو توڑ کر ان کا پانی بہا دیا۔ پھر میں نے رابطہ کرنے والے آلے کو جڑ سے میں دبا کر توڑا تو مجھے عجیب سا جھٹکا لگا مگر میں اسے توڑنے میں بھی کامیاب رہا۔ اب اس کیسب میں کہیں پانی نہیں تھا۔ احتیاطاً میں نے دوسرے خیمے اور جگہیں بھی دیکھ لیں۔ اب پانی یہاں سے کئی میل دور ایک کنوئیں سے ملتا جس کے اوپر ہوائی پمپ لگی ہوئی تھی۔ یہ ہوا سے چلتی اور نیچے سے پانی پمپ تھی۔ اصل میں یہ ہم جانوروں کے لیے لگائی گئی تھی جب یہاں خشک سالی ہوئی اور بارش کے پانی سے بھرے تالاب خشک ہو جاتے تھے تو اس ہوائی پمپ کو چلا دیا جاتا جو پانی پمپ کر کے ایک بڑے سے گول تالاب میں جمع کرتی تھی اور ہم جانور یہاں سے پانی پینے آتے تھے۔ ہوائی پمپ کی طرف جانے کا راستہ اس جگہ سے گزرتا تھا جہاں بیپ اپنی پڑی تھی اور مجھے امید تھی کہ این پانی کے لیے اس طرف جائے گی تو وہ بیپ دیکھ لے گی اور جولی کی مدد کرے گی۔ اس کی روانگی کو مزید پکا کرنے کے لیے میں نے کھانے کی چیزیں بھی تیار کر دیں۔ ہر چیز کو الٹ پلٹ دیا اور یوں برباد کیا جیسے کنگز بنگلوں کے پورے جھنڈے یہاں منہ کر دیا ہو۔

این اداس تھی مگر جب کرس اور جولی جانے لگے تو اس کا دل عجیب سا ہونے لگا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ انہیں روک لے یا پھر ان کے ساتھ ہی چلی جائے مگر وہ کچھ نہ کر سکی۔ بس انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کے پاس کرنے کو کچھ خاص نہیں تھا۔ یہاں بجلی نہیں تھی اور وہ برقی لائٹیں اور دوسرے آلات چارج کرنے کے لیے ایک چھوٹا سا کیمس فٹیل استعمال کرتے تھے۔ دوسرا ذریعہ بیپ کا انجن تھا۔ بیپ جا بکلی تھی اس لیے این نے تمام چارج ہونے والے آلات وہ کیمس فٹیل کے سرکٹ سے لگا دیے۔۔۔۔۔ ان کے پاس دو بڑی تیز روشنی والی لائٹیں اور دو چھوٹی لائٹیں اور دو دیر تک روشن رہنے والی طاقتور تار پیمیں تھیں۔ اسی سے وہ لیپ ٹاپ بھی چارج کرتے تھے۔ کچھ دیر بعد این دور بین لے کر تاور پر چڑھ گئی۔ آج گری شدید تھی اور وہ آس پاس کا نظارہ کرنا چاہ رہی تھی مگر گری کی وجہ سے جانور بھی غائب تھے۔ نصف گھنٹے بعد وہ نیچے آئی تو فوراً ہی اسے گز بڑ کا احساس ہوا۔ اوپر ہوا کی رفتار تیز اور پر شور تھی اس لیے اسے سنا نہیں دیا کہ نیچے کیا ہوا تھا۔ پورا کیسب جس جس ہو گیا تھا۔ وہ سامان والے خیمے میں آئی تو یہ دیکھ کر اس کا دل جھٹ گیا کہ پانی کے سارے کین توڑ دیے گئے تھے اور فرش پر کنگز بنگلوں کے بیروں کے نشانات نمایاں تھے۔ اس نے کھانے پینے کی ساری چیزیں برباد کر دی تھیں اور سب سے اہم چیز یعنی سیلائٹ فون بھی توڑ دیا تھا۔ وہ سکتے میں رہ گئی تھی۔ صرف آدھے گھنٹے میں صورت حال مارل سے خوفناک ہو گئی تھی۔ وہ بالکل نہیں جان سکی کہ کنگز بنگلوں کب کیسب میں گھسے اور یہ تباہی پھیل کر چلے گئے۔ وہ انہیں آتے جاتے نہیں دیکھ سکی تھی۔ پانی کے بغیر وہ یہاں زیادہ دیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے فوری طور پر دوسری جگہوں پر دیکھا تو اسے اپنی دھات کی بوتل میں مشکل سے نصف لیٹر رہ جانے والا پانی ملا تھا۔

این مکی عورت تھی اور اس قسم کے حالات سے گزرتی رہی تھی اس لیے اس نے افسوس کرنے پارو نہ دھونے میں وقت ضائع نہیں کیا۔ اس کے پاس ایک نقشہ تھا جس میں اس علاقے کی تمام اہم جگہوں اور آبادیوں کی نشان دہی کی گئی تھی۔ این نے اپنا بڑا بیگ لیا جو آسانی سے اس کے شانے پر آ جاتا۔ اس نے تمام ضروری چیزیں اور لیپ ٹاپ کی۔ اس کی نکال کر اس میں رہی۔ پھر اہم آلات جیسے ایک شکاری چاقو اور دور بین بھی رکھی تھی۔ اس نے پہلے ہی محل لباس اور مضبوط جوگرز پہن رکھے تھے۔ پانی کے لیے اس

نے بوتل اور پوٹی مہین سے نئی ہوئی بڑی مچاگل ساتھ لی۔ اس میں ایک وقت میں بیپ لیٹر پانی آ سکتا تھا جو تین چار دن کے لیے کافی ہوتا۔ پانی کا کنواں یہاں سے کوئی چار میل شمال مشرق میں تھا۔

اگرچہ میں سزا کا یہ علاقہ نیم صحرائی اور نیم ہیر تھا۔ یہاں گھنے جنگل نہیں تھے مگر وسیع رہنے پر گھاس اور بھانڑیاں موجود تھیں جو یہاں کی جنگلی حیات کی پرورش کے لیے کافی تھیں۔ وہ کیسب سے نکلی اور دروازہ بند کر کے شمال کی طرف چل پڑی۔۔۔۔۔ اس نے عام گزرا گاہ کے بجائے شارٹ کٹ اختیار کیا تھا یوں وہ جلدی کنوئیں تک پہنچ سکتی تھی۔ دھوپ شدید تھی اور ذرا سی دیر میں اس کا گلانشک ہو گیا۔ اس نے بوتل میں بھرا ہوا پانی ایک ٹھونٹ پیا۔ اگرچہ وہ کنوئیں کی طرف جا رہی تھی مگر جب تک پانی حاصل نہ کر لیتی وہ محتاط رہتا جانتی تھی۔ اب کنوئیں کے اوپر لگی ہوئی بجلی نظر آرہی تھی۔ مگر وہ اب بھی کئی میل دور تھی۔ اس تک پہنچنے پہنچنے این نہ چاہتے ہوئے بھی بوتل کا نصف پانی پی چکی تھی۔

جب وہ بجلی کے پاس پہنچی تو اسے احساس ہوا کہ وہ تو کام ہی نہیں کر رہی ہے۔ اس کا پچھلا گھوم رہا تھا مگر کسی خرابی کی وجہ سے وہ کنوئیں سے پانی کھینچنے والے میکینر کو حرکت

نہیں دے پا رہا تھا۔ این کے منہ سے بے بسی سے بھرپور آہ نکل گئی۔ اس نے آس پاس تالاب کی چار دیواری سے اندر مچا لگا کہ شاید اس کی تہ میں کچھ پانی ہو مگر وہاں مٹی تھی۔ پانی کی ایک بوتل اور مٹی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ بجلی کے نیچے موجود پانی کی چھوٹی ٹنگی کا کل کھلا ہوا تھا اور اس میں پانی منع ہوا تھا تو وہ کب کا بہہ چکا تھا۔ این تالاب کی چار دیواری سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔۔۔۔۔ یہاں پانی نہیں ملا تھا اس کا مطلب تھا کہ اسے آگے جانا تھا۔ اچانک اسے کسی کی نزدیک موجودگی کا احساس ہوا اور ایک گز گزاتی ہوئی ملکی آواز آئی۔ وہ دسے قدموں اٹھی اور تالاب کی چار دیواری سے گھومتے ہوئے دوسری طرف آئی۔ تب اسے دور مشرق میں کسی چیز کی چمک دکھائی دی۔

اس طرف گزرا گاہ تھی اور شاید وہاں کوئی گاڑی موجود تھی۔ اس کی دندنا مکرین کا شیشہ سورج کی روشنی منعکس کر رہا تھا۔ گاڑی کا مطلب تھا انسان اور انسان کا مطلب تھا وہ دسے قدموں کنوئیں سے دور تھی اور پھر بھانڑیوں میں سے ہوتی ہوئی گزرا گاہ کی طرف جانے لگی۔ راستے میں اسے نئی بار چمک محسوس ہوئی۔ ایک جگہ پہنچ کر اس نے دور بین لگا لی تو اسے اتنی ہوئی جیب نظر آ گئی اور اس نے جیب کو

ماہنامہ جاسوسی فنانجسٹ

ماہنامہ جاسوسی فنانجسٹ

● **انگاریے**

● **آوارہ گرد**

● **معصوم کے والدین**

● **سزورق کی کہانیاں**

● **بھلی کھاسی**

● **دوسری کھاسی**

● **انگاریے**

● **آوارہ گرد**

● **معصوم کے والدین**

● **سزورق کی کہانیاں**

● **بھلی کھاسی**

● **دوسری کھاسی**

ماہنامہ جاسوسی فنانجسٹ

ماہنامہ جاسوسی فنانجسٹ

شامت کیا تو اس کا دل اچھل کر ملق میں آ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ بے تحاشا اس کی طرف بھاگ رہی تھی۔ اب اسے سمجھ میں آیا کہ اس کے دل پر عجیب سا بوجھ کیوں آ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کرس کی سلامتی کی دعا مانگ رہی تھی مگر جب وہ جیب کے پاس پہنچی تو اس کی حالت دیکھ کر اس کی امیدیں دم توڑ گئیں۔ وہ بھانجی ہوئی ڈرائیونگ کپارٹ تک آئی اور... دھڑام سے گھٹنوں کے بل گر کر اس کے جسم سے سر ہٹا کر رونے لگی۔ اس کا دل ہلکا ہوا تو اسے جولی کا خیال آیا۔ اس نے بڑی مشکل سے معنی سیٹ پر جھانکا مگر جولی وہاں نہیں تھی۔ لڑن پیچھے آئی اور یہاں اسے سامان میں دبی ہوئی جولی مل گئی۔ وہ زندہ اور نیم بے ہوش تھی۔ اس کے سر پر چوٹ آئی تھی مگر باقی جسم سلامت تھا۔ این نے اس پر سے پٹا اٹھا یا اور پھر اس کے منہ میں چند قطرے پانی کے پکائے۔ ردھل میں وہ ہوش میں آنے لگی۔ این نے پانی پکانے کا مکمل جاری رکھا حتیٰ کہ وہ ہوش میں آ گئی۔ چند لمحے وہ اسے خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے باپ کے بارے میں پوچھا۔ "ڈیڈ کہاں ہیں؟"

این کے پیٹے آنسوؤں نے اسے ساری کہانی سنادی اور وہ بھی رونے لگی۔ کچھ دیر بعد این نے اٹھ کر عقی صے میں موجود سامان دیکھا۔ اس میں کھانے پینے کا معمولی سا سامان تھا۔ وہ اس نے نکال کر ٹرائی میں رکھا۔ ٹرائی جیب میں موجود تھی۔ پانی کا ایک چھوٹا کین تھا جس میں تین لیٹر پانی تھا۔ دوسری بوتل مکمل گئی تھی اور اس کا پانی ضائع ہو گیا تھا۔ این نے کام کی اور چیزیں بھی ٹرائی میں رکھیں۔ پھر وہ آس پاس کا جائزہ لے رہی تھی کہ اس کی چھٹی حس نے اشارہ کیا۔ اس نے مزید دیکھا تو دروازے دھول اڑتی دکھائی دی۔ کوئی گاڑی اس طرف آ رہی تھی۔ اس نے جولی کو بتایا تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔ اس نے کہا۔ "یہ وہی ہوں گے۔"

یہ سننے ہی این تیزی سے حرکت میں آئی۔ اس نے جولی سے کہا۔ "ٹرائی یہاں کھائی میں لے جاؤ۔"

خود این نے جھانڈی سے ایک شاخ توڑی اور ریت پر بنے اپنے قدموں کے نشانات مٹانے لگی۔ جولی ٹرائی دھکیل کر پیچھے کھائی میں لے گئی۔ یہ زیادہ بڑی نہیں تھی مگر اس کے نیچے خلا تھا جس میں وہ چسپ سکتی تھیں۔ لڑن جھانڈو مارتی اور نشان مٹاتی کنارے تک آئی اور نیچے اتر گئی۔ اس نے جولی کی مدد سے ٹرائی کو خلا میں زیادہ سے زیادہ اندر کر دیا اور خود اس کے ساتھ دھب کر بیٹھ گئی۔ اس نے سرکوشی میں کہا۔ "آواز مت نکالنا۔"

جولی نے سر ہلایا اور اسی لمحے دوسری گاڑی آ کر وہاں رکی۔ انجن کی آواز بند ہوئی اور وہی دونوں افراد نیچے اترے جو کرس کے قتل میں ملوث تھے اور اس سے پہلے انہوں نے ایک گینڈے کا غیر قانونی شکار کیا تھا۔ ان میں مجرم صورت اس وقت برا فروخت نظر آ رہا تھا۔ اس نے اترتے ہی کہا۔ "ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"تا کہ تم نے جو کیا ہے اسے ٹھکانے لگاؤ۔" معقول صورت والے نے سرد لہجے میں کہا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے؟" مجرم صورت والا غرایا۔

"پڑے رہنے دو کل تک اسے جانور کھا جائیگا گے۔"

"میری بات سنو، یہ ایک انسان ہے۔ تم نے اسے قتل کر دیا ہے۔ یہ مگر یہ اس کا سہق ہے کہ اسے دفن کیا جائے۔ جانوروں کی خوراک بننے کے لیے نہ چھوڑا جائے۔"

معقول صورت والے نے کہتے ہوئے اپنی جیب سے کھدائی کے اوزار نکال کر اس کے سامنے چھینک دیے۔ مجرم صورت کچھ دیر اسے زہریلی نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے جیب سے رسی نکالی اور کرس کی اپنی جیب میں گھس گیا۔ معقول صورت سمجھا نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ کچھ دیر بعد مجرم صورت جیب سے نکل کر اپنی جیب تک گیا اور رسی اس کے پیچھے پیچھے سے باندھ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ معقول صورت والا چلایا۔ "اسے یہ کیا کر رہے ہو؟"

جواب میں اس نے قہقہہ مارا اور جیب چلا دی۔ کرس کی لاش ایک جھینگے سے باہر آئی اور زمین پر پڑنے لگی۔ کئی۔ این ہمت کر کے کھائی سے جھانک کر دیکھ رہی تھی۔ جب کرس کی لاش باہر آئی اور گھسنی ہوئی جانے لگی تو اس نے یہ مشکل اپنی سسکیاں روکیں۔ کرس اس کا صرف شوہر نہیں محبوب بھی تھا۔ ان کی شادی کو چھ مہینے ہی تو ہوئے تھے اور وہ یوں اس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ اب اس کی لاش کے ساتھ یہ سلوک ہو رہا تھا۔ اس وقت اسے مجرم صورت شخص سے شدید نفرت محسوس ہوئی اور اس کا دل چاہا کہ کاش وہ اسے اپنے ہاتھ سے قتل کر سکے۔ مجرم صورت والا صرف اپنی سفاک اور گھنیا طبیعت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ ایک چکر لگا کر لاش اس جگہ لے آیا جہاں معقول صورت والا قبر کھود رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کا ساتھی اس کا ساتھ نہیں دے گا۔ جیب روک کر اس نے ذیک پر بلند آواز سے میوزک لگا دیا اور خود بیئر پینے لگا۔ جب تک معقول صورت والے نے قبر کھود کر کرس کو اس میں دفن کیا اس کا یہی شغل جاری رہا تھا۔ معقول صورت نے زمین بالکل ہموار کر دی تھی تاکہ کسی

کو قبر کا پتا نہ چلے۔ اس کے بعد اس نے کرس کی اپنی جیب پر ڈیزل چھڑکا۔ مجرم صورت نے کہا۔

"اگر وہ لڑکی مل جاتی تو مزہ آ جاتا۔"

"وہ بچی تھی۔"

"وہ کہیں سے بچی نہیں تھی۔" مجرم صورت والے نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اسے تلاش کرتے ہیں شاید وہ آس پاس ہی ہو۔"

معقول صورت والے نے ماچس کی تیلی جلا کر کرس کی جیب پر پھینک دی اور اس نے آگ پکڑ لی۔ معقول صورت نے کہا۔ "وہ بہت دیر پہلے یہاں سے جا چکی ہے۔ اس علاقے میں کوئی اکیلا انسان زیادہ دیر محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اس کا خیال چھوڑ دو اور اس کام پر توجہ دو جس کے لیے ہم یہاں آئے ہیں۔ جارج نے بتایا ہے کہ ہاتھیوں کا ایک جھنڈا تقریب اس علاقے میں آنے والا ہے۔"

مجرم صورت کا منہ بن گیا مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔ معقول صورت والے نے اوزار جیب میں ڈالے اور وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ جب تک وہ وہاں رہے این اور جولی کی جان پر مبنی رہی۔ جولی تو شاک میں تھی اور پھر نیچے گئی وہ ان لوگوں کی باتیں نہیں سن سکتی تھی مگر این نے سنی تھیں۔ یہ لوگ مجرم ہی نہیں بہت گھنیا بھی تھے خاص طور سے جو صورت سے مجرم نظر آ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ جانوروں کا غیر قانونی شکار کرنے والے کسی بڑے ریکٹ کا حصہ تھے۔ کاش کہ کرس اس وقت یہاں نہ آتا۔ رات ہونے والی تھی اور بڑی تاریکی میں جیب کے ہزکتے شعلے اور لمبیاں ہورے تھے پھر اس کا ایندھن کا ٹینک پھٹا تو شعلے بہت بلندی تک گئے تھے مگر کچھ دیر بعد وہ بجھ گئے کیونکہ انہوں نے ہر ایسی چیز کو جلا دیا تھا جو جل سکتی تھی اور اب جیب کا مزا اترادھانی منجمد رہ گیا تھا۔ این قبر تک آئی اس نے سر ہانے کی نشانی کے لیے ایک پتھر اس پر لگایا اور کچھ دیر گھڑی رہی۔ جولی بھی اوپر آئی مگر وہ ابھی تک شاک میں تھی۔ وہ خاموش تھی۔ این نے اس سے کہا۔

"ہمیں یہاں سے آگے جانا ہوگا۔"

"کہاں؟"

این نے نقش نکالا اور تاریخ کی روشنی میں واضح کرنے لگی۔ "ہم یہاں ہیں۔" اس نے ایک جگہ انگلی رکھی۔ "اور ہمیں یہاں جانا ہے۔" اس نے دوسری جگہ انگلی رکھی۔ "یہ ایک آبادی ہے۔"

جولی نے غور سے دیکھا۔ "یہ جگہ یہاں سے کم سے کم

ساتھ میل دور ہے۔"

"ہاں مگر ہمیں جانا ہوگا۔"

"اس خوراک اور پانی کے ساتھ ہم وہاں پہنچ جائیں گے؟"

"کوشش کر سکتے ہیں۔" این بولی۔ "اگر ہم اسی وقت چل دیں تو شاید دو دن میں وہاں پہنچ جائیں۔ کیا تم چل سکتی؟"

جولی نے سر ہلایا۔ "میں چل لوں گی۔"

اس نے اسکرٹ ہلاؤز کے ساتھ لیڈر کے ٹخنوں سے اوپر آتے جوتے پہن رکھے تھے اور ان میں کئی قدر تکلی تھی اس لیے یہ آسان نہیں تھے۔ مگر جولی نو جوان تھی وہ چل سکتی تھی۔ ٹرائی این نے سنبھال لی۔ اس نے اب تک جولی سے اس واقعے کے بارے میں سوال نہیں کیا تھا۔ وہ اسے کچھ وقت دینا چاہتی تھی۔ وہ جھانڈیوں سے گزر رہے تھے اور کبھی کبھی انہیں لگتا کہ ان کے آس پاس کوئی چل رہا ہے۔

میں ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ میری حکمت عملی کامیاب رہی۔ جب این گزر گا کہ بجائے مختصر راستے سے ہوائی چلنی تک آئی تو مجھے مایوسی ہوئی تھی۔ میں تو چاہتا تھا کہ وہ گزر گا کہ کی طرف سے آئے اور اپنی جیب دیکھ لے۔ مگر وہ جیب سے بہت دور تھی میں اس کی نظروں میں آئے بغیر پانی کے طالب کے ساتھ تھا۔ مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ ان دنوں یہاں پانی نہیں تھا۔ میری حکمت عملی سے این نے کرس اور جولی کو پایا۔ میں نے این کی جو گفتگو سنی تھی اس کے مطابق انہیں طویل سفر پر روانہ ہونا تھا۔ میں اس سفر کی سست سے آگاہ تھا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ مجھے اپنا اور اپنی برادری کا بھی کچھ بھلا کرنا چاہیے اس سے پہلے کہ مارے جانے والے گینڈے کی لاش دوسرے جانوروں کے ہتھے چڑھ جائے۔ میں نے ذہن میں سارا حساب کتاب رکھ لیا اور بہت تیزی سے اپنے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گیا مگر میں نے دور سے آواز لگا کر اپنے ساتھیوں کو متوجہ کر لیا۔ بڑے شکار کا سن کر تقریباً پورا جھنڈا ہی دوڑا آیا تھا جس میں میری مادہ بھی شامل تھی۔ ان کو آتے دیکھ کر میں درمیان سے ہی واپس ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میری برادری گینڈے کی لاش کو کھانے میں مصروف تھی۔ کیونکہ مجھے ابھی این اور جولی کے پیچھے جانا تھا اس لیے میں نے جلدی جلدی کھایا۔ مادہ نے میری جبلت محسوس کر لی تھی۔ اس نے پوچھا۔

"تم جلدی کیوں کر رہے ہو؟"

"مجھے جانا ہے۔" میں نے کہا اور اس سے مجبوت

بولے: "یہ گیند غیر قانونی قرار کرنے والوں نے مارا ہے۔ ان کا مزید قرار کا پروگرام ہے اور میں ان کے پیچھے جاؤں گا۔"

مادہ فکر مند ہو گئی۔ "لیکن اس میں خطرہ ہے۔" "خطرہ تو ہماری زندگی کو ہے اب۔ پرسوں میں نے تمہیں جو کھانا دیا تھا وہ میں شیروں کے درمیان سے لے کر آیا تھا۔"

یہ بات مادہ سمجھتی تھی مگر وہ فکر مند رہی۔ "اچھا تم ان لوگوں کے زیادہ نزدیک مت جانا، یہ ہر جانور پر کوئی چلا رہے ہیں۔"

"میں احتیاط کروں گا۔" میں نے جگت میں ایک بڑی بونی لنگتے ہوئے مادہ سے وعدہ کر لیا۔ اچھی طرح پیٹ بھر کر میں روانہ ہوا تو میں نے کوشش کی کہ کوئی اور لکڑ بھگا میری طرف متوجہ نہ ہو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی میرے پیچھے آئے اور اسے ان دونوں عورتوں کے بارے میں پتا چلے۔ اگر لکڑ بھگو کو پتا چل جاتا کہ یہاں دو بے بس عورتیں ہیں تو ممکن ہے وہ ان کے پیچھے جاتے اور میں انہیں روک نہیں سکتا تھا۔ اس لیے بہتر تھا ان کے بارے میں کسی کو علم نہ ہو۔ پیٹ بھرنے کے بعد زیادہ تیز رفتار دی سے دوڑتا تو ممکن نہیں تھا مگر میں نے ایک رفتار طے کر لی۔ اس سے مجھے امید تھی کہ میں جگ تک ان دونوں کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ ذرا آگے جانے کے بعد میں نے ان کے قدموں اور طرائی کے پیروں کے نشانات دیکھ لیے تھے اور میں ان کی رہنمائی میں پہنچنے لگا۔ وہ بھی جان بوجھ کر جھاڑیوں کے درمیان سے گزر رہی تھیں تاکہ ان خطرناک لوگوں سے سامنا نہ ہو۔ انہیں یقیناً جانوروں سے زیادہ انسانوں سے خطرہ تھا، ورنہ وہ بھی ان جھاڑیوں میں نہ ٹھکتیں۔

دوڑتے ہوئے میں تھک جاتا تو کچھ دیر آرام کر لیتا تھا۔ ہوتے ہوتے صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی اور اب تک میں ان دونوں تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ میں نے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا ویسے تو ہم لکڑ بھگے جھنڈ کی صورتوں میں سیکڑوں میل دور بھی چلے جاتے ہیں مگر اکیلے لکڑ بھگے کے لیے حدود متعین ہوتی ہیں اور اس سے باہر جانا خود کو خطرے میں ڈالنے کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ میں اس حد سے بہت دور نکل آیا تھا۔ اگر میں یہاں کسی مشکل میں پڑ جاتا تو میری مدد کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ جب دونوں عورتیں نظر نہیں آئیں تو مجھے لگا کہ میں نے شاید ان کا سراغ کھو دیا ہے۔ روشنی اب تیز ہو رہی تھی۔ یہ علاقہ زیادہ تر خشک

چٹانوں اور کہیں کہیں صحراؤں پر مشتمل تھا۔ اچانک میں رک گیا کیونکہ کچھ راستے پر گاڑی کے ٹائروں کے نشانات واضح تھے۔

یہاں سے کچھ وقت پہلے ہی کوئی گاڑی گزری تھی۔ مجھے خیال آیا کہ شاید ان دونوں نے بھی گاڑی یا اس کے نشانات دیکھ لیے ہوں اور وہ راستے سے ہٹ گئی ہوں۔ اس صورت میں ذرا دور کھنڈر نما چٹانوں میں ہوسکتی تھیں۔ میں سوچتے ہوئے چٹانوں میں گھس گیا اور اس بار میری تلاش رنگ لائی۔ وہ دونوں ایک کمرے نما جگہ پر بے سدھ لیٹیں ہوئی تھیں۔ جولی سورہی تھی مگر این جاگ رہی تھی۔ اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ اس نے ساری رات جاگتے رہنے کی کوشش کی تھی۔ یہ اچھی بات تھی کیونکہ ان چٹانوں میں خطرات بہت زیادہ تھے اور اصل خطرہ تو انسانوں سے تھا۔ ان کو ہوشیار کرنا ضروری تھا تاکہ وہ آگے روانہ ہوں۔ میں نے سامنے آتے ہوئے ہلکی سی غراہٹ بھری آواز لگائی۔ این چونک گئی اور جولی نے ہلکی سی چیخ ماری۔ دونوں جلدی سے کھڑی ہو گئیں۔ این نے جاتو نکال لیا تھا۔ میں نے ان کے سامنے بے باتی سے چند چکر دگائے اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ ان کا رد عمل میری توقع کے عین مطابق تھا۔

"یہاں سے لگو۔" این بولی۔ "یہ خطرناک ہے۔" جولی نے سبکی ہوئی آواز میں کہا۔ "اگلیا لکڑ بھگا عام جگہ سے حملہ نہیں کرتا۔" این نے چادر سمیٹ کر فراری میں رکھتے ہوئے کہا۔ "بلکہ اس نے اسیا کیا کہ ہمیں ہوشیار کر دیا۔ ابھی ہمیں بہت دور جانا ہے۔" وہ آگے چل پڑیں۔ جولی نے پوچھا۔ "اب ہمارے پاس پانی کتنا ہے؟"

"مشکل سے ایک لیٹر۔" این نے جواب دیا۔ "مگر ہمیں راستے میں کہیں پانی نہ ملا تو ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔"

جب میں نے این کو کیپ سے نکالنے کے لیے پانی کا ذخیرہ تباہ کیا تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ اتنا بڑا مسئلہ بن جائے گا اور انسانوں سے زیادہ پانی کی کمی ان کے لیے خطرہ بن جائے گی مگر اب کی ہو سکتا تھا۔ این ٹھیک کہہ رہی تھی انہیں آج کے دن کہیں پانی کے ذخیرے تک پہنچنا تھا ورنہ ان کی جان خطرے میں پڑ جاتی۔ سورج نکلنے ہی گزرنی کی شدت بڑھ گئی۔ ایسے میں پانی کی طلب زیادہ ہو جاتی تھی۔ میں ان سے ہنچے ہوئے تھا کہ وہ میری موجودگی محسوس

نہ کر سکیں۔ کچھ دیر بعد جولی نے پانی مانگ شروع کر دیا مگر این اسے کہہ رہی تھی کہ انہیں پانی بچانا ہے۔ اس پر جولی کو غصہ آ گیا اور وہ این کو برا بھلا کہنے لگی۔ غصے میں آ کر این نے اسے پانی کی بوتل تھما دی۔ "لو تم نے جتنا پیتا ہے لی لو چاہو تو سب پی جاؤ۔"

اس پر جولی کا غصہ خنڈا ہو گیا تھا۔ اس نے بوتل سے ایک گھونٹ لیا اور اسے این کو واپس کر دیا۔ "سوری، میں کیا کروں مجھ سے پیاس برداشت نہیں ہو رہی تھی۔" این بھی نرم پڑ گئی، اس نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "جولی اگر ہمیں زندہ رہنا ہے تو پیاس برداشت کرنا ہو گی ورنہ پیاس ہمیں وقت سے پہلے ہلاک کر دے گی۔"

"میں نے بھی پیاس برداشت نہیں کی۔" یہاں چٹانوں کے درمیان خشک جھاڑیاں تھیں۔ سبز جھاڑیاں صرف نشیب میں تھیں جہاں بارش کا پانی زیادہ عرصے تک رہتا تھا۔ دو پہر تک وہ سارا ہی پانی ختم کر چکی تھیں۔ ان کے چہرے سر جھانکے تھے اور چال میں لڑکھڑاہٹ آ گئی تھی۔ اس وقت وہ ایک وادی کے پاس سے گزر رہی تھیں۔ اچانک ان کو نیچے چنک سی دکھائی دی۔ جولی نے کہا۔ "وہاں کچھ چنک رہا ہے۔"

"شاید پانی ہے۔" این نے امید سے کہا اور وہ دونوں نیچے کی طرف بڑھیں مگر میں نے دیکھ لیا تھا وہاں پانی تھا مگر پینے کے قابل نہیں تھا۔ اس میں کسی جانور کی گل سڑھ جانے والی لاش پڑی تھی۔ جولی نے جب پانی دیکھا تو بے تاب ہو کر بھاگی۔ اس نے جانور کا ڈھانچا بھی نہیں دیکھا تھا مگر این نے دیکھ لیا۔ اس نے بروقت جولی کو روکا۔ وہ پیاس سے پاگل ہو رہی تھی اور یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ پانی سامنے ہوتے ہوئے بھی وہ اسے پینے سے قاصر تھی۔ این اسے وہاں سے لے جانا چاہتی تھی مگر وہ اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے مداخلت کرنی چاہیے اور میں نیچے اتر کر تالاب کے پاس آیا۔ میں نے غرا کر جارہا نہ انداز میں دانت نکالے تو جولی کا رویہ بدل گیا اور وہ ڈر کر این کے پیچھے پھینے لگی۔ اس نے موقع غنیمت جانا اور بولی۔

"یہاں سے چلو اس سے پہلے کہ یہ حملہ کر دے۔"

جولی اس کے ساتھ لڑکھڑاتے قدموں سے اوپر چلی گئی تھی۔ این کے جانے کے بعد میں نے پانی پیا۔ اس سے بدبو آ رہی تھی اور انسانوں کے لیے یہ پانی کسی بھی صورت ٹھیک نہیں تھا مگر ہم لکڑ بھگوں سے بے بالکل ٹھیک تھا۔ اب میں ان کا شکر گزار تھا کہ ان کی وجہ سے مجھے پینے کو پانی ملا

ورنہ مجھے کئی دن سے پانی نہیں ملتا تھا۔ میں پانی پینے کے دوران ان پر بھی نظر رکھنے ہوئے تھا اور وہ اب اس وادی کے اوپری کناروں پر سفر کرتی ہوئی مشرق کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ انہوں نے ایک تباہی فاسد طے کر لیا تھا اور ابھی اپنی منزل سے خاصے فاصلے پر تھیں۔ جب وہ مشرقی سمت جا کر آگے روانہ ہوئیں تو میں بھی وادی سے نکلا اور ان کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ وہ اس وقت تک خاصی آگے جا چکی تھیں اور شاید انہوں نے میرے خوف سے تیزی سے سفر کیا تھا۔ وہ دونوں ٹرائی سمیت ایک چٹان پر چڑھ رہی تھیں۔ اچانک وہ رک گئیں۔ انہوں نے آپس میں کچھ بات کی اور این ایک جھاڑی تلے بیٹھ گئی۔ میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ انہوں نے کیا دیکھا تھا جو رک گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

یہ ایک کیپ تھا جو نیلے کی بلندی سے دور نشیب میں دکھائی دے رہا تھا۔ کئی بڑی چھوٹا ریوں پر مشتمل اس کیپ میں خاصا سامان اور ایک بڑے سائز کی جیب بھی تھی مگر وہاں کوئی آدمی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ این اور جولی نے دیکھا تو جولی پر جوش ہو گئی۔ اس نے این سے کہا۔ "ہمیں یہاں سے مدد مل سکتی ہے۔"

"ہم نہیں جانتے کہ یہاں کون ہے اس لیے ہمیں محتاط ہو کر آگے جانا ہوگا۔"

"پہلے ہمیں دیکھنا ہوگا کہ یہاں کون لوگ ہیں اور جب اطمینان ہو جائے گا تو ہم یہاں جا سکیں گے۔"

جولی نے سوچا اور سر ہلایا۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو ایسا کر دو تم آرام کرو میں دیکھتی ہوں اگر کوئی نظر آیا تو میں تمہیں بھی بتاؤں گی۔"

این ٹرائی سمیٹ کر تھک گئی تھی اس لیے وہ ایک جھاڑی تلے لیٹ گئی۔ جھاڑیوں میں سکون ملا تو اسے چند لمحوں کے لیے اٹھ آگئی اور پھر وہ چونکی تو جولی اپنی جگہ نہیں تھی۔ این نے اٹھ کر دیکھا تو وہ اسے دور کیپ کے پاس نظر آئی وہ تیزی سے... آگے جا رہی تھی۔ این نے زیر لب کہا۔ "بے وقوف لڑکی یہ تم نے کیا کیا؟"

جیسے ہی جولی کیپ کے پاس پہنچی ایک خیمے سے ایک لہجہ آ رہا اور عمر رسیدہ شخص نکلا۔ بڑھ چاہو نے کے باوجود وہ بہت مضبوط جسم کا مالک تھا۔ جولی اس کی طرف گئی اور وہ اسے بارو سے پکڑ کر کیپ میں گئی میزبانہ کرسیوں کی طرف لے آیا۔ اس نے جولی کو کرسی پر بٹھایا اور اسے منزل و اثر کی

ہوئی دی۔ جونی جلدی جلدی پانی پینے لگی۔ پھر اس نے جولی کو سیٹھ پر کھانے کو دیے تھے۔ اسی لمحے این کی توجہ فاصلے سے آتی جیب کی طرف گئی اور یہ دیکھ کر اس کا دل ڈوب گیا کہ جیب میں وہی دو افراد تھے جو کرس کے گھر کے ڈسے دار تھے۔ اس کا مطلب ہے یہ جیب بھی ان ہی لوگوں کا تھا۔ جیب کیس میں داخل ہو کر رکی تو جولی نے ان لوگوں کو دیکھا اور چیخ مارتے ہوئے بھاگی مگر لیے آدی نے لپک کر اس کا بازو تھام لیا۔ این بچہ گئی کہ جولی اور وہ بھی بہت بڑی مشکل میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ جلد جولی اس کے بارے میں بھی بتا دے گی اور یہ اس کی تلاش میں نہیں گے۔

میں جولی کو کیس کی طرف جاتے دیکھ چکا تھا اور اس کے پیچھے تھا۔ وہ این کو دھوکا دے کر خاموشی سے گئی تھی۔ میری کوشش تھی کہ اسے ڈرا کر وہاں لے آؤں مگر وہ پہلے ہی کیس تک پہنچ گئی تھی اور میں جھاڑیوں میں رکنے پر مجبور ہو گیا۔ میری چھٹی حس نے بتایا کہ آگے جاتا میرے لیے خطرناک ہو سکتا تھا۔ جولی آگے گئی تو ایک لمبا آدی خیمے سے باہر آیا اور یہ ظاہر وہ جولی سے بہت نرمی سے پیش آ رہا تھا مگر مجھے اس کی آنکھوں میں ایسی چمک نظر آئی جو ہم جانوروں کی آنکھوں میں شکار دیکھ کر آتی ہے۔ وہ بہت بھری نظروں سے جولی کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ اسے پانی اور کھانے کو دے رہا تھا اور اس سے سوالات کر رہا تھا۔ جولی نے اسے بتایا کہ اسے پر کیا گزری تھی۔ وہ جولی کو یقین دلانا رہا تھا کہ وہ یہاں بالکل محفوظ ہے مگر میں جانتا تھا وہ محفوظ نہیں ہے۔ جلد اس کی تصدیق بھی ہو گئی جب وہی دو افراد جیب میں یہاں آئے جن سے فح کر جولی اور این بھاگے تھے۔ جولی نے دہشت زدہ ہو کر بھاگنے کی کوشش کی مگر لیے آدی نے اسے پکڑ لیا اور درشت لہجے میں اپنے آدیوں سے پوچھا۔

”جینڈ تم بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے؟“
جینڈ نے مجرم صورت کی طرف اشارہ کیا۔ ”میش سے پوچھو اس نے گولی چلائی تھی۔“
میش آرام سے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”تو کیا اسے جانے دیتا ہمارے خلاف مینی گواہ بن گیا تھا۔“
لمبا آدی آگے آیا اور اس نے میش کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ ”تم نے کسی انسان کو قتل نہیں کیا تھا جو تمہیں مینی گواہ کی طرح لگتی تھی۔“
”اب تو ہو گیا اور اچھا ہوا یہ لڑکی بھی یہاں آگئی

ہے۔“ میش نے کہا۔ ”اسے بھی قسم کرو دیتے ہیں۔“
”یہ بچی ہے۔“ جینڈ نے مداخلت کی۔
”تم دونوں قتل کبہ رہے ہو۔ اسے مارنا ضروری نہیں ہے اور جینڈ فور سے دیکھو یہ بچی نہیں ایک خوب صورت نوجوان لڑکی ہے یہ ہمارے کام آئے گی اسے قتل کرنا ضائع کرنے کے برابر ہے۔“
میش سوچ رہا تھا اس نے کہا۔ ”کیا یہ اکیلی ہے؟“
جولی نے اب تک این کے بارے میں نہیں بتایا تھا مگر جب میش نے پوچھا تو اس نے بے ساختہ اوپر نیلے کی طرف دیکھا۔ لمبا آدی بھانپ گیا اس نے کہا۔ ”میش اوپر جا کر دیکھو اور جینڈ اسے اندر جھوپڑی میں پہنچا دو خیال رکھنا یہ بھاگنے نہ پائے۔“

جینڈ جولی کو خیمے میں لے گیا اور میش نیلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ سورج مغرب کی طرف ڈھل گیا تھا اور کچھ دیر میں رات ہونے والی تھی۔ میش نیلے کے اوپر پہنچا اور اس نے وہاں اچھی طرح دیکھا۔ ایک جگہ اسے جھاڑی جلتی محسوس ہوئی اور وہ اس کی طرف بڑھا تھا کہ دوسری جھاڑی ملی اور وہ اب اس کی طرف جا رہا تھا۔ اچانک جھاڑی سے ایک لکڑ بھگا نکل کر بھاگا اور میش بڑبڑا کر گر گیا۔ جب تک وہ تنہیل کرالٹ لکڑ بھگا غائب ہو گیا تھا۔ جھاڑیوں میں وہی کھسا ہوا تھا۔ میش اسے گالیاں دیتا ہوا واپس آیا۔ اس نے لہجے آدی سے کہا۔ ”اوپر کوئی نہیں ہے۔“

”پھر بھی ہوشیار رہنا۔“
”جارج۔“ میش نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ”اس لڑکی کا کیا کرنا ہے؟“
”آرام سے پہلے اپنا کام ختم کرنا اس کے بعد اسے بھی دیکھنا۔“ جارج سختی خیز انداز میں بولا۔ ”پاکٹ نے اطلاع دی ہے کہ ہاتھیوں کا جینڈ کل تک یہاں پہنچ جائے گا۔“
جارج اپنے خیمے میں گیا تو میش موقع پا کر جولی والے خیمے میں آیا۔ یہ ایک طرح سے ان کا کنٹرول روم بھی تھا۔ یہاں ایک ایل سی ڈی پر چاروں طرف لگے سی سی ٹی وی کیمروں کی ویڈیو آرہی تھی۔ یہاں بڑے بڑے یا کس رکھے ہوئے تھے۔ جولی ایک کرسی پر یوں بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ جینڈ اسے باندھ کر باہر چلا گیا تھا۔ میش کو دیکھ کر جولی کانپنے لگی تھی اس کے عزائم بہت واضح تھے۔ میش نے چاقو نکال لیا اور ایک کرسی چھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے چاقو کی نوک جولی کی ران سے لگا کر تودہ رو دینے لگی۔

این نے جگت میں نرالی ایک گھٹی جھاڑی کے اندر گر دی اور خود وہ ایک دوسری جھاڑی میں چھپ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ اسے تلاش کیا جائے گا۔ وہ یہاں سے جا سکتی تھی مگر وہ جولی کو ان درندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔ سورج ڈوبنے کے قریب تھا اور کچھ ہی دیر میں تاریکی چھا جائی۔ وہ دعا کر رہی تھی تاریکی ہونے تک یہاں کوئی نہ آجائے مگر ابھی روشنی تھی کہ ایک شخص وہاں آ گیا۔ این کو بچنے سے اس کے جوتے نظر آ رہے تھے اور اس کا اندازہ تھا کہ یہ وہی مجرم صورت والا تھا جس نے کرس کی لاش کو بے دردی سے جیب سے نکالا تھا۔ این سانس لیتی کہ اچانک ہی کوئی کیز اس کی گردن پر گر اور اس نے بے ساختہ ہاتھ مار کر اسے گرایا۔ اس دوران میں جھاڑی ملی اور آنے والا اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ جھاڑی کی طرف آنے لگا اور این کی جان پر بھاری گئی۔ وہ پکڑی جاتی اور پھر اسے بھی جولی کی طرح قید کر دیا جاتا۔ این کو معلوم تھا کہ یہ لوگ انہیں مار دیں گے اور مارنے سے پہلے ان کی عزت سے بھی کھیلیں گے۔

اس سے پہلے کہ وہ اس جھاڑی تک آتا، دوسری جھاڑی ملی اور وہ اس کی طرف بڑھا تھا کہ اس سے وہی لکڑ بھگا نکل کر بھاگا جو بہت دیر سے ان کے آس پاس منڈلا رہا تھا۔ آدی بولکھا کر کر اور اس نے گالی دی اور پھر اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ این نے سکون کا سانس لیا۔ لکڑ بھگے نے ایک بار پھر اس کی مدد کی تھی۔ وہ جھاڑی سے نکلی اس نے دوسری جھاڑی سے نرالی نکالی اور اس جگہ سے دور جانے لگی۔ اسے جولی کو ان کے چنگل سے نکالنا تھا مگر وہ اندھا دھند کیس میں نہیں جا سکتی تھی، اس طرح وہ خود بھی پھنس جاتی چٹانوں کے درمیان ایک مناسب جگہ نرالی چھپا کر اس نے اپنا شکاری چاقو نکالا اور واپس آگئی۔ جب تک روشنی پوری طرح ختم نہیں ہوگئی وہ اوپر ہی رہی۔ سورج ڈوبنے ہی پہنچے ایک جزیئر آن ہو گیا جواب کیس کو بجلی دے رہا تھا۔ روشنی ایسی تھی کہ کوئی اس سے فح کر کیس تک نہیں آ سکتا تھا۔

این نیچے تک آئی۔ اس نے کیس کا جائزہ لیا۔ لمبا آدی اور اس کا ساتھی ایک طرف بیٹھے تھے۔ این گھوم کر اس خیمے تک آئی جس میں جولی تھی۔ اس نے سایان کی مینیوں کے پیچھے سے دیکھا جولی کرسی پر بندھی ہوئی تھی اور مجرم صورت شخص اسے چاقو سے ڈراتے ہوئے اس سے چھینچھاڑ کر رہا تھا۔ جولی روتے ہوئے خود کو بھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اچانک باہر سے لہجے آدی کی آواز آئی

اور مجرم صورت والا برا سامنے بناتا ہوا اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس کے ہاتھ ہی این ایک طرف سے خیمے کا پردہ اٹھا کر اندر آئی اور اشارے سے جولی کو چپ رہنے کو کہا پھر اس نے چاقو سے جولی کی بندھنیں کاٹیں اور آہستہ سے کہا۔ ”یہاں سے بھاگنا ہوگا۔“
”انہوں نے کس سے بھاگنے کو کہے ہیں۔“ جولی نے ایل سی ڈی کی طرف اشارہ کیا۔
”فکر مت کرو یہاں کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔“

وہ دونوں خیمے سے باہر آئیں اور این اپنی راستے سے کیس سے باہر جانے لگی۔ جولی اس کے پیچھے تھی۔ جگت میں اس کا پاؤں ایک خالی مین کے ڈبے سے ٹکرایا۔ آواز بہت بلند تھی اور جزیئر کے شور کے باوجود ان لوگوں کے کانوں تک پہنچ گئی۔ این جولی کو لے کر خالی مینیوں کے پاس دیکھ گئی کیونکہ وہ مینیوں اب پھیل کر دیکھ رہے تھے کہ آواز کہاں سے آئی تھی۔ میش خیمے میں گیا اور جولی کو غائب پا کر اس نے جلدی سے دور مارا نفل نکالی اور باہر آ کر گھرائی کرنے والے ٹاور پر چڑھ گیا۔ جارج اور جینڈ باقی جگہوں پر دیکھ رہے تھے۔ جس وقت میش ٹاور پر چڑھ رہا تھا۔ این اور جولی اس کے پیچھے سے ہوتے ہوئے ذرا آگے جھاڑیوں تک پہنچ گئیں اور اسی لمحے سورج لائٹ آن ہو کر چاروں طرف گھومتی گئی۔ این نے جولی کو گرایا اور خود بھی گر گئی۔ روشنی ان کے سر کے اوپر سے گزری تھی۔ جیسے ہی سورج لائٹ آگے گئی وہ اٹھ کر بھاگ گئیں۔

مگر اس بار ان کی جھک دیکھ لی گئی اور فائرنگ ہو گئی۔ گولیاں ان کے قریب ہی زمین پر لگیں مگر وہ بچ گئیں۔ جلد وہ سورج لائٹ اور رائل کی زد سے نکل گئی تھیں۔ عقب میں جارج چلا چلا کر ان کا پیچھا کرنے کو کہہ رہا تھا۔ این اور جولی بے تحاشا بھاگ رہی تھیں۔ این پہلے اس جگہ پہنچی جہاں اس نے نرالی چھپائی تھی۔ اب نرالی لے لے جاتا ممکن نہیں رہا تھا اور نہ ہی ان میں اتنی طاقت تھی کہ نرالی چھینچ سکتیں۔ اس لیے اس نے دواؤں کے پیکی سیٹ کچھ اہم چیزیں اپنے بیگ میں رکھیں اور جولی کو چھینچتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ وہ جھاڑیوں سے گزر رہی تھیں اور یہاں چھپنے کی منتخائش زیادہ تھی۔ دو گھنٹے تک مسلسل بھاگنے کے بعد ان کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ جھاڑیوں میں ہی ڈھیر ہو گئیں۔ عقب میں آتے دشمن سمیت اور بھی خطرات تھے مگر صحن، پانی کی کمی اور خند ایسی حاوی ہوئی کہ وہ سو گئیں۔ ان کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ ایک لکڑ بھگا لائن کے آس پاس منڈلا رہا

ہے۔ این کی آنکھ کھلی تو سورج کی روشنی نمودار ہو گئی تھی۔ اس نے بہ مشکل جولی کو اٹھایا۔ اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ بولی۔ ”مجھے چھوڑ دو اب مجھ سے نہیں چلا جائے گا۔“

”تم چل لو گی۔ تم بہادر ہو اور ایک بہادر باپ کی بیٹی ہو۔“ این نے اس کی ہمت بندھائی۔ ”اگر ابھی نہیں چل سکو گی تو ہم کچھ دیر بعد روانہ ہوں گے۔“

وہ دونوں جھاڑی تلے اس کے تنے سے ٹکی بیٹھی تھیں۔ پہلی بار این نے پوچھا۔ ”تم لوگوں کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“

”ڈیڈ گاڑی چلا رہے تھے اور میں آئی پیڈ دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے اچانک گاڑی روکی تو میں وجہ نہیں جان سکی۔ انہوں نے مجھے گاڑی میں بیٹھنے کو کہا اور خود نیچے اتر گئے۔ وہ سمجھے کہ شاید ان لوگوں کو مدد کی ضرورت ہے مگر جب وہ ان کے قریب گئے تو میٹش نامی شخص نے ان سے کہا کہ وہ یہاں سے چلے جائیں۔ تب ڈیڈ کو پتا چلا کہ وہ غیر قانونی شکار کر رہے تھے۔ ڈیڈ تیزی سے واپس آئے اور جیپ کو ریورس میں لے جانے لگے۔ پھر ایک قار ہوا اور.....“ جولی جملہ ادھورا چھوڑ کر رونے لگی اور اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب تمہارا قصور ہے اگر تم ساتھ ہوتیں تو ڈیڈ کو نیچے اترنے سے روک لیتیں۔ تم سمجھدار تھیں مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ میں ڈیڈ کو کیسے روکتی۔“

این نے جولی کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ وہ بھی رو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد دونوں کا دل ہلکا ہوا تو جولی کھڑی ہو گئی۔ ”چلو، مجھے معلوم ہے تم میرے بغیر نہیں جاؤ گی۔“

وہ دونوں چل پڑیں۔ ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ جولی نے حسرت سے کہا۔ ”وہاں اتنا سارا پانی تھا کاش کہ ہم ایک بوتل ہی لے آتے۔“

”اس وقت ہمیں جان بچانے کی فکر تھی، پانی کے چکر میں پڑتے تو مارے جاتے۔“ کہتے ہوئے این کو ہلکی سی گنگناہٹ سنائی دی۔ اس نے آس پاس دیکھا مگر اسے گنگناہٹ کا مخرج سمجھ میں نہیں آیا۔ اچانک جولی نے ایک طرف اشارہ کیا۔

”طیارہ.....“

این نے پلٹ کر ایک چھوٹی پہاڑی کے عقب سے چھوٹا سا طیارہ نمودار ہوتے دیکھا اور جولی کا ہاتھ پکڑ کر بھاگی۔ اب انہیں طیارے سے تلاش کیا جا رہا تھا مگر وہ کچھ آگے گئی ہوں گی کہ جھاڑیاں ختم ہو گئیں اور ایک بڑا سا چنیل میدان سامنے آ گیا۔ طیارہ نزدیک آ گیا تھا، اس لیے وہ جھاڑیوں میں ہی دبک گئیں۔ طیارہ ان کے اوپر سے

گزر رہا تھا وہ اٹھ کر میدان میں دوڑنے لگیں۔ ان کی کوشش تھی کہ طیارے کے دوبارہ گھوم کر آنے سے پہلے میدان عبور کر لیں مگر بد قسمتی سے وہ ابھی درمیان میں تھیں کہ طیارہ آگیا اور جب وہ میدان عبور کر کے دوسری طرف جھاڑیوں میں پہنچیں تو دور سے اڑتی دھول گاڑیوں کی نشان دہی کر رہی تھی۔ این نے جولی سے کہا۔ ”وہ گاڑیوں میں بھی آرہے ہیں۔ ہمیں چھپنا ہوگا۔ طیارے سے ہمیں دیکھ لیا گیا ہے۔“

”اگر ہم اس طرف چلیں تو شاید ان سے بچ جائیں۔“ جولی نے ایک طرف اشارہ کیا اور این نے اس سے اتفاق کیا۔ وہ اس طرف چل پڑیں۔ کچھ دیر بعد دھول اڑاتی گاڑیاں کسی اور طرف نکل گئیں۔ سورج رفتہ رفتہ سر پر آ کر آگ برسانے لگا تھا۔ اس حالت میں سفر کرنا آسان نہیں تھا، وہ بس پاؤں گھسیٹ رہی تھیں۔ انہوں نے ایک چھوٹا سا ٹیلا عبور کیا تو دوسری طرف نشیب میں انہیں ایک چھوٹی سی کیمپ نما آبادی دکھائی دی۔ اس میں لکڑی اور دھات سے بنے ہوئے مکانات تھے جیسا کہ عام طور سے غیر ملکی بناتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اینٹوں سے بنے مکانات بھی تھے۔ مگر وہاں ویرانی دکھائی دے رہی تھی۔ کوئی گاڑی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی جاندار تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک امید کے سہارے اس طرف بڑھیں کہ شاید انہیں یہاں پانی مل جائے۔ مکانات کے ساتھ پانی کی ٹنکیاں لگی تھیں مگر وہ جس ٹنکی کا دال کھولتیں وہ خشک نکلتی تھی۔ یہ جگہ عرصے سے ویران تھی اس لیے پانی بھی خشک ہو چکا تھا۔

”یہاں کہیں پانی نہیں ہے۔ ہم پیاس سے مر جائیں گے۔“ جولی نے رونے والے انداز میں کہا۔

”پانی ہوگا۔ آؤ اندر دیکھتے ہیں۔“ این کہتے ہوئے ایک ہٹ میں داخل ہوئی۔ اس کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے تھے اور اندر ملتا اور ٹوٹی پھوٹی اشیا پڑی تھیں۔ وہ دیوانہ وار پانی تلاش کرنے لگیں۔ مگر وہاں کہیں پانی نہیں تھا۔ جولی ملتا ہٹا کر دیکھ رہی تھی اچانک اس نے چیخ ماری۔ این اس کی طرف لپکی۔ ”کیا ہوا؟“

جولی کا چہرہ سفید ہو رہا تھا اور اس نے ایک طرف اشارہ کیا جہاں ایک درمیانے سائز کا سیاہ سانپ لہراتا ہوا ہٹ سے باہر جا رہا تھا۔ ”اس نے میری پنڈلی پر ڈسا ہے۔“ این نے فکر مند ہو کر اس کی پنڈلی دیکھی اور جلدی سے اپنا بیگ کھول کر اس میں سے دواؤں کی کٹ نکالی۔ اس میں سانپ کے کاٹے کا انجکشن تھا۔ انجکشن سرخ فری تھا۔ انگلی کے برابر انجکشن کا اگلا حصہ زور سے جسم پر مارا جاتا

تو دو خود بخود اچھٹ ہو جاتی تھی۔ این نے جولی کا اسکرٹ اوپر کرتے ہوئے اس کی ران پر انگشت مارا پھر اس نے ایک شیشی سے چند گولیاں نکال کر اسے دیں۔ "یہ کھالو۔"

"پانی کے بغیر؟"

"ہاں یہ لازمی ہے۔ میں پانی کی تلاش میں جا رہی ہوں۔" این نے کٹ واہیں بیگ میں رکھی۔ "تم یہیں رکو اور جاگتی رہنا۔ اگر خیر آئے تو کھڑی ہو جانا۔"

جولی نے سر ہلایا۔۔۔ این نے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے بال سنوارے اور کھڑی ہو گئی۔ وہ باہر آئی اور اس آبادی سے آگے کی طرف روانہ ہو گئی۔

☆☆☆☆

میں بدستور ان کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ این کو بچانے کے بعد میں خود جان بچانے کے لیے بھاگا تھا کیونکہ مسلسل مجرم صورت والا لازمی مجھ پر گولی چلا دیتا۔ بہر حال میں بھی مسلسل ان کے ساتھ ساتھ سفر کرتا رہا اور ان سے مکمل آگاہ رہا۔

این پانی اور مدد کی تلاش میں چلی گئی اور اس کے جانے کے کچھ دیر بعد میں نے مینین اینجین کی آواز سنی۔ وہ لوگ آن پہنچے تھے۔ میں عقب سے گھوم کر نکلا اور باہر دیکھا تو دو گاڑیوں میں وہ تینوں آن پہنچے تھے۔ جارج نے گاڑی سے اترتے ہوئے میٹھ اور جیڈ کو دوسری طرف کے مکانات دیکھنے کو کہا اور خود اس مکان کی طرف آنے لگا جہاں جولی موجود تھی۔ اس نے رک کر سگریٹ سلگا یا اور کش لینے لگا۔ یہ ظاہر اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ میٹھ اور جیڈ نے منٹوں میں ان سارے مکانات کو دیکھ لیا اور جارج کو رپورٹ دی کہ وہاں کوئی نہیں ہے۔ اس نے حکم دیا۔ "تم لوگ آگے جاؤ، میں یہاں یہ چند مکان دیکھ کر آتا ہوں۔"

وہ اپنی جیب میں بیٹھے اور آگے بڑھ گئے۔ جارج نے چند کش لینے کے بعد سگریٹ پھینکا اور مکان کی طرف بڑھا۔ میں گھوم کر اندر آیا تو جولی سامنے والے کمرے میں نہیں تھی۔ اس نے بھی ان لوگوں کی آوازیں سن لی تھیں اور اٹھ کر پیچھے کہیں چلی گئی تھی مگر گرد آلود فرش پر ان کے قدموں کے نشانات واضح تھے۔ انہیں چھپانا لازمی تھا۔ میں تیزی سے فرش پر لوٹنے لگا اور نشانات مٹانے لگا۔ اسی لمحے جارج دروازے سے اندر آیا اور میں بہت تیزی سے اس کے برابر سے نکل کر باہر چلا گیا۔ اس کے منہ سے گالی نکلی تھی اور وہ مشتعل ہو کر پیچھے آیا تھا مگر میں گلی پار کر کے ایک اور مکان میں گھس گیا تھا۔ میں نے وہاں سے جھانک کر دیکھا۔ جارج باہر آ گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جس مکان میں لکڑی بچکے

ہوں وہاں کوئی انسان بنا نہیں لے سکتا۔ اس نے بے دلی سے باقی رہ جانے والے مکانات دیکھے اور گاڑی میں بیٹھ کر آگے روانہ ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی میں دوبارہ جولی والے مکان میں گھسا۔ وہ مجھے ایک کمرے میں نوٹی ہوئی الماری میں نظر آگئی۔ مجھے دیکھ کر وہ سہم گئی اور میں جارحانہ انداز میں خرانے لگا۔

☆☆☆☆

این ہستی سے آگے نکلی تو اسے کوئی نصف میل کی دوری پر بہت ہری جھاڑیاں دکھائی دیں۔ ان کی تازگی بتا رہی تھی کہ وہاں پانی ہے۔ این تیزی سے اس طرف بڑھی۔ اگرچہ اس کا بھی پیاس سے برا حال تھا مگر اسے جولی کی فکر تھی۔ وہ اس کی سوتیلی بیٹی تھی اور اس کا رویہ این سے اچھا نہیں تھا مگر اسے کرس کے حوالے سے وہ پیاری تھی اور وہ خود سے زیادہ اس کی فکر کر رہی تھی۔ وہ جھاڑیوں تک پہنچی اور انہیں عبور کر کے دوسری طرف موجود چھوٹی سی جھیل کو دیکھا تو اس کا خوشی سے برا حال ہو گیا۔ وہ دوڑتی ہوئی کنارے تک آئی۔ شدید پیاس کے باوجود اس نے پہلے ہاتھ میں لے کر ذرا سا پانی پکھا کہ یہ پینے کے قابل ہے یا نہیں۔ پانی بہ ظاہر صاف تھا۔ اس نے بے تابی سے مگر گھونٹ گھونٹ پینا شروع کیا۔ پھر اس نے رک کر اپنی بوتل بھری اور دوبارہ پانی پیا۔ پھر اس نے ہاتھ روک لیا اس سے زیادہ پینا خطرناک ہو سکتا تھا۔ وہ مزی اور سادگت رہ گئی کیونکہ میٹھ سامنے رائفل لیے کھڑا تھا، اس نے چپک کر کہا۔

"لڑکی کہاں ہے۔"

"پلیز۔" این نے التجا کی۔ "میں جانے دو۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہی ہے اسے جانے دو۔" جیڈ نے کہا وہ بھی جھاڑیوں سے نکل آیا تھا۔

"احقانہ باتیں مت کرو! اب ہمارے پاس دو عورتیں ہوں گی اور ہم انہیں بعد میں قتل کریں گے۔"

میٹھ دیکھ نہیں سکا کہ جیڈ نے پستول نکال لیا اور اس نے اچانک میٹھ کو عقب سے گولی ماری تو این بھی اچھل پڑی۔ میٹھ کراہ کر گرا اور سادگت ہو گیا۔ جیڈ نے این کی طرف دیکھا اور بولا۔ "میرے بھی بچے ہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔"

"کیا میں جاسکتی ہوں؟" این نے پوچھا۔

جیڈ نے سر ہلایا اور این نے میٹھ کی رائفل اٹھائی اور دوڑ کر جھاڑیوں میں گھس گئی۔ اسی لمحے وہاں جارج آ گیا اور شاید اس نے دیکھ لیا تھا کہ جیڈ نے میٹھ کو مارا ہے۔ اس نے کہا۔ "یہ تم نے کیا ہے؟"

"ہاں۔" جیڈ کا لہجہ سرد ہو گیا۔ "میں یہاں جانوروں کا شکار کرنے آئے ہیں انسانوں کا نہیں۔"

"ہم شکاری ہیں اس سے قطع نظر کہ شکار جانور کا ہو یا انسان کا۔"

"جب یہ شکار تم ہی کرو۔" جیڈ نے کہا اور وہاں سے جانے لگا۔ جارج نے پستول نکال لیا۔

"تم ایسے نہیں جاسکتے۔"

"تم مجھے مار سکتے ہو، روک نہیں سکتے۔" جیڈ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا تو جارج نے پستول اس کی طرف سیدھا کیا۔ ایک فائر ہوا تو جارج کراہ کر جھکا اس کے سفید کوٹ پر سرخ دھبہ نمودار ہوا تھا۔ پھر دوسرا فائر ہوا تو وہ گھوم کر گر گیا۔ جیڈ نے مڑ کر دیکھا۔ جھاڑیوں کے پاس این کھڑی تھی اور اس کے ہاتھ میں موجود رائفل سے دھواں نکل رہا تھا۔ جیڈ نے اس کی طرف دیکھا۔ "شکر یہ۔"

جیڈ جا کر اپنی جیب میں بیٹھا اور وہاں سے چلا گیا۔ این کو جارج کی جیب مل گئی تھی۔ وہ اس میں بیٹھ کر تیزی سے روانہ ہوئی۔ اسے جولی کی فکر تھی اسے جس سانپ نے کاٹا تھا وہ بہت زہریلا ہوتا ہے اور اس کے زہر کے اثر سے آدمی سو جاتا ہے اور ایک بار وہ سو جائے تو پھر یہ خند موت میں بدل جاتی ہے۔ اس نے گاڑی مکان کے سامنے روکی اور بھاگتی ہوئی اندر آئی مگر جولی اس کمرے میں نہیں تھی جہاں اس نے اسے چھوڑا تھا۔ اس نے چلا کر اسے آواز دی۔ "جولی تم کہاں ہو؟"

مگر کوئی جواب نہیں آیا وہ آگے آئی تو جولی کا ٹیپ والا بیگ گرا ہوا تھا۔ ذرا آگے اس کا پر بھی گرا ہوا تھا اور اسے بری طرح نوچا گیا تھا۔ این کا دل رک گیا۔ اس نے پھر جولی کو نکالا تو اس بار بھی اسی آواز آئی تھی۔ وہ اس کمرے کی طرف پہنچی اور اس نے اندر جاتے ہی ایک لکڑی بچکے کو سوراخ سے نکل کر بھاگتے دیکھا۔ جولی بہت خوفزدہ حالت میں دیوار سے لگی کھڑی تھی، اس کا لباس کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ این نے بے تابی سے اسے منولا۔ "تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔" اس نے جواب دیا، جولی کے جسم پر کوئی زخم نہیں تھا۔ اس نے صرف مجھے دھمکا یا اور میرے پڑے پھاڑے۔"

این نے سوچا کہ کیا لکڑی بچکا جولی کو چکے رکھے ہوئے تھا۔ اس نے پہلے اسے پانی دیا۔ یہ تالاب کا پانی نہیں تھا بلکہ جارج کی گاڑی میں موجود منرل واٹر کی بوتل تھی۔ پھر وہ جولی کو سہارا دے کر گاڑی تک لائی اور نزدیکی

قرین آبادی کی طرف روانہ ہو گئی۔

ان کے جاتے ہی میں بھی روانہ ہو گیا۔ ابھی مجھے طویل مسافت طے کرنا بھی تھا میں اپنے علاقے پہنچ پاتا اور درمیان میں جانے کتنے ٹھکرات تھے جن کا مجھے سامنا کرنا تھا مگر میں مطمئن تھا میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ میں نے اس شخص کی بیٹی اور بیٹی کو بچانے میں اپنا پورا کردار ادا کیا جو ہم لکڑی بچکوں کو اچھا سمجھتے تھے۔ اب مجھے اپنے بچے یاد آ رہے تھے لیکن انسانوں کے برعکس مجھے یہ فکر نہیں تھی کہ اگر میں نہ رہا تو میرے بچوں کا کیا ہوگا۔ کیونکہ ہم لکڑی بچکوں میں بچے سانچے ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆

دو دن بعد جولی ایک اسپتال میں تھی اور تقریباً صحت یاب ہو گئی تھی اس کے جسم سے زہر کے اثرات زائل کر دیے گئے تھے۔ میا جنوبی افریقا سے وہاں پہنچ گئی تھی اور اس وقت جولی کے ساتھ تھی۔ این کمرے میں آئی تو میا اس کے گلے لگ گئی وہ اسے تسلی دے رہی تھی۔ این کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر وہ حوصلہ مند عورت تھی۔ اس نے جولی کی غیریت دریافت کی۔ وہ مسکرا کر بولی۔ "میں ٹھیک ہوں۔"

"میرے بھی ٹھیک ہوں۔" وہ بولی۔ "ابھی تک مقامی حکام کے ساتھ ان علاقوں میں گئی تھی جہاں غیر قانونی شکاری موجود تھے۔ ان کی لاشیں مل گئی ہیں اور ان کے کیپ سے بے شمار مارے جانے والے جانوروں کے جسموں کے حصے ملے ہیں وہاں بہت سارا اسلحہ بھی تھا۔"

میا نے اس سے کہا۔ "یہ تمہاری ہمت اور کوشش ہے جو جولی آج زندہ ہے۔ میں اسے آج ہی واپس لے جاؤں گی۔"

"مام! میں این کے ساتھ جاؤں گی۔" جولی نے اچانک کہا۔

وہ دونوں حیران رہ گئیں۔ میا نے تڑپ کر کہا۔ "ساتھ کیوں نہیں چل رہیں؟"

"مام! اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں اب تک بیٹی بنی ہوئی تھی مگر میں بیٹی نہیں ہوں۔ میں این کے ساتھ جاؤں گی اور پاپا کے ادھر رہے جانے والے پروجیکٹ میں اس کی مدد کروں گی۔ ان کی وارث ہونے کی وجہ سے یہ میری ذمہ داری ہے۔"

"اگر تم اجازت دیتی ہو تو میں جولی کو ساتھ رکھوں گی۔" میا نے سوچا اور سر ہلا دیا۔ "جیسی تمہاری خوشی۔"

سودائے جنوں

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

آخری حصہ

غرضہ دراز سے صبر و وفا تو تین امیہ مسئلہ کے عزم و حوصلے کو سمیٹا کر لے کر ہے۔ سازشوں میں مصروف عمل ہیں۔ اس ریت کاٹناٹ کا بھی کسسا انوکھا انصاف ہے۔ ہر وہیں فرعون پیدا کرتا ہے اور ہر دور کا موسیٰ بھی الگ بناتا ہے جو انہی کے درمیان رہ کر پرورش پاتا ہے اور فرعون ہی طاقتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ آج بین الاقوامی منظر نامہ جو داستانِ دل گیر سمیٹتا ہے اس میں تمام عالم اسلام میں دنگ کی ایک لہر پیدا کی ہوئی ہے۔ جسماس دلوں میں آج بھی ارض مقدس میں صبر و وفا بلبان ان کی چہرہ دستیوں کے خلاف نفرت و عداوت کی آگ بھری ہوئی ہے کیونکہ غاصب ہرودیوں نے مسجد اقصیٰ کو نظرِ آتش کر کے ہمکنارِ سلبامی تعمیر کرنے کی مذہم اور ناپاک سازش تیار کی تھی۔۔۔ جسے روکنے کے حیرم میں اسرائیلی فوجیوں نے نادر اور محبوبہ فلسطینی عوام کو اپنی چنگیزیت اور بربریت کا مشاہدہ بنانا شروع کیا اور فلسطینی دستیوں میں خون کی بولی کھولی۔ اسرائیلی سازشوں کے ذریعہ ہائے کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ آج بھی موت وہاں ٹپکی ٹپکی دروازوں پر دستک دہی گھوم رہی ہے لیکن۔۔۔ آج بھی کچھ ہانگل لوگ عصمتوں کے محافظ بنے ایک سودائے جنوں میں مبتلا ہیں۔۔۔

اب اس بازی کا انجام۔۔۔

جلی رنگت اور کردہ چروں والی شیطانی قوتوں کی بربریت کا لڑہ نیز منظر



پہلے جی اکرانی ہوئی آواز ابھری۔

”میں چاہتا تو تم دونوں کو ہلاک۔ بھی کر سکتا تھا، حالانکہ میں اپنے قیدیوں کو غلام بنانے کا قائل ہوں، انہیں جان سے مارنے کا نہیں۔ بشرطیکہ وہ کوئی مداخلت نہ کریں، تو انہیں ہلاک کر کے۔ ان کی لاشیں گدھوں سے چھانے کے لیے صحرا میں پھینک دیا کرتا ہوں۔“ وہ اتنا کہہ کر پھر رکا۔ اس کے بیچے کی سفاکیت کو محسوس کر کے ایک لمبے کے لیے تو کمال اور احمد کے وجود میں موت کی پھریری سی اتر گئی۔ تاہم کمال کو کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا تھا کہ یہ نصیبت شیطان ان سے کسی قسم کا کوئی معاہدہ کرنا چاہتا تھا پر مگر کون سا؟ اور کیوں؟ جبکہ یہ لوگ اس وقت اس کے رحم و کرم پر تھے اور مجبور اور بے بس۔ تو پھر۔ ایسی آخر کیا بات ہو گئی تھی کہ جس نے ایک وحشی صحرائی لٹیروں کے ”بااختیار“ سرغنہ کو بے بس قیدیوں سے کسی ”معاہدے“ پر مجبور کر ڈالا تھا؟

وہ شیطان اب کی بار اپنی بات عمل کرتے ہوئے بولا۔ "بات اگر معاہدے کی ہو تو پھر ہم بھی اس کی پاسداری کرنا پسند کرتے ہیں، نیک نیتی کے ساتھ..... تمہاری ان دونوں عورتوں سے ہم زبردستی کر سکتے تھے..... اور ایسا ہم کرتے بھی آئے ہیں، لیکن پتا نہیں کیا بات ہے کہ اس بار لگتا ہے ہمیں واقعی کسی سے دلی وجہ باقی دابھگی ہوئی ہے۔ ہمارا اس سے زبردستی کرنے کو جی نہیں چاہتا..... ہم اسے اس کی مرضی سے حاصل کر کے اس سے صحیح طور پر لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ ہم اسے اپنے دل کی ملکہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں اور آج کا جشن اسی سلسلے میں ہی منایا جا رہا ہے۔ ہمارے لیے سب سے بڑی خوشی کی بات

وہاں ام کلثوم نظر نہیں آ رہی تھی جس نے بارے میں انہیں تشویش ہونے لگی۔ تاہم اپنی معیضہ کو اس طرح سہاں دیکھ کر احمد حمادی پر ایک بار پھر بھائی دورو پڑنے لگا لیکن اس بار اس دورے کی نوعیت جارحانہ نہیں تھی۔ اس بے بسی اور بے کسی کی انتہائی مجبور حد ضرور کہا جاسکتا تھا۔ اس نے پہلے اس شیطان سے اپنی ماں ام کلثوم کے بارے میں پوچھا۔ تو بے اختیار حبیبہ کی سسکی گھما میں ابھری۔ کمال اور احمد اس سسکی کا کرب محسوس کر کے دھک سے رو گئے۔ بعد میں رمشید نے بتایا کہ وہ یہ سب کچھ نہ سہہ کر اس جہان سے کوچ کر چکی تھی۔ اس پر کمال کو از حد دکھ ہوا اور ساتھ ہی اس بے رحم انسان رمشید پر عیش بھی آنے لگا جو بڑے آرام سے ام کلثوم کی کسمپرسی میں موت واقع ہونے کی خبر سن رہا تھا۔ جیسے اس میں اس کا کوئی قصور ہی نہ تھا۔ احمد حمادی کی اپنی ماں کے اس طرح انتقال کر جانے پر حالت فحری ہونے لگی۔ اس پر مستزاد اس کی معیضہ حبیبہ کی جان اور عزت الگ داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ وہ بے اختیار غرطہ غم وانہوہ سے تڑپ اٹھا۔

”تمہیں خدا کا واسطہ... ہمیں چھوڑ دو... ہم نے
جلا تم لوگوں کا کیا گناہ ہے؟“ احمد رن پست ہونے کے
باوجود اس شیطان رشید سے داد فریاد کرنے لگا... جبکہ
آنکھیں جو پہلے ہی رو رو کر متورم ہو رہی تھیں، اپنے مختل
کو یہ گریہ و زاری کرتے دیکھ کر کسی جگر کچھ بول نہ سکی۔
رشید بڑی دشت بھری نظروں سے گھورتا ہوا اپنی جگہ
سے اٹھا اور چند قدم چلا ہوا ان کے بالکل قریب آکھڑا ہوا۔

پہلے تو وہ باری باری ان دونوں کی طرف مگھورتا رہا، اس کے بعد۔۔۔ اتنے ہی قدم چلتا ہوا واپس ہوا اور دوبارہ اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔ احمد نے پھر اس کی منت کرنی چاہی تھی کہ دفعتاً ہی رشید نے اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ پھر اس کے ساتھ ہی رن بست کمال نے بھی احمد کو ہولے سے اپنی کنبی کا ٹھیکہ کا دیا کہ وہ پہلے اس کی بات سن لے۔

احمد بے چارہ خاموش ہو گیا مگر اس کی یاس زدہ
فکریں جیسے پرچی رہ گئی تھیں۔

کمال کو شبہ ہوا تھا کہ یہ بد بخت ایمیں صفت کھس
..... رشید ان سے کچھ ایسا کہنا چاہتا تھا جو یقیناً ان کے لیے
نا قابل قبول بھی ہو سکتا تھا۔ بہر طور وہ اس کے بولنے کا
خنکر رہا۔ ساتھ ہی اس کا دھیان بار بار حواد کی طرف بھی
مار رہا تھا کہ معافی کو چھڑی کے بے حس ماحول میں رشید کی

یہی ہے کہ وہ سینکڑوں ایسی ہیملٹن نے اس مقام سے پہلے
 وضاحت ہو گئی ہے۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ
 تہذیبی اس فرم کے ساتھ لڑی جینی کے ساتھ ہاں میں لڑے
 ہاں کر دیا جائے۔

”نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا تم تم
 کہے ذلیل آدمی ایک مجبور اور بے کس معصوم لڑکی
 کے ساتھ ایسا گستاخانہ کھیل نہیں کھیل سکتے میں تمہارا خون
 پی جاؤں گا۔“

احمد حمادی ایک دم سی فیسے اور غیر متوجہ جوں کے جوش
لے پاگل سا ہو گیا اور اس قدر زوردار بھڑکتی ہوئی آواز میں
خفجی کر بولا تھا کہ اس کی گردن کی رہیں تک ابھرائی تھیں۔
کمال کی طرح وہ بھی اس اطمینان مفت و رشید کا اشارہ
بجھ چکا تھا کہ یہ بد بخت شیطان معصوم اور نوجوان دو شیزہ
حبیبہ کے ساتھ شادی کے نام پر کیا کرنا چاہتا تھا۔

اپنے محبوب کی طرف سے ایک دم یوں جو کچھ جنوں میں
کھل ہو جانے کی شاید بد نصیب جیسا کہ بھی توقع تھی۔ وہ۔۔۔
لیکن ہو گئی اور اپنی جگہ سے اٹھنے کی تو قریب کھڑے رہا
نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنی جگہ سے ہٹنے
سے بھی منع کر دیا۔

ڈاکٹر کمال پریشان ہو گیا۔ وہ فطرتاً متحمل مزاج کا
 مان تھا۔ ٹھنڈے دل و دماغ سے حالات کے مطابق
 پہنے کا قائل۔ اس کے بعد ہی وہ کوئی قدم اٹھاتا تھا۔
 اس بھی وہ رشید کی بات کو یہ غور سننے اور سمجھنے کی کوشش کر
 تھا۔ یہی نہیں معصوم حبیب سے متعلق وہ اس غیبت کا
 ارہ بھی سمجھ گیا تھا، لیکن وہ پہلے صبر سے رشید کی بات مکمل
 کرنے دینا چاہتا تھا کہ آخر وہ اب آگے ان لوگوں کے ساتھ
 کرنے کا ارادہ رکھتا تھا کہ اچانک احمد درمیان میں پھر
 اس کا یوں جوش میں آ کر رشید کے لئے ڈالنا، کم
 ناک بات نہ تھی۔ کمال کے مطابق رشید جیسا وحشی
 انسان جو ابھی ان کے ساتھ انسانوں ہی کی طرح مخاطب
 رہے بھی معمولی بات نہ تھی۔ ورنہ تو یہ سب اس کے رحم و کرم
 تھے۔ وہ ان کے ساتھ کوئی بھی سلوک کر سکتے تھے۔

ہوں مال کو بی آتا تھا مردہ ہوش و خرد کا دامن ہاتھ
 بھی نہیں جانے دیتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ جب اس نے
 کے برا بھلا کہنے پر رشید کی طرف دیکھا تو وہاں اس
 چہرے پر بڑے بھیا تک تاثرات پیدا ہونے لگے
 اور وہ بڑی طیش بھری نظروں سے احمد کو پہلے تو گھورتا
 اس کے بعد اس نے بغل سے جھپٹتے ہوئے سر سے ایک

میں نے کہا کہ وہاں تو دل نہال لپکا اور اس کی مال ہر رخ احمد علی طرف
 لڑا رہا۔ اس سے پہلے کہ وہاں اسے رہا تھا وہاں سے ایک کرج
 دای مئے تیرہ ماہی جگہ چھٹی چھٹی پانی اور وہاں سے وہ
 قریب کے سے انداز میں ہوئی۔

”نہیں۔ کچھ خدا کے لیے نہیں اسے
 مست مارو۔ ہم میں میں نے کہا ہے۔ میں
 تمہاری ہر بات مانوں گی، اگر تم نے اسے جاگ کر دیا تو پھر یاد
 رکھنا میں بھی پھر زندہ نہیں رہوں گی۔“

ارشید کا پستول والا ہاتھ یکدم نیچے گر گیا اور فائر
کمال کو ایک جھوٹا سا لگا۔ جمیہ کی گریہ و زاری نے اسے بہت
کچھ سمجھا دیا تھا۔ پھر وہیں سے وہیں اس سے سوچتے ذہن
نے ایک ارادہ باندھا، وہ بھی، دونوں جوار تھے۔ لہذا ارشید
کے پستول والا ہاتھ بھینٹے ہی اس نے اسے فوراً منہ
گرتے ہوئے چڑھ کر مصالحت انداز میں کہہ۔

”تمہید۔۔۔ اُمیں تمہاری بات کا مطلب اور حقیقت
 تم سے دیر پرودہ مفاہمت کا مطلب سمجھ چکا ہوں اور میرا
 خیال ہے کہ تمہارا فیصلہ درست ہے۔ کیا تم مجھے ایک موقع دے
 گے؟ تاکہ میں احمد عسادی کو اعما میں لے کر کچھ سمجھانے کی
 کوشش کروں؟۔۔۔۔۔ تمہاری بات اور ہے، جو فطرتاً اس
 نوجوان کو بھڑکانے کا ہی سبب بن سکتی ہے۔“

وقت، حالات اور موقع محل کی ساری داخلی و خارجی
جزئیات کا ادراک کرتے ہوئے کمال نے رشید سے جو کہا تھا، وہ
تیرہ ہدف ثابت ہوا کہ اس میں اس کا اپنا بھی مفادوہایت تھا۔

اب تک ڈاکٹر کمال کی سمجھ میں جو کچھ آسکا تھا، وہ شاید اب کسی سے بھی چھپا نہیں رہ سکا تھا۔

رمشید لاکھ عیاش پرست، جابر اور سنگ دل شیر اسی
..... نیز اس وحشی آدمی نے اب تک نہ جانے کتنے بے گناہوں
.. کو اپنی بربریت اور سفاکی کا نشانہ بنایا ہوگا اور کتنی ہی
معصوم، مجبور لڑکیوں کو اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھایا ہوگا
مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ جہاں بڑے بڑے بادشاہ اور
مطلق العنان لوگ عورتوں کی اک جہش ابرو سے مار کھا گئے
اب ان میں رمشید بھی شامل ہونے والا تھا۔ ڈاکٹر کمال
کے مطابق ہر انسان میں کوئی نہ کوئی نفسیاتی ”پیچ“ موجود
ہوتا ہے..... اور جو ایک ذرا اشارے پر اٹھ پڑتی ہے، یقیناً
حبیب کی بھی کوئی ایسی ادا اسے بھانپنی تھی، جس نے اسے
بااختیار ہونے کے باوجود اس کے اپنے ہی قید یوں سے...
دور کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور کمال اسی ”موقع“ سے فائدہ
اٹھانا چاہتا تھا۔

آواز ابھری۔ دونوں ٹھنک کر رک گئیں اور سن ہو کر رہ گئیں۔ رات کے دم بہ خود سناٹے میں اس کتے کے بھونکنے کی آواز کسی دھماکے سے.... کم نہیں تھی۔ وہ شاید کوئی تربیت یافتہ اور "بوگیر" شکاری کتا تھا اور سوائے اتفاق مکان کے پھجواڑے کسی گوشے میں کہیں ٹہل رہا تھا، اس نے شاید ان کی بولپالی تھی۔

لیلیٰ فوراً ہی خود بھی رک گئی تھی اور بانو کو بھی آگے قدم بڑھانے سے روک دیا تھا۔ کیونکہ جانوروں کی سرس شامہ ہی تیز نہیں ہوتی بلکہ یہ جب ٹھنک جاتے ہیں تو فوراً ہی اپنے کان بھی کھڑے کر لیتے ہیں۔

لیلیٰ نے اپنے ہونٹ سمجھنے کے لیے تھے، تمام تر احتیاط کے باوصف۔ کھیل بگڑنے لگا تھا۔ اور اس وقت ان دونوں کی جانیں بھی ہتھیلی پر تھیں۔ دشمن کو اس بات کی ذرا بھی بھنک پڑ جاتی کہ ان کی کچھاڑ میں دو اہم دشمن ٹھس آئے ہیں تو بیک وقت ہی سب کے سب حرکت میں آ جاتے۔

لیلیٰ کا دل جیسے ایک ایسی سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا۔ بانو کے چہرے پر بھی تشویش کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ لیلیٰ اسی طرح دبکی رہی۔ کتا دو تین بار بھونکا تھا۔ اب خاموشی چھا گئی تھی۔ لیلیٰ کو خوش گمانی ہوئی کہ شاید کتے کے بھونکنے پر کسی نے یا تو توجہ ہی نہیں دی.... ہوگی یا پھر سنی ہی نہیں ہوگی۔ لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ کیونکہ اسی وقت جب لیلیٰ نے آگے بڑھنے کا ارادہ

باندھا تھا کہ اچانک اسے ایک تیز روشنی سی اسی جانب پڑتی دکھائی دی، جدھر وہ دونوں دبکی کھڑی تھیں۔ لیلیٰ کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ اس طرف خود رو جھاڑیاں تو اگی ہوئی تھیں لیکن وہ اتنی نہیں تھیں کہ ان کے بیچ یا ان کی آڑ لے کر فوری طور پر چھپا جاسکتا۔ ابھی وہ کوئی راہ مفر کے بارے میں سوچ ہی رہی تھیں کہ اچانک لیلیٰ کی ٹھنکی ہوئی۔

نگاہوں نے اسی جانب دیکھا۔ جدھر سے تیز روشنی کی لکیر ابھری تھی۔ کوئی بیرونی دیوار کی طرف سے ہاتھ میں نارچ لے اسی طرف آرہا تھا۔ لیلیٰ نے بے اختیار طمانیت کی سانس لی۔ اس کے خیال میں یہ اکیلا دکیلا چوکیدار تھا۔ جو اندر سے کتے کی آواز پر متوجہ ہوا تھا اور اسی طرف آرہا تھا۔ لیلیٰ کے لیے اس پر قابو پانا کیا مشکل تھا مگر قسمت ہر وقت ہی ساتھ نہیں دیتی۔ لیلیٰ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ چوکیدار اپنے ہاتھ میں نارچ لیے جیسے ہی اس کے ذرا قریب آیا، لیلیٰ اس پر بجلی بن کر کڑکی۔ چوکیدار عام سا ہی آدمی نکلا جو ایک تربیت یافتہ لیڈی کمانڈو کے آگے نہ ٹھہر

سکا۔ لیلیٰ شیرنی کی طرح اس پر چھٹی تھی۔ اور بانو اس کی ممکنہ مدد کے لیے آگے بڑھی۔ چوکیدار کو اس نے دبوچ لیا۔ مگر اسی وقت چوکیدار نے مرنے کے دوران ہی بڑی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ موقع پاتے ہی حرکت کی۔ اگرچہ لیلیٰ جیسی تربیت یافتہ لیڈی کمانڈو کے آگے وہ نہ ٹھہر سکا تھا لیکن اس "مشکل" وقت میں اسے جو ہدایت دی گئی ہوگی۔ اس پر عمل پیرا ہونے کا اسے ایک قلیل موقع مل ہی گیا۔ اس نے لیلیٰ کے ٹھنکے میں پھنس کر گرتے ہی نہ جانے کیسے ایک عجیب سائنس کی روشنی کا گولہ پھینکنے والی گن نکال کر چلا دی۔ وہ اس کی موٹی نال کا رخ آسمان کی طرف تو نہیں کر سکا، جیسا کہ کیا جاتا ہے لیکن نال سے "شائیں" کی ہلکی آواز کے ساتھ جلتا ٹیل نکلا، وہ سیدھا اوپر آسمان کی طرف تو اتنا نہیں اٹھا تھا لیکن اتنا ضرور بلند ہوا کہ قریب کسی مکان میں گرتے گرتے بھی وہ دھماکے سے پھٹا تھا اور اس کی روشنی بھی کسی حد تک پھیلی تھی۔ لیلیٰ کے چہرے پر بیک وقت تشویش اور طیش کے گہرے تاثرات ابھرے تھے اور اسی جوش غیظ میں آکر اس نے چوکیدار کی کن پٹی پر آہنی کلب چڑھا گھونسا رسید کر دیا، جو وہ پہلے ہی اپنی آستین سے نکال چکی تھی۔ اسرائیلی چوکیدار بغیر آواز پیدا کیے وہیں ڈھیر ہو گیا، مگر اس نے جو گل کھلانا تھا، وہ کھلا چکا تھا۔

"ہمیں دیر کیے بغیر مارگٹ کی طرف بڑھنا ہوگا، لیٹس گو۔" لیلیٰ نے بانو سے کہا اور پھر تیزی سے آگے بڑھی۔ آگے بڑھنے کے دوران لیلیٰ کے کان کسی ممکنہ شور شرابے کی بھی سن گن لیتے رہے، تاہم ابھی تک ایسی کوئی بات وقوع پذیر نہ ہوئی، یہ دونوں اپنے مطلوبہ ہتھکے کے پھجواڑے پہنچیں۔ جب یہ اس کی دائیں جانب کی دیوار سے چپکی بیرونی گیٹ کی طرف بڑھنے لگیں، تو دفعتاً انہیں کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی لیلیٰ کی ٹھنکی ہوئی نگاہوں نے سامنے نظر آتے کنکریٹ کے مختصر راستے پر تیز روشنی پڑتے بھی دیکھ لی۔ یقیناً کوئی گاڑی تیزی سے اسی طرف آرہی تھی۔ لیلیٰ کو سمجھنے میں چنداں دیر نہ لگی تھی کہ یہ وہی گشتی ٹرک تھا جو تھوڑی دیر پہلے ہی انہیں نظر آیا تھا۔ شاید ان میں سے کسی کی نگاہ پھوٹی روشنی پر پڑ گئی تھی جو انہیں چونکا نے کا سبب بنی ہوگی۔ ایسی صورت میں ان کا مشن کھٹائی میں پڑتا نظر آنے لگا تو۔ بانو نے لیلیٰ کو سرگوشی میں مشورہ دیا کہ مائیکل پچل کو اب ہلاک کر دینا ہی کافی۔۔۔ ہوگا۔۔۔

نہیں۔ ابھی اس کی ہلاکت سے ہمیں اتنا زیادہ قائم نہیں ہوگا۔ جبکہ اسے یہ حال بنا کر ہم بہت سے اہم مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔ لیٹی نے پرنیال لہجہ میں کہا تو بانو نے ہونے سے اپنے سر کو بھی جھٹک دی۔

لیٹی حالات کا جائزہ لینے کے لیے چند قدم آگے بڑھی، بانو اس کے پیچھے تھی۔ لیٹی جیسی بہادر اور نڈر مجاہدہ کے ساتھ اسے کوئی ڈر نہیں محسوس ہو رہا تھا۔ مشن کی تکمیل کا جوش اس کے اندر بھی ابل رہا تھا۔ لیٹی دیوار کی آڑ لیتی... برقی بیرونی سمت چلی اور رک گئی۔ اسے وہی ٹرک دکھائی دیا۔ دوسرے ہی لمحے لیٹی کی پیشانی پر ٹھکنوں کا جال سا پھیل گیا۔ وہ ٹرک اسی سمت کو مڑ رہا تھا جہر چوکیدار سے اس کی مذہمیز ہوئی تھی۔ یعنی ان کی خفیہ آمد کا بھانڈا پھونسنے والا تھا۔ لیٹی نے تیزی سے کچھ سوچا اور پھر جیسے ہی ٹرک اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوا، اس نے مطلوبہ جگہ کے من گیت کی طرف جوش قدمی کی، جہر ایک مستعد گن مین اپنے گارڈ کین سے ہاتھ نکالا ہوا تھا۔ شاہ اسے بھی کسی گز بڑکا احساس ہو گیا تھا۔ کسی ٹرک کو اس نے بھی مڑتے... ہونے دیکھا تھا، مگر لیٹی کے لیے یہ موقع اچھا تھا۔ بانو نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "لیٹی بہن! کہو تو اسے اپنے خاموش پستول سے موت کی نیند سلا دوں۔"

"نہیں۔" لیٹی نے صرف اتنا کہا اور دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے دائیں ہاتھ کو مخصوص حرکت دی اور اب اس کے ہاتھ میں غائیو کونیکل اسٹار چمک رہا تھا، وہ اس نے ایک خاص تکنیک سے اس سلاح گارڈ کی طرف اچھال دیا۔ پانچ پھیلے کونوں والا یہ مختصر مگر مہلک ہتھیار اس کے ہاتھ سے گولی کی طرح نکلا اور کسی جگہ کی طرح فضا میں گھومتا ہوا گارڈ کی گردن میں دیوست ہو گیا۔ وہ کھڑے کھڑے لہرایا اور پھر پٹ سے گر پڑا۔ اس کے ڈھتے ہی لیٹی اور بانو نے اپنی جگہ سے تیزی کے ساتھ حرکت کی اور جھٹکے جھٹکے گیت کے بغلی دروازے سے جو کھلا ہوا تھا، اندر داخل ہو گئیں۔

ان کے دائیں بائیں مختصر سا فوج تھا۔ وہاں مدھمی روشنی ہو رہی تھی۔ سامنے مرکزی دروازہ تھا، دونوں بلاخیز پھرتی کے ساتھ اسی جانب کو لپکیں۔ ابھی وہ دروازے کے قریب ہی پہنچی تھیں کہ اچانک ایک خوفناک غراہٹ کی آواز ابھری۔ بلڈاگ کے سر اور بڑے بڑے شکاری دانتوں والا ایک کتا ان کے بائیں جانب کے بائیں سے اچانک ہی نمودار ہو کر لیٹی پر چھٹا ہوا، اس نے اپنے خونخوار جیزوں میں

لیٹی کا ایک بازو چاڑھالنے کی سعی چاہی تھی کہ ایسے میں بانو نے، جو پہلے ہی اس کی غراہٹ پر ٹھٹھکی گئی تھی، اپنے سائنٹر لگے پستول سے اس پر گولی چلا دی۔ گولی کھا کر وہ لیٹی سے ٹکرایا، اس کے بعد وہ چپ سے زمین پر گر پڑا۔

لیٹی نے وقت ضائع کیے بغیر دروازے کو لات رسید کر دی، وہ ایک زبردست دھڑاکے سے کھلا۔ اندر داخل... ہوتے ہی، ان دونوں نے اپنی مہیب آتشیں نہیں اب ہاتھوں میں پکڑ لی تھیں۔

لیٹی کی معلومات کے مطابق یہاں اکثریت ایسے افسران اور ملازمین کی تھی جو ابھی اپنی لیٹی نہیں لائے تھے مائیکل پھل بھی تیار ہوتا تھا۔ نیز یہ رہائش گاہیں زیادہ وسیع رقبے پر محیط نہیں تھیں۔ یہ مشکل دو یا تین ہی کمرے تھے۔ باری باری سارے کمروں کی تلاشی کے بعد ایک ہیڈروم میں انہیں اپنا "شکار" مل گیا، مگر اس طرح کہ اس کے اپنے پہلو میں بھی ایک "مخوب صورت" شکار دبا ہوا تھا، وہ کوئی کم عمر حسین بیودن دوشیزہ تھی۔ دونوں ہی برہنہ حالت میں بے ڈھب انداز میں سوئے ہوئے تھے اور ان کے کشادہ آرام دہ سینے سے نیچے نیچے دبیز قالین پر شراب اور خالی بلوریں پیکرے گرے پڑے نظر آتے تھے، جو ان کی شب بیتی کی داستان سارے تھے۔ ایسے میں لیٹی کو ایک عجیب خیال سوچا اور اس کے لبوں پہ زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنی چست شرٹ کی ایک پائنت کیپ کو اونچا کیا، جہاں سے اب ایک اسپائی فگم کا اوپری حصہ جھانک رہا تھا۔ جس کے سرے پر ایک بہت چھوٹا لینس لگا ہوا تھا۔ لیٹی نے اپنی ایک انگلی کی پور سے اسپائی پن کے کیپ کو ہونے سے دبایا، اب وہ خفیہ کمرہ دھیرے دھیرے سامنے کے منظر کی ساری ویڈیو فلم بنا رہا تھا۔

لیٹی نے بانو کو اشارہ کیا اور پھر اپنی گنوں کی آہنی بالوں کے ٹیپ کے مارکر ان دونوں بدستوں کو جاننے پر مجبور کر دیا۔ بیودن دوشیزہ کے چہرے پر خوف و ہراس کے تاثرات نمودار ہو گئے۔ اس نے بے اختیار اپنا منہ کھول کے پیچھے پڑوں کا پورا زور لگا کے چھپنے کی سعی چاہی مگر بانو نے اس کا دھن واہوتے ہی اپنی گن کی نال اس میں کھینچ دی جو شاید اندر حلق تک کو چھو گئی تھی، کیونکہ اگلے ہی لمحے وہ اذیت ناک اور گھنی گھنی کراہیں لینے پر مجبور ہو گئی۔ لیٹی اپنی گن مائیکل پھل کی گردن میں چھوتے ہوئے شیرنی جیسی غراہٹ سے تہدید آہولی۔

"خبردار! اسی طرح خاموشی سے پڑے

رو۔" اور نہ موت تم سے زیادہ دور نہیں۔"

اس کی دھمکی کارگر رہی۔ چہ بیٹے جسم اور بھاری چہرے والے مائیکل پھل کی چھوٹی گول آنکھوں میں خوف اور تشویش کی پرچھائیں مترشح ہونے لگی تھیں۔ جبکہ بانو نے اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی بیودن دوشیزہ کو بھی اسی طرح دھمکی دے کر خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

دونوں کے پاس وقت کم تھا اور صورت حال بھی نازک ہو گئی تھی۔ لہذا لیٹی اور بانو تیزی سے حرکت میں آئیں۔ بانو نے بیودن دوشیزہ کو تو وہیں ہاتھ پیر باندھ کر اور منہ پر اسکاچ ٹیپ چپکا کر کونے میں ڈال دیا جبکہ پھل کے ساتھ بھی یہی کچھ کیا۔ البتہ اسے نہ کونے میں ڈالا گیا اور نہ ہی اس کے پاؤں باندھے گئے۔ تاہم اس کے دونوں ہاتھوں کو ضرور رکن بست کر دیا گیا تھا اور منہ پر اسکاچ ٹیپ لگا دی گئی۔ مقصد یہی تھا کہ وہ خود اپنے پیروں پر چل سکے۔ ورنہ اسے مرنے اور چہ بیٹے جیسے والے پھل کو اٹھانا آسان کام نہ تھا۔

اس دور ان مائیکل پھل نے ان سے خوف کے عالم میں متعدد سوالات کر ڈالے تھے، جن کا لب لباب یہی تھا کہ وہ کون ہیں؟ اور اسے کیوں اغوا کیا جا رہا ہے وغیرہ۔ اس پر لیٹی نے صرف اسی قدر اس سے کہا تھا کہ ان کا مقصد اسے صرف یہ فعال بنانا ہے، بشرطیکہ وہ کوئی گز بڑ نہ کرے... یہ صورت دیگر اسے باقاعدہ گولی مار دی جائے گی

لیٹک اسی وقت جب یہ دونوں اپنے شکار کو دبوچے پلٹ رہی تھیں... کہ اچانک تیز سائرن کی مع غراش آواز سنائی دی۔ لیٹی اور بانو ٹھٹھکی گئیں۔ پھل کے خوف زدہ چہرے پر البتہ کچھ خوش امید کی تاثرات ابھرے تھے۔ "تم ادھر دو۔" مگر حقائق طر بہنا... میں ذرا باہر کے حالات کا جائزہ لے کر آتی ہوں۔" لیٹی نے بانو سے کہا اور تیزی کے ساتھ بیرونی گیت کی طرف بڑھی اور گیت کا بغلی دروازہ کھول کے ذرا باہر کو جھانکا... اسے کچھ افراتفری کا عالم تو نظر آیا مگر وہ ایسا نہیں تھا کہ یہ پھل کے جھٹکے سے باہر نہ نکل سکیں۔ اسرائیلی کشتی دستے... ابھی تک اسی مقام پر ٹامک نوئیاں مار رہے تھے، جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ دونوں موجود تھیں۔ جبکہ لیٹی کے اندازے کے مطابق انہیں جلد سے جلد پھل کا بیگنا چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ لہذا وہ بہ سرعت واپس پلٹی۔

اگلے چند سیکنڈوں میں لیٹی اور بانو اپنے شکار کو دبوچے... جھٹکے کے ایک عقبی چور دروازے سے نکل رہی

تھیں۔ یہاں ان دونوں کو ایک، دو محروم کے عقبی گوشے پار کرنے کے بعد رکنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آگے تقریباً پائیس، پانچ سو گز کے فاصلے پر اس چہار دیواری کے کارنر کے، پرچھائیں بھی، جہر مسلح گارڈز سرچ انہیں کے ذریعے چاروں طرف کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ جبکہ عقب میں وہ ششی دستہ موجود تھا، انہیں اب تک کسی گز بڑکا شہرہ نہیں ہو گیا تھا۔

لیٹی، چند لمحوں کے لیے پر سوچ انداز میں اپنے... ہونٹ جھپٹے کھڑی رہی، ان کے پاس زیادہ وقت نہ تھا خطرے کا الارم مسلسل بج رہا تھا اور کسی بھی وقت آفیسر کالونی کا چہا چہا چھان مارنے کے لیے مسلح گارڈز پھیل سکتے تھے۔ کالونی کے چاروں کارنرز پر گئی سرچ انہیں اب بیرونی سمت کے بجائے اندر پڑنے لگی تھیں۔ اس چوکیدار کی وجہ سے صورت حال کافی محدود ہو گئی تھی۔ اب سوچنے کا نہیں صرف فہم کرنے کا وقت تھا، لیٹی نے چند قدم مزید آگے سرک کر، دو بنگلوں کے درمیان پہنچ گیا، اسے میں قدم رکھ دیا۔ بانو اس کے عقب میں، شکار دبوچے چلی آ رہی تھی۔ مائیکل پھل رکن بست تھا، اس کے منہ پر اسکاچ ٹیپ تھی جبکہ اس کے پاؤں آزاد تھے، اس طرف سے خطرہ تھا کہ وہ کسی بھی وقت اپنا بازو، بانو کی گرفت سے چھڑا کر دوڑ لگا سکتا تھا۔ اسی وجہ سے تحت لیٹی بانو کو اس سلسلے میں خاص طور پر محتاط رہنے کی تلقین کر چکی تھی اور خود بھی اس کی طرف سے محتاط تھی۔

گھیارے کے سرے پر پہنچ کر لیٹی نے ذرا باہر جھانکا... اسرائیلی مسلح گارڈز... اب ان کی تلاش میں، چھوٹی چھوٹی فوٹیوں میں بت کر ادھر ادھر بکھرنے لگے تھے گویا صورت حال بتدریج حوصلہ شکن ہوتی جا رہی تھی۔ مفر کی راہ مسدود ہوتے پا کر لیٹی کو کچھ اور سوچنا پڑا... اسے سامنے بھی مکانوں اور بنگلوں کی ایسی ہی قطاریں نظر آ رہی تھیں... درمیانی راستے سے دوسری طرف کا حصہ تھا، جہر نسبتاً کم کھلی ہوئی تھی۔

ابھی لیٹی اس راستے کو محفوظ طریقے سے پانسنے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اچانک ان کے عقب سے ایک پائنت دار آواز بلند ہوئی۔

"ہالت۔" لیٹی اور بانو نے بری طرح ٹھٹھکی کر پیچھے گردنیں موڑ کر دیکھا۔ تین دردی پوش گارڈز... ان پر عقب سے اپنی گنیں تانے کھڑے تھے۔ نہ جانے وہ کس وقت بنگلوں کے عقبی گھیاروں سے دبے پاؤں چلتے ہوئے

ان کے سروں پر آن پہنچے تھے۔

ان دونوں کی تربیت کا حصہ تھا کہ ایسے کسی نازک موقع پر اپنی جگہ سے حرکت کے بغیر صرف ٹکروں کے ذریعے خاموش پیغام رسانی کو کیسے سمجھا جاتا ہے اور۔۔۔ لٹلی نے بانو سے ایک نگاہ ملاتے ہی اسے اپنی ایک ابرو سے جنبش سے غصہ اشارہ کیا اور دوسرے ہی لمحے بانو نے اپنے ہتھکڑی کو ڈھال بناتے ہوئے اپنے سامنے کر دیا تینوں اسرائیلی گارڈز ان کی چالاکي نہ سمجھ پائے اور ایک نے اپنی گن سے ہوائی برسٹ فائر کر دیا، مقصد یہی تھا کہ ان کے دیگر ساتھی اس طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہو جائے اور ان کے گرد گھیرا حصار تنگ ہو جاتا۔ لٹلی کی اب تک کی زندگی کا یہ سب سے اہم اور خطرناک سوز تھا جب اس نے خود کو لمحے بھر کے لیے بے بس محسوس کیا تھا اور تب پھر اس نے بھی اپنی اب تک کی تربیت اور جا بک دتی کو بروئے کار لاتے ہوئے۔۔۔ ایک خطرناک فیصلہ کیا اور پل کے پل اس پر عمل بھی کر ڈالا۔

ایک گارڈ کے فضا میں برسٹ چلاتے ہی لٹلی نے اس موقع کو حرکت پذیر ہونے کا لمحہ سمجھا اور یہ سرعت اس نے خود کو زمین پر گر دیا۔ اسے یقین تھا کہ تینوں گارڈز لٹلی کو سامنے ہا کر فوری طور پر فائرنگ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ مگر ایسا صرف چند سیکنڈوں کے لیے ہوتا، اس کے بعد وہ لٹلی کو بے آسانی گولیوں سے بھون ڈالتے۔ لیکن بھلا لٹلی اب انہیں یہ موقع کہاں دینے والی تھی۔ لٹلی نے کرتے ہی زمین پر صرف ایک لڑھکنی کھائی تھی اور تینوں گارڈز اس پر اپنی صیب گنوں کی خوش ناک بو چھاڑ کرنے کے لیے ان کا زامہ بدلتے رہے تھے کہ لٹلی نے دوبارہ پیٹ کے پل پر ہوتے ہی اپنی گن کا رخ ان کی طرف کر کے لٹلی دبا دی۔ بے شک یہ آریا پار۔۔۔ والا ہی معاملہ تھا۔۔۔ نتیجتاً رات کے دم بہ خود اور جھکے ہوئے صیب ستارے میں۔۔۔ لٹلی کی ایم لی فائیو اور ریٹائزر گن (یہ تھے اوپر دونوں والی مہلک گن تھی، جس کی لٹلی اور نسبتاً بڑے منظم کی مال سے بہ وقت ضرورت راکٹ بھی داغا جاسکتا تھا) بڑے زور سے گرتی۔ تینوں گارڈز کو سنہلنے کا موقع بھی نہ ملا۔ وہ کربس انگیز چیخوں کے ساتھ رقص اہل کرتے ہوئے زمین ہوس ہو گئے۔

”فائر کو لے کر اس طرف بھاگو۔۔۔ جلدی۔“ لٹلی نے قدرے چلا کر کہا تو بانو حرکت میں آئی، لٹلی نے سامنے کا رخ کیا تھا۔ یہ بہت بڑا اور ایک خطرناک رسک تھا، مگر اب اس کے سوا چارہ بھی نہیں بچا تھا۔ لٹلی نے اندھیرے کا زیادہ

سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی سعی کی تھی اور کافی حد تک کامیاب بھی رہی تھی۔ پھر تازہ معرکہ آرائی کے دوران دیگر مسلح گارڈز بھی دوسری جانب متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ دوسری جانب وہی جگہ تھی جہاں صان دونوں اور بعد میں وہ تین جہنم واصل اسرائیلی گارڈز نے فائرنگ کی تھی۔

بانو لٹلی کی تھلید میں اس کے پیچھے لٹلی اس نے لٹلی کا بازو دبوچ رکھا تھا، اس کے دل و دماغ میں ابھی خاصی وحشت بیٹھ چکی تھی، یوں بھی وہ کچھ زیادہ ہی ”تھروٹلا“ واضح ہوا تھا۔ یقیناً، یہاں کا ”ٹھیکا“ سنبھالنے کے بعد اسے یہودیوں نے اس رخ حقیقت سے بھی آگاہ کیا ہو گا کہ اس یہودیوں کی ناصیانہ آباد کار ہستیوں کے تحیراتی۔۔۔ پروجیکٹ۔۔۔ میں اسرائیلیوں کو شدید مخالفت اور مزاحمت کا بھی سامنا ہے۔ وغیرہ۔ ظاہر ہے بڑی رقم کے لالچ اور اسرائیلیوں کی حوصلہ افزاء ڈھنگوں میں آکر لٹلی یہاں آ تو کیا تھا۔ مگر اب اسے بتا چل رہا تھا کہ۔۔۔ اسرائیلیوں نے اسے اس کام پر مجبور کرنے کے پیچھے کبھی لٹلی ڈھنگ ماری تھیں وہ سب غلط ثابت ہوئی تھیں۔۔۔

بانو۔۔۔ جب اسے لے کر بھاگی تو۔۔۔ اچانک ایک موقع پر مائیکل لٹلی نے وہی کیا جس کا ذکر تھا۔ اس نے اس بڑے بڑے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے۔۔۔ بانو کی گرفت سے خود کو آزاد کرنے کے لیے پہلے تو اسے کانٹہ سے کی شوکر رسید کی، مگر بانو بھی ممتا تھی۔ اس نے اپنی گن کا رخ اس کی طرف کیا۔ اتنا تو اب تک لٹلی بھی جان چکا تھا کہ۔۔۔ ان سے فوری طور پر اسے جان کا کوئی خطرہ نہیں کیونکہ یہ اسے صرف انوا کی نیت سے ہی کسی نامعلوم مقام تک لے جانا چاہتی تھیں۔ اسی لیے جیسے ہی بانو نے اس کی حرکت پر اپنی گن کا رخ اس کی طرف کیا، اس نے اس کی بھی پروا کیے بغیر، اپنے دونوں رسن بست ہاتھوں کو نصف دائرے کی صورت کھما کر دوسری شوکر بانو کے لگائی۔ اس بار بانو کا ہاتھ بھی لمحے بھر کو بھکا تھا۔ لٹلی کے لیے اتنا ہی کافی تھا، اس نے ایک دم دوڑ لگا دی۔۔۔ بانو پریشان ہو گئی۔ اس نے لٹلی سے چلا کر کہا۔

”شکار فرار ہو رہا ہے۔۔۔“ یہ کہتے ہی اس نے بھی اپنی گن بھاگتے ہوئے۔۔۔ مائیکل لٹلی پر تان لی تاکہ ضرورت پڑنے پر اس پر گولی چلا سکے۔ لٹلی اسی سمت کو دوڑ رہا تھا، بعدھر۔۔۔ اسرائیلی گارڈز کا مسلح جھٹکا موجود تھا۔ لٹلی نے جو بانو کی آواز پر پلٹ کر یہ سب دیکھا تو اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ اسے اپنی جاں مسل محنت ضائع

جاتی محسوس ہوئی تھی۔

☆☆☆

زبیدہ اور عابد شکری، ونڈلر کے بتائے ہوئے محل وقوع کے مطابق اب جس سمت پیش قدمی کر رہے تھے۔ وہ ایک تنگ سی راہداری تھی۔ جس میں دو دو افراد ایک ساتھ صرف قطاری صورت میں ہی آگے بڑھ سکتے تھے۔ زبیدہ اور ونڈلر۔ ان دونوں کا فکا راب ایک ہی تھا یعنی۔ اسرائیلی ریزائیڈرل اردوت یہود۔ یہ دونوں مل کر اب اسرائیلی ہجر یہ کے اس اہم افسر کو سب سے پہلے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے تھے۔

اس تنگ سی راہداری میں آگے بڑھتے ہوئے اچانک ونڈلر رک گیا۔ زبیدہ اس کے شانہ بٹا نہ تھی، پھر عابد اور ونڈلر کے تین ساتھی تھے۔

”کیا ہوا؟“ تم رک کیوں گئے؟“ زبیدہ نے قدرے چونک کر پوچھا۔ ونڈلر کوئی جواب دیے بغیر خاموشی سے سن کن لیتا رہا۔ وہ شاید کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور پھر یک دم اس نے بغیر کچھ کہے قدم آگے بڑھا دیے۔

”شاید تم کچھ بھول رہے تھے۔۔۔؟“ اس کے عقب میں چلتے ہوئے زبیدہ نے پھر کہا۔

”نہیں، بھولا تو کچھ نہیں تھا۔ میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک ایسی سی راہداری سے ایک خفیہ راستہ۔ ان کی جہمت تک جاتا ہے۔ مگر وہ راہداری یہ نہیں ہے۔“ ونڈلر نے جواب دیا۔ زبیدہ پر خیال لکچھے میں بولی۔

”ممکن ہے یہاں سے بھی کوئی ایسا راستہ عمارت کے اہم گوشوں کی طرف نکلا ہو۔۔۔؟“

”میں یہی اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔“ ونڈلر نے بے اختیار کہا۔

”ان حالات میں یہاں ایک ایک دشمن ہماری تلاش میں گونا گونا چھان رہا ہے، ہمیں ایسے خفیہ راستوں کو تلاش کر کے دشمن کو ہماری نقصان پہنچانا چاہیے۔“ اس بار عابد شکری نے کہا تو ونڈلر سنجیدگی سے بولا۔

”ہمارے کیپو فرٹش نگار جاسوسوں نے اس سلسلے میں اپنا جو کام باس (چیک ڈوکر) تک پہنچایا تھا، میں اس کے مطابق ہی عمل پیرا ہوں۔۔۔ یہاں ایسا کچھ نہیں ہے۔۔۔ یہ وقت ضائع کرنے والی بات ہوگی۔ ہمیں اس راہداری کو پار کرنا ہو گا۔ مجھے لگتا ہے اپنی مطلوبہ راہداری۔ اس راہداری کے اختتام میں ہمیں مل سکتی ہے۔“

”ایس کو۔۔۔“ اس کی بات سن کر زبیدہ نے یکدم۔۔۔ پھر جوشی جھلت میں کہا اور ایک بار پھر یہ سب۔۔۔ نہیں سنبھالے تیزی سے آگے بڑھے مگر ابھی چند قدم آگے بڑھے کہ انہیں اچانک عقب سے تیزی سے قریب آتی۔۔۔ گھوم گھوم گھوم۔۔۔ ”بھئی آؤ، ایل ایمر جی ستالی ویل۔۔۔ یہ سب بری طرح ٹھیک کر کے۔ زبیدہ اور عابد تو پتہ اندازہ قائم نہ کر سکتے تھے، اس لیے یہ کسی چھوٹی ٹیم کی آواز تھی، لیکن مافیائی ایجنٹ۔ ونڈلر ان آوازوں کو فوراً پہچانتے ہی چلا کر بھاگا۔

”ہو شیار۔۔۔ دشمن فوراً جھیل پائیکس میں۔۔۔“ عقب میں آتے تھے۔

”نہیں۔۔۔ ہمیں ان کا مقابلہ کرنا ہو گا۔“ پائیکس سنبھال لو۔“ زبیدہ نے کہا اور خود تیزی سے چلی۔ اس کی دیکھا دیکھی ونڈلر بھی اپنی گن سنبھالنے چلا۔ زبیدہ نے زبیدی عابد کو پیچھے کر لیا، ٹھیک اسی وقت ان کے عقب میں دو فوجی وکیل بائیک نمودار ہو گئے۔ ان میں دو دو مسلح افراد براجمان تھے۔ ونڈلر کے تینوں ساتھی ان کے نٹے پر تھے۔ ان بے چاروں کو پٹ کر ان پر فائر کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ بائیک سواروں نے آٹا ٹانا اپنی آٹو بیچک گنوں کے منہ کھول دیے تھے، گولیوں کی بھیا تک ترابھری نے اعصاب تک جھنجھٹا ڈالے۔

وہ تینوں بد نصیب کرب انگیز چیخوں کے ساتھ گرے تو اب زبیدہ اور ونڈلر موت کے ان ہر کاروں کی زد میں آگئے مگر اپنے تین ساتھیوں کی قربانی کو وہ بھلا بک ضائع۔۔۔ جلنے دیتے۔ اگرچہ وہ بھی اب یقینی موت کی زد میں ہی تھے۔

اس بھیا تک خطرے کو محسوس کرتے ہی تینوں نے خود کو گرالیا تھا اور جیسے ہی ونڈلر کے تینوں ساتھی رقص اہل کرتے تھے اوپر گرے، زبیدہ اور ونڈلر نے اپنی گنوں کے منہ بھی کھول دیے۔۔۔ سب سے آگے والی بائیک کے دونوں دشمن چھلکی ہو کر ڈھسے گئے اور ان کی بائیک بے قابو ہو کر اچھلی اور پھر رالت گئی۔ ان کے پیچھے والی بائیک کے دونوں دشمن، خطرہ بھانپ کر پیچھے کو پلٹے۔ انہیں فرار ہوتا دیکھ کر ونڈلر اپنے تینوں ساتھیوں کا انتقام لینے کے جوش تلے اٹھا، مگر اسی وقت زبیدہ کی مقامی نگاہوں نے دیکھا۔ ونڈلر ایک خطرناک ٹھٹھی کر چکا تھا، کیونکہ دشمنوں کی بائیک پلٹ تو گئی تھی، مگر اس کے ساتھ بیٹھے دوسرے دشمن نے بیٹھے بیٹھے گوم کر اپنی گن کا رخ ونڈلر کی طرف کر دیا۔ ٹھیک اسی وقت جبکہ زبیدہ اس خطرناک صورت حال کو پہلے ہی بھانپ چکی تھی اس نے اپنے اپنے

وہ ہو کھلا کر اپنی ہر گس سے باہر آئے۔ حسن نے جہاں پہنچا اور جہاں سے جہاں سے نکلے۔

”اے اشراف! میں نے ماضی ہم آواز ہو کر ہوئے
پوری قدرت ان کے اسلامی حقائق و شانہ خدوہاں سے کچھ بھی
اور دشمنوں پر اپنی درست فہمی کہ وہ نہ ہی طے نہ وقت
وہ وہ کر رہے تھے۔“

گو ایوں لی کھن کھن جی میں سات۔ اہالی سے لمانہ۔
 کی کر یہہ انگیز نہیں بھی شامل نہیں۔ شوہر و بیوی کی یہ طاقت
 بکھینے والے۔ اور کر بیزارم سے دہائی ان بیداریوں
 آج صحیح معنوں میں اپنی اوقات یاد آگئی تھی کہ وہ تو آج تک
 ہے فلسطینیوں پر اپنی طاقت کا زور چلاتے رہے ہیں۔ آج
 ان کے مقابلے پر آنے والے ہیں ہاں فروش فلسطینی گوریلز
 تھے۔۔۔۔۔ موت سے بے پروا۔ جذبہ ایمان و حریت سے
 ہر شاہ و منہی بھر تعداد کے باوجود خود سے زیادہ طاقت ور
 منوں کو کیسے ناکوں چنے چہوتے ہیں۔

سات منکال کے ساتوں کمانڈر کو بالکل اسی
 راج چلک جھپکتے میں ہلاک کر ڈالنا تھا جیسا انہوں نے تونس
 پریشن میں فلسطینی راہنما ابو جواد کے ساتھ کیا
 دشمنوں سے بھرپور انتقام لینے کے بعد فرینک
 نرکی پوری غارت کو قائم ہو کر اڑا دیا گیا وہ جلتے
 بے لطف کا منظر پیش کرنے لگی تھی اس سے پہلے

ت چھاتہ بردار نے واسٹ مکیسل کی جانب پرواز لے لی۔ آخری رنگ سینئر سے ہی ایک نیلی کا پٹر کا بندوبست لیا تھا۔ نیز مالی غنیمت کے طور پر محسن نے جانے کیا سوچا ایک کاندھے سے فائر کرنے والا میزائل بھی اچک لیا تھا، تین حصوں میں منقسم کیا گیا تھا۔ زمین سے فضا میں اٹھنے شوڑ بھی اٹھا کر محسن نے اپنی کٹ میں ڈال لیا تھا۔

مشن کا ایک ابتدائی اور اہم مرحلہ کامیابی کے ساتھ
 باجا چکا تھا۔ سات مکالمات سمیت آئزمن ہیری جونیز
 ہی قائم کردہ ٹریڈنگ سینٹر کا قلع قمع کر کے، سات چھات
 رنے بلاشبہ اسرائیل کی کمر توڑ دی تھی۔ جیسا کہ مذکور
 یہ اہم مشن بہت تیزی اور کم سے کم وقت میں پایہ تکمیل
 پہنچانے کا مقناضی تھا، تاکہ زیادہ سے زیادہ اس کے
 خواہ نتائج حاصل کیے جاسکیں، اسی لیے سینٹر کی
 ت کو اسی طرح جلا سکتا چھوڑ کر۔ یہ پہلی کارپز میں
 ہو کر پو پھنے۔ دائن کیل کی طرف پرواز کر گئے۔
 محسن کا دل و دماغ اس وقت جوش جنوں سے بھرا ہوا

سمجھ کر ہی اپنا حصار یعنی رات کا آخری پہر بسپ کی
 عمارت کو، لہ کر لگانا تھا جسے دن جو شریک کر کے
 واسطے تمام لوگوں، یکسپی پہ لیاوری کی، اسے لیاوری اپنے
 مسلح کاروان کے سپرد کر کے اس وقت اٹھتا رہا۔ یہ
 نظر سے خواہ فرکوش کے سر پہ لے رہا ہے۔

جلد ہنی من کی یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی۔ ایک جگہ انہیں مختصر سے دوست میں ایک بڑا سا الیگنٹک پلائی کا مین سوچ ہوا دکھائی دے گیا۔ یہاں بلی کی روشنی تھی۔ پھر بھی من نے نارنجی جاکر اس کا مین سوچ دیکھا۔ پھر وہ کمرے کے کھڑے لٹیک شیری سے رابطہ کیا اور کہا۔

”ایٹمن فاضل اسات کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اور لیڈر
مذکورہ کمال کو جو نظر آئے گولیوں سے بھون ڈالو۔
اسات کمال کی ہیرک سے کوئی زندہ بچ کر جانے نہ پائے۔“
یہ ہدایت دینے کے بعد محسن نے مین سوئچ آف

دیا۔ نہ صرف پوری عمارت، بلکہ اس کے اندر جو بھی
 کے لارنگ سسٹم وغیرہ تھا، وہ سب مل بھر میں ٹیل ہو کر رہ
 میں سوچ آف کرتے ہی محسن نے قاسم کو ہدایت کی
 اس میں ایک نٹرک باکس میں ایسی خرابی بھی پیدا کر دے
 اگلے چند گھنٹوں تک بھی یہ درست نہ ہونے
 قاسم اس میں ایک پھرت تھا، وہ اپنے کام میں جت گیا

حسن اسے وہیں چھوڑ کر اپنے باقی دوستوں کو ملنا اور
 کے ساتھ اس سمت بڑھ گیا جہاں علیہ شہر میں وغیرہ گھات
 ہوئے موجود تھے کہ اچانک ہی گولیوں کی ...
 ۱۱ بھری۔ حسن جان گیا کہ شیریں وغیرہ کا گروہ سات
 سے ہو چکا تھا۔ اس نے اسی جانب دوڑ لگا دی۔

نغمات اور طلحہ اس کے پیچھے تھے۔ انہوں نے لیزر
مکھڑ، دشمنوں پر تان رکھی تھیں، روشنی کے تقریباً دیر ہ
لے کے درمیان تھرکنے والا..... سرخ رنگ کا نقطہ
سے حرکت کرنے لگا اور جس پر وہ پڑتا، ان کی گتیں
شروع ہو جاتیں..... اور شکار آواز نکالے بغیر وہیں
پہنچ جاتا۔

جانا..... جلد ہی یہ اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔ جو
منکال سے نبرد آزما تھے۔ یہی وہ سات منکال تھی
جو تیس آپریشن میں..... ابو جواد اور غلیل الوزیر کو
اس وقت شہید کیا تھا جب وہ اپنے..... اہل خانہ
اپنے گھر میں موجود تھے..... اور وہاں اس یہودی
نے اچانک ہلا بول کر سب جس نہیں کر دیا تھا
یہی سات منکال..... فلسطینی کمانڈرز..... کے
سات چھاتہ بردار کے زخمے میں تھے..... جیسے ہی

سپس ذالحجت — 90 — اگست 2015ء

معروف اور مقبول قلم کار

ظاہر جاوید مثل

کی نئی سلسلے وار کہانی

ازگارے

جاسوسی ڈائجسٹ

میں پیش کی جا رہی ہے

زندگی کی رعنائیاں اور ہولناک سچائیاں

اپنے دامن میں سمیٹے

ایسی طویل، سنسنی خیز اور تحسیر انگیز کہانی

جے و تارین ایک۔ ہی نشست میں پڑھنے پر

خود کو محبور پائیں گے

شکر ادا کیا تھا۔ پھر حاد سے اس کی کہانی دریافت کرتے...
ہوئے ان کی والدہ کا پوچھا تو... حاد نے پہلے احمد کو گاڑی
ایک مظلوم سے کسی طرف سونے کا کہا... وہاں پہنچے تو
... دیکھ کر سب خشک گئے کہ اس طرف... ابن لکھنوی کی
وہی کار ٹھہری تھی، جس میں وہ حاد اور اس کی والدہ عاجزہ کو
پر غمال بنا کر روانہ ہوا تھا مگر اب کار میں صرف عاجزہ ہی
موجود تھی۔

اسے بھی جیب میں سوار کروایا گیا... اور یہ قافلہ
ارٹل کی طرف گامزن ہو گیا... راستے میں حاد اندال نے
بتایا کہ اس نے کسی طرح راستے ہی میں قصی کو پکڑا دے کر
اس سے رہائی حاصل کر لی تھی اور... پھر اسی کی کار لیے وہ
اپنی والدہ سمیت فرار ہو کر ان لوگوں کی تلاش میں یہاں
تک آئے پہنچا تھا۔ تاہم اسے ام کلثوم کے انتقال کا سن کر بے
حد رنج ہوا تھا۔

پوچھنے لگی تھی۔ دور صحرائی افق سے سورج طلوع...
ہونے لگا تھا۔ راستے میں... احمد حادی کو حبیہ سکیوں کے
درمیان بتا رہی تھی کہ اس نے ان کی جان بچانے کی ہی
غرض سے اگرچہ رشید جیسے شیطان کی بات مانی تھی لیکن
حقیقت یہی تھی کہ بعد میں اس نے بھی اپنی جان ختم کرنے کا
ارادہ کر رکھا تھا۔

”تم نے یہ کیسے سوچ لیا تھا بھلا کہ تم میری جان بچا کر
اپنی جان قربان کر دو گی؟“
اس کی بات سن کر احمد نے ہولے سے شکوہ کیا۔ ”میں
کیسے تمہارے بغیر جین سے رہ سکتا تھا؟ تمہارے بغیر تو
میں ایک زندہ لاش ہی بن کر رہ جاتا۔“
”اللہ نہ کرے... اب اسے ایک بھیا تک خواب
سمجھ کر بھلا دو... حادی...“ حبیہ نے ہلکی سرگوشی میں
اس سے کہا۔

ضروری جانچ پڑتال کے بعد ان کے اپنے محل تک پہنچانے
کا خاطر خواہ بندوبست کرنے میں مصروف تھا۔
... معاملہ بھی اگلے چند دنوں میں... حسن ڈوبی
انجام پا گیا... رخصت ہونے کا یہ عمل بہت رقت انگیز
تھا۔ حاد نے بہت دکھ، رنج اور شرمساری کے ساتھ انہیں
رخصت کرنے کے دوران بولا تھا۔
”دوستو... اچھے سخت شرمندگی ہے کہ... میں نے
آپ کو محض اپنے ایک شوق اور فضول خواہش کی خاطر
... اتنی بڑی مصیبت میں پھنسا دیا تھا... جین کرو مجھے
سب سے زیادہ فکر تم دونوں ہی کی تھی۔ کاش...! یہ سب نہ
ہوا ہوتا... کاش...“ حاد کی بات، اس کی آواز اور اس
کے لہجے میں حقیقی تڑپ کو محسوس کر کے... ڈاکٹر کمال اور
جینی دونوں ہی رنجیدہ ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر کمال نے دوستانہ
سی مسکراہٹ سے حاد کے شانے پر اپنا ایک ہاتھ رکھ کر اسے
ہولے سے جھپٹا کر کہا۔

”نہیں حاد...! ایسا کہہ کر ہمیں شرمندہ نہ کرو۔ تم
جس سچے جذبے اور سچی محبت کے ساتھ مجھے اور جینی کو اپنے
ساتھ عراق لائے تھے اور ہم نے تمہارے والدین اور بہن بھائیوں
کے ساتھ جتنا بھی مختصر وقت گزارا وہ ہمیں بالکل ایسا ہی لگا تھا
جیسے ہم انہوں میں... اپنے پیاروں میں بیٹھے ہوں۔ مگر
افسوس کہ تمہارے... برحمت کرنے والے والد... اب اس
دنیا میں نہیں رہے۔ ہم ان کی مغفرت کی دعا ہی کر سکتے ہیں
اور ان کا ہم سے پیار اور شفقت بھر انا ہی نہیں ہم بھی نہیں
بول سکتے... بہر حال ہماری دعا میں آپ لوگوں کے
ساتھ ہیں، اس کے علاوہ ہم اللہ سے دعا بھی کرتے ہیں کہ وہ
تمہارے وطن کے حالات جلد بہتر کرے۔“

کم و بیش جینی نے بھی وہی جذبہ بات کے ساتھ اسی
طرح کے الفاظ حاد اور بالخصوص حبیہ سے بھی کہے۔ اس
کے بعد دونوں... یو کے کی طرف پرواز کر گئے۔
لندن پہنچ کر ہی ڈاکٹر کمال پر کئی انکشافات ہوئے
... پہلا انکشاف تو اس کی... از پورٹ پر...
گرفتاری کی صورت میں پیش آیا کہ جینی کے باپ جان
نسویٹر نے اس پر اپنی بیٹی (جینی) کے انوکا کایس دائرہ کر
رکھا تھا... جبکہ گرفتاری کے وقت جینی چیخ پڑی تھی... کہ
اس کے باپ نے... ڈاکٹر کمال سے ایک پرانی عداوت
کے باعث اس پر جھوٹا الزام عائد کیا ہے... وہ اس کے
ساتھ اپنی مرضی سے عراق گئی تھی... وغیرہ... مگر اس کی
کسی نے نہیں سنی، تو جینی نے بھی پولیس والوں کا پیچھا اتنی
آسانی سے نہ چھوڑا اس نے فوراً ہمیشہ کی طرح اسکاٹ لینڈ

یاد پولیس سے... مطلب کی اور انہیں اصل حقائق سے آگاہ
کیا۔ انوکا کایس تو جینی کے اپنے بیان سے ہی انوکھا رہا...
دیا گیا تھا... چند اچھوتھوں بعد ہی ڈاکٹر کمال کی رہائی عمل
میں لائی گئی اور اس دوران کمال اور جینی کو اس حقیقت کا بھی
علم ہوا کہ... ان کے ”غیاب“ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے
... ڈی کارلو کے باپ جین ڈیوڈ نے موقع سے فائدہ اٹھایا
تھا اور اپنے بیٹے کی ضمانت کروائی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس
غیبت نے اس کے بھائی ظہیر احمد کو بھی گرفتار کر دیا تھا
کمال کی رہائی کے بعد ظہیر بھی رہا ہو گیا تھا... اسکاٹ
لینڈ یاد پولیس جینی کا پورا پورا ساتھ دے رہی تھی۔

پھر جب ان پر آخری انکشاف یہ ہوا کہ ظہیر کی پہلی کو
بھی نامعلوم افراد نے انوکا کر لیا تھا تو یہ بات از خود ہی سمجھ
میں آنے والی تھی کہ... یہ ”حرکت“ کون کر سکتا
تھا؟ یہی بات... ڈی کارلو کے گلے کا پھندا ثابت ہوئی
... اور پولیس نے اسے اس وقت گرفتار کر لیا جب وہ اپنے
باپ جین ڈیوڈ کی ہدایت کے مطابق لندن سے فرار ہونے
کی کوشش کر رہا تھا۔

اسکاٹ لینڈ یاد پولیس کے لیے ڈی کارلو کے منہ
سے اگوتا مشکل ثابت نہ ہوا کیونکہ سارے شواہد اس کے
غلاف جا رہے تھے... روٹی کی گرفتاری عمل میں آ جانے
کے بعد... ظہیر کے بیوی بچوں کو باز یاب کر دیا گیا
... اور ڈی کارلو... ایک لمبی سزا پر دوبارہ جیل چلا گیا۔
آج ظہیر احمد کا گھر خوشیوں کا گہوارا بنا ہوا تھا
... وہاں دن کے کھانے میں سب موجود تھے... ظہیر
احمد، اس کی بیوی پروین، دونوں بچے... ڈاکٹر کمال اور
جینی بھی۔

یہ لوگ سب سے زیادہ... جینی کے ہی شکر گزار تھے
جس نے سچ کی خاطر اپنے لوگوں کی پروا نہ کرتے ہوئے
... ان کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔

یونیورسٹی سے ڈی کارلو پر ”نان گرینا پرسن“ کا لیٹل لک
کر اس کا نام خارج کر دیا گیا تھا جبکہ ڈاکٹر کمال احمد کو لینڈ
یونیورسٹی والوں نے بڑی عزت کے ساتھ ری جوائن کر لیا تھا۔
اس عزت افزائی پر ڈاکٹر کمال کے فیروز نے ان
دونوں کے اعزاز میں ایک پارٹی کا بھی اہتمام کر ڈالا
... ان میں زیادہ تعداد مسلم مذاہن کے اسکاٹ لینڈ کی تھی۔
جینی بہت خوش تھی۔ وہ سمجھتی تھی اس نے کمال کے
ساتھ دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔

احمد الیا جیتہ اور شن جیتہ کے فوہاگ اور مادام
میڈ دسان کی آمد سے صرف چند گھنٹے پہلے ان کی تلاش
... سب سے ڈانچت

میں ”جنگ مارنے“ ایک خصوصی امریکی چارٹرڈ ہیلر سے
کے ذریعے عراق کی طرف کوچ کر پٹے تھے۔
☆ ☆ ☆

اپنے شکار کو رافزار اختیار کرتے دیکھ کر لیلی نے اپنے
ہونٹ سمجھ لیے، اس کی گن کارخ اسی کی طرف تھا، جب اس
نے ہولے سے خود کا میہ بڑبڑاتے ہوئے کہا: ”تم نے خود
ہی اپنی موت کو آواز دے ڈالی... جگل...“ لیلی نے
برست فائر کر دیا۔ پھل چھٹتی ہو کر گر اور وہیں ٹھنڈا پڑ گیا۔

لیلی کو اب اپنی اور بانو کی فکر ہوئی۔ اس نے چلا کر
بانو کو اپنے پیچھے آنے کا کہا اور ایک جانب
دوڑی... اور کچھ سوچ کر اس نے پھل کی ہی رہائش گاہ کا
رخ کیا۔ مگر رکنے کے لیے نہیں... وہ اندرونی زینے
مٹے کرتی ہوئی اوپر چست پر پہنچی تھی۔ بانو اس کے عقب میں
تھی... اور لیلی کے اس اقدام پر ابھن آئیں حیرت کا شکار
تھی۔ کیونکہ اس کے مطابق اب پھل کی رہائش گاہ ان کے
لیے چھپے دان بھی ثابت ہو سکتی تھی... لیلی نے اندر داخل
ہوتے ہی اوپر چست کی طرف جانے والے زینے کا رخ کیا
... بانو اب بھی اس کی حکمت عملی نہ سمجھ پائی... بلکہ اس
کے خیال میں چست پر جانا بھی ان کے لیے خطرے سے
خالی نہ تھا۔ وہاں سے وہ منڈیروں پر پنی چوکیوں کی زد میں
آ سکتے تھے، لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے دیکھا۔ لیلی نے
چست پر پنی ایک دیوار کی آڑ لے کر... ایک راکٹ داغا
... چوکی کے پر نچے اڑ گئے... لیلی پھر رکی نہیں... وہ
اسی طرح ایک مکان سے دوسرے مکان کی چھتیں اور
منڈیروں میں ٹاپتی ہوئی... ایک ایسے مکان کی چست کے
قریب آن پہنچی تھی جس کے بالکل قریب... وہ تباہ حال
چوکی تھی... لیلی نے وہی خود کار آکٹرا نکال کر پہلے بانو کو
اوپر پہنچایا اور پھر خود تباہ حال چوکی کے بلے پر اڑ پڑی۔

بانو اب لیلی کی اس چابک دستی اور ذہانت پر ششدر
ہوئے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ یہی وہ مقام تھا، جہاں سراسر لیلی کچھ
لمحے کے لیے متوجہ تو ضرور ہوئے تھے، لیکن اس طرف کا
انہوں نے رخ کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

”بچے کو دو... جلدی...“ لیلی نے بانو سے ہانپتی
ہوئی آواز میں کہا... اور اسے کارفیا بانو کی جانب بڑھا دیا
... بانو پھرتی کے ساتھ دیوار کے دوسری طرف اتری تو لیلی
اپنی بھڑکاوٹ کی تکنیک سے پہلے ہی بچے آچکی تھی... یہ
آفسیئر کا لونی کا بعد ترین گوشہ تھا... دشمن اندر ان کی...
تلاش میں تاک نوٹیاں ہی مارتے رہ گئے اور یہ دونوں
کالونی کی عمارت سے دور ہوتی چلی گئیں، جتنی کہ انہوں

نے اپنے فلسطینی میزبان کے گھری آکر بنا دی۔

ہاں راشدین کی بہن سامہ..... بے چینی سے جھک رہی تھی۔ ان دونوں کو زندہ سلامت دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ لیٹی نے قدر سے متاثرانہ انداز میں بتایا کہ مشن کسی حد تک کامیابی سے ہمکنار ہو رہا ہے، مگر جس انداز سے وہ اسے پورا کرنا چاہتی تھی وہ نہ ہو سکا تھا، جبکہ بانو فلسطین نظر آتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مشن سو فیصد کامیاب رہا تھا۔ اسرائیلیوں کی اس آفسرز کالونی میں اتنے پیرے کے باوجود اندر داخل ہونا اور کافی حد تک تباہی پھیلنے کے بعد ایک تعمیراتی کمپنی کے ذمے دار افسر مائیکل پگل جو اسرائیلی نسلی دیوار کی تعمیر میں پیش قدمیاں کر رہا تھا۔

”مزیدی لیٹی.....! یہ تمہارا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس سے دیگر افسران، جو اسرائیل کے اس مکروہ منصوبے کی آب یاری کرتا چاہتے تھے، ان کا مورال گر گیا۔ وہ خوف کا شکار ہو گئے ہوں گے، نیز اسرائیلیوں کا یہ دعویٰ بھی باطل ثابت ہوا کہ وہ اس منصوبے کے شریک کاروں کو عمل تحفظ فراہم کر سکتے ہیں۔ جس میں وہ اب مکمل طور پر ناکام ہو چکے ہیں۔“ لیٹی کو مایوس سا دیکھ کر بانو کی طرح سامہ نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کی اور ساتھ ہی ایک خوشخبری بھی سنائی کہ فلسطینی آباد کاروں کی اسرائیلی نسلی دیوار کے خلاف تحریک بھی زور پکڑنے لگی ہے۔ اور عالمی مسلم برادری نے بھی اس کے خلاف اقوام متحدہ میں اپنا احتجاج ریکارڈ کرا دیا ہے۔ اس موقف کے ساتھ کہ یہ ظاہر اسرائیل کا یہ غاصبانہ منصوبہ حالات کو خراب ہونے سے بچاتا اور یہودیوں اور فلسطینیوں کی الگ الگ بستیوں کی تعمیر سے ان کے بیچ امن و امان کی فضا قائم کرنا ہے۔ وغیرہ۔

مگر اب یہودیوں کی یہ فریب کار چال ناکامی سے دو چار ہوئی ہے۔

لیٹی کے لیے یہ خبر امید افزا ثابت ہوئی۔ اس پر بانو نے بھی اطمینان خیال کرتے ہوئے کہا۔

”لیٹی بہن! ہماری اس تازہ کارروائی کے بعد تو اسرائیلیوں کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے جائے گی۔“ یہ باتیں ناشتے کے دوران ہو رہی تھیں، ناٹا سامہ نے ہی ان کے لیے بنایا تھا۔ جو مجبور کی روٹی، مرے اور اونٹ کے دوہ پر مشتمل تھا۔

اس دوران اچانک لیٹی کے ذہن میں گزشتہ شب والا

وہ عجیب واقعہ ابھرا، جب وہ اور بانو اپنے مشن کے لیے سامہ کے گھر کی پیشک سے روئے نہ ہو رہی تھیں اور انہوں نے گھر کے دروازے سے کسی اجنبی کو ٹھیکہ دیکھا تھا۔ پہلے تو لیٹی نے اسے کچھ خام اہمیت نہ دی تھی مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے سامہ سے بہت دھچکے لگنے میں ذکر کر ہی ڈالا تو سامہ..... یہ سن کر پہلے تو پریشان ہی ہو گئی لیکن پھر اس کا چہرہ شرم کی لالی سے گھنار ہو گیا۔ اس کی یہ ہیئت کذالی دیکھ کر بانو کے ہونٹوں پر تو معنی خیز مسکراہٹ ابھری تھی لیکن لیٹی کے چہرے پر اتنا ہمدردی کی طاری رہی۔ تب سامہ نے مارے شرماتے ہوئے بتایا کہ وہ ایک فلسطینی عرب نوجوان ابو عبید تھا، جو ان کا پردیسی بھی تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔

”لیکن سامہ بہن..... ارات کے درمیانی پہر اس کا اس طرح تم سے ملنے آنا کچھ عجیب نہیں لگتا؟“ وہ اس کا سیدھا طریقہ بھی استعمال کر سکتا ہے، یعنی تم دونوں اپنے بڑوں تک یہ بات کیوں نہیں پہنچا دیتے؟“ بھلا اس میں کیا قباحت ہے؟

اس پر سامہ کے چہرے پر ایک حسرت زدہ سی شام اتر آئی اور پھر وہ اسی لہجے میں بولی۔

”پہلے ہم نے یہی سوچا تھا، مگر میرے گھر والے اس رشتے کے خلاف ہیں۔“

”کیوں..... اس کی کوئی خاص وجہ؟“ لیٹی نے اپنی سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ وہ

جواباً ایک گہری سانس خارج کر کے بولی۔

”میرے والد اور بھائی..... ابو عبید والوں کو اچھا نہیں سمجھتے..... ان کے خیال میں یہ لوگ فلسطینیوں کے اس منہی بھر گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو..... اسرائیلیوں کے خلاف مزاحمت کے حامی نہیں ہیں..... بلکہ ان میں سے چند تو صیہونی مراعات لینے کے لیے مجاہدوں تک کی خبریاں کرنے سے بھی نہیں چوکتے، یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے۔“

”پھر تو تمہیں بھی ابو عبید سے ہر طرح کا تعلق توڑ دینا چاہیے۔“ لیٹی نے فوراً اس کی طرف دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ اور آگے بولی۔

”کیا تم نہیں جانتی ہو سامہ..... کہ ایسے لوگوں کو ہم ارض فلسطین کے نثاروں میں شمار کرتے ہیں؟“

”مزیدی لیٹی! یہ ایک غلط فہمی ہے لوگوں کی افواہ ہے۔ جو ہمارے ہی ایک رقیب کی پھیلائی ہوئی ہے۔ تاکہ یہ رشتہ نہ ہونے پائے۔ ابو عبید یا اس کے گھر والے ایسے نہیں

ہیں۔“ سامہ نے پراہٹا لہجے میں جواب دیا۔

اچانک لیٹی کے ذہن طہاش..... ایک خیال منہ لہہ بن کر ابھرا، بولی۔

”تم نے اسے ہمارے بارے میں تو نہیں بتایا؟“ لیٹی کے اس سوال پر سامہ کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے گھبراہٹ کے تاثرات ابھرتے تھے اور وہ کوئی جواب نہ دے سکی جبکہ لیٹی اور بانو اس کے تاثرات دیکھ کر جواب مل گیا۔ ٹھیک اسی وقت باہر ایک سے زائد گاڑیوں کے رکنے کی آوازیں ابھریں۔ وہ تینوں بری طرح ٹھک گئیں۔ اسی وقت ایک میکانی فون کے بتانے کی کڑبڑ آواز ابھری۔ ”لیٹی! آؤ! آؤ! خود کو ہمارے حوالے کر ڈالو۔ اس مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ ہم پانچ تک کتنی نہیں گے، اگر تم ہاتھ اوپر اٹھائے دروازے پر نظر نہ آئیں تو تم سب اس گھر کی اینٹ سے اینٹ بھاڑیں گے۔“ ایک..... دو.....

لیٹی بانو اور سامہ کے چہرے سن ہو کر رہ گئے۔ سامہ کے بڑھے ماں باپ بھی ان کے کمرے میں آ گئے، وہ بھی پریشان اور ہراساں دکھائی دے رہے تھے۔ لیٹی نے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن کے ساتھ ایک تکلیف دہ فیصلہ کیا۔ اور فوراً دروازے کی طرف لپکی۔

”لیٹی! بہن کہاں جا رہی ہو؟“ بانو اٹھ کر اسے روکنے کو لپکی تو لیٹی نے سپاٹ لکھ میں کہا۔ ”یہاں میری وجہ سے تم چار بے گناہوں کی زندگی خطرے میں ہے۔“

بہتر یہی ہو گا کہ میں خود کو..... ان کے حوالے کر دوں۔ تم گھر نہ کرو۔ میں زیادہ دیر ان یہودی غاصبوں کی قید میں نہیں رہوں گی اور ہاں..... تم فوراً یہاں سے بیستہ صفائے نکل جانا۔ فی امان اللہ۔“

بانو اسے روکتی رہ گئی لیکن لیٹی اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے دروازے پر آ گئی۔

سامنے..... اسرائیلی فوجیوں کی بھاری بھر کم گاڑیاں کھڑی تھیں اور ان کے گرد متعدد مسلح فوجی، آٹو ٹینک گئیں.....

تھکتے مستعد کھڑے تھے..... ایک یہودی فوجی افسر کے ہاتھوں میں میکانی فون تھا اور اس کے ساتھ..... شاہجہ.....

احزوت بھی موجود تھا..... کوئی نہیں جان سکا تھا کہ یہ سب کیسے اچانک ہو گیا تھا؟ کس نے خبری کی تھی کہ لیٹی اس گھر میں موجود تھی؟..... یہ صرف لیٹی ہی کے دل میں ایک بہم ہی

ٹھک تھی۔

لیٹی رشا کارانہ گرفتاری کے لیے جیسے ہی

ہیں۔“ سامہ نے پراہٹا لہجے میں جواب دیا۔

اچانک لیٹی کے ذہن طہاش..... ایک خیال منہ لہہ بن کر ابھرا، بولی۔

”تم نے اسے ہمارے بارے میں تو نہیں بتایا؟“ لیٹی کے اس سوال پر سامہ کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے گھبراہٹ کے تاثرات ابھرتے تھے اور وہ کوئی جواب نہ دے سکی جبکہ لیٹی اور بانو اس کے تاثرات دیکھ کر جواب مل گیا۔ ٹھیک اسی وقت باہر ایک سے زائد گاڑیوں کے رکنے کی آوازیں ابھریں۔ وہ تینوں بری طرح ٹھک گئیں۔ اسی وقت ایک میکانی فون کے بتانے کی کڑبڑ آواز ابھری۔ ”لیٹی! آؤ! آؤ! خود کو ہمارے حوالے کر ڈالو۔ اس مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ ہم پانچ تک کتنی نہیں گے، اگر تم ہاتھ اوپر اٹھائے دروازے پر نظر نہ آئیں تو تم سب اس گھر کی اینٹ سے اینٹ بھاڑیں گے۔“ ایک..... دو.....

لیٹی بانو اور سامہ کے چہرے سن ہو کر رہ گئے۔ سامہ کے بڑھے ماں باپ بھی ان کے کمرے میں آ گئے، وہ بھی پریشان اور ہراساں دکھائی دے رہے تھے۔ لیٹی نے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن کے ساتھ ایک تکلیف دہ فیصلہ کیا۔ اور فوراً دروازے کی طرف لپکی۔

غلطی

ایک صاحب کتابیں فروخت کیا کرتے تھے۔ ان کا نام سمیر الدین تھا۔ جب ان کا کاروبار خوب چلک گیا تو انہوں نے دکان کا بورڈ لکھوانے کی عرض سے ایک پیشتر کو بلا کر بورڈ بنانے کا آرڈر دیا۔ بورڈ پر انہوں نے لکھوایا تھا۔

سمیر الدین کتاب فروش لیکن جب وہ بورڈ لکھ کر لایا تو یہ صاحب بورڈ پر لکھے مضمون کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ پیشتر نے غلطی سے بورڈ پر جو عبارت لکھ دی تھی۔ وہ اس طرح تھی۔

کتاب الدین سمیر فروش

سنگری موقع

بج (چور سے) ”تم نے جو بری کی دکان سے زور چرائے تھے؟“

چور۔ ”جی ہاں۔“

بج۔ ”مگر کیوں..... کیا تمہیں پکڑے جانے کا ڈر نہیں تھا؟“

چور۔ ”جناب میں کیا کرتا۔ دکان کے شوکیس پر تحریر تھا۔ سنگری موقع سے فائدہ اٹھائیے۔“

وفا کیا ہے

ملا وفا وہ پھول ہے، جو محبت کے دامن میں آنے سے پہلے ہی مرجھا جاتا ہے۔

ملا وفا ایک آئینہ مل ہے۔ جو مشکل سے ہی محبت کو حاصل ہوتا ہے۔

ملا وفا وہ غزل ہے جس کا پتا محبت آج بھی ڈھونڈ رہی ہے۔

ملا وفا وہ رنگ ہے۔ جو آج کل دنیا میں نایاب ہے۔

ملا وفا وہ دل ہے جو ہر جگہ نہیں دھڑکتا۔

ملا وفا ایک ایسا آنسو ہے جو خاموشی سے چھلک جاتا ہے۔

ملا وفا وہ دامن ہے۔ جو ہمیشہ محبت کے آگے پھیلا رہتا ہے۔

ملا وفا وہ شخص راہ ہے جس پر چلنا مشکل ہے۔

انتخاب۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

چکا تا ہوں۔۔۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے چوڑے کا رخ بدلاتا تو۔۔۔ اچانک بلیک کوئین کی گھٹی گھٹی آواز ابھری۔۔۔
 ”ڈو۔۔۔ ڈارنگ۔۔۔“ وہ دیکھو۔۔۔ آئزرمن نے اس سمت دیکھا اور یکا یک اس کا پہرہ کفن کی سفیدی کا منظر پیش کرنے لگا۔۔۔ اس کے ساتھ ہی ایک دھماکا ہوا۔
 ہٹا ہٹا ہٹا

محسن اپنے ہمراہ ایک کاندھے سے فائر کرنے والا میزائل شوٹ لایا تھا۔ وہ چیخا۔
 ”میری مدد کرو۔ جلدی۔“ ساتھی اس کی جانب بڑھے۔
 محسن نے اپنی کمانڈر دکت چھت کے فرش پر گھول کر پھیلا دی۔

میزائل تین حصوں میں تھا۔ جبکہ شوٹر کے چار حصے تھے محسن نے شوٹر کے بڑے میٹنم والے فولادی بیرل کو اپنے کاندھے سے فائر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔۔۔ میزائل اس میں فٹ کر دیا گیا۔۔۔ اس کا بلاسٹنگ پوائنٹ بھی ریڈی تھا۔۔۔ ہیا حبیب اور ابن طلحہ نے محسن کو تھامے رکھا تھا۔ تاکہ میزائل فائر ہونے کی صورت میں ہونکا ٹکٹے کے باعث وہ گر نہ پائے۔

آئزرمن کا بیٹی کا پر لہجہ بہ لہجہ ان کی دم پہ خود نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ محسن نے نشانہ لے کر میزائل فائر کر دیا۔ ایک زمانے دار آواز کے ساتھ۔۔۔ دھوکے کی ایک لکیر۔۔۔ چیخے چھوڑتا ہوا میزائل۔۔۔ وائٹ کیسل کی چھت سے تیزی کے ساتھ اڑتا ہوا نکلا۔

ان ساتوں کی اب دم پہ خود سی نظریں۔۔۔ سامنے دور نقطے کی صورت میں نظر آنے والے چار پڑرجی ہوئی تھیں اور ان کی سانسیں جیسے سینوں میں اٹکی رہ گئی تھیں۔۔۔ چند سیکنڈوں بعد ہی انہوں نے اس نقطے کو پھیلنے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے فوراً اپنی آنکھوں سے دور بینیں نکالیں۔ آئزرمن ہیری۔۔۔ جو نیز اپنے چار پڑ سمیت واصل جہنم ہو چکا تھا۔ اس کے چار پڑ کے پرچے فضا میں بکھر گئے تھے۔

اگلے ہی لمحے۔۔۔ وائٹ کیسل کی چھت مجاہدین کے فخریہ بکیر سے گونج اٹھی تھی۔

چند گھنٹوں بعد، محل کرم میں یا سر العربی۔۔۔ اپنی سات جہات بردار فورس کو سہار کبادو سے رہا تھا۔

محسن اور اس کے جری ساتھی، آئزرمن ہیری جو نیز کوفہ کے گھاٹ اتارنے اور اس کی پناہ گاہ ”وائٹ کیسل“ کو تباہ کرنے کے بعد نرینگ کیپ سے ہتھیائے ہوئے

بیلی کا پٹر کے ذریعے نکل آئے تھے، البتہ وائٹ کیسل کو تباہ کرنے سے قبل یہ لوگ اس کی جسمت سے تمام ضروری۔۔۔ دستاویزات ساتھ اڑا لائے تھے۔۔۔ جس میں بیوروپوں کے مکروہ منصوبوں اور ان کی کاؤنٹر انٹیلی جنس کی تفصیلات شامل تھیں۔

غزہ کے بے بس مایوس لوگو۔۔۔

ہمیں خبر ہے کہ۔۔۔

یزید عہد رواں نے پھر سے اہتمام کر ب دہا کیا ہے ہر ایک لئے میں جانے گئی اقامتوں کو ہا کیا ہے لوبلو ہے پندار سستی خواب جیتے تھے کھو گئے ہیں

گھر کے آئینوں میں کھیلنے بچے موت کی خیزد مگے ہیں ہر سو موسم کی فضا ہے یزید عہد رواں کی دیکھو لوبلو ڈوئی یہ کربا ہے، تمہارے ہونٹوں پر لڑشیں ہیں تمہاری آنکھوں میں خواہشیں ہیں کہیں سے کوئی مسیحا آکر دست جبر و ستم کی زد سے علم و جود و جفا کی حد سے تمہیں نکالے۔۔۔ تمہیں بچالے مگر سنو۔۔۔!

تم یہ کس کے منتظر ہو؟

تمہیں یہ آخر امید کیوں ہے، یہاں تو جذبول کا قہر ہے یہاں تو احساس مرچکے ہیں جو جہنم کی انسانیت تھی ہم اس سے گزر چکے ہیں جو عہد درودل ہوا تھا اب اس کی ترسیم ہو چکی ہے جس امت سرور کا باطل کوڈر تھا

وہ فرقوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ شری آتش مروج پر ہے باغ سارے اجڑ رہے ہیں، ہم مدد سے کیا لائیں گے ہم تو آپس میں لڑ رہے ہیں۔۔۔ زمین تمہارے لبو سے تر ہے نمناک دیدہ فلک ہے یہ ظلم و جبر و جفا کی آندھی مدد و تمہاری حد تک ہے، یہ بچے جو تمہارے جل رہے ہیں

لڑتے ہوئے ہونٹوں پہ حسرتوں کے سوال سارے سسک رہے ہیں

کسی پہ کوئی اثر نہ ہوگا کہ اپنی اپنی انا کی جنگ میں ہٹا کی جنگ میں

ساری قومیں کھو چکی ہیں

یوں سمجھو کہ بے حس ہو چکی ہیں

ختم شد



ناقابل گرفت

تنویر ریاض

انسان دولت حاصل کرنے کے لیے کیسی کیسی ترکیبیں آزماتا ہے اور اسی آزمائش میں چاہے زندگی مشکلات میں بسر ہو جائے لیکن جس مقام پر بھی اسے موقع ملتا ہے انسان، انسان کو ڈسنے سے باز نہیں آتا۔۔۔ اس کی آنکھوں میں بھی بچپن سے کچھ خواب سجے تھے لیکن ایک رشتہ ایسا بھی تھا جو اسے تعبیر پانے ہی نہیں دیتا تھا مگر ایک روز۔۔۔ اس کے تمام خواب سچے ثابت ہو گئے بس ذرا دیر نہیں تھی لیکن کام سیدھا کر گئی۔

ایک محسوم کے ہاتھوں ناقابل گرفت جرم کا ارتکاب

وہ لاش کو دیکھ کر بالکل نہیں جھنجکی بلکہ ایک منٹ تک اسے دیکھنے کے بعد اس نے اپنی نظریں میرے چہرے پر جمادیں۔ شاید اسے لاش کو دیکھ کر اتنی بے گئی نہ ہوئی ہو جتنی مجھے اس کے اس طرح دیکھنے پر ہو رہی تھی۔ وہ ہمارے مقامی اسپتال کی نرس مس جولین یوک تھی۔ اس کے حسن کو بیان کرنے کے لیے خوش شکل یا خوب صورت کے الفاظ بھی کم تھے۔ مجھے پہلے بھی اس سے اتنا زیادہ قریب ہونے کا اتفاق نہیں ہوا تھا کہ اس کی روشن سبز آنکھیں دیکھ سکوں۔ اس کے سیاہ بالوں کا بڑا حصہ ہیٹ کے نیچے چھپ گیا تھا۔ اسے اپنے سامنے دیکھ کر میں وقتی طور پر بھول گیا کہ میں نے اسے کیوں بلایا تھا۔ یہ شخص اتفاق ہی تھا کہ وہ مجھ سے اتنے فاصلے پر گزر

رہی تھی کہ میری آواز اس تک پہنچ پاتی۔ میں ہل کے بیچے
چلے گی۔ میں گھڑا تھا جہاں ایک گھنٹہ پہلے کچھ سیاہ فام لڑکے
چھلی کا شکار کرنے آئے تھے۔ وہ لاش کو دیکھ کر خوف زدہ
ہو گئے اور انہوں نے وہاں سے دوڑ لگا دی۔ راستے میں
انہوں نے ایک کسان کو روک کر لاش کے بارے میں بتایا۔
اتفاق سے کچھ ہی فاصلے پر میں ایک دکان سے بچ بکس خرید
رہا تھا۔ کسان مجھے ڈھونڈتا ہوا وہاں آ گیا اور اس نے مجھے
لاش کے بارے میں اطلاع دی۔ میں نے فوراً اسٹبل کی
جانب دوڑ لگا دی تاکہ ایک گھوڑا کرائے پر لے سکوں۔
میں لاش کا جائزہ لے رہا تھا کہ میں نے اسے دو
بچیوں والی چھوٹی گاڑی پر گزرتے دیکھا جس میں ٹو جوتا ہوا
تھا۔ ایسی گاڑیاں عموماً بچے راستے پر سفر کرنے کے لیے
استعمال کی جاتی تھیں۔ برابر میں اس کا سفید بل ڈاگ کہہ
بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلاتا اور چلا شروع
کر دیا۔ پہلے کتے نے مجھے دیکھا اور بھونک کر اپنی مالک کی
توجہ میری طرف مبذول کروائی۔ اس نے بڑی احتیاط سے
گاڑی روکی اور اپنی بڑی سی ٹیلی نوٹی کو سر پر اچھی طرح
جھاتے ہوئے گاڑی سے نیچے اتر آئی۔ اس نے کتے کو وہیں
گاڑی میں رکھنے کا اشارہ کیا اور دھیرے دھیرے قدم
بڑھاتی ہوئی میری طرف آگئی۔
میں نے حلیماً اپنا ہیٹ اتار اور اس طرح گھڑا ہو گیا
کہ لاش پر اس کی براہ راست نظر نہ پڑ سکے۔ گوکہ اس کا کام
بوزھوں اور نو مولود بچوں کی دیکھ بھال کرنا تھا لیکن میں جانتا
تھا کہ بعض اوقات وہ ڈاکٹر میکونی کی پوسٹ مارٹم کرنے میں
معاذت کیا کرتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے جانتی ہوگی۔
اس کے باوجود میں نے اپنا جج دکھانا ضروری سمجھا اور
بڑے مؤدبانہ انداز میں بولا۔
"گڈ آفٹرنون مس یوک۔ جسبیں زحمت دینے کے
لیے معذرت خواہ ہوں لیکن مجھے اس وقت کسی کی مدد کی
ضرورت تھی اور تم اس کام کے لیے بہت مناسب ہو۔ شاید
یہ منکر تمہارے لیے زیادہ خوشگوار نہ ہو۔"
یہ کہہ کر میں ایک طرف ہٹ گیا۔ اس شخص کی لاش
چھتے پتھروں کے ڈھیر پر پڑی تھی جیسے کسی نے اسے اوپر
سے پھینکا ہو۔ اس کا میتھی موت اور دھاری دار قیض خون
میں بھیک گئی تھی۔ تیز ہوا چھلنے کے سبب اس کا ہیٹ بیس فٹ
دور جا گرا تھا۔ اس کی گردن اس طرح مڑ گئی تھی کہ اس کے
چہرے کا زیادہ حصہ دیکھا جاسکتا تھا۔ ہمیں یہ اندازہ لگانے
میں دیر نہیں لگی کہ اس کی گردن نوٹ گئی تھی۔

"ایسا لگتا ہے کہ یہ پرستہ شخص ہل سے بچ کر رہا ہے
یا اس نے چھلانگ لگائی ہے۔ کیا تم اسے پہچانتی ہو؟"
"ہاں۔" وہ افسردہ لہجے میں بولی۔ "اس کا نام ریٹائلڈ
فیرلے ہے۔ یہ پاسکینٹ شوپنٹی میں سفری ٹیکس میں ہے۔"
"کیا تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ یہ وہی ہے؟"
"ہاں، مجھے پورا یقین ہے شریف۔"
"میں شریف نہیں بلکہ اس کا ڈپٹی لوئیس ایشیٹ
ہوں۔" میں نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے کہا۔ "اگر
یہ ٹیکس میں ہے تو یقیناً اس کا قیام کسی ہوٹل میں ہوگا۔"
"ہاں، یہ اور اس کی بیوی ہوٹل میں رہتے ہیں۔" یہ
کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ شاید اسے فیرلے کے بیوی بچوں کا
خیال آ گیا تھا کہ وہ اس کے مرنے کے بعد کس طرح زندگی
گزاریں گے۔
میں نے سمجھتے ہوئے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ تم یہ
افسوسناک خبر اس کی بیوی کو سنا دو گی۔ ممکن ہے کہ ہمیں
فیرلے کے دوستوں اور وارثوں کو بھی مطلع کرنا پڑے۔ مجھے
اس لاش کو شہر لے کر جانا ہوگا تاکہ ڈاکٹر معائنہ کر کے اس کی
موت کا باضابطہ اعلان کرے۔ میں نہیں چاہتا کہ مسز فیرلے
کو اپنے شوہر کی موت کی خبر کسی اور ذریعے سے ملے۔ اس
بات کا امکان ہے کہ جن لڑکوں نے اس کی لاش دیکھی تھی وہ
اسے پہچان گئے ہوں اور انہوں نے اس کی اطلاع
دوسرے لوگوں کو بھی دے دی ہو۔"
اس نے اپنی بیوی سلیزیں اور بولی۔ "میں اپنی
گاڑی میں اس لاش کو لے جانے میں تمہاری مدد کر سکتی
ہوں۔ ڈاکٹر میکونی اپنے پیچھے کے پاس گیا ہوا ہے۔ اس کی
غیر موجودگی میں شریف یا مجھے اس کی موت کی تصدیق کرنے
کا اختیار ہے جبکہ شریف بھی پھوڑے کے آپریشن کے بعد
بستر پر پڑا ہوا ہے۔"
یہ بات مجھے پہلے سے معلوم تھی اس لیے کوئی حیرانی
نہیں ہوئی۔ اس نے لاش پر جھک کر گردن اور کلائیوں کو
دبایا پھر ایک رومال نکال کر فیرلے کی ناک پر رکھ دیا لیکن
وہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔
"یہ مر چکا ہے اور مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں
ہے۔ میں اس کی موت کے سرٹیفکیٹ پر دستخط کر دوں گی۔
اس کا زخم ابھی تازہ ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کو سر سے
ہوئے دو ٹکٹے سے زیادہ نہیں ہوئے۔"
یہ کہہ کر وہ اپنے کپڑے جھانٹتی ہوئی گھڑی ہو گئی اور
چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے بولی۔ "اس کی گاڑی

کہاں ہے؟"
میں نے لاش کے انداز میں کندھے اچکائے تو وہ بولی۔
"میرے کہنے کا مطلب ہے کہ یہ شخص یہاں کس طرح پہنچا؟"
مجھے سڑک کے کنارے کوئی کار نظر نہیں آئی تھی۔ اس
لے میں بھی سمجھا کہ وہ کسی گھوڑا گاڑی میں آیا ہوگا اور یوں
لگتا تھا کہ اس کا گھوڑا مالک کا انتظار کرنے کے بعد مایوس
ہو کر اپنے تھان پر لوٹ گیا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی
راستے کا اظہار کرتا، جو لین نے ہل کی جانب اشارہ کرتے
ہوئے کچھ سوچا۔ ہل پر ریل کی پٹری کے دونوں جانب اتنی
کٹھاد سڑک تھی کہ اس پر سے بہ آسانی ایک گاڑی گزر سکتی
تھی۔ اس سڑک سے مشرق کی جانب ایک راستہ نیچے کی
جانب آ رہا تھا جبکہ دوسری جانب کی سڑک ہل کی پٹری کے
ساتھ ساتھ قصبے کی طرف جارہی تھی۔
جو لین نے سنی بھا کر اپنے کتے کہہ کو بلایا اور اسے لاش
کے پاس ٹھہرنے کی ہدایت کی۔ اس کے بعد ہم دونوں کار کی
کلاش میں روانہ ہوئے۔ سڑک کے کنارے ایک پرانے ماڈل
کی بیک کھڑی نظر آئی۔ میں نے مس جو لین کی توجہ ان قدموں
کے نشانات کی طرف دلائی جو ہل کی طرف جانے والی سڑک پر
نظر آ رہے تھے لیکن وہاں کوئی ایسا نشان نظر نہیں آیا جس سے
معلوم ہوتا کہ جانے والا وہاں بھی آیا تھا۔
"مجھے میں نہیں آتا کہ اسے ہل پر جانے کی اتنی
جلدی کیوں تھی؟" وہ قدموں کے نشانات کو بغور دیکھتے
ہوئے بولی۔
"میں ہل پر کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آتی۔ دو تہائی
فاصلہ طے کرنے کے بعد جو لین کی نظر ہل کی ریٹک پر پھنسے
ہوئے ہل کھائے ہوئے دھاکوں پر گئی تو وہ چونکتے ہوئے
بولی۔ "یقیناً یہی وہ جگہ ہے جہاں سے اسے نیچے پھینکا گیا ہوگا۔"
میری نظر ریٹک کے اوپری حصے پر لگے ہوئے خون
کے چھینٹوں پر گئی تو میں نے کہا۔ "ایسا نہیں لگتا کہ اس نے
خود سے چھلانگ لگائی ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"
وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "میری محض یہ تسلیم نہیں
کرتی کہ اس نے خودکشی کی ہوگی۔ ایسا کرنے کی کوئی وجہ
سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کی گاڑی سامان سے بھری ہوئی ہے
جسے بچ کر وہ بھاری منافع کما تا۔ اس کی بیوی گھر پر انتظار
کر رہی ہوگی۔ اس نے گھڑی اور چین پکمن رکھی تھی۔ اگر
اس کا ارادہ خودکشی کرنے کا ہوتا تو کیا وہ اس طرح بچ و بچ کر
باہر نکلتا۔ اور سب سے بڑھ کر اس کے چہرے پر کتنے
والی وہ مخصوص چوٹ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود نہیں گرا

بلکہ اسے گرایا گیا ہے۔"
"بہت خوب۔" میں نے حق یہ انداز میں کہا۔ "ایک شخص
بندی سے پتھروں کے ڈھیر پر گرتا ہے تو اسے چوٹ ضرور لگے
گی۔ خواہ وہ خود چھلانگ لگے یا اسے دھکا دیا جائے۔"
"یہ میں بھی جانتی ہوں ڈپٹی۔" وہ پرستون انداز
میں بولی۔ "لیکن وہ پتھروں کا ڈھیر اونٹ کے گوبان کی
طرح ابھرا ہوا ہے جبکہ مسز فیرلے کے گل اور آنکھ کے
نیچے زخم کی نوعیت ایسی ہے جیسے کسی نے کدال نمٹنے سے
ضرب لگائی ہو۔"
میں نے پہلے اس زخم پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی
لیکن جب میں نے دوبارہ اس کے بارے میں سوچا تو مجھے
جو لین کی بات میں وزن نظر آیا۔ "گو یا تمہارا خیال ہے کہ
پہلے سے مرنے سے پہلے ہی اس کے چہرے پر ضرب لگائی
گئی تھی؟"
"ہاں۔"
"لیکن کیوں؟ اگر کوئی شخص اسے لوثنا چاہ رہا تھا تو
اس نے گھڑی کیوں چھوڑ دی اور سب سے بڑھ کر اس کی
گاڑی میں لدے ہوئے نئے جوتوں پر بھی اس کی نیت
خراب نہ ہوئی اگر وہ کوئی لٹیرا تھا تو وہ جوتوں کے ساتھ گاڑی
بھی لے جاتا۔"
اس نے کندھے اچکا دیے تو میں نے کہا۔ "تم فیرلے
کے بارے میں کیا جانتی ہو؟ اس کی کسی سے کوئی دشمنی تھی یا
اس نے کسی کے ساتھ بے ایمانی کی تھی؟"
اس نے غور سے میرے چہرے کی جانب دیکھا اور
واپس جانے کے لیے مڑ گئی۔ راستے میں اس نے کہا۔
"مسز فیرلے زیادہ تر سفر میں رہتے تھے لیکن شہر میں سب کے
ساتھ ان کے خوشگوار تعلقات تھے۔ وہ مٹی کن سے آئے
تھے جبکہ ان کی بیوی کا تعلق گھٹیل کاؤنٹی سے ہے اور ان کی
کاروباری ساکھ بہت اچھی تھی۔ یہاں تک کہ خریدنے کے
بعد اگر کسی کو جوتے پسند نہیں آتے تو وہ اس کے پیسے واپس
کر دیا کرتے تھے۔"
ہم دونوں نے فیرلے کی لاش کو ربر کی شیٹ میں لپیٹا
اور جو لین کی ٹیگر گاڑی میں ڈال کر مردہ خانے تک لے
آئے۔ وہاں لاش کی مکمل حفاظت کی جاتی... اور کسی غیر
متعلقہ شخص کی اس تک رسائی ممکن نہ تھی۔
مسز فیرلے ہوٹل کے پورنچ میں بیٹھی چھیلیں سے
دل بہلا رہی تھی۔ وہ ایک قبول صورت نوجوان عورت تھی۔ اس

نے بنیان غماشرٹ پر جیکٹ پہن رکھی تھی اور اس کی انگلی میں شادی کی سنہری انگلی بھڑک رہی تھی۔ میں نے نظریں اٹھاتا ہوا اس سے تہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہ رہی تھی۔

سبز فیرلے یہ خبر سن کر یوں اچھلی جیسے اس کے قریب ہی کوئلے کی کان میں دھماکا ہوا ہو۔ یہ ایک فیر متوقع خبر تھی جسے سننے کے بعد اس کے لیے اپنے ہوش و حواس پر قابو پانا ممکن نہ تھا۔ اسی لیے میں چاہ رہا تھا کہ جولین کچھ دیر اس کے پاس رہے۔ میں نے ان دونوں کو ہوٹل میں چھوڑا اور خود فونٹین کو لے کر مردہ خانے چلا گیا تاکہ لاش کی کچھ تصاویر لے لی جائیں اور ڈاکٹر میکونی اور شریف کو بعد میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

اسی شام جولین نے مجھے بتایا کہ سبز فیرلے نے پادری اور اس کی بیوی کے پاس جا کر اپنا غم پلکا کیا اور اب وہ ویلڈوسٹائین مقیم سبز فیرلے کے رشتے داروں کو تار دے رہے تھے کہ وہ جتنی جلد ممکن ہو سبز فیرلے کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ وہ اس وقت میرے دفتر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک سر آہ بھرتے ہوئے کہا: "جب میں نے سبز فیرلے کو گھڑی اور چین دی تو وہ کچھ کئی ہو گئی کہ اس کے شوہر کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے۔ ایک عورت کے لیے اس سے بڑا صدمہ کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے شوہر سے محروم ہو جائے جس سے وہ شدید محبت کرتی تھی۔"

"بالکل ایسا ہی ہے۔" میں نے گھا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "میں کسی جگہ میں بڑا نہیں چاہتا لیکن ہمیں یہ ضرور معلوم کرنا چاہیے کہ حادثے کے وقت سبز فیرلے اس جگہ سے کافی فاصلے پر تھی۔"

جولین نے مجھے ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھا اور بولی: "ہوٹل کے ایک باورچی گیری و اسٹیشن نے بتایا ہے کہ اس روز سبز فیرلے نے صبح کا سارا وقت ہوٹل کے کچن میں گزارا۔ وہ خیر روی رول بنانے کا طریقہ سیکھ رہی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں آرام کرنے چلی گئی۔"

"کیا سبز فیرلے ہوٹل میں ٹھہرنے والے مہمانوں کو کچن میں آنے کی اجازت دے دیتی ہے؟"

"شاید اس نے سبز فیرلے کو یہ رعایت دے رکھی ہو کیونکہ یہ جوڑا اس ہوٹل میں تقریباً ایک سال سے مقیم ہے۔"

"کیا اس نے فیرلے کے بارے میں کچھ اور بتایا؟"

"ہاں، جب ضبط کا بندھن ٹوٹ جائے تو جذبات کا سیلاب اٹھ آتا ہے۔" جولین نے اپنی ٹوپی اتار کر میز پر رکھی

تو اس کے خوب صورت بال شانوں پر لہرائے گئے اور میرے لیے اس کے چہرے پر سے نظریں ہٹانا مشکل ہو گیا۔ وہ میری محویت کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

"اس نے مجھے بتایا کہ فیرلے سے اس کی ملاقات تین سال پہلے مٹی گن میں ہوئی تھی اور کچھ ملاقاتوں کے بعد ہی فیرلے نے اسے شادی کی پیشکش کر دی۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں جھپک گئیں۔ میں سبز فیرلے کے لیے اس کی ہمدردی کو محسوس کر سکتا تھا۔

"شادی کے بعد انہوں نے مٹی گن کے بجائے یہاں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔" میں نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جو تے بنانے والی کہنی جنوب میں اپنے کاروبار کو وسعت دینا چاہ رہی تھی۔ انہوں نے سبز فیرلے کو ایک پرکشش ملازمت کی پیشکش کی تو وہ انکار نہ کر سکا۔ سبز فیرلے نے بتایا کہ وہ اپنے کام سے بہت مطمئن تھا۔"

"حیرت ہے کہ شادی کو تین سال ہو گئے اور ان کے یہاں کوئی بچہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

جولین کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ منہ بناتے ہوئے بولی: "میں نے اس سے یہ بات نہیں پوچھی۔"

"اگر ان کا کوئی بچہ ہوتا تو وہ اپنے آپ کو اتنا حیا محسوس نہ کرتی۔"

"میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ میں اس کے ساتھ ہی دفتر سے باہر آ گیا۔ میں اسے ہوٹل تک چھوڑنا چاہ رہا تھا لیکن اس نے منع کر دیا اور بولی: "آج بہت تھکا دینے والا دن تھا اور میں سمجھتی ہوں کہ تم نے اپنا کام بڑے اچھے طریقے سے انجام دیا ہے۔"

"یہی بات میں تمہارے لیے بھی کہہ سکتا ہوں۔" میں نے گھا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے کہ ایک بار پھر تمہیں چھوٹی سی زحمت دینا پڑ جائے۔" وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی، اس کی آنکھوں میں تجسس نمایاں تھا۔

"کیونکہ مس وائٹ بھی اس پل کے قریب رہتی ہے، اس لیے میں اس سے ملنا چاہتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ تمہیں اپنا دوست سمجھتی ہیں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں آج وہیں جا رہی تھی جب تم نے اشارہ کر کے مجھے بلایا تھا۔ بہر حال مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہوگی۔"

بعض وجوہات کی بنا پر میں دو روز تک اس طرف نہ

جاسکا۔ میں نے شریف کو ٹیلی فون پر اس واقعے کی اطلاع دے دی تھی اور اس کا خیال تھا کہ فیرلے کی موت ایک اتفاقی حادثہ ہے۔ میں کسی واضح ثبوت کے بغیر اس کی تردید نہیں کر سکتا تھا اور اس کے لیے مس وائٹ سے ملنا بہت ضروری تھا کیونکہ مجھے کسی ذریعے سے معلوم ہوا تھا کہ وہ دونوں بہتیں تقریباً روزانہ اس پل پر چہل قدمی کرتی ہیں۔ ممکن ہے کہ انہوں نے کچھ دیکھا ہو۔

میں نے مس لوسیا وائٹ کو ٹیلی فون پر اپنے آنے کی اطلاع دے دی تھی۔ اس وقت تک پورے قصبے میں تقریباً ایک درجن ٹیلی فون لگ چکے تھے اور ان دونوں بہنوں کو سب سے پہلے ٹیلی فون کا شکشٹ ملا تھا کیونکہ ان کی صحت خراب نہیں رہتی تھی اور ان کی رہائش بھی ایسی جگہ تھی جہاں پہنچنا آسان نہیں تھا۔

صدر دروازے پر دونوں نے میرا استقبال کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر فرار ہے تھے پھر ایک بہ فام عورت دروازے پر آئی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے اپنے سر پر ایک زرد رنگ کا رومال لپیٹ رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کے بالوں کی سفیدی کا پتا لگا تھا مشکل تھا۔ اس نے نکٹوں کو پکڑ کر ایک طرف کیا اور مجھے لے کر ہال میں چلی گئی۔ اس نے اپنا تعارف لوسیا وائٹ کی حیثیت سے کر دیا اور کہا کہ اس کی بڑی بہن ہیرل وائٹ اس واقعے کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔ لہذا ہم نے اسے سکون آور دوا دے دی ہے۔ اب شاید ہی وہ پورا دن کمرے سے باہر آ سکے۔

لوسیا اس کی سوتیلی بہن تھی اور اس کی ماں عمر میں چند ہی مہینے ہیرل سے بڑی ہوگی۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہ دونوں بہنیں اپنی جوانی کے دنوں میں چرچ میں دعائیں نعمات گایا کرتی تھیں لیکن گزشتہ چند برسوں سے انہوں نے اپنے آپ کو گھر کی چار دیواری تک محدود کر لیا تھا کیونکہ ہیرل اور لوسیا اعصابی سرینہ بن چکی تھیں لیکن قصبے کے لوگوں سے ان کا رابطہ تھا اور ڈاکٹر میکونی بھی ٹیلی فون پر ان کی خیریت پوچھتا رہتا تھا۔ قصبے کی بوڑھی عورتیں بھی اس سے ملنے آتی رہتی تھیں۔ دونوں بہنیں باقاعدگی سے قصبے میں تین میل تک پیدل چلتی تھیں۔

میں نے اس چہل قدمی کے بارے میں پوچھا تو وہ بولی: "مجھے چہل قدمی کا اتنا شوق نہیں جتنا میری بہن کو ہے لیکن ڈاکٹر میکونی کا کہنا ہے کہ یہ ورزش ہمارے لیے فائدہ مند ہے لہذا میں بھی کبھار اس کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔"

مگر اس کی رفتار کم ہوتی ہے اس لیے میں اسے منع نہیں کرتی۔ بعض اوقات وہ اسے گھر کام کرنے والی ٹوکی ایرس اس کے ساتھ چلی جاتی ہے۔"

"پھر بھی تین میل کا فاصلہ طے کرنا ایک بوڑھی عورت کے لیے کافی تکلیف دہ ہے۔"

"ضروری نہیں کہ وہ پورا راستہ پہل ہی چلے۔ کبھی ہماری کوئی پڑوسی اسے سواری کی پیشکش کر دیتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ دیکھنے کے لیے اسٹیشن چلی گئی کہ ٹرینوں کے اوقات میں کوئی تہیہ نہیں ہوئی۔"

وہ میری طرف بھیجی اور قدرے آہستہ آواز سے بولی: "اس نے ایک دفعہ مجھے بتایا تھا کہ وہ وہاں جنگ میں مرنے والوں کی فہرست دیکھنے جایا کرتی تھی لیکن یہ پرانی بات ہے اور وہ ابھی تک اپنے ماضی سے جڑی ہوئی ہے۔ پرانی یادیں آج بھی اس کے ذہن سے چپکی ہوئی ہیں اب وہ وہاں ٹرینوں کے اوقات دیکھنے جاتی ہے۔ میں نے اسے ایک چھوٹی سی بیبی گھڑی لے کر دی ہے جس کا جنرل دبانے سے گھنٹوں کی سرخی جھونک رہی رہتی ہے اور اگر ٹرین کے آنے کا وقت ہو تو وہ پل پر نہیں جاتی۔"

"لیکن وہ سن نہیں سکتی پھر یہ گھڑی اس کے کس کام میں ہے؟"

مس لوسیا نے ہلکا سا قبضہ لگا دیا اور بولی: "ہاں وہ سن نہیں سکتی لیکن ہر پندرہ منٹ بعد گھڑی میں ہونے والی تھر تھر اہٹ سے اسے وقت کا پتا چل جاتا ہے۔ جب ایک حس ناکارہ ہو جائے تو دوسری کام کرنا شروع کر دیتی ہے۔"

"تم دونوں کے درمیان گفتگو کس طرح ہوتی ہے؟"

"ہم ہاتھ کے اشارے اور چھوٹی چھوٹی پرچیوں کے ذریعے کام چلاتے ہیں۔ اسے بولنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی اور وہ اپنا مطلب آسانی بیان کر سکتی ہے۔"

"کیا پرسوں بھی وہ گھر سے باہر گئی تھی؟"

مطلب ہے جس دن پل پر یہ حادثہ پیش آیا؟

"وہ معمول کے مطابق نو بجے گھر سے نکلی۔ میں نے ہمیشہ کی طرح اس کی گھڑی میں چابی بھری کیونکہ صبح کے وقت اس کی انگلیاں پوری طرح حرکت نہیں کرتیں اور وہ خوشگوار موڈ میں اپنے راستے پر چل دی۔"

"وہ گھر کب واپس آئی تھی؟"

"ہمیشہ کی طرح دوپہر کے کھانے پر ٹھیک ساڑھے بارہ بجے۔ میرا خیال ہے کہ جب تک گھنٹے کی وجہ سے وہ وقت کی پابند ہوئی ہے اور اسے گھڑی دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"کیا اس نے راستے میں کوئی غیر معمولی بات دیکھی

اور گھر پہنچ کر تمہیں اس کے بارے میں کچھ بتایا؟
 "نہیں البتہ وہ معمول سے زیادہ جھکی ہوئی لگ رہی تھی لیکن یہ کوئی ایسی قابل غور بات نہیں کیونکہ اس کی عمر اسی برس سے زیادہ ہے اور میں یہ توقع نہیں کر سکتی کہ وہ کسی کھلاڑی کی طرح چاق و چوبند نظر آئے۔"

اچانک ہی راہ واری میں سیاہ کپڑوں میں ملبوس ایک سایہ نمودار ہوا۔ اس سے پہلے کہ لوسیا اپنی بہن کے استقبال کے لیے اٹھتی وہ فوراً ہی نظروں سے اوجھل ہو گئی لیکن میری نظریں کافی دیر تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ اس کا لباس ہاتھ دروازے کی چوکھٹ پر تھا اور میں نے دیکھا کہ اس کی انگوٹھی والی انگلی غائب تھی۔

"تم کچھ خیال نہ کرنا۔" لوسیا معذرت خواہانہ لہجہ میں بولی۔ "وہ آج اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے شاید اسی لیے اس نے تم سے ملنا پسند نہیں کیا۔"

"معذرت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں مزید کچھ نہیں پوچھوں گا۔ صرف اتنا بتا دو کہ کیا تم مسز فیئرلے کو پہلے سے جانتی تھیں؟"

"مجھے یاد پڑتا ہے کہ گزشتہ موسم خزاں میں اس سے ریلوے اسٹیشن پر ایک بار ملاقات ہوئی تھی۔ میرے ایک جاننے والے مسز میک نے ان کے جوتوں کی بہت تعریف کی تھی اور ان سے ہمیں متعارف کروایا تھا لیکن مسز میک کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم دونوں بہنیں اپنے جوتے خصوصی آرڈر پر اٹلانٹا سے بنوائی ہیں۔ بہر حال اس بہانے مسز فیئرلے سے ملاقات ہو گئی۔"

ایک بار پھر میں نے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنی تو دل چاہا کہ کسی اسکول کے طالب علم کی طرح دوڑتے ہوئے ان قدموں کا تعاقب کروں لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے یہ ارادہ ترک کرنا پڑا جب میں نے دیکھا کہ ایک سیاہ قلم عورت اپنی پیٹھ پر کپڑوں کی بالٹی لاوے مکان کی طرف آ رہی ہے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔ اس نے میری طرف حیرت سے دیکھا تو میں نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم کافی عرصے سے یہاں کام کر رہی ہو؟"

یہ کہہ کر میں نے کوٹ کی جیب سے ایک چاندی کا سکہ نکالا اور اس کی اٹھیلی پر رکھ دیا جسے اس نے جلدی سے اپنے لباس کی آستین میں چھپالیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "میرا نام ارس واٹسن ہے اور میرا خاندان تین نسلوں سے یہاں ملازم ہے۔ میں جب یہاں آئی تو مس لوسیا کے والد

زندہ تھے اور مس بیرل بھی درمیانی عمر پہنچ چکی تھیں۔"
 "کیا تم بتا سکتی ہو کہ مس بیرل کی ایک انگلی کیسے ضائع ہوئی؟"
 "مس بیرل کی زندگی انگوٹھوں سے بھری ہوئی ہے۔ ان کی دوسری شادی ہوئی۔ ان کا پہلا شوہر جنگ کے پہلے سال ہی مارا گیا جبکہ دوسرے کا انتقال اس کے آخری برس میں ہوا۔ ان کے دو بچے بھی ہوئے۔ ایک تو مردہ حالت میں پیدا ہوا تھا جبکہ دوسرا نمونے سے ہلاک ہو گیا۔ مجھے تو ان کے نام بھی معلوم نہیں۔ اب تو لوگ بھول چکے ہیں کہ کبھی ان کی شادی بھی ہوئی تھی۔ ان کے پاپا کے انتقال کے بعد لوگوں نے دونوں بیٹوں کو کس کہنا شروع کر دیا۔ جہاں تک انہی ضائع ہونے کا تعلق ہے تو مس لوسیا نے مجھے بتایا کہ ایک بھگنڈے امریکی فوجی نے مس بیرل سے ان کی شادی کی پیرے والی انگوٹھی چھیننے کی کوشش کی تھی اور جب انہیں انگوٹھی اتارنے میں دیر ہوئی تو اس نے ان کی انگلی ہی کاٹ دی۔ اس حادثے کے باوجود وہ مطمئن زندگی گزار رہی ہے۔ مس بیرل کے پاس اپنا پھولوں کا باغ اور گراموفون ہے۔ کوہہ سن نہیں سکتی لیکن کبھی کبھی اسے چلا کر خوش ہولیتی ہے۔ اکثر اسے طویل فاصلے طے کرنے کے لیے چمڑی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اب بھی وہ دوسری بوڑھی عورتوں سے بہتر نظر آتی ہے۔"

"مس لوسیا کیا کرتی ہے؟" میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔
 "وہ مس بیرل کی دیکھ بھال کرتی ہے جس طرح پہلے اپنے باپ کی کیا کرتی تھی۔"

"کیا واقعی لوسیا کی شادی نہیں ہوئی؟"
 "جہاں تک میں جانتی ہوں، میں نے اس کے علاوہ کوئی بات نہیں سنی۔"
 "بہت بہت شکریہ۔ ایک بات اور۔ کیا تم گزشتہ روز یہاں آئی تھیں جب مس بیرل باہر گئی تھی؟"
 "نہیں، میں گھر پر اپنے شوہر کے ساتھ کام کر رہی تھی۔" میں نے اس کے چہرے پر بیزاری کے آثار دیکھے تو مزید کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور اس کے راستے سے ہٹ گیا۔

☆ ☆ ☆
 مجھے بہت زیادہ امید نہیں تھی کہ جولین میرے بلاوے پر پٹنگ منانے چلی آئے گی۔ بہر حال میں اپنی طرف سے پوری تیاری کر کے آیا تھا۔ میں نے ریلوے اسٹیشن سے دوپٹے باکس خریدے۔ ہر ایک میں فرمائند چکن کے دو ٹکڑے، دو گوشت کے پارچے، بسکٹ، سیب، الجا ہوا

ایٹ اور ایک ٹیک کا ٹکڑا موجود تھا۔ گئی بات تو یہ ہے کہ میں اکثر دوپٹے باکس خریدتا اور خود ہی کھا جاتا۔ میرے کام کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ بارادوں گھومنے پھرنے میں گزار جاتا اور بہت کم دوپٹوں میں ڈھنگ سے کھانا کھانے کا موقع ملتا تھا۔ اس کی آمد میرے لیے بہار کے تازہ مچوگے سے کم تھی۔ اس نے بہت خوب صورت سبز رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور سر کے بال بھی ٹوپی کی قید سے آزاد تھے۔ میں نے فرش پر ایک سفید کپڑا بچھایا اور کھانے کی چیزیں اس پر رکھ دیں۔ جولین اپنے ساتھ گھر کے بنے ہوئے سینڈویچ لائی گئی جن کے ساتھ مسالے والے نمائز اور اٹلی ہوئی پھلیاں تھیں۔ کھانے کے بعد ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا یعنی کہ میرے دادا جنگ ختم ہونے کے بعد مسوری سے یہاں آئے تھے۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں جس میں دو بڑاواں ہیں۔ اس کی تین بہنیں ہیں اور اس نے نرس بننے کا فیصلہ کھارابرٹن کو دیکھ کر کیا جس نے اپنی زندگی سیلاب سے متاثرہ پناہ گزینوں کی امداد کے لیے وقف کر دی تھی۔ باتوں کے درمیان وہ کئی مرتبہ اتنے قریب آ گئی کہ میرے لیے اپنے جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا تاہم میں کسی عملی جگہ پر کوئی ناشائستہ حرکت نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی وہ اسے گوارا کرتی۔ اس کے باوجود یہ ملاقات بڑی خوشگوار رہی اور میں ایک سرد درمیانگ شخص کی طرح گھرواپس آ گیا۔

دوسرے دن مجھے پیغام ملا کہ مس بیرل وائٹ رات کسی وقت سوتے میں انتقال کر گئی اور یہ کہ میں فوراً وہاں پہنچوں۔ میں نے جلدی جلدی شیو بنا کر لباس تبدیل کیا اور وقت ضائع کیے بغیر وہاں پہنچ گیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ مس لوسیا غم و اندوہ کی تصویر بنی لاش کے پاس بیٹھی ہوگی لیکن یہ دیکھ کر خاصی مایوسی ہوئی کہ وہ باہر صحن میں کھڑی مردہ خانے کے منتظم سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے سیاہ سلنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور اس کی تراش خراش دیکھ کر اندازہ لگا یا جاسکتا تھا کہ اس نے اس موقع کے لیے یہ لباس پہلے سے تیار کر دیا تھا۔

وہ مجھے اوپری منزل پر واقع ایک کمرے میں لے گئی جہاں مس بیرل کی لاش ایک بے جان مجسمے کی طرح بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے اور سر کے گرد و مال لپٹا ہوا تھا جبکہ بقیہ جسم پر لینن کی چادر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے سرسراہٹ اور چہرہ پر اہٹ کی آوازیں سنیں تو سمجھ گیا کہ مس جولین پہلے سے وہاں موجود تھی۔ میں نے نظریں گھما کر ادھر ادھر دیکھا تو وہ ایک

لوٹے میں اس طرح بیٹھی ہوئی تھی کہ کسی کو نظر نہ آ سکے۔ میں نے اسے دیکھ کر سر کو غیف سی جنبش دی اور دوبارہ لاش کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں چند سینڈویچ نکال کر غصا موش غزار ہا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایسے موقع پر کیا کیا جاتا ہے۔

مس لوسیا نے میرا مسئلہ اس طرح حل لیا کہ وہ میرے اور جولین کے درمیان ٹھنڈی ہو گئی اور بولی۔ "میں تمہاری ممنون ہوں کہ یہاں آئے اور میرے غم میں شرکت کی۔ میرے دل پر ایک بوجھ ہے اور میں اسے ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ہم دونوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ہونٹوں پر اس طرح انگلی رکھ لی جیسے ڈر ہو کہ نہیں مس بیرل کی روح اس کی باتیں سن کر واپس نہ آ جائے۔

وہ ہمیں لے کر ایک نسبتاً آراستہ کمرے میں آئی اور ہمیں ان کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا جن پر گلابی ٹیکل چڑھا ہوا تھا۔ وہ خود ایک عام سی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"میری کچھ میں نہیں آ رہا کہ بات کس طرح شروع کروں۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "گزشتہ رات سونے سے پہلے میری بہن نے مجھے ایک خوف ناک راز میں شریک کیا تھا۔ غالباً وہ جان گئی تھی کہ اس کا آخری وقت قریب آن پہنچا ہے۔ میں یہ اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ تمہیں بھی اس سے آگاہ کر دوں۔ مسز لوئیس اٹم قانون کے رکھوالے ہو جبکہ مس جولین ہم دونوں بہنوں کی فرشتہ صفت نرس اور ہمارا رشتہ ہیں اس لیے چاہتی ہوں کہ تم دونوں کو بھی اس حقیقت کا پتا چل جائے۔"

ہم دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کون سا خوف ناک راز ہو سکتا ہے۔ کمرے میں کچھ دیر سکوت طاری رہا پھر اس کی بھاری آواز میری سماعت سے گزرائی۔ "میری بہن مسز فیئرلے کی موت کی ذمہ دار ہے۔"

مجھے لگا کہ بہن کی موت کے صدمے کے سبب اس کا ذہن متاثر ہوا ہے اور وہ اول فول بولے جا رہی ہے لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے پہلے کے مقابلے میں صاف اور بھاری آواز میں کہا۔ "اس نے اپنی چمڑی سے ان پر حملہ کیا اور انہیں ہل کی ریٹنگ پر سے گرتے ہوئے دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ ان کی موت واقع ہو گئی۔ اسے اپنے اس عمل پر ایک منٹ کے لیے بھی پچھتاوا نہیں ہوا۔"

ہم دونوں کی زبان سے بیک وقت نکلا۔ "لیکن اس نے ایسا کیوں کیا اس وائٹ؟"

"مسز فیئرلے نے ٹرین کے آنے کی آواز سن لی

ہوگی اور انہوں نے دیکھا ہوگا کہ میری بہن ہل کی پٹری پر چل رہی ہے۔ انہوں نے چلا کر اسے غصے سے آگاہ کرنے کی کوشش کی اور وہ اس کی جانب دوڑے تاکہ کھینچ کر پٹری سے دور کر سکیں۔

جولین نے قیاس آرائی کرتے ہوئے کہا: "میرا یہ خیال ہے کہ مس بیرل کو غلط فہمی ہوگئی اور وہ مسز فیئر لے کو اپنی جانب آتا دیکھ کر خوف زدہ ہوگئی ہوگی۔"

مس لوسیا عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی: "وہ حافی بھی کہہ کر رہی ہے۔"

"میں کچھ بھی نہیں مادم؟" جولین چوکتے ہوئے بولی۔
"ممکن ہے کہ اس کا ارادہ مسز فیئر لے کو قتل کرنے کا نہ ہو اور اس نے اپنے دفاع میں ایسا کیا ہو۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اس نے مسز فیئر لے کو قتل کیا لیکن کیوں؟ وہ تو اسے ٹھیک طرح سے جانتی بھی نہ تھی؟"

"میری بہن کو معلوم تھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مس بیرل کو اس سے کیا خطرہ تھا؟"

"جب میری بہن نے مڑ کر دیکھا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی جانب کھینچنے کی کوشش کر رہا ہے تو اس نے پوری قوت سے مسز فیئر لے پر چھڑی سے حملہ کر دیا۔"

"کیا تمہارے کہنے کا مطلب ہے..."
وہ میری بات کا منہ ہوتے ہوئے بولی: "تم جو بھی سمجھو لیکن میں نہیں سمجھتی کہ وہ جسمانی طور پر اپنی طاقتور تھی۔ یقیناً اس نے اپنے کمزور جسم کی پوری قوت جمع کر کے حملہ کیا ہوگا جس سے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور ہل کی ریلنگ پر جا گرا۔ میری بہن کا کہنا تھا کہ وہ یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ کوئی آوارہ شخص اس کے جسم کو ہاتھ لگائے۔ چاہے وہ ٹرین کے نیچے ہی کیوں نہ آجاتی۔"

مس لوسیا کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کسی تھیز میں اسٹینچ پر کھڑی مکالمے ادا کر رہی ہو۔ اس نے اپنے لہجے میں جوش پیدا کرتے ہوئے کہا: "میری بہن نے بتایا کہ سر پر چھڑی کی ضرب کتنے سے وہ لڑکھڑایا اور اس نے اپنا ہیٹ سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس اثنا میں میری بہن نے اس پر ایک اور وار کر دیا۔ وہ اس حملے سے نہ سنبھل سکا اور ہل کی ریلنگ پر جا گرا۔ اس کی اونچائی بہت کم ہے اور اس کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔ جب ٹرین ہل پر سے گزر گئی تو میری بہن

ایک ستون کا سہارا لیے نیچے کھائی کی تہ میں دیکھ رہی تھی جہاں فیر لے بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔"

میرا ارادہ مس لوسیا کی بے عزتی کرنے کا نہیں تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ ڈرامائی انداز میں بول رہی ہے۔ اس نے میرے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا کہ میں نے اس کی باتوں پر یقین نہیں کیا۔

"میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ یہ بالکل سچ ہے۔" وہ محسوس لہجے میں بولی: "میری بہن بار بار کہہ رہی تھی کہ اس نے اپنے تمام حسابات عمل کر دیے ہیں۔ اس کے بعد وہ گوما میں چلی گئی۔ میرے والد کا انتقال بھی اسی طرح ہوا تھا۔ تب میں نے مس جولین کو پیغام بھیجا کہ وہ میرے پاس آجائے۔ اس نے ہر مشکل وقت میں ہمارا ساتھ دیا ہے اور اس کے آنے سے مجھے بڑی ڈھارس ہوتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بولی: "کیا تم لوگ کافی پینا پسند کرو گے؟"

اس سے پہلے کہ ہم کچھ کہتے، وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھ گئی لیکن چوکت پر پہنچ کر وہ مڑی اور بولی: "میں محسوس کر رہی ہوں کہ مجھے بھی اپنی ایک چھوٹی سی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہیے دراصل اس روز میں بڑی بہن کے ہاتھ پر گھڑی باندھنا بھول گئی تھی۔ میں سمجھ رہی تھی کہ اسے گھڑی پہنا چکی ہوں لیکن میں نے اس بارے میں صرف سوچا تھا، عمل نہیں کیا تھا۔ بعد میں جب مجھے خیال آیا تو وہ جا چکی تھی۔ اگر اس کے ہاتھ میں گھڑی ہوتی تو اسے ٹرین کے گزرنے کے وقت کا پتا ہوتا اور وہ ہل پر نہ جاتی اور نہ ہی مسز فیئر لے اس کی مدد کے لیے آگے بڑھتے اور نہ ان کی جان جاتی۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے۔"

میں نے اپنی پوری زندگی میں کسی خاص موضوع پر اتنی دیر تک گفتگو نہیں کی تھی۔ مجھے کمرے میں ٹھنکن کا احساس ہونے لگا تو میں تازہ ہوا میں سانس لینے کی خاطر باہر آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو جولین، مس لوسیا کا ہاتھ تھامے ہوئے کہہ رہی تھی کہ اسے اپنے آپ کو کسی عذاب میں مبتلا کرنے کی ضرورت نہیں۔

"میں اس کی ضرورت پوری کرنے میں ناکام رہی۔" مس لوسیا نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: "یہ گھڑی ہمیشہ مجھے پریشان کرتی رہے گی۔"

جولین نے موضوع بدلنے کی خاطر کہا: "میرا خیال ہے مس لوسیا کہ اب تمہیں اتنے بڑے مکان میں رہنے کی ضرورت نہیں۔"

"اب تم نے یہ ذکر چھیڑ دیا ہے تو میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ مجھے ہمیشہ سے ہی سفر کرنے کی خواہش رہی ہے۔ میں براؤ سے جانا چاہتی ہوں۔"

"تم کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے حیرت سے کہا۔
"مجھے ہمیشہ سے ہی براؤ دے کے ڈرامے دیکھنے کی خواہش تھی۔ میں جانتی ہوں کہ اس عمر میں یہ احقانہ خواہش بھیجے جانے کی لیکن مرنے سے پہلے ایک سربہ لوگوں کے درمیان بیٹھ کر ان ڈراموں سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہوں۔"

اس نے ہم دونوں کے چہروں کے تاثرات پڑھ لیے اور بات بدلتے ہوئے بولی: "میں چاہتی ہوں کہ میری بہن کی تجویز و تعلیم پورے وقار اور احترام کے ساتھ انجام پائے۔ میں نے ساری زندگی اس کے سامنے زبان نہیں کھولی حالانکہ کئی بار میرے ہونٹوں پر یہ یارک کا نام آیا لیکن ادا نہیں کر سکی۔ میں نے اپنی تمام خواہشات کو دبا رکھا تھا لیکن اس کے مرنے کے بعد اپنے آپ کو آزاد محسوس کرنے لگی ہوں اور میری ساری خواہشیں دوبارہ زندہ ہوگئی ہیں۔"

☆ ☆ ☆
واپس کا سفر خاموشی سے گزرا۔ جولین مجھ سے بالکل چپک کر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا یا بے دھیانی میں قاصدہ رکنا بھول گئی۔ ٹھیک رفقار قدر سے آہستہ تھی۔ شاید وہ بھی ہمیں زیادہ سے زیادہ وقت ساتھ گزارنے کا موقع دینا چاہ رہا تھا۔ اچانک ہی وہ میری طرف کھوی اور اتنا قریب آگئی کہ اس کے بالوں کی لٹیس میرے چہرے کو چھونے لگیں۔ وہ سرگوشی کے انداز میں بولی:

"ڈینی ایشیٹ! کوئی بات مجھے مسلسل پریشان کر رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا اظہار کس طرح کروں؟"

میں نے ناامیدی سے اس کی طرف دیکھا اور بولا: "کیا تم مجھے صرف لوسیس کہہ کر مخاطب نہیں کر سکتیں جبکہ ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں۔"

اس نے میرے احتجاج کو نظر انداز کر دیا، بولی: "یقین جانو، میں نے بھی اتنی بری بات نہیں سوچنی۔"

"جو کچھ سوچ رہی ہو، وہ کہہ ڈالو۔ شاید پھر وہ بات اتنی زیادہ بری نہ لگے۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ مس لوسیا واقعی مس بیرل کے ہاتھ پر گھڑی باندھنا بھول گئی تھی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نے بان بوجھ کر ایسا کیا ہو۔ وہ جانتی تھی کہ مس بیرل کو ٹرینوں کی آمد و رفت کے اوقات زبانی یاد ہیں اور وہ تقریباً روزانہ ہی

اسٹیشن جا کر معلوم کیا کرتی تھی کہ کہیں اس میں کوئی تبدیلی تو نہیں ہوئی۔ وہ بہری ہوئی کے ٹرین کی آواز نہیں سن سکتی تھی اس لیے گھڑی کی مدد سے وہ ٹرین کے گزرنے کے وقت کا اندازہ لگا لیتی تھی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ مس لوسیا نے ایک منصوبے کے تحت اس کے ہاتھ پر گھڑی نہ باندھی ہوتا کہ اسے وقت کا اندازہ نہ ہو اور وہ ٹرین سے ٹکرا جائے۔ آخر وہ کب تک اس کی دیکھ بھال کر سکتی تھی، کب تک اپنی خواہشات کا کھانا کھوتی جبکہ ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ مس بیرل کو بڑھاپے کے علاوہ اور کوئی بیماری نہیں اور کافی عرصے تک اس کے زندہ رہنے کا امکان ہے۔"

وہ میرے اتنے قریب تھی کہ میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے پہلو سے لگاتے ہوئے بولا: "مس لوسیا کو یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ اس کی ساری دولت سمیٹ کر خاموشی سے شمال کی جانب نکل جاتی اور بقیہ عمر وہاں رہ کر ٹھیکر کے ڈرامے دیکھ کر لطف اندوز ہوتی رہتی۔"

جولین نے اپنا چہرہ میرے قریب کر لیا۔ ایک بار پھر اس کے بالوں کی لٹ میری مونچھوں کو چھونے لگی۔ اس کے چہرے پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ ابھری اور وہ سرشاری کے عالم میں بولی: "تم بھی بالکل بدحوہ میرے ڈہنی۔ وہ دولت کتنے عرصے اس کا ساتھ دیتی لیکن اب وہ اپنی بہن کے ترکے کی واحد وارث ہے۔ اس کے حصے میں یہ عالی شان مکان اور پھلوں کا باغ بھی آیا ہے۔ اگر وہ مکان بیچ دے تب بھی پھلوں کے باغ کی آمدنی سے ساری عمر عیش کر سکتی ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا: "لیکن ہم مس لوسیا کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔ بہن کے ہاتھ پر گھڑی نہ باندھنا کوئی جرم نہیں ہے۔ اظہار مس بیرل ہی فیئر لے کی موت کی ذمہ دار ہے۔ اگر وہ اس پر چھڑی سے حملہ نہ کرتی تو وہ ہل سے نیچے نہ گرتا۔ اس کیس کو داخل دفتر ہی سمجھو اور کسی سے اس بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، جو ہوتا تھا وہ ہو چکا۔"

"ہاں، شاید ان دونوں کی موت اسی طرح نکلی تھی۔" وہ سرد آہ بھرتے ہوئے بولی پھر اس نے میرے سینے پر سر رکھتے ہوئے کہا: "اور جو کچھ اب ہو رہا ہے؟"

"اسے بھی تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لو۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔



سفید پوش

ملک صغیر حیات

محبت شرمنا کوئی حرم نہیں لیکن اس نے حصول کے لیے حوائج ڈال دیں۔
 نامہ اہل عالمی ہوتا ہے اور اسمی لیے محبت جیسا پائیزہ جذبہ دنیا کی نگاہ میں
 شوم اور ذلت کا احساس بن کر رہ جاتا ہے... اگرچہ وہ بھی ایک وفادار ملک
 حواری تھا لیکن جانے کیسے اتنی ہمت کی جانب چل دیا کہ جس کے ہر قدم پر
 رسوائی اور ذلت کی کیچڑ بکھری ہوئی تھی جبکہ اس وقت اس پر تو جیسے مس عشق
 کی وحشت سوار تھی اور یہ گہراہت کہ اگر ابھی کچھ نہ کر سکا تو کبھی کچھ نہ
 کر سکے گا لہذا اس جنونی عاشق نے سردی کی بازی لگادی مگر احساس کہ نہ سر
 ہلندی سے اٹھا سکا اور نہ دھڑمزل کی جانب جاسکا۔ کیونکہ نیت میں کیوٹ ہو تو
 حقیقی جوشی دور کھڑی مسکراتی ہے اور جب محافظ ہی غاصب بن جائے تو دنیا
 کے ہر شے سے اعتبار ختم ہو جاتا ہے... اس پر بھی بہت مشکل سے یقین آیا تھا
 اور جب آگیا تو ہر چہرے میں لٹیروں کی چٹک نظر آنے لگی... اس دھندلے
 منظر کو ملک صغیر حیات نے اس طرح شفاف طریقے سے واضح کیا کہ
 ہر چہرے سے نقاب الٹ گئی۔

دل کے ہاتھوں مجھ کو اپنی چادر سے پاؤں نکالنے والے ایک
 سرخبرے عاشق کی دلیری

”خیریت نظر تو نہیں آ رہی جناب۔“ کانیشیل نے
 جواب دیا۔ ”ان کے ساتھ چار پانچ افراد بھی ہیں۔ سننے
 میں آیا ہے کہ پچھلی رات ان کی حویلی میں کوئی بڑی گزبڑ
 ہوئی ہے۔“
 ”بڑی گزبڑ؟“ میں نے کانیشیل کے الفاظ کو
 دہرایا اور کہا۔ ”ٹھیک ہے، چودھری قادر علی کو فورا میرے
 پاس بھیج دو۔“
 ”جو حکم ملک صاحب!“ کانیشیل مجھے سپاہت کرنے
 کے بعد کمرے سے نکل گیا۔
 تھوڑی دیر کے بعد چودھری قادر علی میرے
 سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ آنے والے
 افراد کو باہر برآمدے ہی میں چھوڑ دیا تھا جس سے دو

اپریل کی کوئی تاریخ تھی۔ میں تھانے میں بیٹھا
 روزمرہ کے کام شمار ہاتا تھا کہ مجھے بتایا گیا، چودھری قادر علی
 مجھ سے ملے آیا ہے۔
 قادر علی سے میری پہلے بھی دو تین ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔
 وہ جس آباد کا چودھری تھا۔ جس آباد میں یہ گاؤں میرے تھانے
 سے شرق کی سمت، ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ ”جس
 آباد“ کا نام چودھری قادر علی کے دادا مرحوم جس ملی کے نام پر
 رکھا گیا تھا مگر یہ گئے وقتوں کا قصہ ہے۔ اب تو قادر علی کا والد
 قادر علی مرحوم ہو چکا تھا اور خود قادر علی بھی میری معلومات کے
 مطابق، پچاس کا ہندسہ عبور کر چکا تھا۔
 ”چودھری قادر خیریت سے آیا ہے نا؟“ میں نے
 اطلاع دینے والے کانیشیل سے استفسار کیا۔

ہاتھیں ظاہر ہوتی تھیں۔ نبر ایک، اس کے ہمراہ آنے والے لوگ غیر اہم تھے۔ نبرد، معاملہ خاصا سمجھتا تھا۔ ویسے چودھری کی حالت سے بھی یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ حالات چودھری کے قابو میں نہیں ہیں ورنہ وہ یوں افراتفری کے عالم میں خود تھانے آنے کے بجائے اپنے کسی بندے کو بھیجتا۔ اگلے ہی لمحے اس نے میرے اندازے کی تصدیق بھی کر دی۔

”ملک صاحب!“ وہ پریشان لہجے میں بولا۔ ”بچھلی رات ڈاکوؤں نے میری حویلی میں گھس کر قیامت برپا کر دی ہے۔ وہ۔۔۔ وہ میری جوان بیٹی نورین کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔“

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں چودھری صاحب؟“

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“ چودھری نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بتایا۔ ”ایک ٹٹے کے بعد نورین کی شادی تھی۔ ڈاکو نورین کے ساتھ تمام طلائی زیورات اور قیمتی ملبوسات کا بھی صفایا کر گئے ہیں۔ جس سوٹ کیس میں یہ سامان رکھا ہوا تھا، وہ کمرے سے غائب ہے۔“ اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”ملک صاحب! یہ بہت ہی حساس اور سنگین معاملہ ہے، اسی لیے میں خود چل کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ آج جمعہ ہے۔ اگلے جمعے کو نورین کی رخصتی ہے۔ آپ کو کسی بھی قیمت پر اگلے جمعے سے پہلے نورین کو واپس لانا ہے ورنہ میری ناک کٹ جائے گی۔ میری عزت اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔“

مجھے اس تھانے میں تعینات ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن میں چودھری قادر علی کے بارے میں جتنا بھی جانتا تھا، اس کی روشنی میں وہ روایتی ”چودھری برادری“ سے بہت کر ایک صلہ جو، امن پسند اور سودو نمائش سے عاری شخص تھا۔ اس کی حویلی میں اتنا بڑا واقعہ پیش آ گیا تھا اور وہ اپنی مٹوی بیٹی کی واپسی کے لیے مجھ سے منت کر رہا تھا۔ اس کی جگہ اگر کوئی روایتی چودھری ہوتا تو اب تک پورے گاؤں ہلکے ارد گرد کے گاؤں کی بھی ایسی کم تھیں گر چکا ہوتا۔ تھانے وہ بعد میں آتا۔ پہلے وہ اپنی جاگیردارانہ طاقت کو آزمانے کی کوشش کرتا۔

میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”آپ فکر نہیں کریں چودھری صاحب۔ ایک ہفتہ تو بہت بڑا عرصہ ہے،

میں آپ کی بیٹی کو ایک دو دن ہی میں ڈھونڈ نکالوں گا مگر۔۔۔“

”مگر کیا ملک صاحب؟“ وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

”مگر یہ کہ۔۔۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ مجھے تمام تر حالات پوری سچائی کے ساتھ بتائیں گے۔“

”جی ہاں۔ بالکل۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میری آپ سے ایک درخواست ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ فوری طور پر میرے ساتھ حویلی چلیں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”پہلے آپ وقوعہ کا معائنہ کریں۔ اس کے بعد آپ مجھ سے جو بھی پوچھیں گے، میں اس کا جواب دوں گا۔“

اس کی تجویز انتہائی مقبول تھی لہذا میں نے اس کے ہمراہ شمس آباد جانے کا فیصلہ سنا دیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم تھانے سے روانہ ہو گئے۔

شمس آباد ایک ہزار سے بارہ سو تک نفوس کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ہم جلد ہی چودھری قادر علی کی معیت میں شمس آباد پہنچ گئے۔ میرے ساتھ حملے کا ایک آدمی کانشیل واحد بھی تھا۔ واحد بہت تیز طرار اور چاق و چوبند لہکا تھا۔

تائیکے حویلی کے گیٹ پر ر کے اور چودھری ہمیں اپنے ساتھ حویلی کے اندر لے گیا۔ وہ حویلی نہ تو زیادہ بڑی تھی اور نہ ہی چھوٹی۔ اس کی آرائش وزینائش پر بھی دل کھول کر خرچ نہیں کیا گیا تھا۔ چودھری قادر علی چونکہ خود سادہ مزاج کا مالک تھا لہذا اس کی حویلی کے چپے چپے سے بھی سادگی جھلکتی تھی۔ عام روایتی چودھریوں کی حویلیوں جیسی شان و شوکت اور رعب و دبدبہ کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے کانشیل واحد کو خصوصی ہدایات دے کر حویلی کے مختلف بیرونی حصوں کے ”معائنے“ پر مامور کر دیا اور خود چودھری کے ہمراہ اندرونی رہائشی حصے کی جانب بڑھ گیا۔

چودھری قادر علی مجھے ایک ایسی جگہ لے آیا جہاں چار کمرے ایک قطار میں بنے ہوئے تھے۔ اس مقام تک رسائی سے پہلے حویلی کی خواتین کو دوسرے حصے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ میں نے اوپر جن چار کمروں کا ذکر کیا، وہ بنیادی طور پر بیڈروم تھے۔ یہ کمرے شمال جنوباً حویلی کے وسطی حصے

میں بنے ہوئے تھے۔ جنوبی سمت میں واقع آخری کمرہ چودھری قادر علی اور چودھرائیں زاہدہ پروین کی خواب گاہ تھی۔ اس کے بعد گھریلو ملازمہ بشیراں کا کمرہ تھا جو چودھری کے دو بیٹوں کی آیا بھی تھی۔ پانچ سالہ نوید اور تین سالہ سعید بشیراں کی نگرانی اور نگہداشت میں رہتے تھے اور رات کو اسی کے کمرے میں سوتے تھے۔ بشیراں کے بعد مخوی نورین کا کمرہ تھا اور شمالی سمت میں سب سے آخر میں ایک ایسا کمرہ تھا جہاں نورین کے جیمز کا سامان رکھا گیا تھا۔ تمام کا تمام فرنیچر اور دیگر قیمتی سامان جوں کا توں کمرے کے اندر موجود تھا۔ بس، وہاں سے وہ سوٹ کیس غائب تھا جس کے اندر طلائی زیورات اور بیش بہا ریشمی ملبوسات رکھے ہوئے تھے۔

میں نے نورین اور جیمز والے کمرے کو جائے وقوعہ کی حیثیت دیتے ہوئے وہاں کا تفصیلی اور تنقیدی معائنہ کیا۔ دونوں کمروں کے کسی بھی حصے سے مجھے افراتفری کے آثار نہیں ملے جن سے ظاہر اور ثابت ہوتا ہو کہ وہاں ڈاکوؤں نے کوئی ہنگامی کارروائی کی ہوگی جبکہ چودھری قادر علی نے مجھے تھانے میں یہی بتایا تھا کہ۔۔۔ بچھلی رات ڈاکوؤں نے میری حویلی میں گھس کر قیامت برپا کر دی ہے اور وہ میری جوان بیٹی نورین کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔

میں دونوں کمروں کے تسلی بخش جائزے سے فارغ ہوا تو چودھری قادر کو لے کر ایک کمرے میں بیٹھ گیا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”چودھری صاحب! آپ ایک امن پسند اور شریف انیس انسان ہیں اس لیے میں یہ نہیں کہوں گا کہ آپ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں مگر جو کچھ آپ فرما رہے ہیں، اس کے آثار کہیں نظر نہیں آ رہے۔“

”میری بیٹی حویلی سے غائب ہے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”قیمتی سامان والا سوٹ کیس بھی کمرے میں موجود نہیں۔“ آپ کو اور کس قسم کے آثار کی تلاش ہے؟“

”میرا اشارہ ڈاکوؤں کی کارروائی کی جانب تھا چودھری صاحب!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”جب ڈاکو کہیں پر ہلا بولتے ہیں تو وہاں افراتفری اور اتری پیدا ہوتی ہے لیکن میں نے جن دو کمروں کا معائنہ کیا ہے، وہاں تو سب امن و امان ہی دکھائی دیتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کی بیٹی خود ہی سوٹ کیس اٹھا کر کہیں چلی

گئی ہو۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ملک صاحب!“ وہ دھکی لہجے میں بولا۔

”حالات و واقعات کی روشنی میں میرے ذہن نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے، وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔“ میں نے چودھری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”محضرت کے ساتھ مجھے کہنا پڑ رہا ہے کہ حویلی کے اندر مجھے ڈاکوؤں کی کارروائی کہیں نظر نہیں آ رہی۔“

”مگر نورین۔۔۔ بھاری سوٹ کیس اٹھا کر۔۔۔ خود کیوں کہیں چلی جائے گی؟“ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میری بیٹی اس قسم کی ٹھنڈا حرکت نہیں کر سکتی ملک صاحب۔“

”میں آپ کے کرب کو محسوس کر سکتا ہوں چودھری صاحب!“ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔

”کیا آپ نے خود اپنی آنکھوں سے ڈاکوؤں کو یہ کارروائی کرتے دیکھا تھا؟“

”میں نے نہیں، بشیراں نے دیکھا تھا۔“ اس نے بتایا۔

”وہ۔۔۔ آپ کی گھریلو ملازمہ اور بچوں کی آیا؟“

”جی ہاں!“ چودھری نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”بشیراں آدمی رات کو میرے چھوٹے بیٹے سعید کو رفع حاجت کرانے کے لیے کمرے سے نکل کر ہاتھ روم کی طرف بڑھی تو اس نے دو افراد کو تیزی سے حویلی کے گیٹ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے اپنے سر پر سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا اور دوسرے نے اپنے کندھے پر نورین کو لاد رکھا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گئی اور اس نے چھٹا چلا تا شروع کر دیا۔ اس کی چیخ و پکار سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میں آن واحد میں کمرے سے باہر آیا اور بشیراں نے مجھے بتایا کہ ڈاکو نورین کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ میں نے حویلی کے گیٹ کی جانب دوڑ لگا دی۔ گیٹ کھلا ہوا تھا لیکن جب تک میں حویلی سے باہر پہنچا، ڈاکو وہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔ میں دھچکے نہیں سکا کہ وہ تعداد میں کتنے تھے۔ رات کی تاریکی میں مجھے گھوڑوں کے بھاگنے کی مخصوص آوازیں سنائی دیں۔ میرے محتاط انداز سے کے مطابق، وہ دو یا تین یا پھر چار گھوڑے تھے۔“

”آپ نے ڈاکوؤں کا تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کی؟“ اس کے خاموش ہونے پر میں نے سوال کیا۔ ”حویلی میں آپ کے محافظ ملازم بھی تو موجود ہوں گے۔ وہ ڈاکوؤں

کی کارروائی کے دور ان میں کہاں سے؟ ڈاکو حویلی میں اتنی بڑی واردات کر کے رفو چکر ہو گئے اور وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے کیوں بیٹھے رہے؟

میرے متعدد سوالات کے جواب میں چودھری قادر علی نے ایک پوچھل سانس خارج کی اور بھرائی ہوئی آواز میں بتانے لگا۔ "حویلی کا کھلا ہوا گیت دیکھ کر میرا قہقہہ نکلا تھا اور فوری طور پر میرے ذہن میں یہی آیا تھا کہ یہ جیلا اور بالا کہاں سرگئے ہیں۔ جیلا اور بالا میرے خاص ملازم ہیں جو حویلی کے گیت کے قریب ہی رہتے ہوئے ایک کمرے میں رہتے ہیں۔ حویلی کی نگرانی اور پہرے داری ان کے فرائض میں شامل ہے۔"

"پھر جیلا اور بالا کے بارے میں آپ کو کیا پتا چلا؟"

وہ لمبے بھر کو رکھ کر تو میں نے سوال کیا۔ "بشیراں کی پکار پر تو میں ہڑبڑا کر اٹھا تھا اور سیدھا حویلی کے گیت کی جانب دوڑ لگا دی تھی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن جب ڈاکو تارکی میں غائب ہو گئے تو میں نے تیزی سے جیلا اور بالا کے کمرے کا رخ کیا تھا۔"

"کیا وہ دونوں اپنے کمرے میں موجود تھے؟"

نے پوچھا۔ "جی ہاں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "وہ دونوں بے ہوش پڑے تھے۔"

"بے ہوش؟" میں چونک اٹھا۔ "کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"وہ اپنی اپنی چار پائی پر بے سدھ پڑے تھے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے انہیں جگانے کے لیے پہلے آواز دیں۔ وہ نرس سے کس نہ ہوئے تو میں نے فیسے میں انہیں جھنجھوڑا اور ان کی چار پائیوں کو ٹھنڈے بھی مارے مگر اس سے بھی بات نہ بنی تو میں نے بالائی بھر بھر کر ان پر پانی ڈالا۔" وہ ذرا دیر کو سانس ہموار کرنے کے لیے رک رکھتی بات کھل کرتے ہوئے بولا۔

"بڑی مشکل سے میں انہیں ہوش میں لانے میں کامیاب ہو سکا۔ جب وہ کچھ بتانے کے قابل ہوئے تو پتا چلا، ان دونوں کو حویلی میں ہونے والی واردات کی کوئی خبر ہی نہیں تھی۔ ڈاکو ان کی بے ہوشی کے دوران ہی میں اپنا کام کر کے چلے گئے تھے۔ مجھے تو یہ لگتا ہے ملک صاحب! ڈاکوؤں نے کسی طرح حویلی میں داخل ہونے کے بعد جیلا اور بالا کو بے ہوش کیا پھر وہ نورین والے کمرے میں پہنچے اور اٹھانے سے پہلے اسے بھی بے ہوش کر دیا ورنہ وہ اپنے

انوار کے وقت ضرور شور مچاتی۔ اس قسم کی وارداتیں کرنے والے مجرموں کے پاس بے ہوشی والی دوا میں بسا ہوا رومال ہوتا ہے جو وہ کسی کو بھی سٹگھا کر اٹھا فٹیل کر دیتے ہیں۔ سوتے ہوئے آدمی پر تو اس رومال کا استعمال اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔"

"آپ حیکم کہہ رہے ہیں چودھری صاحب! میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ "ڈاکوؤں کے پاس کلوروفارم میں بسا ہوا ایسا رومال ہوتا ہے جسے وہ موسی (موم) جامہ کی بنی ہوئی) جھلی میں محفوظ رکھتے ہیں اور یہ وقت ضرورت استعمال کرتے ہیں۔ نورین پر کلوروفارم والے رومال کا استعمال تو کچھ میں آنے والی بات ہے مگر۔" میں نے لمحائی توقف کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

"مگر یہ جیلا اور بالا کیسے پہرے دار ہیں جنہیں۔ بیک وقت ڈاکوؤں نے تسخیر کر لیا۔ کیا وہ گہری نیند میں ڈوب کر حویلی کی نگرانی کر رہے تھے؟"

"میں نے انہیں سختی سے ہدایت کر رکھی ہے۔ وہ باری باری اپنی اپنی نیند پوری کریں۔ یعنی ایک وقت میں ایک سوئے اور دوسرا جاگتا رہے۔" چودھری نے بتایا۔ "پچھلی رات ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوا ہے، یہ میں نے ابھی ان سے پوچھا نہیں۔ ان ہنگامی حالات نے مجھے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔"

"کوئی بات نہیں چودھری صاحب! آپ نہیں پوچھ سکتے تو یہی سوال میں ان سے کروں گا۔" میں نے نمبر سے ہوئے لیٹے میں کہا۔ "مجھے حویلی میں تین دوسرے افراد سے بھی پوچھ کر پتہ کرنا ہے۔"

"کیوں نہیں ضرور۔" وہ جلدی سے بولا۔

میں نے کہا۔ "چودھری صاحب! آپ ذرا میرے ساتھ حویلی سے باہر آئیں۔"

وہ فوراً سے پیشتر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر ہم حویلی کے اندرونی حصے سے نکل کر کشادہ صحن سے گزرتے ہوئے حویلی کے گیت کی جانب بڑھنے لگے۔ میں نے چودھری کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

"چودھری صاحب! آپ کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ تو نہیں؟"

"نہیں جناب! وہ سادگی سے بولا۔ "میں نے ایسا کوئی روگ نہیں پال رکھا۔ اللہ کا شکر ہے، نہ میں کسی کا دشمن ہوں اور نہ کوئی میرا دشمن ہے۔"

"مگر آپ کے بقول پچھلی رات حویلی میں جو

اندو ہناک واقعہ پیش آیا ہے، وہ کسی دوست کا کارنامہ تو نہیں ہو سکتا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اگر اسے سیدھی سادی ڈاکوؤں کی واردات بھی سمجھ لیا جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ڈاکوؤں کو حویلی کے اندرونی حالات و معاملات کی اتنی گہری معلومات کیسے تھیں کہ وہ یہ آسانی حویلی کے اندر داخل ہوئے، انہوں نے چوکیداروں کو... پھپھوش کیا پھر وہ سیدھے نورین کے کمرے میں پہنچے۔ اسے بے ہوش کر کے اٹھا لیا اور اس کے برابر والے کمرے سے طلائی زیورات و قیمتی ملبوسات والا سوٹ کیس اٹھا کر اطمینان سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ اس سے تو ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے۔"

"کون سی بات؟" چودھری نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔

میں نے بتایا۔ "یہ کہ اس واردات سے پہلے ڈاکوؤں نے حویلی کے اندرونی حالات کے بارے میں مکمل تحقیق کی ہوگی کہ کون سی چیز کہاں اور کس جگہ پر ہوگی۔ اور یقیناً ممکن ہے، یہ خطرناک معلومات حویلی کے اندر ہی سے کسی نے انہیں پہنچائی ہو۔"

"آپ کا مطلب ہے۔" وہ چلتے چلتے رک گیا پھر سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "حویلی کا کوئی آدمی ان ڈاکوؤں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔"

"یہ ناممکن تو نہیں چودھری صاحب! میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "چودھری صاحب! دراصل پولیس کی تفتیش کی گاڑی شنگ کے بینروں سے چلتی ہے۔ موجودہ حالات کو دیکھ کر ایک بات میرے ذہن میں آئی اور وہ میں نے آپ کے سامنے بیان کر دی۔" میں نے لمحائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اگر یہ آپ کے کسی دشمن کی کارروائی ہے تو پھر تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ دشمن حویلی کے اندرونی حالات سے پوری طرح آگاہ ہے۔ یہ آگاہی اس نے چاہے کیسے بھی حاصل کی ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"دیکھیں جی ملک صاحب۔" وہ ایک مرتبہ پھر میرے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے بولا۔ "اگر اس روئے زمین پر واقعی کوئی میرا دشمن ہے تو میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور جہاں تک حویلی کے اندر سے کسی کے معلومات فراہم کرنے کا تعلق ہے تو میں کسی پر شک نہیں کر سکتا۔ یہ سب میرے بھروسے کے لوگ ہیں۔"

باتیں کرتے ہوئے ہم حویلی کے گیت پر پہنچ گئے۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ "چودھری صاحب! آپ کے وہ دونوں ملازم جیلا اور بالا انہیں نظر نہیں آ رہے۔"

"نہیں کہیں ہوں گے جناب۔" وہ سرسری لہجے میں بولا۔ "جب ہم تھانے سے واپس آئے تھے تو میں نے انہیں ادھر ہی دیکھا تھا۔"

ہم حویلی کے گیت سے باہر نکل آئے تو میں نے دریافت کیا۔ "چودھری صاحب! آپ نے ڈاکوؤں کو کس جانب فرار ہوتے دیکھا تھا۔" میرا مطلب ہے، ان کے ٹھونڈوں کی ٹاپوں کی مخصوص آواز تاریکی میں کس سمت محسوس ہوئی تھی؟

"اس طرف جناب۔" چودھری نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

"ادھ! میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ "ادھر تو تھانہ ہے۔"

"میں نے جود دیکھا اور جوسنا، وہ آپ کو بتا دیا ہے۔" وہ سادگی سے بولا۔

ان لمحات میں میرا ذہن برق رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ شمس آباد سے مغرب میں ایک میل کے فاصلے پر میرا تھانہ تھا اور اسی سمت میں اگر مزید آگے بڑھتے جائیں تو لگ بھگ میل، سوائیل کے بعد جنگل شروع ہو جاتا تھا جو شانہ جنوبی میلوں تک پھیلا ہوا تھا جبکہ شرفا غرا بھی اس کا پھیلاؤ پانچ میل سے کم نہیں تھا۔ وہ ڈاکو شمس آباد سے نکل کر مجھے سلام کرنے تھانے تو آ نہیں سکتے تھے۔ اغلب امکان یہی نظر آتا تھا کہ انہوں نے تھانے سے پہلو تہی کرتے ہوئے جنگل کا رخ کیا ہوگا۔ اس بات کا فوری طور پر فیصلہ کرنا ممکن نہیں تھا کہ اگر وہ جنگل ہی میں گھسے تھے تو سیدھے مغربی سمت بڑھتے چلے گئے تھے یا انہوں نے اپنے ٹھونڈوں کو شانہ جنوبی طرف موڑ لیا تھا۔

میں نے چودھری قادر علی کو اپنے خیالات سے آگاہ کیا تو وہ اضطرابی لہجے میں بولا۔ "ملک صاحب! ایسا ہو سکتا ہے۔ بس، اب آپ جلدی سے میری نورین کو ڈھونڈ نکالیں تاکہ میری عزت پر کوئی حرف نہ آئے۔"

"آپ پریشان نہ ہوں چودھری صاحب۔" میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ "اللہ عزت رکھنے والا ہے۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ نورین شمس آباد سے بیاہ کر کہاں جانے والی تھی؟"

”بہادر پور!“ اس نے جواب دیا۔ ”بہادر پور کے چودھری خدابخش کے بیٹے کریم بخش سے نورین کی شادی ہونے والی تھی۔“

”بہادر پور“ نامی وہ گاؤں، شمس آباد سے جنوب مغرب میں، چار میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ میری معلومات کے مطابق بہادر پور کے اختتام سے جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ گویا وہ جنگل کے کنارے واقع تھا۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔ ”چودھری صاحب! نورین اور کریم بخش کا رشتہ امن وامان سے ملے ہو گیا تھا یا اس دوران میں کوئی بدمزگی ہوئی تھی..... یا یہ کہ نورین کے دوسری جگہوں سے بھی رشتے آئے تھے۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟“

”جی، اچھی طرح سمجھ رہا ہوں کہ آپ کا اشارہ کس طرف ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مگر یقین کریں، ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ چودھری خدابخش سے میری دیرینہ دوستی ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھتے ہیں۔ کریم بخش اور نورین کے رشتے کی بات ہم دونوں کے درمیان ہی ملے پائی تھی اور کسی کو اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ایک سال پہلے منگنی ہوئی تھی اور اب ایک ہفتے بعد نورین کی برات آنے والی تھی کہ.....!“ بولتے بولتے اس کی آواز رندھ گئی۔

میں اسے حویلی کے اندر لے آیا۔ یہ اتنا بڑا واقعہ تھا کہ پورے شمس آباد میں تھر تھلی بچ گئی تھی۔ حویلی کے نزدیک بھی گاؤں کے کئی افراد جمع تھے لیکن چودھری کے ملازمین خاص جیلا اور بالا کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے چودھری سے کہا۔

”چودھری صاحب! جیلا اور بالا کو پیدا کریں۔ ان کے بیانات بہت ضروری ہیں۔ پتا نہیں، وہ کدھر غائب ہیں؟“

چودھری نے گاؤں کے دو اہم افراد کو اپنے پاس بلا کر حکمانہ لہجے میں کہا۔ ”تم دونوں فوری طور پر جیلا اور بالا کو ڈھونڈ کر میرے پاس لاؤ..... فوراً!“ وہ دونوں حکم بجالانے کا یقین دلاتے ہوئے روانہ ہو گئے۔

میری نظر میں چودھری قادر علی کے ذاتی ملازم اور حویلی کے نگران جیلا و بالا نہایت ہی اہم افراد تھے۔ انہیں بے ہوش کرنے کے بعد ہی مبینہ ڈاکوؤں نے حویلی والی مہم

سر کی تھی۔ جیلا اور بالا سے پوچھ گچھ کی جاتی تو ڈاکوؤں کے حوالے سے کوئی اہم سراغ ہاتھ لگ سکتا تھا۔ میں نے حویلی کے اندرونی حصے میں پہنچنے کے بعد کہا۔

”چودھری صاحب! جب تک جیلا اور بالا یہاں پہنچتے ہیں، اس وقت تک میں آپ کی گھریلو ملازمہ بشیراں سے چند سوالات کر لیتا ہوں۔ سب سے پہلے بشیراں ہی نے ڈاکوؤں کو دیکھا تھا۔ ممکن ہے، بشیراں سے کوئی ایسی بات پتا چل جائے جس سے نورین تک پہنچنا آسان ہو جائے۔“

چودھری نے مجھے برآمدے میں بٹھایا اور کہا۔ ”میں بشیراں کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔“

پھر وہ حویلی کے اندرونی حصے میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بشیراں میرے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ گھٹکڑا لے بالوں والی سانولے رنگ کی ایک فرہ اندام عورت تھی۔ قد میانہ اور عمر پینتالیس، پچاس کے درمیان۔ چودھری کے مطابق بشیراں کی ساری زندگی اسی حویلی میں گزری تھی اور وہ اس کی نظر میں ایک قابل بھروسہ ملازمہ تھی۔

میں نے بشیراں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”چودھری صاحب تمہاری بہت تعریف کر رہے تھے۔ وہ تمہارے کام سے بہت خوش ہیں۔ نورین والے واقعے کا تمہیں بھی دکھ ہوا ہوگا؟“

میں نے ملے جلے جملوں سے پوچھ گچھ کا آغاز کیا تھا۔ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”چودھری صاحب کی مہربانی ہے جو انہوں نے میری تعریف کی۔ میں تو حویلی کے کام کو عبادت سمجھ کر کرتی ہوں جی اور جہاں تک نورین والے واقعے کا تعلق ہے.....“ اس نے ذرا رک کر ایک گہری سانس لی پھر بڑے کرب سے بولی۔ ”جس طرح میں چودھری نوید اور چودھری سعید کو پال رہی ہوں نا..... ایسے ہی نورین کی پرورش بھی میرے ہی ہاتھوں میں ہوئی تھی۔ اس سے آپ میرے دکھ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اگر سعید میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو میں ہر شے کی پروا کیے بغیر ان ڈاکوؤں کے پیچھے دوڑ لگا دیتی.....“

”ہوں.....!“ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”اب تک میں جتنی معلومات حاصل کر سکا ہوں، ان کے مطابق سب سے پہلے ڈاکوؤں کو تم ہی نے دیکھا تھا۔ کیا تم ان کے قد کاٹھ یا حلیوں کے بارے میں مجھے کچھ بتا سکتی ہو؟“

”نہیں جی.....“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”آدھی رات کا وقت تھا اور ہر طرف اندھیرا ہی

اندھیرا۔ میں ان لوگوں کے چہرے نہیں دیکھ سکتی تھی کیونکہ۔۔۔

”کیونکہ کیا؟“ وہ رکی تو میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں پوچھا۔

”انہوں نے ڈھانے لگا رکھے تھے۔“ وہ بڑے سکون سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”جب میں ننھے سعید کو رفع حاجت کرانے کے لیے اپنے کمرے سے نکل کر حویلی کے کچن کی طرف آئی تو میں نے ان دونوں ڈاکوؤں کو تیزی سے بھاگ کر حویلی کے گیٹ کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ ان میں سے ایک نے زیورات اور قیمتی سامان والا سوٹ کیس اپنے سر پر اٹھا رکھا تھا اور دوسرے نے نورین کو کندھے پر لاد رکھا تھا۔ میں انہیں دیکھ کر بہت زور سے چیختی تھی۔ میری آواز سن کر چودھری صاحب اپنے کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ جب میں نے انہیں صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ حویلی کے گیٹ کی طرف بڑھ گئے تھے۔“

وہ تفصیل بیان کر کے خاموش ہوئی تو میں نے استفسار کیا۔ ”بشیراں بی بی! تم نے رات کی تاریکی میں کیسے جان لیا کہ ایک ڈاکو نے نورین کو کندھے پر ڈال رکھا تھا؟“

”کیا مطلب ہے بی بی آپ کا۔۔۔؟“ اس نے ابھمن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ”نورین اپنے کمرے سے غائب تھی تو ڈاکو پھر نورین ہی کو اٹھا کر لے گیا تھا جی!“

وہ میری بات کو سمجھ نہیں پائی تھی لہذا میں نے آسان الفاظ میں کہا۔ ”نورین کے کمرے کو تو بعد میں چیک کیا گیا ہوگا۔ میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ جب تم نے ڈاکوؤں کو حویلی کے گیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا تو تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ وہ نورین ہی ہے۔ میں اس پہچان کی وجہ جاننا چاہتا ہوں؟“

”تمہارے دار صاحب! اس حویلی میں ہم تین ہی عورتیں ہیں۔“ وہ غصہ سے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اور تینوں کا قد کاٹھ اور جسامت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ میں آپ کے سامنے بیٹھی ہوں۔ چودھرائن جی دہلی پٹلی اور چھوٹے قد کی ہیں جبکہ نورین بھرے ہوئے جسم کی مالک ایک اونچی لمبی لڑکی ہے۔ بس، میں نے انہی خصوصیات کی بنا پر اندازہ لگایا تھا کہ ڈاکو نے نورین کو کندھے پر ڈال رکھا ہے۔“

بشیراں بی بی کی وضاحت سے میری تسلی ہو گئی۔ میں نے پوچھا۔ ”جب ڈاکو نورین کو کندھے پر ڈال کر حویلی کے گیٹ کی طرف بھاگ رہا تھا تو کیا نورین نے کوئی مزاحمت کرنے یا شور مچانے کی کوشش نہیں کی تھی؟“

”نہیں جی۔“ اس نے گردن کوئی میں جنبش دی

اور بتایا۔ ”وہ تو ایسے لگ رہا تھا جناب کہ ڈاکو کسی لاش کو اٹھا کر بھاگ رہا ہو۔ بعد میں پتا چلا کہ ڈاکوؤں نے نورین کو پہلے بے ہوش کیا ہوگا اور اس کے بعد ہی اٹھایا ہوگا۔ ان غلاموں نے حویلی میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے حویلی کے رکھوالوں جیلا اور بالا کو بے ہوش کیا تھا۔“

پھر بشیراں مجھے جیلا اور بالا کی بے ہوشی کی تفصیل سنانے لگی۔ یہ باتیں پہلے ہی چودھری قادر علی کی زبانی مجھ تک پہنچ چکی تھیں لہذا میں نے عدم دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے اس سے براہ راست سوال کیا۔

”بشیراں! تمہارے خیال میں یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟“

”میں۔۔۔ میں کیا جانوں جی۔“ وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ ”مجھے تو وہ دونوں ڈاکو ہی لگتے تھے۔“

”یعنی۔۔۔ تمہیں کوئی اندازہ نہیں کہ چودھری قادر علی کے ساتھ یہ دشمنوں والی کارروائی کس نے کی ہے؟“

”نہیں جی۔۔۔“ وہ قطعیت سے بولی۔ ”مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔“

اس کے بعد میں لگ بھگ دس منٹ تک تمہا پھر کر مختلف زاویوں سے سوالات کر کے بشیراں سے یہ جاننے کی کوشش کرتا رہا کہ ڈاکوؤں کو کیسے پتا چلا کہ کس کمرے میں نورین سوتی ہے؟ کس کمرے میں طلائی زیورات اور قیمتی لمبوسات والا سوٹ کیس رکھا ہوا ہے؟ وہ حویلی میں کس تدبیر سے داخل ہوئے؟ انہوں نے حویلی کے رکھوالوں پر کس طرح قابو پایا۔۔۔ اور کیا کسی گھر کے بھیدی نے تو یہ لگا نہیں ڈھالی؟

بشیراں سے مجھے کوئی بھی ایسی بات معلوم نہ ہو سکی جسے ”کام“ کی بات کہا جاسکے اور جس کی ”مدد“ سے نورین کو دھمزنے میں آسانی میسر آجائے۔ میں بشیراں سے سوال کرتے ہوئے مسلسل اس کے چہرے کے تاثرات، آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کی حرکات و سکنات کا بھی باریک بینی سے جائزہ لے رہا تھا جس کے نتیجے میں میرا پیشہ وارانہ تجربہ یہ کہتا تھا کہ وہ دروغ کوئی سے کام نہیں لے رہی تھی۔ میں نے اسے فارغ کر دیا۔

میں پچھلے ایک گھنٹے سے چودھری قادر علی کی حویلی میں موجود تھا اور میری حاصل شدہ معلومات کے مطابق اس حویلی میں زندگی بسر کرنے والے افراد کی تعداد آٹھ تھی۔ چودھری قادر علی، اس کی بیوی زاہدہ پردین، ان کے تین بچے نورین، نوید، سعید، طائرہ۔ بشیراں بی بی اور دو ملازم رکھوالے۔ جیلا اور بالا!

نورین انہو ہو چکی تھی۔ سعید اور نوید کی عمریں ایسی

میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”مجھے یاد ہے۔ چلیں۔“

تھوڑی سی دیر کے بعد میں چودھری قادر علی کے کمرے میں موجود تھا۔ اس وقت ہم تینوں کے سوا وہاں اور کوئی بھی نہیں تھا۔ چودھری کی بیوی زاہدہ پردین کو دیکھ کر مجھے حیرت کا ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ وہ چودھرائن ہے کیونکہ چودھری اور زاہدہ پردین کی عروں میں بہت زیادہ فرق تھا۔

چودھری نے میری آنکھوں اور چہرے پر نمودار ہونے والی حیرت کو فوراً نوٹ کر لیا اور وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”زاہدہ سے میری شادی کو چھ سال ہوئے ہیں۔“

”اور نورین۔۔۔؟“ میں نے سوالیہ نظر سے چودھری کی طرف دیکھا۔

”وہ میری پہلی بیوی عتار بیگم سے ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”عتار بیگم سے میری چار اولادیں ہوئی تھیں۔ تین بیٹے تو پیدا ہونے کے کچھ ہی عرصے کے بعد اللہ کو پیار سے ہو گئے تھے۔ چوتھے نمبر پر نورین پیدا ہوئی تھی اور اسے جنم دیتے ہوئے عتار بیگم کا انتقال ہو گیا تھا۔ زاہدہ سے میری دو اولادیں ہیں۔ سعید اور نوید۔“

زاہدہ پردین کی عمر زیادہ سے زیادہ تیس سال رہی ہوگی۔ وہ بلاشبہ ایک پرکشش اور حسین و جمیل عورت تھی تاہم ان لمحات میں وہ خاصی افسردہ نظر آتی تھی۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا۔

”تمہارے دار صاحب۔۔۔!“ اس کے لہجے سے دکھ اور اداسی چمکتی تھی۔ ”مجھے نورین کو پیش آنے والے واقعے کا بڑا غم ہے۔ پچھلے چھ سال میں ہمارے درمیان بڑے گہرے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ ہم بالکل دو سہیلیوں کی طرح حویلی میں رہتی تھیں۔ میں پچھلے چھ ماہ سے کتنے چاؤ سے اس کی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ پتا نہیں کس عالم نے۔“ بولتے بولتے زاہدہ کی آواز بھرا گئی۔

میں نے مناسب الفاظ میں چودھرائن کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں انشاء اللہ بہت جلد نورین کو تلاش کر کے واپس لے آؤں گا۔ میری تسلی بخشی سے اس کی پریشانی میں قدرے کمی واقع ہوئی تو میں چودھری کے ساتھ حویلی کے بیرونی حصے میں آ گیا۔

تھوڑی سی دیر میں وہ لوگ واپس آ گئے جنہیں چودھری قادر علی نے جیلا اور بالا کی تلاش میں بھیجا تھا۔ بالا

محکمے الفاظ

اگر کسی کی یادداشت اچھی نہ رہے تو اور تم بھی اسے بھلا نہ پاؤ تو یہ تمہارا کام نہیں، کمال اس کا ہے کیونکہ اس کے پیار اور غم میں کوئی عادت نہیں۔

فرمان۔ حضرت امام حسینؑ

مرسلہ۔ قمر صائم، خوشاب

حویلی پہنچ گیا تھا مگر جیلا نہیں دیکھائی نہیں دے رہا تھا۔ چودھری نے بالا سے پوچھا۔

”تم لوگ کہاں مر گئے تھے؟“ چودھری کے استفسار میں خفگی تھی۔ ”اور وہ جیلا کدھر ہے؟“

”چودھری صاحب!“ بالا لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔ ”میں جیلا کو دکھاتا ہوں مگر اس نے میری ایک نہ سنی اور وہ چلا گیا۔“

”کہاں چلا گیا؟“ چودھری نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

”جنگل کی طرف!“ بالا نے جواب دیا۔ ”جناب!

وہ ٹھوڑے سے پریشان کر نورین بی بی کی تلاش میں نکلا ہے۔ رات ڈاکوؤں نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا، اس کا جیلا کے دماغ پر بڑا گہرا اثر ہوا ہے۔ وہ بار بار ایک ہی بات کہہ رہا تھا۔“

”کیا کہہ رہا تھا وہ؟“ چودھری بالا کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

”وہ کہہ رہا تھا۔“ بالا وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ہم اس حویلی کے رکھوالے ہیں اور ہمیں بے ہوش کر کے وہ بد معاش ڈاکو اتنی بڑی واردات کر گئے کہ ہم چودھری صاحب کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔“

اب۔۔۔“ لگاتی توقف کر کے بالا نے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے جیلا کے الفاظ کو مکمل کر دیا۔

”اب جب تک میں نورین بی بی کو واپس نہیں لے آؤں گا، حویلی میں قدم نہیں رکھوں گا۔“

”مجھ پانگل ہے یہ جیلا بھی۔“ چودھری بد بدایا۔

”اگر اسے نورین کی تلاش میں جانا ہی تھا تو مجھے تو بتا کر جاتا۔ میں اس کے ساتھ کچھ اور لوگوں کو بھی بھیج دیتا۔“

”یہ بات میں نے بھی اس سے کہی تھی۔“ بالا جلدی سے بولا۔ ”کہہ چکا ہے جانا ہے، چودھری صاحب کو بتا دو۔“

اس نے کہا، میں جا کر چودھری صاحب کو بتا دوں اور وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا جنگل کی طرف نکل گیا۔

جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ شمس آباد اور میرے قہانے میں ایک میل کا فاصلہ تھا اور جنگل میرے قہانے سے میل، سوا میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس حساب سے شمس آباد اور جنگل کے درمیان لگ بھگ دو سواڑ میل کا فاصلہ حاکم تھا۔ جیلا نے غیرت بھری پھرتی دکھائی تھی جو وہ چودھری قادر علی کو خبر کیے بغیر یورین کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ اس کی دایہ پر ہی پتا چل سکتا تھا کہ اس تلاش میں جیلا نے کون سا تیر مارا تھا۔

میں جیلا اور بالا سے خصوصی پوچھ گچھ کا ارادہ رکھتا تھا۔ جیلا تو فی الحال میرے نہیں تھا لہذا میں بالا ہی کو لے کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

اقبال عرف بالا کی عمر کم و بیش پچیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ بال ٹھنڈے اور ہلکی ہلکی سوپیس اس کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ اس کے چہرے کی سب سے نمایاں چیز اس کی خوبصورت بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔

”ہاں بھئی بالا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ذرا تفصیل سے بتاؤ، پہلی رات یہاں حویلی میں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟“

”جناب! جب چودھری صاحب نے مجھے جگا یا۔ بلکہ ہم دونوں کو پانی پینک پینک کر جگا یا تو اس وقت تک ڈاکو اپنا کام کر کے جا چکے تھے۔ مجھے تو اس واقعے کے بارے میں چودھری صاحب ہی سے پتا چلا ہے۔“

”تم دونوں اس حویلی کے رکھوالے ہو۔“ میں نے۔

بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”پھر تم دونوں پروڈاکوؤں نے ایک ساتھ کیسے قابو پایا؟ چودھری صاحب نے تو تم لوگوں کو باری باری سونے کی تاکید کر رکھی ہے؟“

”جی ہاں۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ہم دونوں کا سونے اور جاگنے کا وقت طے ہے۔“

”اور وہ طے شدہ وقت کیا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”پہلے میں سوتا ہوں جی۔“ اس نے بتایا۔ ”آدھی رات کے بعد کسی وقت جب جیلا کو نیند آنے لگے تو وہ مجھے جگا دیتا ہے اور خود سو جاتا ہے۔ پھر صبح تک میں جاگ کر حویلی کا پہرا دیتا ہوں۔“

”کیا پہلی رات بھی تم پہلے سو گئے تھے؟“ میں

نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”اس وقت جیلا چاق و چوبند اور ہوشیار تھا۔ مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ آدھی رات کے بعد جیلا نے مجھے جگا یا کیوں نہیں اور۔۔۔ اور خود بھی کیوں سو گیا۔“

”اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ تم دونوں بے خبر سو رہے تھے بلکہ بے ہوش تھے۔“ میں نے بالا کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”چودھری صاحب نے بڑی مشکل سے تمہیں بیدار کیا تھا۔“

”میری تو کچھ کچھ میں نہیں آ رہا تھا نے دار صاحب!“

وہ بے بسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آخر اتنا بڑا واقعہ کیسے پیش آ گیا۔۔۔“

”واقعہ تو یہ واقعی، بہت بڑا ہے بالا۔“ میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھا پھر خامسے جیسے لہجے میں استفسار کیا۔ ”تمہارے خیال میں یہ کس کی کارروائی ہو سکتی ہے؟“

”جناب۔۔۔ مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”آج تک کبھی اس حویلی سے ایک پیسے کی چوری نہیں ہوئی۔ کبھی کہ ڈاکو نورین بی بی کو اٹھالے گئے اور سارے زیورات بھی۔۔۔“

”یعنی تمہیں کسی خاص آدمی پر شک نہیں ہے؟“ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”کوئی بھی ایسا شخص جو چودھری قادر علی سے دشمنی رکھتا ہو؟“

”نہیں جی۔“ وہ غمی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”چودھری صاحب تو اتنے اچھے ہیں کہ کوئی ان سے دشمنی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“

میں نے مزید دو چار سوالات کے بعد اقبال عرف بالا کو فارغ کر دیا۔ اس سے کوئی بھی مفید بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ اگر اس کی جگہ میں نے جمیل عرف جیلا سے پوچھ گچھ کی ہوتی تو یقیناً کوئی کام کی بات سامنے آ سکتی تھی کیونکہ جب بالا سویا تھا تو اس وقت جیلا جاگ رہا تھا۔ دونوں پہرے داروں کی پر اسرار بے ہوشی والا معما جیلا ہی حل کر سکتا تھا اور جیلا۔۔۔ نورین کی تلاش میں جنگل کی طرف گیا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد کانسٹیبل واحد کھوئی فتح محمد کو لے کر حویلی پہنچ گیا۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں کھوئی کو صورت حال سے آگاہ کیا اور کہا۔ ”چاچا! اس سے آگے تمہارا کام شروع ہوتا ہے۔“

”ٹھہرا! نہ کرو ملک صاحب۔“ وہ غصہ دہیاتی لہجے

میں بولا۔ ”ہو نہیں رزلٹ سامنے آجائے گا۔“

کھوئی فتح محمد کی عمر ساٹھ سے ستواڑ تھی تاہم اس کی پھرتی کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ پچیس سے زیادہ کا نہیں۔ اس کی بیٹائی بھی ماشاء اللہ بڑی ٹھیک تھا کہ جی۔ آدھے گھنٹے کی مابراہ تحقیق اور تفتیش کے بعد فتح محمد نے رپورٹ پیش کر دی۔

کھوئی کے مطابق، چار گھڑ سوار چودھری قادر علی کی حویلی تک آئے تھے لیکن حویلی کے اندر صرف دو اینٹی افراد کے پاؤں کا کھرا ملا تھا۔ یہ کھرا حویلی کے پیردنی گیت سے نورین والے کمرے اور اس کے برابر واقع سامان والے کمرے تک گیا تھا اور پھر واپس حویلی کے گیت تک چلا گیا تھا۔ حویلی کے باہر بھی ان دو اینٹی اشخاص کا کھرا پایا گیا تھا اور پھر چار گھڑ سواروں کا کھرا شمس آباد سے نکل کر ہمارے قہانے کی جانب یعنی گاؤں سے مغرب کی سمت چلا گیا تھا۔ میں نے کانسٹیبل کو وہیں چھوڑا اور کھوئی فتح محمد کی ذیولٹی لگا دی کہ وہ گھڑ سواروں کے کمرے کا پیچھا جاری رکھے پھر میں چودھری کو بھرپور تسلی دینے کے بعد قہانے آ گیا۔

☆☆☆

ایک بات کا میں ذکر کرنا بھول گیا اور وہ یہ کہ میں نے شمس آباد سے رخصت ہوتے وقت چودھری قادر علی کو ہدایت کر دی تھی کہ اس کا خاص آدمی جیلا جیسے ہی واپس آئے، وہ اسے میرے پاس قہانے پہنچ دے۔ چودھری نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا یقین دلایا تھا۔ میں جیلا کا خصوصی انٹرویو کرنا چاہتا تھا۔

قہانے پہنچ کر میں نے اسے ایس آئی افکار حسین کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ افکار حسین خاصا تیز طرار پولیس اہلکار تھا۔ میں نے اسے صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔

”افکار! میں تمہیں نورین کی تلاش میں جنگل کی طرف روانہ کرنا چاہتا ہوں۔ حالات و واقعات کے مطابق ڈاکو اسے جنگل ہی کی سمت لے کر گئے ہیں۔ تم اپنے ساتھ دو کانسٹیبل کو بھی لے جانا لیکن۔“

”لیکن کیا ملک صاحب؟“ میں نے جملہ ادھر و اچھوڑا تو اس نے فوراً پوچھا۔

”لیکن یہ کہ۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”تم جنگل کی طرف روانہ ہونے کی تیاری مکمل کر لو مگر اس مشن کا آغاز کرنے کے لیے کھوئی کی واپسی کا انتظار کرنا ہوگا۔“

میں نے ”دو تیری تنجیدی سے ہو۔“ اور اگر کھوئی کا کام شمس سے پہلے میں نہ ہوتا۔

”تو پھر تم اس مشن پر کل صبح روانہ ہو گے۔“ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”کھوئی فتح محمد نے چار گھڑ سواروں کا کھرا پتہ رکھا ہے۔ اس کی مابراہ رپورٹ کے بغیر کسی قسم کی مہم جوئی منسب نہیں ہوگی۔ میرا ذہن ایک بات ماننے کو تیار نہیں کہ ڈاکوؤں نے شمس آباد سے نکل کر قہانے کا رخ کیا ہوگا۔ اگرچہ چودھری قادر علی کا یہی بیان ہے کہ اس نے گھڑ سواروں کو مغرب کی سمت یعنی ہمارے قہانے کی جانب تاریکی میں غائب ہوتے دیکھا تھا اور ابتدائی کھرا بھی اسی بات کی نشاندہی کرتا ہے مگر میں دلی طور پر مطمئن نہیں ہوں۔“

”میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں ملک صاحب۔“

افکار نے برسوج انداز میں کہا۔ ”یہ ممکن نہیں کہ ڈاکوؤں کو یہ پتا نہ ہو کہ شمس آباد اور جنگل کے بیچ میں قہانہ بھی پڑتا ہے۔ اگر انہوں نے شمس آباد سے نکل کر جنگل ہی کا رخ کیا ہے تو پھر قہانے سے بیچ کر ہی آگے بڑھے ہوں گے۔“

”تم نے ذہانت سے بھرپور بات کی ہے۔“ میں نے ستائشی نظر سے اسے ایس آئی کو دیکھا۔ ”میرے ذہن میں بھی کچھ اسی قسم کے خیالات ہیں۔“

”کھوئی فتح محمد کی واپسی تک واقعی کچھ نہیں ہو سکتا۔“

افکار حسین نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

”بہر حال، میں اپنی تیاری مکمل کرتا ہوں۔“

تھوڑی دیر تک ہمارے درمیان اسی واردات کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی پھر اسے ایس آئی میرے کمرے سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔ آج دو پہر کا کھانا بھاگ دوڑ میں گول ہو گیا تھا۔ اس وقت سہ پہر کے چار بجے تھے۔ میں نے وقت کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہلکی پھلکی پیٹ پوجا کرنی تاکہ کام بھی چل جائے اور رات کا کھانا بھی خراب نہ ہو۔ بعض اوقات تنگدستی جانی معاملات میں سر جوکانے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ حتیٰ کہ یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ کب کھانے کا وقت ہوا اور کب یہ وقت گزر گیا۔ بہر حال، اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے کانسٹیبل واحد اور کھوئی فتح محمد قہانے پہنچ گئے۔ میں نے کھوئی کو فوراً اپنے کمرے میں بلا لیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور کوئی سنسنی خیز اطلاع لایا ہوگا۔ وہ میرے سامنے آ کر بیٹھا تو میں نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں چاہا۔ کیا پورٹ ہے؟"

"پورٹ تو خاصی حوصلہ افزا ہے۔" وہ بڑے اطمینان سے بولا۔ "وہ چاروں گھڑسوار جنگل ہی میں داخل ہوئے ہیں مگر تھانے سے بچ بچا کر۔"

"تھانے سے بچ بچا کر۔!" میں نے الجھن زدہ نظر سے کھوئی کو دیکھا۔ "اس بات کا کیا مطلب ہے چاہا؟"

"دیکھیں جی ملک صاحب۔" وہ غم سے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میں آباد سے تھانہ لگ بھگ ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ وہ چاروں گھڑسوار چودھری قادر علی کی حویلی سے کوئی چھ فرلانگ (پوتا میل) تو سیدھے تھانے کی طرف ہی آئے تھے لیکن پھر انہوں نے اپنا راستہ تبدیل کر لیا تھا۔ میں نے جس فاصلے کا ذکر کیا ہے، وہاں سے وہ جنوب مغرب کی سمت سڑک سفر کرتے ہوئے جنگل میں داخل ہوئے ہیں۔"

"اور اس کے بعد۔۔۔؟" میں نے سوالیہ نظر سے کھوئی کی طرف دیکھا۔

"اس کے بعد تو اللہ ہی جانتے ہیں۔" وہ سادگی سے بولا۔ "میں نے جنگل کے اندر جا کر کھرا نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ کام دن کی روشنی ہی میں ہو سکتا ہے ملک صاحب۔ البتہ۔۔۔۔۔" لگائی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"البتہ، میں نے اس مقام پر ایک واضح نشانی لگا دی ہے جہاں سے وہ گھڑسوار جنگل کے اندر داخل ہوئے تھے۔ اگر آپ کا حکم ہوگا تو صبح وہیں سے ڈاکوؤں کے کھرے کا کام دوبارہ شروع کر دوں گا۔"

"حکم کی بات نہیں چاہا، یہ وقت کی ضرورت ہے۔"

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں کل صبح اے ایس آئی اور دو کانسٹیبلوں کو بھی تمہارے ساتھ روانہ کروں گا۔ یہ کھوج لگانا بہت ضروری ہے کہ وہ ڈاکو، چودھری قادر علی کی بیٹی نورین کو اغوا کر کے کہاں لے گئے ہیں۔ ان میں سے کوئی ہاتھ لگے گا، بھی پتا چلا یا جاسکے گا کہ وہ کون لوگ ہیں۔ ان کی چودھری سے کیا دشمنی ہے اور۔۔۔ یہ کہ انہوں نے یہ کام کسی اور کے ایما پر تو نہیں کیا۔"

"ٹھیک ہے ملک صاحب۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ "میں کل صبح ہی صبح آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد آپ کی جو مرضی ہو۔"

"اوکے۔" میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک

لگاتے ہوئے کہا۔ "اب تم جا کر آرام کرو۔ کل کا دن پتا نہیں، کتنا مصروف ہو۔ ہو سکتا ہے، تمہیں سانس لینے کی فرصت بھی میسر نہ آئے۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہا ہو۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے چاہا۔ کوئی مشکل یا پریشانی ہے؟"

"ملک صاحب! آپ نے جس مصروفیت کا ذکر کیا ہے وہ صرف میرے ہی لیے نہیں، آپ کے لیے بھی ہے۔" اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اس مصروفیت میں آپ مجھے نہیں بھول جانا۔"

"او۔۔۔!" میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ میں فوراً سے بیشتر اس کی بات کی تہ میں پہنچ گیا تھا۔ "فکر نہ کرو چاہا!" میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ "تمہارا انعام مجھے یاد ہے لیکن۔۔۔ پہلے کام ختم ہو جائے اور اس کام کا کوئی حوصلہ افزا نتیجہ بھی سامنے آجائے۔"

"انشاء اللہ!" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "جب کام شروع ہو گیا ہے تو اس کا کوئی نتیجہ بھی برآمد ہوگا۔"

"مجھے تمہاری تجرباتی مہارت اور کڑی محنت کا پوری طرح احساس ہے چاہا۔" میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم نے چار پانچ گھنٹوں میں کھرے کا اچھا خاصا کام نمٹا دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔۔۔۔۔" میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بات مکمل کر دی۔

"ان گھڑسواروں نے جہاں سے راستہ بدلا تھا، وہاں سے جنوب مغرب میں جنگل کا کنارہ لگ بھگ دو میل تو ہوگا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں ملک صاحب! وہ ٹائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ فاصلہ دو میل یا دو میل سے کچھ زیادہ ہی ہوگا مگر میرے خیال میں یہ کام کافی آسان تھا۔ چار گھڑسواروں کا کھرا بہت سیدھا اور واضح تھا۔ ہمیں اس کا تعاقب کرنے میں کوئی خاص دشواری محسوس نہیں ہوئی لیکن یہی کام جنگل کے اندر آسان ثابت نہیں ہوگا۔ خیر۔۔۔۔۔ اللہ مالک ہے۔ کل کی کل دیکھی جائے گی۔"

کھوئی کو رخصت کرنے کے بعد میں نے اے ایس آئی کو ایک مرتبہ پھر اپنے پاس بلا لیا۔ ہمارے درمیان پندرہ بیس منٹ تک اسی معاملے پر بات چیت ہوتی رہی۔ میں نے اسے بڑی تفصیل کے ساتھ سمجھا دیا کہ اگلی صبح اسے

کس انداز سے اپنے مشن کا آغاز کرنا ہے۔ افکار حسین نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میری توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کرے گا۔

اے ایس آئی کو فارغ کرنے کے بعد بھی میں کافی دیر تک چودھری قادر علی کی حویلی میں پیش آنے والے ذہنی اور انخوا کے اس واقعے پر غور کرتا رہا۔ کسی بھی کیس میں اس وقت بڑی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں جب جائے وقوعہ یا متاثرین کی طرف سے مجرم یا مجرموں کے بارے میں کوئی پوائنٹ سامنے نہ آئے۔ یعنی تفتیش کو آگے بڑھانے کے لیے کوئی سرا یا سراغ ہاتھ نہ لگے۔ یہ کیس بھی کچھ اسی نوعیت کی صورت حال کا حامل تھا۔

میری اب تک کی حاصل شدہ معلومات کے مطابق چودھری قادر علی کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی اور میں کسی بھی قیمت پر ماننے کو تیار نہیں تھا کہ یہ "کارنامہ" کسی دوست کی طرف سے انجام دیا گیا تھا۔ دوسرا بڑا ایٹو ڈاکوؤں کی بروقت معلوماتی کارروائی کا تھا۔ چودھری کی حویلی کو نشانہ بناتے والوں کو حویلی کے اندر کا احوال بہ خوبی معلوم تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ ڈاکوؤں کو حویلی کے اندر روئی حالات و معاملات سے مکمل آگاہی حاصل تھی یا پھر یہ قیمتی معلومات انہیں مہیا کی گئی تھیں اور یہ کام کوئی گھر کا بھیدی ہی کر سکتا تھا۔ تیسرا پہلو حویلی کے پیرے داروں کا تھا۔ بیک وقت دونوں محافضوں کا اٹنا فٹیل ہو جانا بھی ذہن میں چھین پیدا کرتا تھا۔

محافضوں میں سے بالا کا میں نے تفصیلی انٹرویو کر لیا تھا لیکن اس تمام تر پوچھ گچھ میں سے کوئی کام کی بات نکل کر سامنے نہیں آ سکی تھی۔ چودھری قادر علی کا یہ کہہ دینا کہ اس کی کسی سے دشمنی نہیں، مجھے ہشتم نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر واقعی اس کا روئے زمین پر کوئی دشمن نہیں تھا تو پھر ایک امکان یہ بھی سامنے آتا تھا کہ نورین اپنی مرضی سے اغوا ہوئی ہو۔۔۔۔۔

یہ امکان اگرچہ خاصا کمزور تھا تاہم وہی بات کہ پولیس کی تفتیش کی گاڑی ٹھک کے پیڑوں سے چلتی ہے۔ میں اس زاویے پر سوچے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے ادھر حویلی میں چودھری قادر علی اور اس کی نوجوان بیوی زاہدہ پر دین سے بھی اس حوالے سے ڈھکے چھپے الفاظ میں سوالات کیے تھے لیکن ان کی جانب سے کوئی خاطر خواہ جواب موصول نہیں ہوا تھا۔ اگر نورین اپنی مرضی سے اغوا ہوئی تھی تو یقیناً اس کا کسی کے ساتھ چکر رہا ہوگا۔ وہ بہادر پور کے چودھری کریم بخش سے شادی نہیں کرنا چاہ رہی ہوگی

جیسی شادی سے ایک ہفتہ قبل اس نے ذرا مانی انداز میں حویلی کوئی ہاد بھدیا تھا مگر یہی اس امکان کی حیدری و تقویت بخشے ان کوئی بات ابھی سامنے نہیں آ سکی تھی۔ چودھری اور اس کی بیوی ایسے کسی معاملے سے صاف انکاری تھے۔ اب آجاکر حویلی کے دوسرے محافض ٹیمبل عرف جیلا کی داہنی سے چھامپیدیں وابستہ تھیں۔

جیلا کی پہلوؤں سے اہمیت کا حامل تھا۔ نمبر ایک۔ اس کی ذہنی رات ابتدائی حصے میں جاننے کی تھی۔ آدھی رات کے بعد وہ بالا کو جگا تا تھا اور خود سو جاتا تھا۔ دو۔ کی رات و بالا کے بیان کے مطابق، وہ جو رات کو سو یا تو پھر چودھری نے پانی پینک پینک کر ہی اسے جگا یا تھا اور اس کے ساتھ ہی جیلا بھی بے خبر سوتا ہوا پایا گیا تھا۔ اسی دوران میں ڈاکو اپنی کارروائی ڈال کر روفو چکر ہو چکے تھے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ جیلا، بالا کو جگانے سے پہلے کیسے سو گیا؟ ڈاکو اس کے جاگنے کے دوران میں آئے تھے یا اس کے سونے کے بعد؟

نمبر دو، وہ نورین کی تلاش میں چپ چاپ کیوں نکل گیا تھا؟ وہ چودھری قادر علی کا پرانا نمک خوار تھا۔ اس قسم کا جرأت مندانہ قدم اٹھانے سے پہلے اس نے چودھری کو اعتماد میں کیوں نہیں لیا؟ اسی نوعیت کے اور بھی بہت سے سوالات ذہن میں سر اٹھاتے تھے جن کے جوابات صرف اور صرف جیلا ہی دے سکتا تھا۔ میں بڑی بے تابی سے جیلا کی داہنی کا انکشاف کرنے لگا۔

کہتے ہیں، کبھی کبھی بے تابی بہت جلدی رنگ لے آتی ہے۔ میں تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر کی طرف جانے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ ایک کانسٹیبل نے کمرے میں آکر اطلاع دی۔

"سر! چودھری صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

"کون چودھری صاحب؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"جناب! میں چودھری قادر علی کی بات کر رہا ہوں۔"

کانسٹیبل نے بتایا۔ "ان کے ساتھ ایک بندہ بھی ہے۔"

"ٹھیک ہے، انہیں فوراً میرے پاس بھیج دو۔" میں نے تھکسا نہ انداز میں کہا۔

"اوکے سر۔" کانسٹیبل یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

"چودھری قادر علی اور اس وقت۔۔۔" میں نے حیرت بھرے انداز میں خود دکھائی کی۔ "خیر دیکھتے ہیں، کیا

اس وقت تک رات نے اپنے پر پھیلا لیے تھے۔ اگر چودھری قادر بھی شمس آباد سے تھانے آیا تھا تو اس کا مطلب تھا ضرور کوئی اہم بات ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں چودھری اور اس کا ساتھی میرے سامنے موجود تھے۔

میری پیشکش پر چودھری میرے سامنے ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا جبکہ اس کے ساتھ آنے والا شخص چودھری کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ میں نے چودھری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”چودھری صاحب! خیریت تو ہے۔ آپ اس وقت تھانے آئے ہیں، کوئی خاص بات۔“

”جی ملک صاحب!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے خاصے افسردہ لہجے میں بولا۔ ”بات اگر خاص نہ ہوتی تو شاید میں کل صبح آپ کے پاس آتا یا پھر آپ کی ہدایت کے مطابق، جیلا کو اکیلے ہی تھانے بھیج دیتا۔“

”تو کیا نورین کی تلاش میں جانے والا آپ کا ملازم جیلا جنگل سے واپس آ گیا ہے؟“ میں نے افسردہ لہجے میں استفسار کیا۔

”جی ہاں۔“ چودھری نے یہ کہتے ہوئے اپنے پیچھے کھڑے شخص کی جانب اشارہ کیا اور بتایا۔ ”یہ جیلا ہے جناب۔ یہ جیسے ہی واپس آیا اور اس نے مجھے ایک خوفناک کہانی سنا، میں اسے لے کر سیدھا آپ کے پاس آ گیا ہوں۔“

”خوفناک کہانی؟“ میں چونک اٹھا۔ ”کیسی خوفناک کہانی چودھری صاحب؟“

”نورین کے بارے میں جیلا نے جو کچھ بتایا ہے، اسے سن کر تو میری جان ہی ٹھل گئی ہے ملک صاحب۔“ چودھری نے دل گیر آواز میں کہا۔ ”آپ خود اس سے پوچھ لیں کہ اس نے ادھر جنگل میں کیا دیکھا ہے۔“

میں فی الفور جیلا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”ہاں بھی اتم جنگل میں کیا دیکھ کر آ رہے ہو۔“

”جناب! چودھری صاحب نے ہمیں جنگل کے بعد ڈاکوؤں کی واردات کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، اس سے یہی نتیجہ نکلتا تھا کہ وہ لوگ نورین بی بی کو اٹھا کر جنگل کی طرف گئے ہوں گے۔“ جیلا بڑی وضاحت سے مجھے اپنے عالیہ تجربے کے بارے میں بتانے لگا۔ ”کاش! میں رات ہی کو نورین بی بی کی تلاش میں نکل جاتا تو وہ کچھ دیکھنے کو نہ ملتا جو میں ابھی دیکھ کر آ رہا ہوں۔“

”یہی تو میں بھی جانتا چاہ رہا ہوں۔“ میں نے افسردہ انداز میں کہا۔ ”تم نے وہاں جنگل میں ایسا کیا دیکھ لیا ہے جس نے چودھری صاحب کو اتنا پریشان کر دیا ہے؟“

”میں جب جنگل میں داخل ہوا تو مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں صبح سوت میں جا رہا ہوں یا راہ سے بھٹک چکا ہوں۔“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ ضروری نہیں تھا کہ ڈاکو بھی اسی مقام سے جنگل میں داخل ہوئے ہوں جہاں سے میں گھسا تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں، یہ جنگل کتنا گھٹا اور لمبا چوڑا ہے۔“

”ہاں، یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور اپنے سامنے کھڑے جیلا سے پوچھا۔ ”ذرا مجھے بتاؤ، تم کس طرف سے جنگل میں داخل ہوئے تھے؟“

جیلا کے جواب نے میرے تن بدن میں سنسنی سی دوڑا دی۔ کھوٹی بابا نے جنگل کے جس کنارے پر نشانیاں لگائی تھیں، وہ مقام جیلا کے جنگل میں داخل ہونے والے مقام سے چند گز کے فاصلے پر تھا۔ میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

”کیا تم نے راستے میں میرے بندوں کو نہیں دیکھا؟“

”آپ کے بندے۔“ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔ ”میں سمجھا نہیں تھا کہ دار صاحب۔“

”وہ دو افراد تھے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ”ایک بچی عمر کا کھوٹی بابا اور دوسرا نوجوان کانشیل۔“

”اب تم مجھے بتاؤ، جنگل میں کیا دیکھ کر آ رہے ہو؟“ میں فوراً اصل بات کی طرف آ گیا۔

”جناب! جیسا کہ آپ جانتے ہیں، یہ جنگل بہت ہی گھٹا اور دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔“ وہ ٹھوک لگنے کے بعد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے امید نہیں تھی کہ میں اس جنگل میں نورین بی بی کا سراغ لگا سکوں گا لیکن اس موقع پر اللہ نے میری مدد کی مگر۔“

”میں جنگل میں زیادہ سے زیادہ ایک فرلانگ تک گیا ہوں گا کہ ایک صندوق کو دیکھ کر چونک اٹھا۔“

”صندوق۔“ میں نے پوچھا۔

”دور سے وہ صندوق ہی نظر آیا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن قریب جا کر پتا چلا کہ وہ نورین بی بی کے جینز کے سامان والا سوٹ کیس تھا۔ یہ سوٹ کیس گھلا ہوا تھا اور اس کے ارد گرد چاروں طرف قیمتی کپڑے پھیلے ہوئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا، ڈاکوؤں نے بڑی جگہت میں سوٹ کیس کی تلاشی لی ہو۔“

”چودھری صاحب کے مطابق، اس سوٹ کیس میں قیمتی ملبوسات کے علاوہ طلائی زیورات بھی رکھے ہوئے تھے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”تمہارے بیان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکوؤں نے سوٹ کیس میں سے طلائی زیورات نکالے اور آگے بڑھ گئے۔“

”جی ہاں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”مجھے بھی یہی لگتا ہے۔ مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ میں نورین بی بی کے لیے کچھ نہیں کر سکا۔“

”کیا تم نے جنگل میں مزید آگے جا کر نورین کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی؟“ میں نے جیلا سے استفسار کیا۔

”جی ہاں، جہاں تک میرے بس میں تھا، میں نے کوشش کی ہے جناب۔“ وہ شکست خوردہ انداز میں بولا۔ ”لیکن اس کوشش سے کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ مجھے لگتا ہے، ڈاکو نورین بی بی اور زیورات کو لے کر جنگل کے بیچوں بیچ کہیں آگے نکل گئے ہیں۔“ اتنا بتانے کے بعد وہ کسی ناکام شخص کی طرح گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

”ملک صاحب!“ چودھری امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہاں سے آپ کا کام شروع ہوتا ہے۔ جیلا جنگل میں جو کچھ دیکھ کر آیا ہے، اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکو میری بیٹی کو جنگل کے راستے کہیں لے گئے ہیں یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جنگل کے اندرونی حصے میں ان کا ٹھکانا ہو۔ اگر آپ بروقت کارروائی کریں تو نورین تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔“

”آپ بھرا فرماتے ہیں چودھری صاحب!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑی رसान سے کہا۔ ”لیکن چند باتوں کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔“

”میرا کام یہاں سے شروع نہیں ہوتا چودھری صاحب! میں نے آج صبح آپ کی حویلی سے اپنی نفیث کا آغاز کیا تھا اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرے کھوٹی نے ڈاکوؤں کا کھرا بڑی مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے۔ وہ ڈاکوؤں کے گھوڑوں کے قدموں کے نشانات کا تعاقب کرتے ہوئے جنگل تک پہنچ گیا تھا لیکن اندھا میرا ہو جانے کی وجہ سے اس کام کو عارضی طور پر روکنا پڑا۔ صبح انشاء اللہ! پھر وہیں سے کام شروع ہوگا جہاں آج چھوڑا ہے اور صبح جیلا بھی کھوٹی کے ساتھ ہوگا۔“

”جیلا۔“ میں نے پوچھا۔ ”چودھری کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔“

”میں کیوں جی؟“ جیلا نے بے ساختہ پوچھا۔

”میں چونکہ چودھری سے مخاطب تھا لہذا روئے سخن اسی کی طرف رکھتے ہوئے جواب دیا۔“ اس کی ایک خاص وجہ ہے چودھری صاحب! جیلا جہاں سے جنگل میں داخل ہوا ہے، وہ مقام اس جگہ سے چند گز کی دوری پر ہے جہاں میرے کھوٹی نے اپنے تحقیقاتی کام کو پہنچایا ہے۔ اگر جیلا میری ٹیم کے ساتھ ہوگا تو یہ انہیں اس سوٹ کیس تک پہنچا دے گا جسے یہ جنگل میں گھلا پڑا دیکھ کر آیا ہے۔ اس سے میری ٹیم کا کام آسان ہو جائے گا اور وہ جلد از جلد یہ جانے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ ڈاکوؤں کا وہ شیطانی ٹولہ طلائی زیورات اور نورین کو لے کر کس طرف گیا ہے۔“

”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!“ چودھری نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ”میں صبح تڑکے جیلا کو آپ کے پاس بھیج دوں گا۔“

”اللہ آپ کا بھلا کرے چودھری صاحب۔“ میں نے غمبیرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں جن باتوں کی وضاحت کر رہا تھا ان میں دوسرا نمبر ڈاکوؤں کے کھڑے کا ہے۔ آپ اس بات کا تو اطمینان رکھیں کہ میں انشاء اللہ بہت جلد آپ کی بیٹی کو حوض نکالوں گا۔ ڈاکو گھوڑوں پر سفر کریں یا پیدل، وہ میرے کھوٹی کی عقلی نظر سے بچ نہیں سکیں گے۔ میں ان کے کھڑے کی مدد سے بہت جلد ان کی گردنیں دیو بوج لوں گا۔“

”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے ملک صاحب۔“ وہ تشکرانہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”نمبر نمبر۔“ میں نے اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے آپ کے اس ملازم خاص جیلا سے بھی تھوڑی پوچھ بچ کرنا ہے۔ میرے ذہن میں چند ایسے سوالات ہیں جن کا

سبب ڈالجت 131 اگست 2015

ابھی تک تسلی بخش جواب مجھے مل نہیں سکا۔“

”جی ضرور۔“ چودھری نے جیلا کی طرف دیکھا۔

”آپ پوچھیں اس سے جو بھی پوچھنا چاہتے ہیں۔“

جیلا کی عمر چھبیس سا تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ ایک درمیانے قد کا ٹھہکا مالک سانولا شخص تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بے پناہ بے چینی اور اضطراب جھلکتا دیکھا۔ ہو سکتا ہے، اس کی یہ کیفیت ڈاکوؤں والے واقعے کی وجہ سے ہو۔ وہ حویلی کا محافظ تھا اور اسے انسائفل کر کے ڈاکو اس کے منہ پر کا لک مل کر چلے گئے تھے۔ یہ بڑے شرم کا مقام تھا۔ بہر حال، جیلا بڑا ڈسٹرب نظر آتا تھا۔

”بیٹھ جاؤ جیلا۔۔۔!“ میں نے قدرے نرم لہجے

میں کہا۔

”جج۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔“ وہ چودھری کی طرف دیکھتے

ہوئے بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ”میں کھڑا ہی ٹھیک

ہوں۔ آپ جو پوچھنا چاہتے ہیں ایسے ہی پوچھ لیں۔“

مجھے یہ سمجھنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا کہ وہ چودھری کے برابر والی کرسی پر بیٹھنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ میں نے بھی بیٹھنے پر اصرار نہیں کیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”جیلا! بالا نے مجھے بتایا ہے کہ وہ رات کے پہلے حصے میں سوتا تھا اور تم رات کے آخری حصے میں اپنی نیند پوری کرتے تھے؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ بالا نے آپ کو ٹھیک بتایا ہے۔“

”کیا پچھلی رات بھی بالا پہلے سویا تھا؟“ میں

نے پوچھا۔

”جی تھا نے دار صاحب!“ جیلا نے جواب دیا۔

”بالا سو رہا تھا اور تم جاگ کر پہرا دے رہے

تھے۔“ میں نے یہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے

ہوئے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا پھر بالا کے بیان کو

چیک کرنے کی غرض سے استفسار کیا۔ ”کیا آدھی رات

کے بعد تم نے بالا کو جگا دیا تھا؟“

”نہیں جناب! اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔“ وہ عجیب

سے لہجے میں بولا۔

”نوبت نہیں آئی۔۔۔۔۔ کیا مطلب؟“

”جناب! بالا مزے کی نیند سو رہا تھا اور میں جاگ کر

حویلی کی حفاظت کر رہا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے

بولا۔ ”پچھلے کچھ دنوں سے میری کمر میں درد ہو رہا تھا۔ میں

نے سوچا، تھوڑی دیر چار پائی پر لیٹ کر کمر سیدھی کر لیتا

ہوں۔ میں بالا کے برابر دوسری چار پائی پر دراز ہو گیا، پھر پتا نہیں، کب میری آنکھ لگ گئی۔“

”گویا تم نے اپنے فرض سے غفلت برتنے کا مظاہرہ کیا تھا؟“ میں نے گھور کر اسے دیکھا۔

”میں مانتا ہوں جی، وہ میری غلطی تھی۔“ وہ ندامت

آمیز انداز میں بولا۔ ”مجھے چار پائی پر نہیں لیٹنا چاہیے تھا۔

میں تھوڑی دیر تک اپنی کمر کے درد کو برداشت کر لیتا تو شاید

یہ افسوس تاکہ واقعہ پیش ہی نہ آتا۔“

”تمہیں کچھ اندازہ ہے، تم کتنے بجے چار پائی پر لیٹے تھے؟“

”میرا خیال ہے، اس وقت رات کے گیارہ یا

ساڑھے گیارہ بجے ہوں گے۔“

”پھر تو تم نے واقعی بہت غلط کیا۔“ میں نے ہونٹ سکیڑتے

ہوئے کہا۔ ”اگر تم گھنٹا، آدھا گھنٹا اور صبر کر لیتے یا تمہاری کمر میں

زیادہ ہی تکلیف تھی تو تم بالا کو جلدی جگا سکتے تھے۔“

”بس جی، جو وقت ہاتھ سے نکل جائے وہ واپس نہیں

آتا۔“ وہ شرمندگی بھرے لہجے میں بولا۔ ”میں رات کا باقی

حصہ اپنی اس غلطی پر پشیمیاں ہو ہو کر کڑھتا رہا اور صبح جب یہ

کیفیت میری برداشت سے باہر ہو گئی تو میں گھوڑے پر سوار

ہو کر جنگل کی طرف نکل گیا لیکن افسوس کہ۔۔۔۔۔“

جملہ ادھورا چھوڑ کر اس نے ندامت سے گردن جھکالی۔

میں نے مناسب الفاظ میں چودھری قادر علی کو تسلی بخشی

دی اور جیلا کو صبح تھانے بھیجنے کی تاکید کر کے انہیں رخصت

کر دیا۔

اگلی صبح بڑی سنسنی خیز ثابت ہونے والی تھی لہذا میں

تھانے سے اٹھا اور اپنے کوارٹر کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ

ایک بھر پور نیند لے سکوں۔ کل کے بارے میں کچھ نہیں کہا

جاسکتا تھا کہ کس نوعیت کی مصروفیات کا سامنا کرنا پڑتا لہذا

اس بھاگ دوڑ کے لیے آرام بھی ضروری تھا۔

☆☆☆

میں حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو اے ایس

آئی دو کا نسٹیبلو منظور اور شا کر کے ساتھ کمر کسے، جنگل کی

طرف جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ میں نے فوراً اسے اپنے

کمرے میں بلا لیا۔

”افتخار حسین!“ وہ میرے سامنے بیٹھ چکا تو میں نے

نمبر ے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”کیا کھوجی تھانے پہنچ

گیا ہے؟“

”جی ہاں۔ وہ تو کافی دیر سے آیا ہوا ہے۔“ اے

ایس آئی نے بتایا۔ ”بس، آپ کی آمد کا انتظار ہو رہا ہے۔“

میں بھی بالکل تیار بیٹھا ہوں۔

”وہ تو کہیں دیکھ کر ہی لگ رہا ہے۔“ میں نے تنقیدی نظر سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں سمجھتا ہوں، ابھی آپ لوگوں کو نکلنے میں تھوڑی دیر لگے گی۔“ بات ختم کر کے میں نے دروازے کی طرف دیکھا اور آواز لگائی۔ ”واحد۔“

”دیر کیوں لگے گی ملک صاحب؟“ اسے ایس آئی نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔

”تم لوگوں کے ساتھ ایک اور بندہ بھی جائے گا۔“ وہ کون بندہ ہے جناب؟“ اسے ایس آئی کی حیرت دو چند ہو گئی۔

”اس بندے کا نام جمیل عرف جیلا اور تعلق شس آباد سے ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ”یہ چودھری قادر علی کا وہی ملازم ہے جو کل صبح کسی کو بتائے بغیر نورین کی تلاش میں جنگل کی طرف نکل گیا تھا۔ اس کی روانگی کے بارے میں صرف اس کے ساتھی بالا کو خبر تھی۔ بالا ہی کی زبانی مجھے بھی پتا چلا تھا۔ شاید میں نے کل شام تم سے جیلا کا ذکر بھی کیا تھا۔“

”جی ملک صاحب! ذکر تو آپ نے ضرور کیا تھا مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ آج وہ بھی ہمارے ساتھ جنگل کی طرف جائے گا۔“ اسے ایس آئی نے متانت سے کہا۔ ”لگتا ہے، وہ جنگل کی طرف سے کوئی خاص خبر لایا ہے جو آپ اسے ہمارے ساتھ بھیجتا چاہتے ہیں؟“

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے افتخار حسین۔“ میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”اگرچہ جیلا، نورین کا سراغ لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تاہم وہ ڈاکوؤں کے جنگل میں پہلے پڑاؤ تک رسائی حاصل کر چکا ہے۔ وہ اگر تمہارے ساتھ رہے گا تو نورین کی تلاش میں کافی آسانی ہو جائے گی۔“

”ڈاکوؤں کا پہلا پڑاؤ۔“ اسے ایس آئی نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ”میں کچھ سمجھا نہیں ملک صاحب؟“ اس سے پہلے کہ میں افتخار حسین کی بات کا جواب دیتا، کانٹیل واحد کمرے میں داخل ہوا۔ ”جی تم ملک صاحب! شس آباد سے کوئی بندہ تو نہیں آیا؟“ میں نے کانٹیل سے پوچھا۔

”نہیں جناب! ابھی تک تو نہیں آیا۔“ ”ٹھیک ہے۔“ میں نے کانٹیل کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس بندے کا نام جمیل عرف جیلا ہے۔“

وہ جیسے ہی تمنا نے پہنچے، اسے فوراً میرے پاس لے آئے۔ ”اد کے ملک صاحب۔“ کانٹیل نے مجھے سیلیوٹ کیا اور واپس چلا گیا۔

میں نے اسے ایس آئی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اپنی بات کو مکمل کر دیا۔ یہ دراصل اس کے سوال کا جواب بھی تھا۔

”ڈاکوؤں نے جنگل میں کوئی فرلانگ بھرسز کرنے کے بعد ایک جگہ عارضی قیام کیا تھا۔ وہاں انہوں نے حویلی سے لائے گئے سوٹ کیس کا پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ وہ سارے قیمتی ملبوسات کو سوٹ کیس سے نکال کر ادھر ادھر پھینک گئے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ سوٹ کیس کو بھی جنگل کے اسی حصے میں چھوڑ گئے ہیں۔ بس، مطلقاً زیرورات اور نورین کو لے کر وہ گئے جنگل میں کہیں کم ہو گئے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ۔۔۔“ میں نے لمبائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہمارا کھوجی جنگل کے داخلی حصے پر، جہاں تک ڈاکوؤں کا کھرا پکڑ کر پہنچا ہے، وہ مقام وہاں سے چند گز کے فاصلے پر ہے جہاں جیلا سوٹ کیس اور قیمتی ملبوسات بھرسے پڑے دیکھ کر آیا ہے۔“

”اد۔۔۔“ اسے ایس آئی سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس کا مطلب ہے، جیلا کو اپنے ساتھ لے جانا سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔“

”میں نے یہی سوچ کر اسے تمہارے ساتھ بھی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”آپ کا فیصلہ زبردست اور بروقت ہے ملک صاحب۔۔۔“

ادھر اسے ایس آئی کی بات ختم ہوئی، ادھر کانٹیل واحد ایک بار پھر میرے کمرے میں موجود تھا۔ اس نے۔۔۔ یہ آواز بلند اطلاع دی۔

”ملک صاحب! شس آباد والا بندہ تو آگیا ہے مگر اس کا نام بدل گیا ہے۔“

”نام بدل گیا ہے۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے گھور کر کانٹیل کو دیکھا۔

”وہ جی۔۔۔ آپ نے کہا تھا اس بندے کا نام جمیل عرف جیلا ہے۔“ کانٹیل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”اور یہ بندہ اپنا نام اقبال عرف بالا بتا رہا ہے۔“ بالا دراصل جیلا کا جوڑی دار تھا۔ میں کل چودھری کی حویلی میں بالا کا تفصیلی انٹرویو کر چکا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا

سفید پوش

کہ چودھری قادر علی نے جیلا کی جگہ بالا کو کیوں تھا نے بھیج دیا۔ صورتو حال جاننے کے لیے میں نے کانٹیل واحد سے کہا۔

”وہ جیلا ہے یا بالا، اسے فوراً میرے پاس لے آؤ۔“ ”جی ملک صاحب۔“ کانٹیل یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

”یہ کیا ماجرا ہے ملک صاحب؟“ اسے ایس آئی نے مجھ سے پوچھا۔

”یہ ماجرا ہے یا ماجرا۔ ابھی کل کر تمہارے سامنے آجائے گا۔“ میں نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شس آباد سے آنے والا بندہ ہی اس حصے کو مکمل کر سکتا ہے۔“

انگلے ہی لمحے کانٹیل جس شخص کو میرے کمرے میں لے کر آیا، وہ صد فیصد اقبال عرف بالا تھا۔ میں نے بالا کو بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر پوچھا۔

”وہ جیلا کدھر ہے؟“

”جیلا کو رات سے بہت تیز بخار ہے تھانے دار صاحب۔“ بالا نے بتایا۔ ”چودھری صاحب نے یہی بتانے کے لیے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے اور یہ بھی کیا ہے کہ۔۔۔“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اگر آپ مجھے اپنے ساتھ جنگل لے جانا چاہیں تو میں حاضر ہوں۔“

”کیا تم ڈاکوؤں اور جنگل کے بارے میں جیلا جتنی معلومات رکھتے ہو؟“ میں نے بالا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”نہیں جی۔۔۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”تو پھر تمہیں اپنے ساتھ جنگل لے جانے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”جنگل سے زیادہ چودھری قادر علی کی حویلی تو تمہاری۔۔۔ ضرورت ہے کیا سمجھو؟“

”جی سمجھ گیا۔“ وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”جتنی طراں سمجھ گیا جناب۔“

”اگر جنگل طراں سمجھ ہی گئے ہو تو پھر فی الفور واپس چلے جاؤ۔“ میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔ ”حویلی کی حفاظت اور دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ اگر ممکن ہو تو میرا بھی ایک کام کر دینا۔“

”آپ حکم کریں سرکار۔“ وہ خامسے جوش سے بولا۔ ”ایک نہیں، میں آپ کے دس کام کر دوں گا۔“ ”دس نہیں، صرف ایک کام۔“ میں نے متنبی انداز میں کہا۔

”جی جی!۔۔۔“ وہ ہر دین گوش ہو گیا۔

”تمہیں حویلی کے اندر اور باہر رہتے ہوئے ہر لمحے اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا ہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اور ہر وقت ذہن میں اس سوال کو دہراتے رہنا ہے کہ چودھری صاحب کا ایسا دشمن کون کھس ہو سکتا ہے جس نے ذہنی اور قتل کی واردات کی ہے یا کرائی ہے؟“

”میں آپ کی ہدایات کو یاد رکھوں گا جی۔“ وہ فرماں برداری سے بولا۔ ”اور جیسا آپ نے حکم دیا ہے، میں اس کے مطابق عمل کروں گا جناب۔“

”تم اس کام کو میرے حکم سے زیادہ اپنا فرض سمجھ کر انجام دینا۔“ میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ”تم چودھری قادر علی کے پرانے نمک خوار ہو۔ اگر یہ پتا چل جاتا ہے کہ حویلی میں ہونے والی ذہنی اور نورین کے اغوا میں کس کا ہاتھ ہے تو مجھے بھروسہ تک پہنچ کر نورین کو واپس لانے میں آسانی ہو جائے گی اور چودھری کے وفادار ملازم ہونے کے ناتے تمہاری بھی یہی خواہش ہوگی کہ نورین بی بی جلد از جلد حویلی واپس آجائے۔“

”یہ آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے تھانے دار صاحب!۔۔۔ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”میری اور جیلا کی غفلت کی وجہ سے یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ ہم دونوں کی یہی خواہش ہے کہ نورین بی بی باعزت اور زندہ سلامت واپس آجائے۔ جیلا تو نورین کو ڈھونڈنے کے جنگل کی طرف بھیجے گا۔ لیکن کچھ بھی اس کے ہاتھ نہ آسکے۔ اسی شکست اور غم کی وجہ سے اسے چوتھ کر بخار چڑھ گیا ہے۔ جیلا کامیاب ہو یا جنگل سے خالی ہاتھ واپس آگیا مگر اس نے ایک کوشش تو کی اور ایک میں ہوں کہ۔۔۔“

”دل چھوٹا نہ کرو بالا۔“ میں نے اس کی آرزو کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم من و مرن میری ہدایت پر عمل کرتے رہے تو ہو سکتا ہے، تم کوئی بڑا کارنامہ انجام دے ڈالو۔“

”جی!۔۔۔“ اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ ”ہاں، میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“ میں نے مضبوط سنجیدگی میں کہا۔ ”اب تم فوراً شس آباد روانہ ہو جاؤ اور

جیسا میں نے جنہیں سمجھایا ہے اس کے مطابق مل کرو۔" بالائے دل سے میرا شکر یہ ادا کیا اور سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اسے ایس آئی افکار حسین کو کھوئی فتح محمد اور دو چاقو وچو بند کاشیلو کی معیت میں جنگل کی جانب روانہ کر دیا۔ وہ سب دو گھوڑوں پر سوار ہو کر تھانے سے روانہ ہوئے تھے۔ ایک گھوڑے پر دونوں کاشیلو سوار تھے اور دوسرے گھوڑے پر اسے ایس آئی کے پیچھے کھوئی بابا بیٹھا ہوا تھا۔ جنگل کے اندر سفر کرنے کے لیے تانکا کسی بھی صورت موزوں نہیں تھا اسی لیے گھوڑوں کا انتخاب کیا گیا تھا۔

اس روز بیٹے کا دن تھا۔ میں پورا دن تھانے میں موجود رہا لیکن کوئی بھی قابل ذکر واقعہ رونما نہ ہوا۔ میں امید کر رہا تھا کہ چودھری قادر علی ضرور تھانے چکر لگا کر صورت حال جاننے کی کوشش کرے گا۔ وہ آیا اور نہ ہی اس کی حویلی کی جانب سے کوئی تازہ اطلاع موصول ہوئی۔

شام رات میں ذیل رعیت تھی کہ جنگل کی طرف جانے والی مٹلاشی پارٹی واپس لوٹ آئی۔ ان کی شکلوں ہی سے نظر آ رہا تھا کہ وہ کام و کام دار لوٹے ہیں۔ میں نے صرف اسے ایس آئی اور کھوئی فتح محمد کو اپنے پاس بلالیا۔

"ہاں بھی کیا رہا۔" میں نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

"ملک صاحب! ہم قیمتی ملبوسات اور سوٹ کیس تو اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔" اسے ایس آئی نے مایوسی بھرے لہجے میں بتایا۔ "لیکن ڈاکوؤں اور نورین کا کچھ پتا نہیں چل سکا۔"

جیسا کہ ہے۔ میرا خیال ہے ڈاکو وہاں سے کسی گاڑی وغیرہ میں سوار ہو کر کسی طرف نکل گئے ہیں۔ اس مکی سڑک پر تیل گاڑیوں اور تانکوں کے علاوہ بسوں اور وینکوں کی آمد و رفت کے آثار بھی ملتے ہیں۔

"ڈاکو تیل گاڑی میں بیٹھے ہیں یا موزر گاڑی میں۔" میں نے غصے سے لہجہ میں کہا۔ "مگر ان چار گھوڑوں کے بارے میں تم کیا کہو گے جن پر سوار ہو کر وہ لوگ شہر آباد سے جنگل کے دوسرے کنارے تک پہنچے تھے؟"

کھوئی نے جنگل کی دوسری جانب جس مکی سڑک کا ذکر کیا تھا، وہ میری دیکھی بھائی ہوئی تھی۔ مذکورہ سڑک شمال مغرب میں تھوڑا آگے جا کر ایک مکی سڑک سے مل جاتی تھی جو سیدھی لائل پور (موجودہ فیصل آباد) شہر تک جاتی تھی۔ اگر ڈاکوؤں نے ادھر کا رخ کیا تھا تو اس کا یہی مطلب تھا، وہ اگلے پور گئے تھے اور اگر انہوں نے مخالف سمت میں سفر کیا تھا تو پھر ان کو "فیروزنگر، ملک وال اور چک بتیس" میں ڈھونڈنے کی ضرورت تھی۔ یہ تینوں گاڑیوں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے مذکورہ مکی سڑک کی زیریں جانب واقع تھے۔

کھوئی فتح محمد نے میرے جھلپٹ بھرے استفسار کے جواب میں بتایا۔ "ملک صاحب! میں نے جنگل سے باہر نکلنے کے بعد گھوڑوں کے کھرے کو تلاش کرنے کی اپنی ہی کوشش کر ڈالی ہے مگر اس مقصد میں مجھے کامیابی نہیں ہو سکی۔ اب گھوم پھر کر میرا ذہن ایک ہی طرف جا رہا ہے۔"

"چاہا! بھجارتیں نہ ڈالو۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "تمہارا ذہن گھوم پھر کر جدھر بھی جا رہا ہے فوراً اس کی وضاحت بھی کر ڈالو۔"

"میرے خیال میں ڈاکوؤں نے جنگل سے نکلنے کے بعد گھوڑوں کے سونے پر موم جاسے یا کپڑے کی تھیلیاں چڑھائی ہوں گی۔" فتح محمد نے سنجیدہ لہجے میں بتایا۔ "اسی لیے گھوڑوں کا کھرا آگے نہیں مل سکا۔ بعض شاطر مجرم اس قسم کی حرکت کرتے ہیں۔"

"اور بعض ذہین کھوئی ان شاطر مجرموں کی حرکت کو ناکام بھی بنا دیتے ہیں۔" میں نے چہیتے ہوئے لہجہ میں کہا۔ "گھوڑوں کے تھروں پر موم جاسے یا سونے کپڑے کی تھیلیاں چڑھالیے جانے کے باوجود بھی وہ پاؤں کے دباؤ کا سہارا لے کر اپنا کام نکال لیتے ہیں؟"

میں نے ایک طرح سے کھوئی فتح محمد پر طنز کیا تھا۔ وہ میرے لہجے کی ترشی اور چٹکے پن کو فوراً محسوس کر کے بولا۔

"جی ہاں! یہ بات میں بھی جانتا ہوں ملک صاحب! اور اللہ کے فضل و کرم سے مجھ میں یہ صلاحیت موجود ہے جس کا ابھی آپ نے ذکر کیا ہے۔"

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "پھر کیا ارادہ ہے تمہارا پھانچا؟"

"میں کل صبح اپنا کام وہیں سے دوبارہ شروع کروں گا جہاں آج چھوڑ کر آیا ہوں۔" اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "آج پانچ میل کے جنگل کو عبور کرنے میں اچھا خاصا وقت لگ گیا ہے اور آپ کو پتا ہے، کھرے کھوج کا کام رات کی تاریکی میں نہیں ہو سکتا۔ کل انشا اللہ اچھے اپنی صلاحیتیں آزمانے کا زیادہ موقع ملے گا اور میں آپ کو کوئی خوش خبری بھی سناسکوں گا۔"

"اللہ تمہاری زبان مبارک کرے چاہا!" میں نے غلوں دل سے کہا۔ "تم کل صبح ایک کاشیلو کو ساتھ رکھ کر کام کو آگے بڑھاؤ۔ اس کے ساتھ ہی میں لائل پور، فیروزنگر، ملک وال اور چک بتی (بتیس) کو چیک کرنے کے انتظامات کرتا ہوں۔"

کھوئی تھوڑی دیر مزید میرے پاس بیٹھ کر رخصت ہو گیا۔ میں اسے ایس آئی افکار حسین کے ساتھ اگلے دن کا انڈھل تیار کرنے میں مصروف ہو گیا۔

اتوار کی صبح اگرچہ شہروں اور قصبہ جات وغیرہ میں بننے والے عام لوگوں کے لیے بڑی سہانی ہوتی ہے مگر گاؤں دیہات میں چونکہ چھٹی... خصوصاً ہفتہ وار چھٹی کا کوئی تصور نہیں ہوتا اس لیے ہر دن ایک جیسا لگتا ہے۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ کی نوکری بھی کچھ اسی مزاج کی ہوتی ہے۔ خاص طور پر دیہاتی تھانوں میں جہاں تھانے دار کی رہائش بھی تھانے کے اندر ہی رہائشی کوارٹر میں ہو تو پھر یہی محسوس ہوتا ہے جگہ پولیس سے رشتے داری ہے اور تھانہ گھر ہے۔

اتوار کی صبح تھانے جانے سے پہلے میں ایک ضروری کام کرتا ہوں اور وہ یہ کہ بیٹے بھر کے سیلے کپڑوں کو ایک گھنٹری میں باندھنا ہوتا ہے کیونکہ دھوبی اتوار ہی کو آتا تھا۔ وہ دھلتے ہوئے کپڑے دے جاتا اور سیلے کپڑوں کی گھنٹری لے جاتا۔ میری شروع ہی سے یہ عادت رہی ہے کہ یونیفارم ہو یا عام گھریلو استعمال کے کپڑے، میں انہیں اتارتے وقت جیمیں وغیرہ ضرور چیک کر لیا کرتا ہوں۔ اسی طرح جب میں سیلے کپڑوں کی

گھنٹری باندھتا تھا تو ایک مرتبہ پھر احتیاطاً جیموں میں جھانک لیا کرتا تھا۔

کہتے ہیں، احتیاط بہت اچھی چیز ہے۔ ایسا کہتے ہیں تو کچھ بھی غلط نہیں کہتے۔ اس اتوار کی صبح بھی جب میں سیلے کپڑوں کی گھنٹری باندھتے وقت انہیں چیک کر رہا تھا۔ یونیفارم کی ایک پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو مجھے عجیب سا لگا۔ میرا ہاتھ کسی دھاتی شے سے ٹکرایا تھا۔

میں نے فوراً مذکورہ شے کو جیب سے باہر نکال لیا۔ وہ ایک لاکٹ تھا جو چاندی کی زنجیر میں پڑا ہوا تھا۔ لاکٹ کے چاندی کے فریم میں ایک فیروز زئی پتھر بڑا ہوا تھا جو غالباً فیروزہ تھا۔ چاندی کی زنجیر ایک جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔

اس لاکٹ پر نگاہ پڑتے ہی سینکڑے ہزار دینے مجھے یاد آ گیا کہ مذکورہ لاکٹ مجھے کہاں سے ملا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا، جب میں جے کی صبح چودھری قادر علی کی حویلی پہنچ کر جائے وقوعہ کا معائنہ کر رہا تھا تو یہ لاکٹ مجھے مغوی نورین کے کمرے کے فرش پر پڑا ملا تھا۔ اس وقت میں چونکہ بہت سے معاملات کو ایک ساتھ دیکھ رہا تھا اس لیے میں نے اس لاکٹ کو پتلون کی جیب میں ڈال لیا تھا کہ بعد میں چودھری سے اس کے بارے میں استفسار کروں گا۔ اطلب امکان یہی تھا کہ اس لاکٹ کا تعلق مغوی نورین سے ہوگا اور انہو کی ہنگامی واردات کے دوران میں زنجیر نوٹ جانے کے باعث لاکٹ اس کی گردن سے نکل کر کمرے کے فرش پر گر گیا ہوگا۔ لیکن یہ ایک اتفاق ہے کہ بعد میں فیروز سے والا یہ لاکٹ میرے ذہن سے نکل گیا اور اب اچانک ہی سامنے آ گیا تھا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ یونیفارم کی پہلی تلاشی میں مذکورہ لاکٹ میرے ہاتھ سے کیسے نکل گیا۔ بہر حال، ہر کام میں قدرت کی کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ اس لاکٹ کے ساتھ کون سی کہانی جڑی ہوئی تھی۔

میں حسب معمول تیار ہو کر تھانے آ گیا۔ فیروز سے والا لاکٹ میری جیب میں تھا اور میں مسلسل اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تھانے میں کھوئی فتح محمد مجھ سے پہلے موجود تھا۔ میں نے کل ایک چہیتے ہوئے بیٹے سے اس کی دھمتی ہوئی رگ کو چھیڑ دیا تھا۔ وہ خاصا جذباتی ہو گیا تھا اور اس وقت بھی بڑے جوش میں دکھائی دیتا تھا۔

فتح محمد ایک تجربہ کار اور ہنرمند شخص تھا۔ ہر فنکار جذباتی ہوتا ہے۔ اس کے اندر خود داری اور اتار بھی ہوتی

ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کل وہ میرے جیسے بیٹے کے جواب میں اچھل پڑا تھا۔ یقیناً اسے ایسا محسوس ہوا ہوگا کہ میں اس کے سامنے دوسرے ماہر کھوجوں کا ذکر کر کے اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جبکہ درحقیقت ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

میں نے فتح محمد کو ایک کانسٹیبل دے کر روانہ کر دیا۔ اس کی رپورٹ کے بعد ہی فیصلہ کیا جاسکتا تھا کہ سٹالاشیئم کو لاک پور کی طرف روانہ کیا جائے یا دیگر گاؤں کی سمت۔ پھر میں نے افتخار حسین کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ مجھے سلام کرنے کے بعد کمری پر بیٹھ چکا تو میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”افتخار! میں دو تین گھنٹے کے لیے شمس آباد کی طرف جانا چاہتا ہوں۔ اس دوران میں تمہارے کاظم ونسٹ تم سنبھالو گے۔“

”ٹھیک ہے ملک صاحب! آپ بے فکر ہو کر جائیں۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔

”کیا ادھر کوئی خاص بات ہے؟“

”ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ میں نے اس سے لاکٹ کا ذکر نہیں کیا۔ ”ہو سکتا ہے، وہاں پہنچ کر کوئی خاص بات سامنے آجائے۔ کل کا پورا دن چودھری قادر علی کی کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ پتا تو کیا جائے، ادھر حویلی میں ہو کیا رہا ہے۔“

”جی ہاں..... ضرور۔“ وہ معتدل انداز میں بولا۔

”آپ تمہارے کی طرف سے مطمئن ہو کر جائیں۔ آپ نے اتنا تو سکھایا دیا ہے کہ مجھے یہاں کام کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی اور پھر.....“ لچائی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”ملک صاحب! شمس آباد یہاں سے دور ہی کتنا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک میل نا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو بھی گئی تو میں آپ کو بلا لوں گا۔“

افتخار حسین کی پراعتاد باتوں نے مجھے مطمئن کر دیا۔ پھر اسی نے ایک کانسٹیبل کو بھیج کر میرے لیے تانگے کا بندوبست کیا اور میں کانسٹیبل واحد کے ہمراہ شمس آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے بھر وہ لاکٹ ایک لمبے کے لیے بھی میرے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

میں اور چودھری قادر علی، حویلی کی بیٹھک میں براجمان تھے۔ پہلے جب میں یہاں آیا تو بیٹھک میں بیٹھنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ وہ سارا وقت افراتفری میں گزر گیا تھا۔ چودھری کی بیٹھک سجادات اور سادگی کا خوب صورت

احترام پیش کرتی تھی۔ یعنی وہاں اہلکار بے درجہ اور کروڑوں ظاہر کرنے والی کوئی شے دیواروں پر آویزاں نہیں کی گئی تھی۔ گویا وہ بیٹھک چودھری قادر علی کے فطری سزان کی عکاس تھی۔

رکی ٹیک سلیک کے بعد چودھری نے دل گرفتہ لہجے میں پوچھا۔ ”ملک صاحب! میری نورین کی کوئی خیر خبر؟“

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں چودھری کو اپنی اب تک کی تفتیش اور تحقیق سے آگاہ کیا پھر آخر میں سلی بھر سے لہجے میں کہا۔

”آج شام تک یہ پتا چل جائے گا کہ وہ ڈاکو نورین کو جنگل سے باہر لٹکنے کے بعد لاک پور کی طرف لے گئے ہیں یا پھر زریں جانب موصفات غیر وزگھر، ملک وال اور چک تپیس کی طرف۔ ذرا صبر کا تقصیر ہو جائے، اس کے بعد نورین کی تلاش بہت آسان ہو جائے گی۔ کسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد ہی سٹالاشیئم کو روانہ کیا جاسکتا ہے۔“

”ملک صاحب! ابھی تک تو میں نے کوشش یہی کی ہے کہ ادھر بہادر پور والوں کو اس واردات کی خبر نہ ہو۔“ چودھری نے تشویش ناک لہجے سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کسی بھی طرح ایک دو دن میں نورین کو بازیاب کرنے کی کوشش کریں۔ اگر میرے دوست چودھری خدا بخش کو اس اندوہناک واقعے کا پتا چل گیا تو پھر قیامت ہی آجائے گی۔ میری بچی بھی اچھے کی اور ناک بھی کٹے گی۔“

”ایسا کچھ نہیں ہوگا چودھری صاحب۔“ میں نے پرسکون انداز میں کہا۔ ”آپ خواہنا وہ پریشان ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ”کیا آپ اس واردات کو معمولی واقعہ سمجھ رہے ہیں۔“

”نہیں چودھری صاحب! ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں نے یہ دستور نمبرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں تو چودھری خدا بخش کے حوالے سے کہہ رہا تھا۔“

”چودھری خدا بخش کے حوالے سے؟“ اس کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔

”ملک صاحب! آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آسکی۔“

”چودھری خدا بخش آپ کا ورینہ اور قابل بھروسہ دوست ہے؟“

”بے شک! ایسی ہی بات ہے۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

”سچے اور مخلص دوست اپنے دوستوں کی مجبوریوں کو سمجھنے اور ان کی مدد کرنے کی کوشش کرتے ہیں چودھری صاحب۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں تو یہی کہوں گا کہ چودھری خدا بخش کو صورت حال سے آگاہ کر دیں۔ وہ اس معاملے میں آپ سے تعاون اور ہمدردی کرے گا۔“

”نہیں ملک صاحب۔“ وہ بڑی تیزی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ابھی پانی سر سے زیادہ اونچا نہیں ہوا۔ بس، ایک دو دن میں آپ نورین کو ڈھونڈ نکالیں جب کوئی چارہ کار نہیں رہے گا تو پھر میں خود بہادر پور جا کر چودھری خدا بخش کو حالات کی حقیقتی سے آگاہ کر دوں گا۔“

”بھئی آپ کی مرضی۔“ میں نے سادہ انداز میں کہا۔ ”وہی اس وقت میں ایک اور کام سے آپ کے پاس آیا تھا۔“

”اور کام سے۔ کون سا کام ملک صاحب؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے سوپے بچے منسوبے کے تحت کہا۔ ”ادھر جنگل سے ہمیں ایک خاص شے ملی ہے۔ میں وہ شے آپ کو دکھاتا ہوں۔ ہو سکتا ہے، اس کی مدد سے ان ڈاکوؤں کا سراغ لگانے میں کوئی مدد مل سکے۔“

”جی۔ دکھائیں۔“ وہ پراشتیاق انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے فیروزے والا لاکٹ جیب سے نکال کر چودھری کی آنکھوں کے سامنے لہرایا تو اس کی آنکھوں میں شناسائی کی واضح چمک ابھری پھر وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

”یہ لاکٹ آپ کو جنگل سے ملا ہے۔؟“

”جی ہاں!“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو آپ اس لاکٹ کو اچھی طرح پہچانتے ہیں؟“

”جی ہاں، بالکل۔ اس میں نہ پہچاننے والی کون سی بات ہے۔“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ”یہ تو جیلا کا لاکٹ ہے!“

اب میرے چہرے پر کٹنے کی باری تھی۔ میں جس لاکٹ کو نورین کا سمجھا تھا، وہ جیلا کا نکل آیا تھا مگر سوال یہ پیدا ہوتا

تھا کہ جیلا کا لاکٹ نورین کے کمرے میں کیسے پہنچ گیا؟ یہ پراسنسی خیز سوال تھا لہذا میں نے نمبرے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ”چودھری صاحب! آپ کو یقین ہے کہ یہ لاکٹ جیلا ہی کا ہے۔“

”جانب! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔“ وہ شامی انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے صد فیصد یقین ہے کہ یہ لاکٹ جیلا ہی کا ہے۔ لگتا ہے، اس کی زنجیر ٹوٹنے کی وجہ سے یہ جنگل میں کہیں گر گیا ہوگا۔ اگر آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں تو جیلا سے پوچھ لیں۔ وہ ادھر گیت کے قریب اپنے کمرے میں موجود ہے۔ آپ کہیں تو میں جیلا کو یہاں بلا لیتا ہوں۔“

”لاکٹ“ کے حوالے سے پوچھ چوچھ کے لیے میں نے حویلی کی طرف آتے ہوئے راستے میں ایک لاکھ مل تیار کر لیا تھا جس میں بہت سی باتیں حقیقت سے دور تھیں اور میں سچائی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اسی لاکھ مل پر عمل پیرا تھا۔

”جیلا کا بخار اب کیسا ہے؟“ میں نے چودھری سے پوچھا۔

”اب تو وہ ٹھیک ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بس کمزوری ہے۔ ایک آدھ دن آرام کرے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ ”اب جیلا کو بلا لیں۔“

تھوڑی دیر کے بعد جیلا بیٹھک میں موجود تھا۔ چودھری کے اشارے پر وہ ایک موڑے پر بیٹھ گیا۔ جب سے مجھے یہ پتا چلا تھا کہ فیروزے والا وہ لاکٹ جیلا کا تھا اور ہر وقت اس کی گردن میں لٹکا رہتا تھا، میرے رگ و پے میں ایک عجیب سی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک سے بیٹھ چکا تو میں نے اس سے پوچھا۔

”جیلا! تمہارا وہ لاکٹ کہاں ہے جو ہر وقت تمہاری گردن میں موجود رہتا تھا؟“

”پتا نہیں جی، وہ کہاں گر گیا ہے۔“ وہ اپنی گردن پر ہاتھ بھیرتے ہوئے بولا۔ ”میں نورین بی بی کی وجہ سے بہت زیادہ پریشان رہا ہوں بلکہ ابھی تک پریشان ہوں۔ جب تک نورین بی بی واپس نہیں آجاتی، حویلی میں رہنے والا ایک ایک شخص بلکہ پورا شمس آباد ہی اداس اور غمگین رہے گا۔“ وہ لمبے بھر کے لیے رکا۔ ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”ان دو تین دنوں میں یہاں ایسی افراتفری رہی ہے کہ مجھے خود اپنا ہوش نہیں رہا۔ لاکٹ پر کیا دھیان دیتا۔“

”تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے جیلا۔“ میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”انشاء اللہ! میں مغربیہ نورین کو بازیاب کروں گا۔ فی الحال میں تمہارا فیروزہ والا لاکٹ دھونڈنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔“

جیلا کی آنکھوں میں ابھرنے آمیز حیرت نمودار ہوئی۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ ”وہ آپ کو کہاں سے ملا؟“

”تھوڑی دیر پہلے میں نے مذکورہ لاکٹ کو جیب میں رکھ لیا تھا۔ جیلا کے اضطرابی سوال پر میں نے وہ لاکٹ اپنی جیب میں سے نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ لاکٹ ہمیں جنگل میں سے ملا ہے۔“

”اس کی زنجیر ٹوٹی ہوئی ہے۔“ وہ لاکٹ کو ہاتھوں میں پھراتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے، جب میں نورین بی بی کی تلاش میں جنگل کی طرف گیا تھا تو یہ لاکٹ زنجیر ٹوٹ جانے کی وجہ سے وہاں گر گیا ہوگا۔“

میں اس دوران میں مسلسل جیلا کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان لمحات میں جیلا مجھے خاصا الجھا ہوا دکھائی دیا۔ ہو سکتا ہے یہ اس کی بیماری کے اثرات کا شریک ہو۔ بہر حال میں نے اسے لپکا کرنے کی خاطر پوچھا۔ ”دیسے یہ لاکٹ ہے تو تمہارا ہی؟“

”ہاں جی، بالکل!“ وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں بھلا اپنے لاکٹ کو پہچاننے میں کس طرح غلطی کر سکتا ہوں۔ پورے شمس آباد میں ایسا لاکٹ اور کسی کے پاس نہیں ہے۔“

”اور تمہیں اس بات کا بھی یقین ہے کہ جمعے کی صبح جب تم نورین کی تلاش میں، چودھری صاحب کو بتائے بغیر چپ چاپ جنگل کی طرف جا رہے تھے تو یہ لاکٹ تمہاری گردن میں موجود تھا؟“ میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں استفسار کیا۔

جنگل میں کہیں گر گیا ہوگا۔ میں نے لاکٹ کو تلاش کرنے کے بارے میں بھی سوچا تھا لیکن تیز بخار نے مجھے اس کی مہلت ہی نہیں دی اور اب بھی کمزوری کی وجہ سے اسے پکڑا رہے ہیں کہ میں ٹھیک طرح آپ سے بات بھی نہیں کر پا رہا ہوں۔“

”ہاں جیلا! میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں کہ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“ میں نے بعد دی بھرے لہجے میں کہا۔ ”تم یہ لاکٹ اپنے پاس رکھ لو اور اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ نورین کے حوالے سے بھی ذہن کو تھکانے کی ضرورت نہیں۔ ایک دو دن میں وہ حویلی میں موجود ہوگی۔“

جیلا نے لاکٹ کی ”بازیابی“ کے لیے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھے سلام کر کے بیٹھک سے نکل گیا۔ چودھری سے سوچتی ہوئی گہری نظر سے مجھے دیکھا اور بکھری ہوئی ابھرنے زدہ آواز میں پوچھا۔

”ملک صاحب! میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کیا کرتے پھر رہے ہیں؟“

”کیا مطلب چودھری صاحب؟“ میں نے پوچھا۔ ”مطلب یہ کہ۔“ وہ بہ دستور اچھے ہوئے انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ کی باتوں اور ان سے جھمکنے والے اطمینان سے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو انہی طرح معلوم ہے، نورین کہاں ہے۔ اور آپ جب چاہیں گے اسے سامنے لے آئیں گے؟“

”ایسی بات نہیں ہے چودھری صاحب!“ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ”یہ خدا مجھے اس بات کا تو علم نہیں کہ نورین اس وقت کہاں ہوگی لیکن اگر آپ میرے ایک سوال کا بالکل درست جواب دیں تو ممکن ہے، میں شام سے پہلے آپ کی بیٹی کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جاؤں۔“

”ملک صاحب! اس وقت مجھ سے زیادہ اور کوئی اس بات کا خواہش مند نہیں ہوگا کہ نورین جلد از جلد باعزت اور صحیح سلامت واپس حویلی پہنچ جائے۔“ وہ آگے کو جھک کر گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”آپ جتنے بھی سوالات پوچھیں گے، میں ان کا ٹھیک ٹھیک جواب دوں گا۔“

”جتنے اور کہتے نہیں، صرف ایک سادہ سا سوال۔“

”جی پوچھیں، آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے

مسکین پوش

ہیں؟“ وہ بہترین گوش ہو گیا۔

”میں نے جھپٹے پھیرے میں حویلی کے اندر دنی جیسے کا تفصیلی جائزہ لیا تھا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”خاص طور پر ان چار کمروں کا جو ایک ہی قطار میں بنے ہوئے ہیں جن میں سے تین تو آپ لوگوں کی خواب گاہیں ہیں اور چوتھے کمرے میں نورین کا جینز بھرا ہوا ہے۔“ لچائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کی، آپ کے بچوں کی اور نورین کی خواب گاہ میں کس کس کو جانے کی اجازت ہے؟“

”میں، میری گھر والی زادہ پروین، بشیراں بی بی، نوید، سعید اور نورین۔“ اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ”یا پھر جو ہمارے قریبی رشتے دار ہیں، وہ جب شمس آباد آتے ہیں تو وہ ان کمروں میں بہ آسانی آ جاسکتے ہیں۔ ویسے میں نے باہر سے آنے والے مہمانوں کے قیام و طعام کے لیے حویلی کے اندر ہی دو تین کمرے الگ سے بھی بنا رکھے ہیں۔“

”جیلا اور بالا سے آپ کی کوئی رشتہ داری نکلتی ہے؟“ میں نے چودھری کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے غامض لہجے میں استفسار کیا۔

”نہیں جی، بالکل نہیں۔“ وہ شمس انداز میں بولا۔ ”وہ صرف ملازم ہیں۔ ٹھک خوار اور وفادار ملازم۔ انہیں حویلی کے اندر دنی رہائشی کمروں میں آنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ وہ زمان خانے سے دور حویلی کے بیرونی حصے میں ڈیوٹی دیتے ہیں۔“

”اگر میں یہ کہوں کہ۔“ میں نے بھی تھوڑا آگے جھک کر معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ ”وہ نیلے پتھر والا چاندی کا لاکٹ مجھے نورین کے کمرے کے فرش پر پڑا ملا تھا تو آپ کا رد عمل کیا ہوگا چودھری صاحب؟“

”اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!“ میری بات سنتے ہی چودھری اچھل پڑا۔ ”جب جیلا کو نورین کے کمرے میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں تو پھر اس کا لاکٹ وہاں کیسے پہنچ سکتا ہے۔“

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں چودھری کو فیروزہ والے لاکٹ کی کہانی سنائی اور آخر میں کہا۔ ”مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ جیلا اس ڈکیتی اور اغوا والی واردات کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔“

اس کی آنکھیں حیرت سے چٹکیں، وہ جھرمجراتی

ہوئی آواز میں بولا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ملک صاحب؟“

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“ میں نے چارے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ”میں آپ کے ٹھک خوار جیلا کو اپنے ساتھ تھانے لے کر جا رہا ہوں۔ شام سے پہلے اس نے حیرت انگیز اور ناقابل یقین انکشافات نہ کیے تو میں سمجھوں گا، اب تک میں نے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں جھگ مارا ہے۔“

چودھری قادر علی مشکل بی سے کسی عمر اس بات کے لیے راضی ہو گیا کہ میں جیلا کو تفتیش کے لیے تھانے لے جاؤں۔ اس کے بعد حویلی میں رکنے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔ ہم نے جیلا کو تانگے میں بٹھایا اور تھانے کی جانب روانہ ہو گئے۔

وہ راستے بھر خاموش اور کھویا کھویا سا رہا۔ میں نے جیلا کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے کس مقصد کے لیے تھانے لے کر جا رہا ہوں۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ میں نورین کی تلاش کے سلسلے میں اسے کوئی اہم ذمہ داری سونپنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

۱۶۰

مجھے شروع ہی سے جیلا اور بالا پر شک تھا۔ وہ چودھری کی حویلی کے محافظ تھے اور اس پر اسرار واردات کے وقت وہ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر پائے گئے تھے اور یہی بات مجھے ہنسنے نہیں ہو رہی تھی۔ بالا کا تفصیلی انٹرویو کرنے کے بعد میں مطمئن ہو گیا تھا لیکن جیلا کا رویہ ابتدا ہی سے مشکوک تھا۔ یہ لاکٹ والا ”معاذ“ سامنے آنے کے بعد تو میرا یہ شک یقین میں بدل گیا تھا کہ وہ اس واردات کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ جانتا ہے۔

میں نے تھانے پہنچ کر جیلا کو خونگ صورت والے ایک حوالدار کے حوالے کیا اور واضح الفاظ میں کہا۔ ”چمن خان! میں جانتا ہوں کہ چودھری قادر علی کی حویلی میں ہونے والی ڈکیتی اور اغوا کی واردات میں کسی نہ کسی حوالے سے یہ جیلا بھی ملوث ہے۔ اس کی زبان سے اقرار کرانا اب تمہاری ذمہ داری ہے۔“

”آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب!“ چمن خان نے جیلا کو ایسی نظر سے دیکھا جیسے قصاب، بکرے کو دیکھتا ہے۔ ”میں ایک گھنٹے کے اندر آپ کو رپورٹ پیش کرتا ہوں۔“

اس کے بعد چمن خان، جیلا کو دھکیلتے ہوئے نرمل روم کی طرف لے گیا۔ جیلا اس غیر متوقع صورت حال سے بے حد خوفزدہ ہو گیا تھا لہذا اس نے چمن خان کی بتائی ہوئی مدت

چھوٹی فیکٹریوں کے ۳۰ کچھ بھی نہیں تھا۔ ٹرین لندن ٹرانسپورٹ سسٹم کے آخری اور نو تعمیر شدہ اسٹیشن، یلنگٹورڈ برج کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہ اسٹیشن نو تعمیر شدہ مڈل سیکس یونیورسٹی کے متعلقین کی سہولت کے لیے بنایا گیا تھا۔ شام کا جھٹ پنا اترنے لگا تو اسٹریٹ کیسپس تاریخی روشنی اٹھنے لگے۔ مسٹر بنسن اسٹیشن پر اترے تو انہیں فٹ پاتھوں پر برف نظر آئی۔ ان کے ہاتھ میں ایک بوسیدہ سا

جس ٹرین میں مسٹر بنسن سوار ہوئے، وہ لوگوں سے کچھ کچھ بھری ہوئی تھی اور زیر زمین سڑک پر تھی۔ وہ اوٹر جنوری کی سہ پہر میں ہر اسٹاپ پر مسافروں کو اتار دیتی بڑی کافی سے دریائے ٹیمز کے ڈیلٹائی علاقے میں سطح زمین پر رواں دواں تھی اور تقریباً خالی ہو چکی تھی۔ وہ ایسے علاقوں سے گزر رہی تھی جن کے نام بڑے رومانوی تھے لیکن وہاں اینٹوں کے بنے ہوئے پرانے مکانات اور چھوٹی

احتجاج شکن

ابونیہ اقبال

دنیا میں دو طرح کے لوگ ایذا مند مقام بننا پاتے ہیں۔ ایک بہت اچھے... دوسرے بہت بُرے... لہذا ان کے کردار و عمل میں بھی انفرادیت پائی جاتی ہے۔ ان کی پسند ناپسند اور اظہار کے طریقے بھی الگ ہوتے ہیں۔ اگرچہ اسے بھی بہت ساری باتوں پر اعتراض تھا مگر احتجاج کا سخت مخالف دنیا اور اس نے اپنی مخالفت کا اظہار کچھ اور ہی رنگ میں کیا کیونکہ اس میں کچھ نہ کچھ تو انفرادیت تھی۔

دنیا میں کچھ لوگ کرکٹ کے میدان میں جہاں ایک احتجاج شکن کا قصہ

کی مدد اور تعاون سے حویلی کے اندر داخل ہوئے۔ اس وقت بالا گہری فینڈ سوار ہاتھا۔ اس کی ٹاک پر مخصوص رومال رکھ کر اسے اٹھا فٹیل کر دیا گیا تھا۔ جیلاؤ کوؤں کے ساتھ پہلے نورین والے کمرے تک پہنچا۔ ڈاکوؤں نے سوئی ہوئی نورین کو بھی رومال کی مدد سے اٹھا فٹیل کر دیا۔ اس کے بعد جیلاؤ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا اور خود کو بے ہوش ثابت کرنے لگا۔ ڈاکوؤں کی وہ مکمل راہنمائی کر چکا تھا۔ انہوں نے نورین کو کندھے پر لاوا اور طوائف زیورات والا سوٹ کیس اٹھا کر پلٹے بنے۔

ان کے سچ جنگل کے ایک مخصوص حصے میں اگلی صبح ملاقات طے تھی جہاں بشارت بھی موجود ہوتا اسی لیے قتل کی سچ جیلاؤ چپ چاپ جنگل کی طرف نکل گیا تھا۔ پروگرام کے مطابق طوائف زیورات پر ڈاکوؤں کو قبضہ کرنا تھا اور نورین جیلاؤ کے حوالے کر دی جاتی۔ جیلاؤ بشارت کی مدد سے نورین کو لے کر کسی محفوظ علاقے کی طرف نکل جاتا لیکن ڈاکو، جیلاؤ کو چادے گئے تھے۔ اگلی صبح جب وہ جنگل کے مخصوص مقام پر پہنچا تو وہاں کھلے ہوئے سوٹ کیس اور ریشمی لمبوسات کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس صورت حال سے جیلاؤ کے ذہن کو ایسا دھچکا لگا کہ وہ تیز بخار میں مبتلا ہو گیا۔ جیلاؤ جب ڈاکوؤں کی راہنمائی کرتے ہوئے نورین کے کمرے میں گیا تھا تو وہیں اس کا لاکٹ گر گیا تھا جو اس کیس کو کھل کرنے کا سبب بن گیا۔

جیلاؤ کی نشان دہی پر میں نے چک تیس اور ارد گرد کے گاؤں دیہات میں چھاپے مار کر بشارت کو گرفتار کر لیا۔ وہ فیروزنگر سے آگے ایک گاؤں ٹروٹ میں چھپا ہوا تھا۔ جب میں نے بشارت کو قفیش کی ہنگی میں پینے کے لیے ڈالا تو اس نے ڈاکوؤں کے بچے ٹھکانے سے مجھے آگاہ کر دیا۔ میں نے سرٹوڈ کو کوشش کر کے انھارہ اپریل بدھ کے روز دوپہر میں نورین کو بازیاب کر لیا۔ یعنی اس کی برات سے صرف ایک دن پہلے۔ اس دوران میں نورین کے ساتھ کیا بیٹی اور میں نے جیلاؤ بشارت سمیت ڈاکوؤں کا کیا حشر کیا۔ یہ ایک الگ عبرت ناک داستان ہے جو پھر کسی مناسب موقع پر بیان کروں گا۔

محبت کرنا کوئی جرم ہے اور نہ ہی گناہ لیکن اس محبت کے حصول کے لیے جرم کی راہ اختیار کرنا کسی بھی طور قابل معافی نہیں۔ اگر یہ نکتہ انسانوں کی سمجھ میں آجائے تو ہماری دنیا جنت بن جائے گی۔

(تحدید: حسام ہت)

سے پہلے ہی زبان کھول دی۔ جو لوگ زندگی میں پہلی مرتبہ کسی سنگین جرم کا ارتکاب کرتے ہیں اور پولیس سے بھی ان کا واسطہ نہیں پڑا ہوتا، ان کی زبان کو کھلوانے کے لیے عکسریہ ک نفیسی جھکندے استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

”مک صاحب! یہ بندہ تو بھیڑ سے بھی زیادہ ڈر پوک لگا ہے۔“ چمن خان نے میرے پاس آکر بتایا۔ ”اس نے زبان کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ کھول دیا ہے۔ اس وقت اس کے بدن سے بدبو کے پھکے اٹھ رہے ہیں۔“

”تم جلدی سے جیلاؤ کی صفائی ستھرائی کا بندوبست کرو چمن خان!“ میں نے براہ راست بتاتے ہوئے کہا۔ ”تاکہ اس کا بیان قلم بند کیا جاسکے۔“

جیلاؤ، نورین کو پسند کرتا تھا لیکن اس پسندیدگی کے اظہار کا مطلب یہ تھا کہ اپنے پروانہ موت پر دستخط کرنا۔ جب نورین کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی تو وہ اس رہنے لگا۔ نورین کو کچھ ہی دنوں میں جس آباؤ کو چھوڑ کر بہادر پور طے جانا تھا۔ یہاں رہتے ہوئے تو بھی کبھار اسے نورین کی شکل نظر آ جاتی تھی لیکن اگر وہ بیاہ کر بہادر پور چلی جاتی تو پھر جیلاؤ کے لیے بڑی مشکل ہو جاتی۔ احساسِ محرومی، جذبات کی شکست اور نا آسودہ خواہشات نے اسے ایک شیطانی منصوبے پر عمل کرنے کے لیے اکسایا۔ چک تیس میں اس کا ایک دوست بشارت رہتا تھا جس کے ہر قسم کے لوگوں سے تعلقات تھے۔ بشارت نے جب جیلاؤ کی چٹا سنی تو وہ اس کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

جیلاؤ حویلی کے اندرونی معاملات سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ بشارت کے مشورے پر ڈاکوؤں کا آلہ کار بننے پر تیار ہو گیا۔ اس نے حویلی کے اندرونی حالات سے ڈاکوؤں کو آگاہ کر دیا۔ ان چار ڈاکوؤں کا بندوبست بشارت نے کیا تھا۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب چار ڈاکو گھوڑوں پر سوار ہو کر چودھری قادری کی حویلی پہنچ گئے۔ ان کے پاس بے ہوش کرنے والی دوا (کھوروفارم) میں بیسے ہوئے رومال بھی تھے۔ دو ڈاکو جیلاؤ



سوٹ کس تھا۔ وہ ہائی اسٹریٹ کی طرف جانے والی
ڈھولان پر چل رہے تھے۔ ہائی اسٹریٹ پر پہنچے تو انہیں احساس
ہوا کہ وہاں کچھ ہو رہا ہے۔
سڑک کے بچوں سچ لوگوں کا ایک گروہ مارچ کر رہا
تھا۔ ان میں سے بیشتر کچھ گارے تھے اور کچھ چلا رہے
تھے۔ ان کے عقب میں کافی ٹریفک رکھا ہوا تھا اور اس میں
اضافی شور مچا رہا تھا۔ وہ قریب آئے تو مسٹر بنسن کے کانوں
میں کچھ لفظ پڑے وہ طلبا تھے، ان کا نعرہ تھا: "جب تک
ہمارے مطالبات تسلیم نہیں کیے جائیں گے ہم شیو نہیں کریں
گے۔" ایک اور گروپ گچرا رہا تھا۔ "ہم جیک ہاروے کو کسی
گزوے سب کے درخت پر پھانسی دیں گے۔" وہاں ایسے
لوگ جو نہ گارے تھے، نہ نعرے لگا رہے تھے صرف پولیس
والے تھے جو جلوس کے ساتھ ساتھ مارچ کر رہے تھے۔

اگلی قطار میں تین افراد تھے۔ وہ قریب سے گزرے
تو مسٹر بنسن نے انہیں صاف طور پر دیکھا۔ درمیان میں
ایک سونا تازہ سرخ چہرے والا، نکل جیسا نوجوان تھا۔ اس
کی داہنی طرف کافی کی رنگت والا ایک نوجوان تھا۔ اس کے
بال کالے تھے بہت پتلی سیاہ موٹھیں تھیں۔ وہ بہت سنجیدہ
لمحہ لگتا تھا۔ بائیں جانب سفید رنگت والی ایک پرکشش لڑکی
تھی اس کے منظر اگلے بال تانبے کی رنگت کے تھے۔
مسٹر بنسن کھڑے وہ تماشا دیکھتے اور شور مچاتے رہے
یہاں تک کہ جلوس بہت دور چلا گیا۔ بالآخر ٹریفک کے
دھارے نے دوبارہ بہنا شروع کیا۔ کار ڈرائیو کرنے
والوں کے چہروں پر بے زاری کا تاثر تھا مسٹر بنسن بھی
آگے بڑھ گئے۔

برف باری پھر شروع ہو گئی تھی۔

مسٹر بنسن کے ذہن میں یونیورسٹی کا ایک خاص تصور
تھا۔ اس لیے انہیں شاک لگا۔ ڈیڑھ گھنٹے میں یونیورسٹی کو بڑے
پیمانے پر بنانے کی اسکیم رہی ہوگی لیکن بعد میں بچت کے نقطہ
نظر سے مختصر تبدیل کیا گیا ہوگا۔ اس لیے محارمیں بے ڈھنگی
ی لگ رہی تھی۔ وہاں ہرے بھرے لان بھی نہیں تھے۔
دیکھنے میں وہ کسی عام سی جاگیر اور آرکیٹیکچرل کونٹرنٹ کے
درمیان کی کوئی چیز لگتی تھی۔

انہوں نے پرنسپل کا لاج تلاش کیا جو نام نہاد یونیورسٹی
کے دور ترین حصے میں واقع تھا۔ پرنسپل نے مسٹر بنسن کا خیر
مقدم کیا۔ ڈاکٹر جیک ہاروے سفید بالوں والا ایک سونا پلپلا
فصیح تھا۔ اس کے ہونٹوں پر رکی پیشہ وارانہ مسکراہٹ تھی۔
"آؤ..... اندر آ جاؤ۔" اس نے کہا۔ "تم تو لگتا ہے

مخمد ہو چکے ہو۔ کیا یہاں تک پیدل آنا پڑا؟ ہاں یہاں
ٹیکسیوں کی بڑی قلت ہے۔ مسٹر بنسن، مجھے خوشی ہے کہ تم
ٹیکسی کے عارضی رکن کی حیثیت سے جوائن کر رہے ہو۔
جس میں جدید یورپ کی معاشرتی اور معاشی تاریخ کے مضمون
کو گور کرنا ہوگا۔ وزیر صاحب نے تمہاری زوردار سفارش
کرتے ہوئے یہ بھی بتایا تھا کہ تم باہر لسانیات بھی ہو۔"
"ہی ہاں، یورپ کی بیشتر زبانوں میں شد بد رکھتا
ہوں میں۔" مسٹر بنسن نے انکساری سے کہا۔

"تب تو تم بہت کارآمد ثابت ہو گے۔ اس مضمون کی
بیشتر کتابیں جرمن زبان میں ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں تم ہمارے
ہاں مستقل طور پر آ جاؤ؟"

"پہلے میں طلبا سے مل لوں تبھی کچھ کہہ سکتا ہوں۔
یہاں آتے ہوئے راستے میں کچھ طلبا ملے تھے۔ بیشتر
اٹھائے ہوئے ایک اچھی خاصی فوج۔"

"وہ اکثر مظاہرے کرتے رہتے ہیں۔" ڈاکٹر
ہاروے نے کہا۔ "اس بار کیا مسئلہ تھا؟"
"مجھے تو صرف ایک نعرہ سنائی دیا..... جیک ہاروے
کو پھانسی دو۔"

پرنسپل ہنس دیا۔ "بہت زعمہ دل لوگ ہیں لیکن بے
ضرر ہیں۔ میں نے گزشتہ سال کے آغاز میں یہاں کا چارج
لیا تھا جب سے اب تک میرے درجنوں پتلے چلائے جا چکے
ہیں لیکن مجھے کوئی فکر نہیں ہوئی۔"

"بس آپ کے پتلے ہی ملتے رہیں تو کوئی حرج
نہیں۔" مسٹر بنسن نے اٹھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

دو دن بعد بنسن نے پہلی بار کلاس کا سامنا کیا۔ یہ
بات ان کے لیے دلچسپی کا باعث تھی کہ مظاہرہ کرنے والے
طلبا کے تینوں لیڈر اس کلاس میں موجود تھے۔ وہ ان کے
متعلق توڑا بہت تو معلوم کر چکے تھے۔ لڑکی ایلیا دارنی تھی،
کرڈ پتی سیوکیل دارنی کی بیٹی۔ بھاری بھر کم لڑکا آئرش
تھا، اس کا نام پیٹرک میکان تھا۔ دہلے پتلے لڑکے کے متعلق
وہ پہلے ہی سے جانتے تھے۔ وہ احمد بن اکبر بن سلیمان تھا،
راں الدار کے حکمران کا وارث۔

اس مفروضے کے تحت کہ جس چیز میں انہیں دلچسپی
ہے اس میں ان کے اسٹوڈنٹ بھی دلچسپی لیں گے، مسٹر
بنسن نے جنگوں کے درمیان کے جرمی کا موضوع منتخب کیا۔
انہوں نے کوٹ ایڈن اور ہولین کی عبوری حکومت کا تجربہ کیا
اور بالاکن کی حکومت تک پہنچے تو ایلیا نے مداخلت کی۔ اس

نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے بڑے مہذب لہجے میں پوچھا۔
"سرا اگر ہم درمیان میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہیں
تو آپ اس مداخلت کا برا تو نہیں مانیں گے؟"
"ہرگز نہیں۔" مسٹر بنسن نے کہا۔ "لیکن یہ بات
پوچھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟"
"وہ..... کچھ پیچیدہ ایسے ہیں کہ اس پر بہت ناراض
ہوتے ہیں۔"

"میں جنہیں یقین دلاتا ہوں کہ مجھ جیسے شوقیہ پیچیدہ
آؤٹ آف پرنسپل بھی ہوں انکی مداخلت کا خیر مقدم
کرتے ہیں۔ اس طرح انہیں سکھ کا سانس لینے کی سہولت بھی
مل جاتی ہے اور یہ سکون بھی ہو جاتا ہے کہ وہ جو لوٹس تیار
کر کے لائے ہیں ان کی مدد سے پورا پیریز گزر جائے
گا۔" اس پر پوری کلاس خوش دلی سے ہنس دی۔

"بات یہ ہے کہ آپ جس عہد پر پیچیدہ کر رہے ہیں
وہ بہت خوف ناک رہا ہوگا لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس کے
بعد جو دور آیا وہ بظہر کا تھا۔ تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ موازنہ کیا
جائے تو بظہر کا عہد اپنے پیش روؤں کے عہد سے بہتر تھا؟"
"میرا خیال ہے کہ بظہر بہت تباہ کن تھا۔" مسٹر بنسن
نے آہستہ سے کہا۔ "نہ صرف جرمی کے لیے بلکہ پوری
مغربی دنیا کے لیے۔"

"لیکن یہ فیصلہ آپ شاید جنگ کے بعد شائع ہونے والی
کتابوں کے حوالے سے صادر فرما رہے ہیں۔" احمد نے کہا۔
"اگر تم سمجھتے ہو کہ میں نے یہ بات صرف کتابوں کی
بنیاد پر کہی ہے تو تم غلطی پر ہو۔ اس میں میرے ذاتی
تجربات اور مشاہدات کا بھی دخل ہے۔"
"تو آپ بظہر سے ملے تھے؟"

"ہاں، دو بار ملا تھا۔"
"مگر وہ رکی ملاقاتیں ہوں گی۔" احمد نے اعتراض
کیا۔ "اور آپ ان کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہیں دے سکتے۔"
"ایک ملاقات رکی تھی مگر دوسری غیر رکی تھی اور
دونوں بار میں نے انکی کوئی بات نہیں دیکھی، جس سے تاریخ
کا فیصلہ لفظ یا جانب دارانہ قرار دیا جاسکے اور اس سے میری
یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بدھنکی، بدامنی اور سیاسی انتشار
اپنے پیچھے ہمیشہ کوئی ڈکٹیٹر شپ لاتا ہے۔"

"کیا یہ ایسا اصول ہے جو کبھی غلط ثابت نہیں ہو سکتا؟"
احمد نے پوچھا، اس کے انداز میں دلچسپی تھی۔
"نہیں، تشکیات بھی ہیں مثلاً آئر لینڈ میں عام طور پر
سیاسی انتشار مزید سیاسی انتشار لاتا ہے۔" اس پر توجہ کے

میں مطابق پیٹرک میکان بھڑک اٹھا۔ تاہم پیریز مکمل طور
پر خوش گوار انداز میں گزرا۔

☆☆☆

"یہ شخص کون ہے؟" میکان نے جانی لیتے ہوئے
پوچھا۔ وہ تینوں اس وقت ایلیا کے کونٹری نما کمرے میں
بیٹھے تھے۔ احمد اور ایلیا بیڈ پر تھے اور میکان اکلوتی کرسی پر
قابض تھا۔

"یہ اس نرم میں موروثی کے حصے کے پیچیدہ ہارے
کرے گا۔" ایلیا نے بتایا۔
"اچھا پیچیدہ نہیں لیکن موروثی سے بہر حال بہتر ہے۔"
"مجھے تو بھی بہت اچھا لگا اور خدا کے لیے جمائیاں
لینا بند کرو پیٹرک۔"

"مجھے خینڈ آرہی ہے۔"
"شام چار بجے خینڈ کا کیا کام اور سنو ہمارے ایجنڈے
پر اہم معاملات موجود ہیں۔ پہلا نکتہ کل کا مظاہرہ۔"

"تم مصر ہو کہ وہ پر تشدد ہوگا؟" احمد نے پوچھا۔
"ہاں، میں اس پر اصرار کروں گی۔ ہمارے عام
مظاہرے لا حاصل ثابت ہو چکے ہیں۔" ایلیا بولی۔ "ابھی
تک ہم ٹریفک بلاک کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکے ہیں۔ ہم
بااختیار لوگوں پر کوئی تاثر نہیں چھوڑ سکے ہیں۔ اگر تم شامل
نہیں ہوتا چاہتے تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔"

"نہیں شامل تو میں ہوں گا۔"
"لیکن لگتا ہے تم قائل نہیں ہوئے ہو۔ تمہارے لہجے
میں زور نہیں۔"

"جو کچھ ہم طلب کر رہے ہیں وہ میں جانتا ہوں جائز
ہے۔ یہ کہ ہمارے ساتھ بچوں کا سا برتاؤ نہ کیا جائے۔ ہمیں
اپنے معاملات میں آزادی حاصل ہونی چاہیے اور یہ بھی سن
لو کہ میں تشدد سے خوف زدہ نہیں۔ میں جہاں سے آیا ہوں
وہاں تشدد معمولات میں شامل ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ
تشدد کے رد عمل کے طور پر روپے اور سخت ہو جاتے ہیں۔ فی
الوقت ہم میں سے چند ایک ہی ایسے ہوں گے جو بااختیار
لوگوں سے فساد محسوس کرتے ہوں۔ کم از کم مجھے کوئی عناد
نہیں، بغیر کسی وجہ کے تشدد پر اتر آنا میرے خیال میں
زیادتی ہے۔"

ایلیا نے گہری سانس لی۔ "یہ تو اچھی صورت حال
نہیں۔ چلو، پیٹ کا ووٹ فیصلہ کن ہوگا۔" لیکن کرسی کی
طرف سے خراٹوں کی آواز آرہی تھی۔
"خدا کی پناہ، یہ تو سوچنا ہے۔"

”چہ تو کوئی اچھی پینٹس شیٹ نہیں۔“
 ”ممکن ہے میں کچھ بڑھا چڑھا کر بیان کر گیا ہوں۔
 بہر حال بڑھا چڑھا انہی خطوط پر سوچ رہا ہے۔ مغربی تہذیب
 کو سمجھنے کے لیے اس نے اپنے بیٹے کو انگلینڈ کی ایک
 یونیورسٹی میں تعلیم کے لیے بھیجا ہے تاکہ چتا چل جائے کہ
 مغربی تہذیب کے کیا فائدے ہیں اور کیا نقصانات۔ فارن
 آفس نے ڈل ریکس یونیورسٹی تجویز کی تھی۔ انہوں نے سوچا
 تھا کہ نئی یونیورسٹی ہونے کی وجہ سے وہاں زیادہ مسائل نہیں
 ہوں گے۔“

”یونیورسٹی نئی تھی لیکن وہاں طلباء بہت تیزی سے سیکھ رہے ہیں۔ دو دن پہلے انہوں نے پرنسپل کی اقامت گاہ پر چھراؤ کیا، کمزریوں کے شیشے توڑے، پرنسپل کا رویہ تبدیل ہو گیا۔ اب وہ ایک مہربان اکل ہے نہ بڑا بھائی اور تو ایک پھر ادا شیر بن گیا ہے۔“

”مجھ سے مل چکا جانے والا ایک پتھر پوری دنیا کو بدل سکتا ہے لیکن مجھے فکر احمد کی ہے کہیں وہ پتھر احمد نے نہ پھینکا ہو۔“

”احمد اس جنگ میں سب سے اگلی صف میں تھا۔ خوش قسمتی سے پولیس نے اس پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ انہوں نے تو بس ایک جنگی آئرش لڑکے کو گرفتار کر لیا لیکن ضروری نہیں کہ اگلی بار بھی احمد محفوظ رہے اور اگر اس نے ایک رات بھی حوالات میں گزار لی تو ایسٹ گلف کمپنی کو اس الدار میں کچھ بھی نہیں ملے گا۔“

فریزر اٹھا اور تھل کے کنویں کے ماڈل کے پاس جا کھڑا ہوا۔ "کالڈر..... تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہونے والا معاہدہ کتنا اہم ہے۔"

”میں یہ بات سمجھتا ہوں۔“ کانڈر نے کہا۔ ”اور ہم اس معاملے کو بہت اہمیت دے رہے ہیں۔ چیف نے وہاں میرے ساتھ بنیشن کو بھیجا ہے۔ وہ ایک ٹرم تک وہاں معاملات پر نظر رکھے گا اور اب بنیشن نے مجھے بھی مدد کے لیے وہاں بلا دیا ہے۔ عام حالات میں بنیشن اپنے طور پر معاملات سے نمٹنے کی اولیت رکھتا ہے لیکن یہ معاملہ کچھ پیچیدہ ہے۔“

”اس خوب صورت و مجید کی کا نام ہے ایلیا وارنی۔“
 ”سام وارنی کی بیٹی؟“
 ”جی ہاں۔“
 ”صورت حال تو پہلے ہی خراب تھی یہ اور برا ہوا۔“

فریزر نے افسردگی سے کہا۔

☆ ☆ ☆
 "لو..... بچ کی گھنٹی بج گئی۔" میٹسن نے کہا۔ "بہت
 پر حالی ہو چکی اب چھٹی۔"
 ایلیا وارنی نے اس کی میز پر رکھی ہوئی اپنی کتابیں
 اور کاغذات سینے ہوئے کہا۔ "مجھے تو بھوک نہیں ہے۔
 یہاں جو کھانا دیا جاتا ہے وہ سب کی بھوک اڑانے کو کافی
 ہے۔"

ظن اٹپا پائپ بھرنے میں معروف تھا۔ "کھانا ایک ایسا چیز ہے، جسے بہت زیادہ اہمیت دی جاسکتی ہے اور غیر اہم بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ میں دوسرے قبیل سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں گھر پر ہوتا ہوں تو میری آنٹی میرے لیے کھانا پکاتی ہیں، وہ تین ڈشوں پر زور دیتی ہیں۔ قیمہ، مرغی کا قورمہ اور آرش اسنو۔" اس نے پائپ کے چند چمکے کش لیے۔ "اور میں ڈانکے کی پیمان سے اتنا بے بہرا ہوں کہ ان تینوں میں فرق بھی نہیں کر سکتا۔"

ایلیا نے کہا۔ "ایک بات بتاؤ مسٹر ٹنسن، آپ
یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"سچیدگی سے بات کریں، آپ معلم ہرگز نہیں ہیں۔"

”آپ دیکھنے میں مگر نہیں لگتے۔ صرف دیکھنے میں

"نہیں، بات کرنے اور سوچنے میں بھی۔"

"لگتا ہے، تم نے اس پر تحقیق کام کیا ہے۔"

"الٹا..."

بالکل، یہ میری جو نیورکی ہے بس میں، میں پڑھ
 رہی ہوں۔ دو جو نیورشیوں سے نکالی جا چکی ہوں، مناسب
 دے کی بنیاد پر۔“

”جسٹیس یہاں داخلہ ملا تو یہ بات یہاں والوں کے
میں تھی؟“

”جی ہاں، میرے والد نے انہیں بھاری مالی امداد کا
مکمل دیا تھا انہیں بری کے لیے۔“

”اب بتائیں، آپ کوئی آفیسر ہیں یا انیسکٹر ہیں؟“

”خدا کی بناء۔“ مضمّن نے گہرا کر کہا۔ ”کیا میں ایسا“

”یا پھر آپ اور بڑی چیز ہیں مثلاً اٹلی جس کے رکن
ہماری جاسوسی کے لیے آئے ہیں؟“

یہ سن نے ایک گہرائش لے کر دھواں بکھیر دیا۔

"१५५५"

”آدمی حقیقت تو تم سمجھ ہی چکی ہو۔“ یونس نے کہا۔ ”تو پوری ہی جان لو۔ میں ویسے بھی تمہیں اپنے احاد میں لینے والا تھا۔ مجھے یہاں احمد پر نگاہ رکھنے کے لیے بھیجا گیا ہے تاکہ وہ بری صحبت میں نہ پڑے۔“

”بری صحبت کا مطلب ہے..... میں اور میزک؟“

”ہاں۔“

”اور یہ کام آپ کیسے کریں گے؟“
 ”میرا تجربہ ہے کہ ایسی خطرناک صورتِ حال میں
 دشمنوں کو اپنے ساتھ ملا لینا بہت فائدہ مند ہوتا ہے۔“
 ”واہ..... ذرا تفصیل سے بتائیں مجھے۔“

”احمد کا باپ ایک چھوٹی سی مہرانی مملکت کا فرماں روا ہے۔ وہاں کی آبادی بھی بہت تھوڑی ہے۔ ان کا گزارہ وٹوں کی افزائش اور مجوروں پر ہے۔ یہی بھی وہ سونے کی سرنگھٹ میں بھی ملوث ہو جاتے ہیں لیکن اب وہاں تیل کا نئے کاغذی ترین امکان سامنے آیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وکٹریٹ ہمیں ملے۔ عام حالات میں وہ ہمیں ہی ملے گا کیونکہ تیل کی تلاش کا کام بھی ہم نے ہی کیا ہے لیکن اگر احمد کو سزا ہوئی یا اسے یونیورسٹی سے نکالا گیا تو صورت حال بدل جائے گی۔“

”اور تم چاہتے ہو کہ میں احمد کو اچھا بچہ بننے کی تلقین کروں تاکہ جیل بھنی دولت کما سکے؟“

”اب تم حب الوطنی کا ذمہ لیں پھر شروع کر دیتا۔“

”یہ تو ہوگا، اب تیس سال پہلے کے جوانوں کے
 سے میں سوچ کر حیرت ہوتی ہے۔ وہ بڑی بڑی موٹھیں

میتے تھے۔ ان لوگوں میں جاتے تھے اور ان میں سے بیشتر
 فی مونیوں سمیت جل مرے۔ انہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ

سے والے ہیں لیکن وہ ناخوش نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے وہ وطن کی خاطر جان سے گزر رہے ہوتے تھے۔ تمہیں

کچھ دیر خاموشی رہی پھر ایلیانے کہا: "کچھ کہ نہیں

ی۔ یہ ایسی بات ہے، جسے سن کر اسی جی اُٹھتی ہے اور رونا
ی۔ بات شاید محسوس کرنے کی ہے لیکن بہر حال یہ بچھلے
انوں کی بات ہے اور اس سے وہ ان کے الگ ہیں۔

”مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ میں بڑھا ہوا چکا ہوں۔ میں تو نو جوانوں کے لیے سچا ہوں۔ اور ابھی کہ وہ سب

نہیں زندگی گزار جائے اور مرنے کے لیے ایک ذہن کا مقصد

پاؤں پھیلانے والے

شیخ سعید علی دشتی میں رہتے تھے۔ جاکم وقت سلطان ابراہیم پاشا کو ان سے ملنے کی آرزو تھی۔ ایک دن چنانچہ اطلاع دے کر انہیں ملنے کے لیے آگیا۔ شیخ سعید علی اس وقت پاؤں پھیلائے اپنے شاگردوں کو درس حدیث دے رہے تھے۔ انہوں نے سلطان کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ کچھ دیر بعد انہوں نے نظر اٹھا کر سلطان کی طرف دیکھا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اشارہ دینے کے بعد وہ پھر درس دینے میں مصروف ہو گئے۔ سلطان درس کے اختتام تک وہاں موجود رہا اور نہایت خاموشی سے درس سنا۔ علی واپس پہنچ کر ایک قاصد کے ہاتھ اس نے اشرافیوں کی ایک جمعی شیخ سعید علی کی خدمت میں بھیجی۔ قاصد جب جمعی لے کر ان کے پاس پہنچا تو آپ نے قاصد سے کہا کہ وہ جمعی کس لیے لایا ہے۔ ہدیہ کے طور پر قاصد نے کہا۔ مجھے ان اشرافیوں کی ضرورت نہیں لہذا تم اسے واپس لے جاؤ شیخ سعید علی نے اس پر کہا۔ وہ کیوں؟ قاصد کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ سلطان کو میرا سلام عرض کرنا اور کہنا جو پاؤں پھیلاتے ہیں وہ ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ شیخ سعید علی کا جواب تھا۔

سرسد۔ محمد جاوید شبیر برہہ علی پور

”مئی مس واری؟“ پرنسپل کے لہجے میں گرم جوشی اور سرد مہری کا عجیب ترین امتزاج تھا۔ ایلیا واری اس کے لیے ایک بانی بھی تھی اور اس کا باپ یونیورسٹی کو علیہ بھی دینے والا تھا۔ ”میں پیٹ میکان اور دوسروں کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”دوسرے کون؟“

”وہ جو انیم خریدتے رہے ہیں، بے وقوف لوگ۔“

”میں اس سے زیادہ سخت الفاظ استعمال کروں گا۔“

پرنسپل نے سرد لہجے میں کہا۔ ”وہ قانونی طور پر جرم کا ارتکاب کرتے رہے ہیں۔“

”پولیس کا کہنا ہے کہ اگر آپ زور نہیں دیں گے تو وہ کس نہیں بتائیں گے۔“

”میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟“

میرے خیال میں یہ بات میرے اور ہوم آفس کے نمائندے کے درمیان ایک راز تھی جس نے اس معاملے کو بے نقاب کیا ہے۔“

لوگوں کو گڈ ٹائٹ کہتے ہوئے بار سے رخصت ہو گیا۔ باہر سڑک پر تار کی تھی۔ وہ سر جھکائے بارش سے بچتا بچتا آگے بڑھتا رہا۔ اسے مطلق احساس نہیں تھا کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ اچانک کالڈر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو کالڈر نے بڑی مہارت سے اس کے مقلق پر ایک نپاٹا ہاتھ رسید کر دیا۔ وہ مرنے لگا تو کالڈر نے اسے سنبھالا اور اسے آہستگی سے زمین پر لٹا دیا۔ پیکٹ اس کی جیب میں تھا جو اس نے اپنی جیب میں منتقل کر لیا۔ اس اثنا میں مونے شخص نے کسمپاسا شروع کر دیا تھا۔ کالڈر نے سہارا دے کر اسے بٹھایا۔ ”اگر میں تمہاری جگہ ہوتا مسٹر پونٹنگ تو یہاں سے سیدھا نکل جاتا۔ اس موسم میں باہر رہنے سے زکام ہو جاتا ہے۔“ کالڈر نے کہا۔

☆☆☆

یہ اس واقعے کے دو دن بعد کی بات ہے۔

”یہ مسٹر پونٹنگ ہے کون؟“ ہینسن نے پوچھا۔

”اس کی تمباکو اور منشا کی دکان ہے۔ یونیورسٹی کے پیچھے۔“ کالڈر نے بتایا۔ ”اس کے پیشتر گاہک طلبا ہیں۔ میرا خیال ہے انہیں وہ منشا اور سگریٹ سے کہیں زیادہ ضرور سال چیزیں فروخت کرتا ہے۔“

”نشیاں؟“

”ہاں۔“

”بہت تباہ کن مال؟“

”نہیں میرا خیال ہے اس کے ہاتھ اتنے لمبے نہیں ہیں۔ وہ بس سادہ ایلیم فروخت کرتا ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں نے مال دینے والے کو دیکھ لیا تھا۔ میں اسے جانتا ہوں اس کا نام جو کوکسین ہے۔ میں اس کی اوقات جانتا ہوں۔“

”خطرناک بات ہے لیکن بہت زیادہ نہیں۔“ ہینسن نے کہا۔ ”اب اگر باب اختیار اس سلسلے میں کیا کریں گے؟“

”دیکھنا یہ ہے کہ پرنسپل کیا ایکشن لیتا ہے۔ پونٹنگ تو بے حوصلہ آدمی ہے۔ اس نے چھ طلبا کی نشان دہی کر دی جو اس سے مال لیتے تھے۔ میں نے پرنسپل سے کہا تھا کہ پونٹنگ کو ایسا زرا دوں کہ۔“

”تو پرنسپل نے تمہاری بات نہیں مانی؟“

”دشواری یہ ہے کہ پونٹنگ کے گاہکوں میں پیرک میکان بھی ہے اور پرنسپل بہت مستحکم مزاج آدمی ثابت ہو رہا ہے وہ یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہتا۔“

☆☆☆

”تم خود کو کتنے بکھری ہو، وہ لیڈر نہیں ہیں، لیڈر تم ہو۔“

”اگر یہ سچ بھی ہے تو بھی میں اس کی یہ سب نہیں کر سکتی۔“ ایلیا نے سنجیدگی سے کہا۔

”تمہیں احساس ہے کہ اگر جنگ جاری رہی تو تمہیں صحیح معنوں میں مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔ ایک ناراض انتقامیہ سے بڑھ کر گندی جنگ کوئی نہیں لڑ سکتا۔“

”میں جانتی ہوں، یہ جنگ سخت بھی ہوگی اور گندی بھی۔ اسی لیے ایک سخت جان لیڈر کی ضرورت ہے۔ تو یہ ذمہ داری آپ سنبھال لیں، کیا خیال ہے؟“

ہینسن نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں اس لڑائی میں شامل ہی نہیں ہوں۔“ اس نے کہا۔

”لیکن آپ کو اس میں لطف آئے گا، ہے؟“

آپ کو معلوم ہے مجھے یہ احساس کب ہوا کہ آپ دوسرے پروفیسروں سے مختلف ہیں؟ جس وقت آپ ہنر کے متعلق باتیں کر رہے تھے کیا واقعی آپ ہنر سے ملے تھے؟“

”ہاں۔“

”کب؟“

”43ء میں روس میں۔ اس نے مجھے متاثر کیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ میری وہاں موجودگی کا مقصد اس کے طیارے میں بم فٹ کرنا تھا۔“

”یہ ہونے لگا بات، میں یہی تو کہہ رہی ہوں کہ میں آپ سے لیڈر کی ضرورت ہے۔“ ایلیا نے کہا۔ ”آپ بلوا کرنے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔“

☆☆☆

کالڈر ویٹنگن فورڈ کی ایک عقی سڑک پر واقع بار میں بیٹھا تھا۔ اپنی شخصیت، اپنے لباس اور عمر سے وہ غیر اہم آدمی لگتا تھا۔ اس کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوا اور وہ خود بھی یہی چاہتا تھا۔

بارش ہو رہی تھی۔ باراندر سے بے حد گرم اور پر ہجوم تھا۔ کالڈر وینسکی کے گھونٹ لیتا رہا۔ جس مونے شخص کا وہ تعاقب کر رہا تھا وہ ایک گوشے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ بیڑ پیٹے ہوئے وہ بھی کبھی اپنی گھڑی میں وقت دیکھتا۔ نو بجے کے قریب بالآخر اس کا ملاقاتی آگیا۔ وہ دبلا پٹکا شخص تھا۔ دونوں بیٹھے چند منٹ باتیں کرتے رہے۔ پیکٹ کا تبادلہ اتنی غصا سے اور رازداری سے ہوا کہ اگر کالڈر خصوصیت سے ان پر نظر نہ رکھے ہوتا تو اس کو کبھی پتا نہ چلتا۔

پیکٹ لٹے ہی مونے شخص اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے کانوں پر مفلر لپیٹا اور عام سے انداز میں بار میں موجود تمام

بھی نہ ملے۔ شاید یہی ان کی بے چینی کا سبب ہے۔“

”ہمارے پاس بھی ایک سبب، ایک نصب العین ہے۔“

”پرنسپل کے گھر پر ہتھراد کرنا۔“

”آپ اس لہجے میں یہ بات اس لیے کہہ رہے ہیں کہ آپ ہماری بات سمجھ نہیں سکتے۔ پرنسپل صاحب اپنی گھڑیوں میں دوبارہ شیشے لگا سکتے ہیں، گھڑیوں کی سرست کر دیا سکتے ہیں مگر اپنے پبلک ایجنج کو درست نہیں کر سکتے۔“

”کیوں بھی، ان کے پبلک ایجنج میں کیا خرابی ہے؟“

”وہ فراڈ ہیں۔ یہاں دوسرے درجے کی بلکہ تیسرے درجے کی چیزیں بیچی جا رہی ہیں۔ پڑھائی کا معیار بہت خراب ہے۔ اسٹوڈنٹس گھر بیٹھ کر خود مطالعہ کر کے یہاں سے بہتر نتائج حاصل کر سکتے ہیں اور ذہن طلبا بھی کرتے ہیں۔“

”تو راتوں رات معلوم تو تیار نہیں کیے جاسکتے۔“

”یہ درست ہے لیکن دوسرے معاملات تو ٹھیک کیے جاسکتے ہیں۔ چالیس طلبا کے لیے یہاں ایک ہاتھ روم ہے، وہ بھی ٹگ سا اور دھوا فوفا وہ بھی بند ہو جاتا ہے۔ دیواریں ایسی ہیں کہ تین کمرے دور سے آواز یوں سنائی دیتی ہے جیسے اپنے کمرے میں گھنگو ہو رہی ہو اور کھانا..... ایسا کھانا کسی جیل میں کھلایا جائے تو دوسرے ہی روز بغاوت ہو جائے۔“

”تو تم یہ سب کیسے بہتر کر سکتی ہو؟“

”سادہ سی بات ہے، انتظام طلبا کی کیمپ کے سپرد کر دیا جائے۔ آپ کو شاید احساس نہیں یہاں ایسے لوگ بھی زیر تعلیم ہیں کہ جو یہاں نہ ہوتے تو کاروبار کامیابی سے چلانے میں دوسروں کی مدد کر رہے ہوتے۔ یہاں ایسی لڑکیاں ہیں جو شادی کر کے بڑی خوش اسلوبی سے گھر چلا رہی ہوتیں۔ بچے پال رہی ہوتیں اور یونیورسٹی والے ہمارے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے ہیں جیسے ہم بچے ہوں۔ یہ ہے ہماری جنگ..... اس روئے کے خلاف جنگ جاری رہے گی۔ میں نہیں سمجھتی کہ ہم میں سے کوئی مارا جائے گا لیکن اس جنگ میں ہم بے آرام ضرور ہوں گے ممکن ہے کچھ زخمی بھی ہو جائیں۔“

”چلو اگر میں مان لوں کہ تم نے جو کچھ کیا ہے، کچھ مہالنے کے باوجود درست ہے تب بھی کیا ضروری ہے کہ اس جنگ میں شامل ہو؟“ ہینسن نے کہا۔

”وہ اور پیٹ میکان لیڈر ہیں۔ اب پیٹ جیل میں ہے اچھے بچے ہٹ گیا تو ہمیں سب کچھ از سر نو کرنا ہوگا۔“

"اسکی باتیں کہاں بھیجتی ہیں۔" ایلیا نے بات نالے والے انداز میں کہا۔ "میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ سمجھتا کرتا ہے یا نہیں؟"

"اگر آپ پولیس کو مقدمہ قائم کرنے سے روک دیں تو میں گارنٹی دیتی ہوں کہ اب یونیورسٹی میں بد امنی نہیں ہوگی۔"

پرنسپل کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "تمہارا خیال ہے کہ میں اسکی گھنیا سودے بازی میں حصہ لے سکتا ہوں؟"

"وزیر صاحب آئندہ ہفتے لاہور ری ونگ کا افتتاح کرنے آرہے ہیں۔ آپ یقیناً نہیں چاہیں گے کہ اس موقع پر کوئی گزب ہو۔ گزب ہوئی تو وزیر صاحب یہی سوچیں گے کہ آپ ایسے مستحکم نہیں ہیں۔"

"تم نے مجھے لٹل سمجھا ہے لڑکی۔" پرنسپل نے ہونٹ بھیج کر کہا۔ "میں اچھا مستحکم نہ ہوتا تو تمہاری بلیک میلنگ اور رشوت کے سامنے پہلے ہی ہتھیار ڈال چکا ہوتا۔ اب اٹھ جاؤ، مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں۔"

☆☆☆

"یعنی ہم تصادم کی طرف بڑھ رہے ہیں۔" بنینس نے کہا۔

"لڑکی بہت اچھی ہے۔۔۔۔۔ ناقابل فراموش۔" کالڈر نے تبصرہ کیا۔ وہ پام کورٹ ہوٹل میں چائے پی رہے تھے جہاں کالڈر مقیم تھا۔

"اس میں کوئی شک نہیں، اس کی شخصیت بہت متاثر کن ہے۔" بنینس نے تائید کی۔ "اس کا باپ کروڑ پتی ہے اور وہ انتہا پسند اور مخلص آئیڈیلٹ۔ اسے پرنسپل بتادیا جائے تو یہ ملک بھر کی مثالی یونیورسٹی بن جائے۔"

"لگتا ہے، جنہیں اس نے زیادہ سی متاثر کر دیا ہے۔" بے شک اور جانتے ہو اس نے خورائی مجھے پیمان

لیا تھا۔"

"وہ کیسے؟" کالڈر نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "اس نے شروعاتی پیشکش کی کہ احمد کو احتجاجی طلبا کی قیادت سے ہٹا دے گی۔"

"اور شرط کیا تھی۔"

"شرط یہ تھی کہ میں احمد کی جگہ طلبا کی قیادت سنبھال لوں مگر میں باوجود اس کے کہ یوں ہمارے مسائل حل ہو رہے تھے، میں یہ شرط نہیں مان نہیں سکتا تھا۔"

دونوں آرکسٹرا کی دھن سننے رہے۔ بنینس تو کھوسا

گیا، وہ ساتھ ساتھ گنگنار ہاتھ اچانک اسے احساس ہوا کہ کالڈر نے اس سے کچھ کہا ہے۔ "کیا کہا تم نے؟" اس نے پوچھا۔ "کچھ احمد کے بارے میں کہہ رہے تھے؟"

"میں کہہ رہا تھا کہ اب جنہیں احمد کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے باپ نے اسے وطن واپس بلا لیا ہے۔"

"وطن واپس؟"

"اس کا یونیورسٹی کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ فیصلہ پالیسی کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔"

"جنہیں کب معلوم ہوئی یہ بات؟"

"ابھی ایک گھنٹہ پہلے۔"

"یہ پالیسی کا کیا مطلب ہوا؟" بنینس ارٹ ہو گیا۔ "صاف صاف بتاؤ، کیا معاملہ ہے۔ مجھے کیوں نہیں بتایا گیا؟"

"میں خود بھی فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جنہیں بتاؤں یا نہ بتاؤں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جنہیں یہ سن کر فضا آئے گا پھر میں نے سوچا چائے پی لو تو بتاؤں۔"

☆☆☆

"سب سے پہلے تو ہم پیٹ سے اور دوسرے لڑکوں سے محروم ہوئے۔ وہ بے چارے تو اس وقت تک ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتے جب تک مقدمہ عدالت میں ہے اور اب احمد۔۔۔۔۔ لعنت ہو، سب کچھ تباہ ہو کر رہ گیا۔"

وہ پہلا موقع تھا کہ بنینس نے ایلیا کی آنکھیں بھیجتے دیکھیں۔ "میرا خیال ہے، یہ مناسب موقع ہے کہ میں جنہیں حکمت عملی پر پیکر دوں۔" بنینس نے کہا۔ "تم نے پرنسپل کو صلح کی پیشکش کر کے غلطی کی تھی۔ اپنے حریف کو صلح کی پیشکش اس وقت کرنی چاہیے، جب آپ مضبوط پوزیشن میں ہوں۔"

"آئی ایم سوری مگر میری سمجھ میں نہیں۔"

"جب آپ کو بے در پے نقصانات ہو رہے ہوں، جب آپ سامنے سے دھکیلے جا رہے ہوں، جب دونوں پہلوؤں سے آپ پر گولہ باری ہو رہی ہو اور جب آپ کو عقب سے بھی خطرات لاحق ہوں تو آپ کے پاس صرف ایک راستہ رہ جاتا ہے۔ آپ ایک کریں، یہی جنہیں کرنا ہے۔ تمام طلبا تمہارے پیچھے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ پرنسپل حکم حراستی سے کام لے رہا ہے۔ پرنسپل اتنا زیادہ غیر مقبول بھی نہیں رہا۔ بدھ کو وزیر صاحب یہاں آرہے ہیں۔ اس وقت پریس کی پوری قوت یہاں موجود ہوگی۔ یہ تم لوگوں کے لیے سنبھلی موقع ہے۔ دنیا کو یہ بتانے کا تم رنگ پرنسپل کو کیا سمجھتے ہو؟"

"باتیں کرنا بہت آسان ہے، جانتے ہو تمہارا ہر ایسا

رکن جو کچھ کرنے کی اہلیت رکھتا تھا، آؤٹ آف ایکشن ہے۔ ازتالیس گھنٹے میں نئی کمیٹی تو نہیں تشکیل دی جاسکتی۔" بنینس نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ اس نے کہا۔ "نقد ایر اسیلی ہال میں ہوں گی۔ ڈانس کے مین اوپر ایک انٹرویو ہے۔ میرا خیال ہے، چھت لکڑی کی یا پلاسٹر بورڈ کی ہے۔ اگر وہاں درست مقام پر ایک ٹریپ ڈور بنادیا جائے۔"

"میرے پاس انفرادی قوت اور مناسب آلات ہوں تو میں درجنوں زبردست آئیڈے سوچ سکتی ہوں۔" ایلیا بولی۔ "اور جنہیں معلوم ہے کہ رات کے وقت اسیلی ہال لاک کر دیا جاتا ہے۔"

"میرا ایک دوست یہاں ویٹیکن فورڈ میں مقیم ہے۔" بنینس نے کہا۔ "تالوں سے اس کی بڑی آشنائی ہے اور وہ ہر طرح کے ضروری آلات کا بندوبست بھی کر سکتا ہے۔"

"لیکن وہ ہماری مدد کیوں کرنے لگا؟ بلکہ تم بھی ایسا کیوں کر دے؟"

"ہم دونوں ہی پرنسپل سے بے حد خفا ہیں۔" بنینس نے کہا۔ "اور جب ہم کسی سے ناراض ہوں تو اسے سزا دیے بغیر نہیں مانتے۔"

☆☆☆

بنینس اپنے چیف مسز فورٹ کے سامنے بیٹھا تھا۔ مسز فورٹ بولے تو ان کے لہجے میں ناپسندیدگی تھی۔ "اس کا مطلب ہے بنینس کس ناخوشگوار واقعے میں تمہارا ہاتھ تھا؟"

"جی ہاں، میں نے ہی اسے آرگنائز کیا تھا کالڈر کی مدد سے۔"

"اور اگر تم پکڑے جاتے تو؟"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تم نے اس بات کا خیال رکھا۔"

مسز فورٹ پھر سامنے دھکی رہی رپورٹ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "اخبار میں لکھا ہے کہ پرنسپل اور وزیر صاحب پر اچانک ہی کالنگ اور راکہ کی برسات ہو گئی۔"

"ہم نے اس میں آنا بھی ملایا تھا۔" بنینس نے بتایا۔ "اس کی وجہ سے ان کے طے نہایت عجیب ہو گئے۔"

"بلیک اینڈ وائٹ۔" کالڈر نے لہجہ دیا۔

"اور اگر الزام اس لڑکی ایلیا وارنی پر لگا اور اس نے تمہارا نام لے دیا تو؟" مسز فورٹ نے غصہ سے پوچھا۔ "اس کے خلاف ثبوت نام کی دہائی بھی نہیں ملے گی۔ وہ سامعین کی تیسری قطار میں بیٹھی تھی۔ ٹریپ ڈور کھلنے میں

اس کا ہاتھ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو سوچا بھی نہیں جاسکتا۔" اور نماز بھی اس نے نہیں چھینکے؟" کالڈر بولا۔ "نماز؟ اخبار میں تو نمازوں کا کوئی تذکرہ نہیں۔"

"کوئی جس کے قریب طلبا تھے جنہوں نے ان پر نماز پھینکے اور ان میں سے کوئی پہلے بھی احتجاجی سرگرمیوں میں ملوث نہیں رہا تھا۔"

ایسا لگتا جیسے مسز فورٹ اس منظر کا تصور کر رہے ہوں۔ "راکھ، آنا اور نماز جبکہ وزیر صاحب ذاتی وقار کا بہت خیال رکھنے والے آدمی ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ محفوظ ہونے ہوں گے۔"

"محفوظ کیا ہوتے وہ تو آدمی گھنٹے تک پرنسپل کو آگاہ کرتے رہے کہ اس کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے۔ انہوں نے پرنسپل سے کہا کہ تمہارے اسٹوڈنٹ تمہارے قابو سے بالکل باہر ہیں۔ اس بات پر شرط لگائی جاسکتی ہے کہ پہلی فرصت میں نئے پرنسپل کا تقرر ہوگا۔"

"میں نے محسوس کیا ہے کہ پرنسپل کا تذکرہ کرتے وقت تمہارے لہجے میں عناد ہوتا ہے، یہ ایک غیر معمولی بات ہے، ایسا کیوں ہے؟"

"آپ کو معلوم ہے، اس نے احمد سے کیسے ہتھکڑا

پایا تھا؟"

"پوری طرح نہیں معلوم اور میں نے یہ خبر سن کر بس سکون کی سانس لی تھی کہ ہم لوگ شرمندگی سے بچ گئے۔ میں نے تفصیل معلوم ہی نہیں کی۔" مسز فورٹ بولے۔

"پرنسپل نے احمد کے باپ کو ایک پیغام بھجوایا تھا۔" کالڈر نے بتایا۔ "یہ پیغام کہ اس کا بیٹا ایک بیہودی لڑکی کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ بات آگے بھی بڑھ سکتی ہے۔"

"میری ذاتی رائے میں وہ محض آنے، راکھ اور نماز کا مستحق نہیں تھا۔ اس پر تو کھول ہوا پانی پھینکا جانا چاہیے تھا۔" بنینس نے رائے دی۔

مسز فورٹ چند لمبے اپنی کرسی پر جمولتے رہے ان کی آنکھیں کہیں دور دیکھتی محسوس ہو رہی تھیں پھر انہوں نے کہا۔ "یہ تجربہ اس سے پہلے اس صدمہ کی تیسری دہائی کے اوائل میں کیا گیا تھا۔۔۔۔۔ ایبرڈین یونیورسٹی میں پرنسپل کے ایکشن کے دوران اور بے حد کامیاب اور نمونہ ثابت ہوا تھا۔"

کالڈر اور بنینس حیرت سے انہیں دیکھتے رہے۔ "تو آپ بھی۔۔۔۔۔؟" کالڈر نے کہا۔

مسز فورٹ نے اثبات میں سر ہلادیا۔ وہ سہرا رہے تھے۔



✽ فریال گوہر کراچی
اب اس کا نام درختوں پہ لکھتے پھرتے ہیں
ہم اس کو بھول رہے تھے وہ یاد دب آیا
✽ عامر خان سکس
ڈوبتا جاتا ہے بے وصل چراغوں کا دھواں
پھیلتا جاتا ہے اک بھر مسلسل جاناں
ہم سے کچھ تیرے مراسم ہی بڑے گہرے تھے
ورنہ صحراؤں میں رکھتے نہیں بادل جاناں
✽ کوثر رضوی حیدرآباد
رفتہ رفتہ میرے ہاتھوں سے لکیریں اڑ گئیں
قسموں کے بید مٹی میں بھی پوشیدہ نہ تھے

✽ محمد اشفاق سیال..... شور کوٹ سنی
مکوں میں رنگ بھرے باد تو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے
نفس لہاں ہے یاد صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہر خدا آج ذکر یاد چلے
✽ رضوان تنولی کریڑوی..... اورنگی ٹاؤن، کراچی
مقرر ہوں، نہ واعظ ہوں، نہ ساحر ہوں میں لفظوں کا
زبان بس ساتھ دیتی ہے میں باتیں دل سے کرتا ہوں
✽ عتیق الرحمن، عمران زریب..... سمندری، فیصل آباد
پیری آنکھوں میں آنسو تیرے دامن میں بہا
گل بنا سکتا ہے تو شبنم بنا سکتا ہوں میں
✽ محمد صفدر معادیہ..... تحصیل ضلع خانیوال
درزنداں پہ دستک آہستہ پیری جان
دوانے سو رہے ہیں شب غم گزار کر
✽ محمد حنیف ببول..... ملتان جیل
اے خاک نشینو! اٹھ بھو وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اچھالے جائیں گے
اب نوٹ کریں گی زنجیریں، اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دیا جھوم کے اٹھے ہیں، بھگوں سے نہ نالے جائیں گے

✽ سید عبادت کافلی..... ڈیرہ اسماعیل خان
کس مقام پر سوچتی تھی چھڑنے کی
اب تو جا کے کہیں دن سنورنے والے تھے
✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال
اس دل کے آئینے میں بس عکس ہے تمہارا
اپنا نہیں بنا لو پھر عید آگئی ہے
✽ رانا سجاد اختر..... ملتان جیل
نہ حاکم اہل دانش ہیں نہ قابل اب رعایا ہے
میں اس ملک کو دانا دینا اک تمنا ہے
چمک جس کی بھی کھوئے کھروں سے بڑھ کے ہوموہ
کینوں میں ہوایا اک گھینہ یہ بھی اک تمنا ہے
✽ جاوید شبیر بربرہ..... علی پور مظفر گڑھ
میرے محبوب کو نہ یہ کہنا
عید کا چاند لگ رہے ہو تم

✽ سید محی الدین اشفاق..... فتح پور، ایلہ
پھر پلٹ آئی ہیں سادوں کی سہانی راتیں
پھر تیری یاد میں چلنے کے زمانے آئے
✽ فرح گل..... درابن کلاں
چلتے صحراؤں گر جا سردیا برس
مٹی طلب کس کو پتھر ابر کہاں جا برس
ظن ہر لمحہ سوخت جانوں پہ کر جتے بادل
یا تو کھٹکھٹا کھٹکھٹا گھٹائیں نہ بٹا یا برس
✽ زاہد چودھری..... پھور کینٹ
قربت بھی نہیں دل سے اتر بھی نہیں جاتا
وہ شخص کوئی فیصلہ کر بھی نہیں جاتا
آنکھیں ہیں کہ خالی نہیں رہتیں لبو سے
اور زخم ہدائی ہے کہ بھر بھی نہیں جاتا
✽ محمد جاوید..... تحصیل علی پور
یہ تیری رہیں ہیں کہ سادوں کی گھٹا چھائی ہے
یہ تیرے عارض ہیں کہ پھولوں کو ہنسی آئی ہے
✽ مہر محمد عامر اسماعیل..... حاصل پور، ضلع بہاولپور
محبوبوں میں ہر اک لمحہ وصال ہوگا یہ طے ہوا تھا
پھڑکے بھی ایک دوسرے کا خیال ہوگا یہ طے ہوا تھا
پھڑکے گئے ہیں تو کیا ہوا کہ یہی تو دستور زندگی ہے
جدائیوں میں نہ قربتوں کا ملال ہوگا یہ طے ہوا تھا
✽ زوہیب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
گزر اوقت اور بہتا دریا لوٹ کے پھر نہ آئے گا
نقش پا کیوں نکلتے ہو، یہ ہوا چلی مٹ جائے گا
کچے رنگ سے کب تک اپنے دل پہ لکھو گے پیار کے گیت
دھوپ پڑے گی جب کافور پر تو سادہ رہ جائے گا
✽ احمد حسن عرضی خان..... قبولہ بانی پاس
آنکھیں نم کر گیا پھڑکے محبوب کا خیال
وہ دیکھو درد دل دینے چلی آئی ہے عید
✽ غلام یاسین نوٹاری..... چوک سرد شہید
نصیحت روز بکٹی سے عقیدت روز بکٹی ہے
ہمارے شہر میں لوگو محبت روز بکٹی ہے
✽ ادریس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی
ایک وہ جن کیلئے طوفان کنارے بن گئے
ایک ہم ہیں جن کی قسمت میں کہیں ساحل نہ تھا

✽ جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی
مگر چہ رنج بہت ہے، لب نہیں گے نہیں
بس اک نظر تجھے، بکھیں گے کچھ کہیں گے نہیں
اس ایک پل کی رفاقت کو بھی قیمت جان
تمام عمر تیرے ساتھ ہم رہیں گے نہیں
✽ آسیہ نور سکس
لذت آوارگی بھی اس قدر محتاط تھی
گھر کی ویرانی کو پہلے باخبر کرنا پڑا
ہائے وہ لمحہ کہ جس میں اس سے ملنا تھا سلیم
ہم کو وہ لمحہ بھی اب وقف ہنر کرنا پڑا
✽ مدحت..... کراچی
یہ فاصلہ جو ازل ہی سے درمیان کا ہے
زمین سے کوئی تعلق تو آسمان کا ہے
تو خود ہی نوٹ پڑے گا طلسم خوش فہمی
یقین کے شہر سے رستہ مرے گمان کا ہے
✽ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر..... نئی منڈی سکس
یوں بھی نہیں کہ میرے بلانے سے آگیا
جب رہ سکا نہیں تو بہانے سے آگیا
✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
یہ دل برا کسی سر بازار تو نہ کہہ
کچھ دیر آخر تو اس میں رہا بھی تو ہے
✽ شازیہ..... کراچی
دور تک پھیلا ہوا اک واہمہ رہ جائے گا
تو نہیں ہوگا تو ان آنکھوں میں کیا رہ جائے گا
✽ محمد اقبال..... کورنگی، کراچی
ہر نظر سورج گزیدہ ہے بھلا دیکھے گا کون
دھوپ کی شدت ہے اب رنگ صدا دیکھے گا کون
لوگ اونچا کر رہے ہیں ہر درو دیوار کو
جو زمین میں سو رہی ہے وہ بلا دیکھے گا کون
✽ کمال انور..... چنیوٹ
میں سوچتا ہوں کہ سچ کب تک نہ بولیں گے
تھکن بڑھے گی تو خود ہی دریچہ کھولیں گے
✽ محمد قدرت اللہ نیازی..... حکیم ٹاؤن خانیوال
نہ جانے خود سے کیسے بنتی ہوگی
نفرت تجھے بے وفاؤں سے بہت تھی



تہ در تہ شخصیت کا تذکرہ چہڑ چاہے اور عورت کے روپ پر بحث نہ ہو اس کے بھانڈ کوئی بات مکمل نہیں ہوتی۔ عورت ذات ہے ہی ایسی چیز جو کبھی زمین تو کبھی آسمان، کبھی برابر تو کبھی حزاں، کبھی یقین تو کبھی گمان کی صورت ڈھل کر دنیا کو حیران کرتی رہی ہے مگر پھر بھی اس کی حقیقت واضح نہیں ہوتی... یہی حال اس کا بھی تھا جو چلا تھا عورت کو آزمائے اور اس کا اصل روپ دیکھنے مگر بدقسمتی سے ایک ذرا جھٹک دیکھلا کروہ ایسے نظروں سے اوجھل ہوئی کہ ناحیات وہ اس کی کھوج میں پہلو بہ لغارہ کیا کیونکہ... عورت واقعی ایک پہیلی ہے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔

ایک شہر کی برسی

رام دیال پورا بہرہ دیا تھا۔ اسے بھیس اور آواز بدلنے میں کمال حاصل تھا۔ جب وہ کالج میں پڑھتا تھا تو وہاں اس کی اداکاری کی دھوم مچی رہتی تھی۔ اب سینما کی دنیا میں آیا تو ہر جانب اس کے چرچے تھے۔ کالج سے ڈگری لینے ہی اسے بھیسی کی ایک فلم کہنی میں اچھی جگہ مل گئی تھی۔ پھر جلد ہی اس کا شمار ملک کے بہترین اداکاروں میں ہونے لگا۔ لوگ اس کی اداکاری کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ اس کے پاس ذہانت تھی، وہ فن اداکاری کی ہاریکیوں کو خوب سمجھتا تھا اور فن کی بلندیوں کو چھونے کا آرزو مند تھا۔ اس لیے وہ جو بھی کردار ادا کرتا، اس میں حقیقت کا رنگ بھر دیتا اور نہ کہنے والے دادو حسین کے



☆ امتیاز علی..... پھالیاں
دل کھول کر نہ کر سکے ہم خالد و فغاں
دھڑکا یہی رہا کہ وہ ہزک و مانغ ہے

☆ عاصم علی..... راہ پلندی
ابھی تو تمہیں سرطاق غم جلا نہیں
کہ تم نے عشق کیا بہتیں اٹھائیں نہیں

☆ محمد ذوالفقار..... خانیوال
بدن کیا روح بھی قیدی ہوئی باقی ہے میری
یہ آنکھیں وا ہوئیں یا وا درزنداں ہوا ہے

☆ مندی بہاؤ الدین
تصویروں کا روگ بھی آخر کیا ہوتا ہے
تنبہائی میں بات کرو تو بولنے لگتی ہیں

☆ بینش علی..... حیدر آباد
زندگی بھر کی شناسائی چلی جائے گی
کھر بسالوں کا تو تنہائی چلی جائے گی

☆ نعمان اعجاز..... ملتان
اک موج مرے سر سے یہ کہتی ہوئی گزری
ساحل سے تو اندازہ طوفاں نہ کیا کر

☆ محمد حسن..... بہاولپور
سر پھری پاگل ہوا کی کس کو خواہش تھی بھلا
جس کی شدت بڑھی تھی لوگ بے کھر ہو گئے

☆ فرحان علی..... میانوالی
تجھ کو یہ ضد میں تری آنکھوں سے دنیا دیکھتا
اور مجھے خواہش ترے لب سے ادا ہونے کی تھی

☆ زینب..... فیصل آباد
کیسے عجیب لوگ تھے جن کے یہ مشغلہ رہے
میرے بھی ساتھ ساتھ تھے غیر سے بھی ملے رہے

☆ کوثر منظور..... لاہور
تجھے بھلائیں کہ اب تیری آرزو کی جائے
یہ بات ملے ہو تو پھر تجھ سے گفتگو کی جائے

☆ مندر علی..... اسلام آباد
تم سانس کی مانند ہو میرے لیے
تجھے لیتے رہیں گے، جیتے رہیں گے

☆ عثمان انصاری..... نیو سینٹرل جیل ملتان
کیسے کہوں کہ میرے لیے کیا ہو تم
یقین کرو بہت خاص، بہت خاص ہو تم

☆ قاضی عرفان احمد عاجز..... آڑو، چوہا سیدن شاہ
بدن سے روح جاتی ہے تو بچھ جاتی ہے صدف ماتم
مگر کردار مر جائے تو کیوں ماتم نہیں ہوتا

☆ مونا رضوان..... کورنگی، کراچی
سوکھے پھول اور تلی کوئل پھینکا اپنی کتابوں سے
جن لکھوں میں قید تھے سپنے ان کو بھی آزاد کیا

☆ حنا عروج..... کراچی
غیروں سے تو واقف تھے ہم، کھائی ہے اپنوں سے مات
دل کی بازی جان کے باری کچھ تھے ایسے ہی حالات

☆ ادریس احمد..... لاہور
کہتے ہوئے بازار میں ہم نے دیکھے رام محبت کے
تکلی گلی میں شور ہوا جب کر گئے وام محبت کے

☆ محمد اعجاز..... حیدر آباد
بھول کے پہلی عورت کو دہی سے کرے پیمان
گلی گلی پھرتے ہیں بچے باپ بنے انجان

☆ محمد زریان سلطان..... اردو بازار، کراچی
اپنوں نے تو مرے دکھوں کو کھیل تماشا سمجھا تھا
مل گئے مجھ کو چارہ گر بھی بیگانوں کی بستی میں

☆ سید احسن علی..... سرگودھا
وہ مہروش جو آیا کھر میرے بن بلائے
یہ تو نے آج گردش چرخ بریں نئی کی

☆ احمد خان..... کوئٹہ
عشق کے باعث گئے جاتے تھے نادانوں میں ہم
ورنہ کہتے اپنے آگے کس کو دانائی میں تھے

مجلات شہر و شہر

نام: _____

پتا: _____

کتاب خانہ

نمبر

2015

حال ہی میں اس کی شادی ہوئی تھی۔ بسنتی کی ایک خوش حال بسنتی میں چھوٹی سی کوٹھی کرائے پر لے کر اس میں رہنے لگا تھا۔ ایک وقت صاحب وہ ایسی کوٹھی میں رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اس کی مفلسی کا زبانیہ تھا۔ اب وہ دولت میں مکمل رہا تھا۔ روپے پیسے کی ریل چل رہی تھی۔ اس کی شادی بھی اونچے گھرانے میں ہوئی تھی۔ بیوی بھی خوب صورت اور خوش گفتار تھی۔ جس طرح بادل خشک اور پیاسی زمین پر برس کر اسے سرسبز کر دیتے ہیں، اسی طرح قدرت نے رام دیال کی مفلس زندگی کو کبھی دھن کی بارش سے سنبھال دیا تھا۔

چند اسی کمرے میں داخل ہوا اور اس نے جن دبا کر بلب روشن کر دیے۔ یکایک کمر روشنی سے جھلک اٹھا۔ رام دیال نے ایک نظر طازم پر ڈالی، دیوال سے ٹھیک کو صاف کیا اور دوبارہ مطالعہ کرنے لگا۔ وہ "نیادور" کا خواتین ایڈیشن تھا۔ وہ رسالہ تو اس نے یونہی اٹھایا تھا اور ورق گردانی کرتے ہوئے ایک مضمون پر اس کی نگاہ اٹک کر رہ گئی۔ اس کی سرخی خاصی دلچسپ تھی۔ اس نے مضمون کو پڑھنا شروع کیا تو پھر پڑھتا ہی چلا گیا۔ وہ پورا مضمون اس نے پڑھ لیا۔ اس تحریر میں کسی اداکاری کی سوانح حیات، اداکاری پر تیسروں یا چاروں پیش نہیں کیا گیا تھا۔ فن اداکاری پر کوئی نئی بات نہیں لکھی گئی تھی..... وہ ایک عام اور سیدھا سادہ مضمون تھا۔ جس میں عورت کی فطرت پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ رام دیال کے لیے بالکل نئی بات تھی، جس میں لکھا تھا۔

رام دیال اٹھا اور لائبریری سے باہر آگیا۔ دو گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ سڑک پر روشنیاں جل اٹکی تھیں۔ وہ دل کی دھڑکن کی رفتار کے ساتھ دیرے دیرے قدم اٹھاتا چلا

گھڑی نے فن، فن، نو بجائے۔ سامنے والی کونجی میں روشنی مکل ہو گئی۔ ارطاح کو تنہائی کا احساس ہونے لگا۔ اس نے ستار اٹھالیا اور اس کی ملائم انگلیاں تاروں سے کھیلنے لگیں۔
 ”وسرے ہی لمحہ فضا حرا گیت سے جموٹنے لگی۔“
 ”بسکس ان ہیمن تو وچن ہارے۔۔۔۔۔“

ایک دروہا جو سر کی رتھ پر سوار ہو کر پھیل رہا تھا۔ لوہج اور لے تھی۔ سینے میں انتھار کی آگ تھی..... وہ گویا اپنے آپ میں وہ گئی، سروں میں منہک ہو گئی۔ اپنی مدھر آواز کے سوز میں کھو گئی۔ اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ رام دیال کب آیا اور کب سے دروازے سے قہقہے لگائے اس کی جانب دیکھے جا رہا ہے۔ وہ بے سدھ گاتی رہی۔ اس کی انگلیاں ستار کے تاروں پر ٹپک رہی تھیں۔ اس کی نیم وا آنکھیں ستار پر جمی تھیں۔

اگلے دن رام دیال صبح ہی مھر سے چلا گیا اور رات گئے تک واپس آیا۔ ار ملا دوڑی دوڑی گئی اور پرات میں پانی لے آئی تاکہ اس کا منہ ہاتھ دھلوا سکے۔ رام دیال کے چہرے سے غصہ نکل رہا تھا۔

”آپ اتنی دیر کہاں رہے؟“

وہ خاموش رہا۔
ارطال نے پانی کا تسلا آگے بڑھا دیا۔ گھر میں
اظہارِ مائیں تو تھیں، لیکن شوہر کی خدمت وہ خود کیا کرتی تھی۔
رام دیال شام کو جب گھر آتا تو وہ اس کا منہ ہاتھ دھواتی۔
مشرقی میں کچھ کھانے کو لاتی اور سنوڈی کی خبریں پوچھتی۔
آج رام دیال نے ہاتھ نہ بڑھایا۔ وہ چپ چاپ کھڑی
اس کے گمبیر چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کا دل عجیب
طرح سے دھڑکنے لگا تھا۔ طرح طرح کے اندیشے سر اٹھانے
لگے۔ وہ کچھ کہتے رک گئی، اس خیال سے کہ وہ جواب میں
جھڑک نہ دے۔ کبھی امید گد گدائے گنتی اور کبھی ناامیدی دامن
غلام لیتی۔ جب انسان کے دل میں شک پیدا ہو جائے تو پھر اس
سلسلہ دراز ہوتا چلا جاتا ہے۔ ناامیدی بہور کی صورت میں
رہ جاتی ہے۔۔۔۔۔ ایسے میں امید سراپ بن کر آنکھوں کے
ساتنے چھیل ہو جاتی ہے۔ پھر بھی اس نے ہمت کر کے پوچھا۔
”طبیعت تو شک ہے؟“

”چپ رہو۔“
 ”سو امی!“
 ”خاموش۔۔۔! میں نے کہا نا، چپ رہو۔ میں کچھ سننا
 نہیں چاہتا۔“

ارملا کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ ناامیدی نے امید کو ٹھکرا دیا۔ اس کے قدم گویا زمین میں گز کر رو گئے تھے۔ اسے کل کا قہر یاد آ گیا لیکن ایک معمولی سی بات پر اتنا غصہ، یہ اس کی صف سے باہر تھا۔ اسے تو اس بات پر خوش ہونا چاہیے تھا۔ بس، یہ بات نہیں۔ اس سے ضرور کوئی دوسری بھول ہوگئی ہے، کسی حکم عدولی سرزد ہوگئی ہے۔ ممکن ہے کسی سے جھگڑا ہو گیا۔ اس کے دل میں مختلف اندیشے سر اٹھاتے رہے، اسے

ارملا بہت دیر تک اسی طرح پڑی آنسو بہاتی رہی۔
سے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک معمولی سی بات پر وہ اپنے شوہر کی
لہروں سے گر جائے گی۔ رام دیال کے اس رویے کو دیکھ کر
ارملا کے دل میں اس کے بارے میں طرح طرح کے خیالات
گرا خٹانے لگے۔ اس نے آج تک شوہر کو شکایت کا موقع نہیں
پا تھا۔ اس نے رام دیال کی معمولی سی بات کو بھی اہمیت دی
تھی۔ اس کا ہر حکم بھالائی تھی، سر آنکھوں پر رکھتی تھی۔ پھر یہ
نت کیوں؟

یہ سوچ کر وہ انہی۔ اے اپنے وجود میں عجیب سی قوت
 میں لپکتی محسوس ہوئی۔ وہ جائے گی۔۔۔۔۔ اپنے شوہر سے اس
 اور ناراضی کا سبب بوجھ کر رہے گی۔۔۔۔۔ اور اس وقت تک
 کا پیچھا نہیں چھوڑے گی جب تک کہ وہ سب کچھ بتا نہیں
 یا اپنی بانہوں میں لے کر یہ نہ کہہ دے۔ "میں تو مذاق
 رہا تھا۔"

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی رام دیال کے
رے میں داخل ہو گئی۔ وہ لیٹا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر
بسی مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ ارطاکو آتا دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا
نوک کر بولا۔

”کیوں آئی ہو یہاں؟ نکل جاؤ میرے کمرے سے۔
 ”میرا قصور۔۔۔۔۔“

”میں کہتا ہوں چلی جاؤ۔“
 ارطلام بخود ہی کھڑی رہ گئی۔ جیسے کسی جادوگر کی نے اس
 کے سر پر جادو کی چھڑی پھیر کر اسے جحش کا بتا دیا ہو۔ قوت اور

عید کے رنگ اور رعنائیاں لیے اگست 2015ء کا پاکیزہ

کراچی
ماہنامہ
پاکیزہ

نگہت سیمہ اور قیصرہ حیات کے سلسلے وار ناول

غم، خوشی امید و ناامیدی کی کیفیات

کی بھرپور عکاسی کرتا شیریں حیدر کا ناول

زندگی خاک نہ تھی

رشتوں کی ڈور میں الجھنا یا اب جیلانی کا ناول کہر میں

نبیلہ ابرار کا خوب صورت ناول متاع دل

شکر عطا نے الہی ایک روح پرور مضمون اختر شجاعت کے قلم سے

اس کے علاوہ پڑھیں عقیلہ حق، شمیم فضل خالق، نزہت حبیب ضیا،

قانتہ رابعہ، نگہت اعظمی، غزالہ عزیز و دیگر بہت مشق لکھاریوں کی پُر لطف تحریریں

اس کے ساتھ ساتھ دلچسپ معلومات اور تفریح سے پُر مشتمل سلسلے صرف آپ کی خوش ذوقی کی نذر

اور اب دل کے دھڑکنے میں کتنا فرق تھا۔ پہلے وہ اس خوف سے کانپ اٹھتی تھی کہ رام دیاں کہیں اس سے نفرت نہ ہو جائے۔ اب وہ اس خدشے سے مری جا رہی تھی کہ کہیں شوہر اس کے دل کی بات نہ جان لے۔ کہیں وہ رات بھر رو کر ان کے تنگیت رہا میں غفلت نہ ڈال دے۔

اکتوبر کا آخری ہفتہ تھا۔ رام دیاں گھر آیا۔ ارملہ میں اتنا حوصلہ بھی نہ تھا کہ شوہر سے نظریں ملا سکتی۔ وہ اس کے سامنے بھی نہ گئی۔ رام دیاں نے اسے بلوایا بھی نہیں۔ وہ ملازمہ سے صرف اتنا کہہ کر چلا گیا۔

”میں مزید ایک ماہ تک گھر نہیں آسکوں گا۔ فلم کے کچھ سین دوبارہ شوٹ ہونے ہیں۔“

جب وہ چلا گیا تو ارملہ نے سکون کی سانس لی۔ جیسے اس کے دل سے کوئی بوجھ سا ہٹ گیا ہو۔ وہ کوئی ایسا بھرد چاہتی تھی جس کے سامنے اپنا محبت بھرا دل کھول کر رکھ دے۔ رام دیاں وہ نہیں تھا۔ وہ اس کی پہنچ سے دور تھا۔ پانی بلندی کی طرف نہیں چلتا، نشیب ہی میں بہتا ہے۔ رام دیاں بلندی پر کھڑا تھا اور ”وہ“ شخص نیچے، اس کی پہنچ میں تھا۔ ارملہ کا دل اس کی طرف بہہ چلا۔ اس دن ارملہ نے دل سے گایا۔ آج اس کے گیت میں مٹھاس تھی۔ جس میں اداسی کی جگہ خوشی، اٹنگ اور جوش ہلکورے لے رہا تھا۔ اب وہ کمرے میں بیٹھ کر گانے کے بجائے باہر برآمدے میں بیٹھ کر گاتی تھی۔ دونوں کی تانیں ایک دوسرے کی تان سے مل کر رہ جاتیں۔ ان کے دل تو کب کے مل چکے تھے۔

شام کا وقت تھا۔ ارملہ لان میں ٹہل رہی تھی۔ اس کی نگاہیں رو رہ کر سامنے والی کونجی کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ اس وقت ارملہ کے دل میں یہ خواہش چٹکیاں لے رہی تھی کہ وہ شخص اس کے لان میں آجائے اور وہ اس کے سامنے دل کھول کر رکھ دے۔

ارملہ کو اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ تنہا رہتا ہے لیکن کبھی اس نے دن کے وقت اسے نہیں دیکھا تھا۔ دھوپ اپنا وجود کھوپنگی تھی۔ رات کا دھندلا ڈوبتے سورج کی لالی میں دھیرے دھیرے طلوع کر رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، پودے جموم رہے تھے اور ارملہ کے دل کو کچھ ہوا جا رہا تھا۔ کچھ گدگدی سی ہو رہی تھی۔ وہ ایک بیچ پر بیٹھ گئی اور گنگٹانے لگی۔ دھیرے دھیرے یہ گنگٹانا گیت کی شکل اختیار کر گیا اور وہ پوری آواز سے گانے لگی۔ اپنی ہر آواز اور گیت کی دھن میں گم سی ہو گئی۔ بائیسویں کی قد آدم فیصل کی دوسری جانب سے ایک ساپ آہستہ قدموں سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ارملہ اس سے....

خود امدادی جو کچھ دیر قبل وہ محسوس کر رہی تھی، سب ہوا ہو گئی۔ خواہش کے باوجود وہ مزید کچھ نہ بول پائی۔ اداسی کا سبب پوچھنا اس بے وجہ فیسے کا گدگد کرنا۔ اپنے قصور کی معافی مانگنا۔ وہ سب کچھ بھول گئی۔ تصورات کے شاندار مکمل پہا بھر میں نہ میں ہوں ہو گئے۔

وہ چپ چاپ وہاں چلی آئی اور رو کر تکیہ بھگوئی رہی۔ نیند نہ جانے کہاں جا سوتی تھی۔

وقت کو پنکھ لگا کر دن اڑتے گئے۔ رام دیاں اب گھر میں بہت کم آتا تھا۔ ارملہ کی خدمت کے لیے دو ملازمائیں اس میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ ان سے تنگ آ گئی تھی۔ اسے کسی کی خدمت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو محبت کی بھوکی تھی۔ اس کی زندگی کا باغ محبت کے پھول سے خالی تھا۔ آسمان پر گہرے بادلوں چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا گویا ساقی کی چال پھل رہی تھی۔ باہر کہیں سے پیسے کی آواز آرہی تھی۔ ہوا کا ایک جھونکا اندر آیا۔ ارملہ کے دل میں خوشی اور اٹنگ کے بجائے افسردگی کی ایک لہری دوڑ گئی۔

اس نے ایک گہری سانس لی، انہی اور ستار سنبھال لیا۔ سر بکھرنے لگے۔ موسم پر گویا نشہ سا طاری ہونے لگا۔ اس کی آواز میں درد تھا، غم تھا اور جھلن تھی۔ وہ اپنے احساسات میں ڈوبی گئی رہی۔ اسے بیرونی دنیا کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ اچانک سامنے والی کونجی سے جیسے کسی نے ستار کی آواز کے جواب میں گانا شروع کر دیا ہو۔

”یابن یمن کہاں من کو....“

گیت ختم ہو گیا۔ فضا میں چھایا ہوا جادو ٹوٹ گیا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑکی میں آ گئی۔ اس نے دیکھا وہ شخص ستار پر ہاتھ رکھے بڑے اٹنگ سے اس کا گانا سن رہا تھا۔

ارملہ کے وجود میں سستی سی دوڑ گئی۔ کاسرائی کی سستی! اس نے وہ رام دیاں، اس کی محبت، اس کی جدائی۔ سب کچھ بھول گئی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں بس ایک ہی خیال بس گیا تھا کہ اس نے ایک دوسرے راگی کو مات دے دی ہے۔

اس کے بعد روز اندہ دونوں طرف سے گیت اٹھتے اور فضا میں بکھر جاتے۔ دودھی انسان، تنہائی کے شکار، دوزخ کا سنگیت کے ذریعے ایک دوسرے سے ہمدردی ظاہر کرتے۔ دل کا درد گیتوں کی زبانی ایک دوسرے کو سنایا کرتے۔

ایک مہینہ اور بیت گیا۔ کبھی ایک نئی فلم تیار کر رہی تھی۔ ان دنوں رام دیاں کو رات میں بھی کام کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ کئی کئی راتیں اسٹوڈیو ہی میں گزار دیتا۔ اتنے دنوں میں وہ صرف ایک بار گھر آیا تھا۔ ارملہ کا دل دھڑک اٹھا۔ پہلے

یہ داستان ہے دو بوجہ کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی سنگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا بھرا اور چائی بھائی کے ساتھ اندرون سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ گاؤں کا وزیر اشست جلائی ایک بد نیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار روپے کا حق نامہ تھا، چونکہ ماروی مراد کی سنگی تھی اور دونوں بھینسوں سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انھیں کوٹھ پھونڈنا پڑا۔ مراد جو کہ قانونی تعلیم یافتہ تھا وزیر اشست کی مٹی کی گری کرتا تھا۔ وزیر اشست جلائی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انھوں نے جانکاد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زینہ کی شادی قرآن سے کر دی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ بولی۔ زینہ نے بھارت کے راستہ اپنا دیا اور مراد کو بھجور کیا کہ وہ اس کی تنہائیں کا سامحی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہو گیا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کر اپنی کے ایک مضائقہ مطلقے میں کچھ آگے جہاں ماروی اپنے چاچا، چائی بھائی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اٹھافا محبوب ملی چانچ سے ہوئی جو کہ بھرا اسلی اور بڑنس ناٹیکوں، لیکن وہ بھرا مراد کا کام مکمل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانچ اپنے ہم صل کو دیکھ کر حیران ہوا اور اسے یاد آ گیا کہ شست جلائی جو کہ خود بھی بھرا اسلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ عرصہ مراد کے فرار کے بعد زینہ نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کر لی اور خاموشی سے فرار ہو گئی۔ وزیر سے اور اس کے بیٹوں کو بتا چلا تو انھوں نے کشاکش شروع کرائی۔ تاہم یہ انھوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زینہ کے ہی قد کاٹھ کی تھی برادار کے قتل کر دیا اور اس کا چہرہ تیاراب سے سجا کر کے اسے اپنی بیٹی کا بکر کے اڑام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود کو شصتھیں ہوتا تھا، محبوب کے سر پرست اس کے والد کے زمانے کے معروف چلی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل میجر اکوئیر بڑی کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے سرمہ لگیا۔ ایک پانچویں دن جب مراد کو کوئی کھوت نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بطور مال ماروی کو چنا اور مراد کے ڈرہے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زینہ کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہو گیا۔ زینہ مراد کے بیٹے کو ختم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وزیر اب اپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زینہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں اور بھائی بھی نہیں مراد سے ملاقات تھی۔ وہ خبر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہذا انھیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانچ ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی جھڑی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی وزیر اشست سے دشمنی ہو گئی۔ یہ بات پارٹی کے لیڈر تک پہنچی مٹی تینچا چانچ اور استغفار سے کر چلا آیا۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہو گیا۔ اسے انوار کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی کھلی کی شادی میں شرکت کے لیے کوٹھ گئی، تاہم محبوب چانچ اسے بھلا لایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کوور ہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایکٹ مرینہ بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مقدمے کو معلوم نہیں کب تک چلتا تھا لیکن محبوب تک بچی سے ان کا مددگار تھا اور جی کہ ماروی محبوب کے احسانات سے بچنے کے لیے جان بوجھ کر غائب ہو گئی۔ اس خبر کے بعد وہ دلبرداشتہ ہو کر خود مراد کی جگہ قتل میں قید ہو گیا جبکہ دوسری جانب ماروی کی کشاکش کا لالچ دے کر مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہو گیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھاپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے گھٹے سے فرار ہو گیا۔ جبکہ دوسری جانب سیرا اور چلی صاحب محبوب کو کشاکش کرتے پھر رہے تھے۔ مرینہ اپنے باپ کے قتل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ ماروی چائی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہو گیا کہ مرینہ ماروی کو جام قہار کے چودھری کے پاس لے جا رہی ہے لہذا مشکلات سے خبردار نہا ہوتے ہوئے وہ ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیتا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی ہے جس کے باعث اس کی یادداشت چلی جاتی ہے۔ مراد شیرخوار کر نیکل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے راز داری کے ساتھ قتل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہو جاتا ہے۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جا رہا تھا۔ مرینہ کے پانچوٹنے سے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کر لے جاتے ہیں۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ جس میں قانون کا علم رکھنے والے مراد کے ہاتھوں مراد جاتا ہے۔ ماروی کا طالع ہوتا ہے مگر ماروی محبوب اور مراد دونوں کو نہیں پہچانتی۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو بوجھ کے ساتھ مل گیا۔ مرینہ کو چٹا چل گیا کہ مراد ماسٹر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آ جاتی ہے۔ مراد مرینہ کے زیر اثر آچکا تھا۔ ماروی کو چٹا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کر دیا۔ رابو خاتون نے مراد کے بچے کو ماروی کے ہاں پہنچا دیا۔ ادھر مرینہ دوبارہ TINET فیئر بین گئی تھی مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر جینی سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروائی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے چہرے سے ہونے چاہیے ایمان ملی کی شکل دے دی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہنے لگا۔ وہاں اس کے ساتھ ایمان کا دوست عہدائے کبھی بھی آ گیا۔ مراد نے اس کی بھی سرجری کر دے اسے اپنا چہرہ دے دیا۔ اب یونا عہدائے مراد بن گیا تھا۔ مراد کو بوجھ دیکھ کر پھر اگئے۔ ماروی کی یادداشت واپس آ گئی تھی۔ ادھر مرینہ اپنے بچے کی مٹی تھی۔ مراد نے اسے قایم کر کے اس کی سرجری کروادی اور ایک آنکھیں لگاوا دی جس سے اس پر پاگل پن کے دور سے بچنے لگے۔ اب اس کے پاس نہ اپنا چہرہ تھا اور نہ پرانی یادداشت۔ اس کی یادداشت تھوڑی دیر کے لیے آئی تھی تاہم اس نے ڈاکٹر بکس جزل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد اسرا نیکل پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر جینی سن کے

بچے ایمان سے ہو گئی۔ مراد نے ایمان کو اپنی لام بائیں ہاتھ میں مار دیا۔ مرینہ بھی اسرا نیکل پہنچی مٹی اور ایمان، مراد بن کر اسے اپنے پیچھے بھاگنے لگا۔ مراد کو لندن والی ملاقات میں نیکی براؤن مل گیا۔ مراد کے پیچھے نیکی براؤن کی بیٹی لگ گئی۔ لندن ایئر پورٹ پر نیکی پر حملہ ہوا اور اس کا ایک بیٹا مارا گیا۔ مارنے والے نے اپنا نام مراد بتایا۔ ادھر مرینہ نے ایمان کو مراد بھگہ کے اس سے ملنا چاہا تاہم ایمان دشمنوں کی قاتلنگ سے زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گیا اور مرینہ جان گئی کہ یہ مراد نہیں ہے۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آ گیا۔ مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہو گئی اور پاکستان آ گئی۔ ادھر مراد نے دوبارہ اپنا چہرہ تبدیل کر لیا اور اپنے بچے کی بیٹی براؤن کی بیٹی کے پیچھے لگ گیا۔ میڈونا ایمان ملی کے ساتھ اسکیننگ کرنے کی ہوتی ہے۔ ایسے میں مراد وہاں پہنچ کر نیکی کو دیکھ دیتا ہے کہ تیری بیٹی گئی۔ نیکی پریشان ہو جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

نیکی براؤن کی تو کھوپڑی محوم کر رہ گئی تھی۔ یہ تو اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ مراد یوں اچانک اسکیننگ لوکیشن میں اس کی بیٹی کے پاس پہنچ جائے گا۔ اس نے فوراً ہی سیکج رنی انسر سے فون پر پوچھا۔ "تم کہاں ہو؟ میڈونا کہاں ہے؟ اس کیپنے نے ابھی فون پر کہا ہے کہ وہ میری بیٹی کے پاس پہنچ گیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "انہی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم اسکیننگ لوکیشن میں بے بی کے ساتھ ہیں۔ میں دور بین سے دیکھ رہا ہوں بے بی مڑے سے اسکیننگ کرتی ہوئی، ایک فلیک سے گزر کر دوسرے فلیک کی طرف جا رہی ہے۔ ہمارے چھوٹے گاڑوں اس کے آس پاس ذرا قاصد رکھ کر اسکیننگ کر رہے ہیں۔ ایمان ملی بھی اس کے ساتھ ہے۔" نیکی نے چیخ کر کہا۔ "میں جین کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے میڈونا کی بات کراد۔ وہ دشمن جھوٹ نہیں بولے گا۔ وہ میری بیٹی کے قریب ہی ہے۔" سیکج رنی انسر نے کہا۔ "سرا! آپ اطمینان رکھیں ہمارے چھوٹے گاڑوں بے بی کے ساتھ اسکیننگ کر رہے ہیں۔ ایسے وقت کسی کے پاس فون نہیں ہوتا۔ آپ اس وقت بے بی سے بھی رابطہ نہیں کر سکیں گے۔ وہ سب ہماری آوازوں سے ہمارے پہنچے سے دور ہیں۔" نیکی بے بسی سے بیٹھ گیا۔ اسکیننگ کا پورا ایک رازڈن ختم ہونے کے بعد ہی بیٹی سے فون پر بات ہو سکتی تھی۔ ادھر مکمل شروع ہو گیا۔ چپت رازڈ کے ایک ماتحت نے برف پر چلتے ہوئے ایک گاڑی کے قریب پہنچے ہی اس کی ٹانگ میں زور کی اسٹک ماری۔ اس کے قدم اٹھ گئے۔ وہ اچھل کر پشت کے قتل برف کی سطح پر گر ا۔ برف کی تختی نے ریزہ کی ہڈی کے بارہ بھاہا دیے۔ پاؤں کے نیچے سے ایک تختہ نکل گیا۔ وہ نشیب میں لڑھکتے ہوئے جانے لگا۔ دوسرے دو گاڑوں نے اپنے ساتھی کی یہ حالت دیکھی۔ وہ فوراً دور تھے۔ اس ماتحت کو پکڑنے کے لیے ادھر

کبل ہو گئی تھی۔ مراد کو یوں لگا جیسے آگ کا شعلہ لپٹ گیا ہو۔ وہ فوراً ہی اسے الگ کرتے ہوئے بولا۔ "اب بھی کوئی گولی نہیں سے آسکتی ہے۔ وہ سائے پولیس اسٹیشن ہے۔ وہاں چلو۔"

انہوں نے تختوں سے پاؤں نکال لیے۔ وہ بولی۔ "میں نیچے پاؤں نہیں چل سکوں گی۔ پلیز مجھے وہاں تک اٹھا کر لے چلو۔"

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے اس کے حیروں کو دیکھا۔ جوتے نہیں تھے۔ صرف اسکیٹنگ کی جرابیں تھیں۔ وہ آگ سے دور رہتا چاہتا تھا۔ پھر اس نے سوچا۔ "مرد کو خواہشات سے زیر نہیں ہونا چاہیے۔ میں اتنا کمزور نہیں ہوں۔ میرے ساتھ ایمان کی قوت ہے۔"

یہ سوچتے ہی اس نے ایک ہاتھ سے اسے اٹھا کر اپنے شانے پر لاد لیا اور کسی بھی لحاظ جذبے سے عاری ہو کر وہاں سے تن کر جانے لگا۔ وہ اچانک سرزد ہو گئی۔ "کیا مرد ایسے ہوتے ہیں۔ ایک جنگی میں اٹھا کر لے جاتے ہیں؟" کل میں نے ایمان ملی سے کہا تھا مجھے بازوؤں میں اٹھاؤ۔ ضد کرنے پر اس نے دونوں بازوؤں میں اٹھایا تھا پھر بیڈ پر چھوڑ دیا تھا۔ ہائے وہ کی یہ پوری کر رہا ہے۔ کیسا پتھر جیسا سخت ہے۔"

وہ پتھر بدل رہی تھی۔ نیت بدل جائے تو مرد بدلے میں دیر نہیں لگتی۔ ایمان ملی اس کے ذہن سے دواں آگت ہو گیا۔ مراد چشم زدن میں اس کے اندر کھلبلی پیدا کرنے لگا۔ اس نے پولیس اسٹیشن کے اندر آ کر اسے کانڈ سے اتار دیا۔ فائرنگ اور دغمی ہونے والوں کی خبریں وہاں تک پہنچ گئی تھیں۔ آفیسر سپاہیوں کے ساتھ اسکیٹنگ کے میدان کی طرف گیا تھا۔ جو نیئر آفیسر نے مراد کا بیان لکھا۔ میڈونا نے باپ کو کال کی۔ اس نے تپ کر پوچھا۔ "باپ کی جان! آخریت سے ہو؟ وہ دشمن تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے؟"

"پتا نہیں پاپا! کون تھا وہ دشمن..... ہمارے گارڈز ہاتھی کے دانت ہیں صرف دکھانے کے لیے۔ مجھے تو ایک جوان نے بچایا ہے یہ نہ ہوتا تو آپ ابھی بنی کی آواز نہ سنتے۔"

"تھیکس گاڈ! کون ہے وہ جوان؟ مجھ سے بات کراؤ۔"

میڈونا نے مراد کی طرف فون بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میرے پاپا سے بات کرو۔"

مراد نے فون کو لے کر کان سے لگایا۔ دو جانی دشمن ایک کال کے ذریعے قریب آ گئے۔ اس نے کہا۔ "ویلفر مایے؟"

اس نے پوچھا۔ "بھئی! تم کون ہو؟ تم نے میری بیٹی کو ایک بہت ہی خطرناک دشمن سے بچایا ہے۔ میں تمہارا منہ سوتوں سے بھر دوں گا۔ اب میں تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گا۔ تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ اس خطرناک دشمن سے کوئی بچ نہیں پاتا۔ تم نے اس کا مقابلہ کیسے کیا ہے؟ کیا تم نے اس کی صورت دیکھی ہے؟"

"میں روزی اپنی صورت دیکھتا ہوں۔"

"میں تمہارے نہیں، اس کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ کیا تم اسے کہیں دیکھ کر پہچان سکو گے؟"

"نہیں، اس نے منہ پر منظر لپیٹا ہوا تھا اور آنکھوں پر اسنو بکس تھا۔ چہرہ چھپا ہوا تھا۔"

"پلیز بتاؤ تم نے اس کا مقابلہ کیسے کیا تھا؟"

"میں آپ کی بیٹی کو بچانے کے لیے قریب آ رہا تھا۔ وہ دشمن کن نکال چکا تھا۔ آپ کی بیٹی کو گولی مارنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی میں نے اپنی اسٹک اس کے پاؤں پر ماری۔ اس کے قدم اکھڑ گئے۔ ہاتھ سے کن چھوٹ گئی۔ وہ لڑھکنا ہوا نشیب کی طرف جانے لگا۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "شاباش! تم نے اسے گولی کیوں نہیں ماری؟"

"اسے گولی مارنے سے زیادہ ضروری یہ تھا کہ پہلے آپ کی بیٹی کے لیے ڈھال بن جاتا۔ میں ڈھال بن کر ہی اسے بچاؤ تھا۔ پولیس اسٹیشن تک لے آیا ہوں۔ اب آپ آ کر اسے اپنی حفاظت میں لیں اور مجھے جانے دیں۔"

"میں وہاں نہیں، سسلی میں ہوں۔ تم میری میڈونا کو چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔ تمہاری دلیری کبھی ہے کہ وہ دشمن تمہارے ہی ہاتھوں مارا جائے گا، تم میڈونا کے ساتھ رہو۔ مجھ سے جتنی رقم چاہو گے، تمہیں دیتا ہوں گا۔"

"نہ میں رقم کا محتاج ہوں اور نہ ہی کسی کا باڈی گارڈ بن کر رہنا چاہتا ہوں مگر ہاں شعلہ میں میرے لیے رہائش کا مسئلہ ہے۔ اگر آپ یہ مسئلہ حل کر دیں گے تو....."

وہ فوراً ہی بات کاٹ کر بولا۔ "مسئلہ حل ہو گیا سمجھو۔ میری بیٹی کے ساتھ ایک بہت ہی مہنگے اور آرام دہ کالج میں رہو۔ اسے قائل کرو کہ وہ جلد سے جلد وہاں سے باپ کے پاس چلی جائے۔ اسے کسی طرح بخیریت میرے پاس بھیج دو۔ اس کے بعد بھی میں تم سے دوستی رکھوں گا۔ میں نے کہا نا مجھے یقین ہو گیا ہے، تم ہی میرے اس بدترین دشمن کو ہلاک کر سکو گے۔"

مراد نے کہا۔ "وہ کون ہے، میں نہیں جانتا اور نہ ہی

مداروی

اندھ سے بند کیا۔ پھر باپ سے فون پر بولی۔ "ہاں بولیں۔ میں اکیلی ہوں۔"

باپ نے پوچھا۔ "یہ عادل نواز دیکھنے میں کیسا ہے؟"

"او پاپا! دیری دیری وینڈم، میں تو اس کی طرف کبھی جا رہی ہوں۔"

"اور وہ ایمان ملی.....؟"

"وہ کیا بتاؤں؟ اسے دیکھتے ہی وہ دل سے اتر گیا ہے۔ اس سے کیسے جھجکا چمڑاؤں؟"

"تو کوئی پراہلم نہیں ہے۔ میں تمہارے بدلے ہوئے مزاج کو کھتا ہوں، ابھی حکم دیتا ہوں۔ وہاں کے تمام گارڈز اسے تمہارے قریب نہیں آنے دیں گے۔ اگر وہ سیدھی طرح داکس چلا جائے گا تو تھیک ہے، ورنہ اسے گولی مار کر کہیں پھینک دیا جائے گا۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "تھیک پو پاپا! آئی لو یو۔"

"یہ بات سمجھ لو کہ اسے تم سے دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے بڑی حکمت عملی سے اسے تمہارے ساتھ رہنے پر راضی کیا ہے۔ اب اسے اپنی طرف جھکاؤ تمہارا کام ہے۔ اسے کسی بھی طرح اپنا لائف پارٹنر یا باڈی گارڈ بناؤ۔ وہیں شعلہ میں رہو۔ مراد تم پر حملہ کرنے آتا رہے گا تو عادل نواز کے ہاتھوں ضرور مارا جائے گا۔"

"او کے پاپا! میں عادل کے پاس جا رہی ہوں..... ہائی۔"

وہ مراد کے پاس آ گئی۔ وہاں انسپکٹر کے آفس میں اس کے سٹا گارڈز آ گئے تھے۔ اس نے مراد سے کہا۔ "میں بہت خوش ہوں۔ پاپا نے کہا ہے تم میرے ساتھ کالج میں رہو گے، چلو ہماری گاڑی آ گئی ہے۔"

وہ اٹھ کر اس کے ساتھ آفس سے باہر آتے ہوئے بولا۔ "تمہارے ساتھ ایک جھت کے نیچے رہنے سے پہلے کچھ ضروری باتیں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں۔ میری باتوں پر عمل کرو گی تو ساتھ رہوں گا۔ ورنہ چلا جاؤں گا۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں اتنی بھیتیں دوں گی کہ تم کہیں جانا بھول جاؤ گے۔"

"میری پہلی شرط یہی ہے کہ محبت نہیں کرو گی۔ نہ جسانی تعلق کی خواہش رکھو گی۔ میں ابھی زیادہ نہیں بولوں گا۔ کار میں گارڈز ہماری باتیں سنیں گے۔ اہم باتیں کانچ میں پہنچ کر ہوں گی۔"

وہ اس کے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے وقت بھی اس نے قائلہ رکھا تھا۔ اس کا سخت رویہ میڈونا کو مایوس کر رہا تھا لیکن اسے اپنے حسن و شباب پر بڑا ناز تھا۔ اسے

خواب تھا اس سے دشمنی سول لوں گا۔ میری یہ کمزوری ہے کہ میں کسی صورت پر ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ میڈونا پر ظلم کرنے والا تھا اس لیے میں اسے بچانے آ گیا۔ آئندہ ایسے کسی جھیلے میں نہیں پڑوں گا۔"

اس نے "جسٹ اسے منٹ" کہہ کر ذرا چپ رہ کر سوچا۔ عقل میں یہ بات آئی کہ بیٹی کو وہیں شعلہ میں رہنا چاہیے۔ وہ وہاں رہے گی تو مراد اس پر حملے کرتا رہے گا اور یہ جوان اسے بچانے کے لیے اس سے مقابلہ کرتا رہے گا۔ مراد ضرور اس کے ہاتھوں مارا جائے گا۔

پھر اس نے فون پر کہا۔ "تھیک ہے، میں تم سے نہیں کہوں گا کہ تم کسی جھیلے میں پڑو۔ صرف اتنا کرو کہ جب تک میڈونا وہاں ہے اس کے ساتھ کالج میں رہو۔ اسے ایک جانی دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ کر نہ جاؤ۔"

"یہ مجھے منظور ہے۔ جب تک میڈونا یہاں رہے گی، میں اس کے ساتھ رہوں گا۔ میں دیکھوں گا کہ وہ دشمن کتنے پانی میں ہے۔ میں اسے قریب نہیں آنے دوں گا۔"

"تھیکس، یعنی مینی ٹھیکس۔ فون میڈونا کو دو۔"

مراد نے فون اسے دیا۔ اس نے بڑی حکمت عملی سے اپنا ہماؤ بڑھا کر دشمن کا اتحاد حاصل کر لیا تھا۔ آئندہ اس کی بیٹی کی رگ جاں کے قریب رہنے والا تھا۔

میڈونا نے فون پر پوچھا۔ "نیں پاپا! اس جوان سے معاملہ طے ہو گیا؟ میں نے ابھی تک اس کا نام نہیں پوچھا ہے۔"

میڈونا نے یہ کہتے ہوئے مراد کو دیکھا۔ وہ بولا۔ "میرا نام عادل نواز ہے۔ میں یہاں گرمیوں کا موسم گزارنے آیا ہوں۔"

وہ بولی۔ "پاپا! اس کا نام عادل نواز ہے۔"

وہ بولا۔ "بیٹی! تم نے کہا تھا کہ مراد عورتوں پر حملہ نہیں کرتا ہے۔ تم نے آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ دشمن کم ظرف ہے۔ اس کا کوئی اصول نہیں ہے۔ شکر کرو عادل نواز تمہاری سلامتی کے لیے آ گیا ہے۔"

"کیا یہ میرے ساتھ رہے گا؟"

"ہاں تم عادل نواز سے ذرا دور جاؤ۔ میں کچھ اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"او کے پاپا! وہ فون بند کر کے پولیس آفس سے بولی۔ "واش روم کہاں ہے؟"

سپاہی نے کہا۔ "آپ میرے ساتھ آئیں۔"

وہ اس کے ساتھ آفس سے نکل کر عمارت کے ایک حصے میں آئی۔ وہاں واش روم کے اندر پہنچ کر دروازے کو

تجین تھا کہ درخت رفتا سے اپنا پیر بنا لے گی۔
وہ کالج کے احاطے میں پہنچ گئے۔ وہاں احاطے کے

باہر اور اندر کئی سڑک گارڈز نظر آ رہے تھے۔ کالج کے
اطراف رنگ برنگے پھولوں کا باغچہ تھا۔ وہ دونوں کالج
کے اندر آ گئے۔ گارڈز باہر رہ گئے۔ مراد جیسے ہوئے انداز
میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ میڈونا اسی صوفے پر قریب آ کر
بیٹھتی ہوئے بولی۔ "پولیس اسٹیشن میں تمہاری بات اوموری
رہ گئی تھی۔ تم کیا بول رہے تھے؟"

وہ وہاں سے اٹھ کر دوسرے صوفے پر جا کر بیٹھتی
ہوئے بولا۔ "میں یہی کہہ رہا تھا۔ ہمارے درمیان فاصلہ ہے
گا۔ ہم ایک صوفے پر بھی قریب ہو کر نہیں بیٹھیں گے۔"

"ہائے تم کتنے نیک اور پارسا ہو۔ مجھے ایسے ہی
آئینہ دل کی تلاش تھی، جو حسین عورتوں کو گفت نہ دیتا ہو۔ میں
نے تمہارے جیسے پارسا کے انکار میں اپنے آپ کو سنبھال کر
رکھا ہے۔ کسی کو میں نے ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں دی۔"

"میں نے اسکیٹنگ گراؤنڈ میں تمہیں اپنے پیار کے
ساتھ دیکھا ہے۔ وہاں تم اس کے گلے کا ہارنی ہوئی تھیں۔"
وہ ہنسنے لگا۔ "نہیں، تم غلط سمجھ رہے ہو۔
میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"پلیز مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ تم کیسی
زندگی گزار رہی ہو۔ مجھے اتنی مصل ہے کہ تازہ کھانا ملتا ہو تو
بای کومنز نہیں لگنا چاہیے۔"

وہ صوفے سے بولی۔ "تم مجھے منہ نہ لگانے کی بات
کر رہے ہو۔ میری انسٹ کر رہے ہو۔"

"میرا نیک مشورہ ہے کہ میرا خیال دماغ سے نکال
دو۔ پھر انسٹ محسوس نہیں ہوگی۔"

"تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟ میں تمہیں ٹھکراتی ہوں۔ دور
ہو جاؤ میری نگاہوں سے۔"

"تمہارے باپ کو زبان دے کر آیا ہوں۔ وہ
بولے گا کہ چلا جاؤں تو چلا جاؤں گا۔"

وہ باپ سے فون پر رابطہ کرنے لگی۔ مراد نے اسے
اور پیش دلانے کے لیے کہا۔ "کتنا بھی قصہ دکھاؤ، پھر سے
کنواری بن نہیں سکی۔ ہمیشہ آبرو بابت کہلاؤ گی۔"

وہ حلق پھاڑ کر چیختی ہوئے بولی۔ "پوشٹ اپ۔"
اسی لمحے میں باپ سے رابطہ ہو گیا۔ اس نے حیرانی
سے پوچھا۔ "تم مجھے شٹ اپ کہہ رہی ہو؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "میں اس مفرد کو کہہ رہی ہوں۔ یہ
میری انسٹ کر رہا ہے۔ کہتا ہے، میں کنواری نہیں ہوں۔ اپنی

آبرون بچتی ہوں۔ پاپا! اسے ابھی یہاں سے نکال دیں۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "میڈونا! تم اپنے ذاتی
محاطے میں میرا کام بگاڑ رہی ہو۔ میں انکار کر رہا ہوں کہ
مراد جلد ہی عادل کو نواز سے ٹکرانے گا۔ میرا دل کہتا ہے، اس
بار مراد مارا جائے گا لیکن تم دوسرے سسٹے میں میری پانچ
کوٹا کام بتا رہی ہو۔ اپنا فون اسے دو۔ میں اس سے بات
کر رہا ہوں۔" اس نے اپنا فون آگے بڑھا دیا۔
"کیا تم اسے قصہ دلا رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "سوری، میری نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ میں
آدمے کھینچے بعد باتیں کر سکتوں گا۔"

وہ فون بند کر کے کالج کے مختلف حصوں کو دیکھنے لگا۔
پھر ایک کمرے میں جا کر اس نے دروازے کو اندر سے بند
کر لیا۔ میڈونا دوری دور سے اسے دیکھتی ہوئی پیچھے جا رہی
تھی۔ جب اس نے ایک کمرے کا دروازہ بند کر لیا تو اس
نے فون پر باپ سے کہا۔ "آپ ایک غلط آدمی پر بھروسہ
کر رہے ہیں۔ جو آپ کی بیٹی کی عزت نہ کرتا ہو، وہ آپ کا
دوست نہیں، دشمن ہی ہوگا۔"

"میڈونا! مجھے اس سے دوستی نہیں کرنی ہے۔ بس
ایک بار اسے مراد سے ٹکرانے دو۔ جس طرح دوسرے
مار سے گئے ہیں، اسی طرح وہ بھی مراد کے ہاتھوں مارا جائے
گا۔ اس کے مرنے سے ہمارا کچھ نہیں جائے گا اور اگر مراد
اس کے ہاتھوں مارا جائے گا تو تمہارے باپ کو پیٹنے بھنائے
ایک بہت ہی خطرناک دشمن سے نجات مل جائے گی۔"

پھر وہ ذرا سرگوشی میں بولا۔ "ہم یہودی ہیں۔ ان
مسلمانوں سے ہمارا کچھ جوڑ بھی ہو ہی نہیں سکتا۔ میں تم سے
دعوت کرتا ہوں۔ جس دن یہ مراد کو ہلاک کرے گا، اسی دن
میرے گارڈز اسے جہنم میں پہنچا دیں گے۔ میں اپنی بیٹی کی
انسٹ کرنے والے کو وہاں سے زندہ نہیں جانے دوں گا۔"

"پاپا! آپ کی چال سمجھ میں آگئی ہے۔ بس میں یہی
چاہتی ہوں کہ یہ یہاں سے زندہ نہ جائے۔ آپ بتائیں
میں کیا کروں؟"

"اپنی انسٹ برداشت کرو۔ کچھ دنوں تک تمہارا
دیکھو کہ مراد یا عادل میں سے کون زندہ رہے گا۔ یہ میرا وعدہ
ہے عادل تمہارے سامنے مارا جائے گا۔"

"تھیک پو پاپا۔۔۔۔۔!"

"بس قصہ ٹھوک دو اور اس سے دوستی کرو۔"

"آل رائٹ پاپا۔۔۔۔۔ یہی کروں گی۔"

وہ بند کمرے میں نماز پڑھ رہا تھا۔ اس کی یہی کوشش

ہوتی تھی کہ ایک وقت کی بھی نماز قضا نہ ہونے پائے۔ وہ دعا
مانگنے کے بعد وہاں سے اٹھنا چاہتا تھا۔ اسی وقت کالنگ فون
سنائی دی۔ اس نے سوچا یہ کون کال کر رہا ہے۔ فون
اٹھا کر نمبر پڑھنے سے معلوم ہوا ایمان ملی نکار رہا ہے۔
اس نے فون دیکھا۔ "اکیلے ہو؟"
"ہاں، کوئی آس پاس نہیں ہے۔"

"یار! میرے ساتھ مجب تھا ہوا ہے۔ گارڈز نے
مجھے کالج میں جانے سے روک دیا ہے۔ میرا سامان باہر لا کر
کہہ دیا ہے کہ آئندہ ادھر نہ آؤں۔ میڈونا نے مجھے دودھ کی
کھمی کی طرح نکال دیا ہے۔ یہ سگم دیا گیا ہے کہ اپنی سلامتی
چاہتا ہوں تو آج ہی دہلی واپس چلا جاؤں۔ تم بولو کیا کروں؟"
"چپ چاپ دہلی چلے جاؤ۔ یہ انٹرنیشنل بد معاش
ہیں، ان کے منہ نہ لگو۔"

"یار! تو زیادتی ہے۔ میں میڈونا کے ساتھ کچھ اور
راتیں گزارنا چاہتا تھا۔"

"تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو رہی ہے۔ تم
بھی ایک حسن سے کھینچے ہو، پھر اسے چھوڑ کر دوسری کی طرف
چل دیتے ہو۔ میڈونا بھی تمہارے ساتھ یہی کر رہی ہے۔"
"کیا تمہاری طرف لڑکھائی ہے؟"

"تم ابھی طرح جانتے ہو، میں ایسی دل پیچک
عورتوں کو دیکھتے ہی لاجول پڑتا ہوں اور ان سے دور
بھاگتا ہوں۔ تمہیں بھی سمجھانا ہوں۔ بہت عیاشی کر چکے۔
اب نمازیں پڑھو۔"

"وہ تو پڑھتا ہوں۔"

"جب دل چاہتا ہے یا ضرورت کے وقت خدا یاد
آتا ہے تو پڑھ لیتے ہو۔ سچ بولو، کل سے اب تک میڈونا کے
ساتھ رہ کر ایک وقت کی بھی نماز پڑھی؟"

"وہ یار! بات یہ ہے کہ وہ یہودی حسینہ ہے۔ دل نے
کہا اس کی چھت کے نیچے نماز نہیں پڑھوں گا۔ دوسرے دن
کسی مسجد میں جاؤں گا۔"

"بس آگے نہ بولو۔ میں نے اسی یہودی حسینہ کے
کالج میں ابھی نماز پڑھی ہے۔ دل میں خدا کا خوف رکھو پھر
خود ہی عبادت کی طرف مائل ہوتے رہو گے، بہر حال میں
زیادہ کچھ دینا نہیں چاہتا۔ یہاں سے آج ہی چلے جاؤ۔
آئندہ مجھے فون نہ کرنا۔ میں اپنے فون سے تمہارے نمبر
ڈیلیٹ کر رہا ہوں۔"

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ وہاں سے اٹھ کر دروازہ

کھول کر باہر آیا تو میڈونا سامنے کھڑی تھی۔ وہ سر جھکا کر
بولی۔ "عادل۔۔۔۔۔! میں سوری کہتی ہوں۔"
مراد نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ بولی۔
"جب تم نے کہا کہ میں کنواری نہیں ہوں تو مجھے قصہ آ گیا
اور میں نے غصے میں تمہارے احسان کو بھلا دیا۔ آج تم
میری جان نہ بچاتے تو میں کب کی مر چکی ہوتی۔ تم نے مجھے
نئی زندگی دی ہے۔"

وہ ذرا قریب ہو کر بولی۔ "پلیز میں نے غصے میں جو
بھی کہا ہے، اسے بھول جاؤ۔ مجھے معاف کر دو۔"

"تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ تم اعتراف
کر رہی ہو۔ معافی مانگ رہی ہو۔ میں کھلے دل سے معاف
کر رہا ہوں۔"

"تھیک پو عادل! تم بہت اچھے ہو۔"

وہ اور قریب آ کر بولی۔ "میں اور قریب نہیں آؤں گی۔
تم فاصلہ رکھنا چاہتے ہو۔ میں تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی۔"
"ایسی مجھو داری سے رہو گی تو میں تمہارے دشمن کو
خاک میں ملانے تک یہاں رہوں گا۔"

وہ دل میں بولی۔ "اسی لیے تو پھر سے دوستی کر رہی ہوں۔
دشمن کو خاک میں ملانے کے بعد تم بھی میں مل جاؤ گے۔"

پھر اس نے کہا۔ "جس کمرے میں تم نے عبادت کی
ہے، اب اسی میں رہا کرو گے۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو،
گارڈز کو حکم دو گے تو ضرورت فوراً پوری ہوگی۔"

ایک گارڈ نے آ کر کہا۔ "سچ تیار ہے۔ میز پر
آ جاؤ۔"

وہ ڈانٹ نکھل پر آگئے۔ میڈونا نے اس کی طرف
ایک ڈش بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم واقعی پارسا ہو؟ تم
نے کبھی کسی حسینہ میں دلچسپی نہیں لی ہے؟"

اس کے قصور میں ماروی آگئی۔ وہ اسے بڑے
جذبے سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "بس ایک ہی ہے۔ تم نے
پوچھا اور وہ نگاہوں کے سامنے آگئی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے، تم کسی کے بچے عاشق ہو؟"

وہ سرد آہ بھر کر بولا۔ "ہاں، مگر یہ عشق یک طرفہ
ہے۔ وہ مجھے گھاس نہیں ڈال رہی ہے۔"

"تعب ہے۔ تمہارے جیسے منڈم اور اسمارت
جوان سے دل نہیں لگا رہی ہے۔ کیا بہت مغرور ہے؟"

"ہاں، مگر اس کے خلاف کچھ نہ کہنا۔ اس مغرور کی ہر
ادامیرے دل کو بھاتی ہے۔"

"ادگاؤ! اس کے غرور سے بھی محبت ہے۔ پھر تو واقعی

اس کے کپے عاشق ہو۔ یہ بتاؤ اس کے لیے پاگل ہو تو پھر اس سے دور یہاں کیوں آئے ہو؟“

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ گرمیاں گزارنے ادھر آئے گی۔ اسی لیے یہاں آیا ہوں۔“

”کیا وہ شملہ میں ہے؟ میں اسے دیکھنا چاہوں گی۔“

اس نے دل میں کہا۔ ”میری ماروی تو دل میں رہتی ہے۔ اسے کیسے دکھا سکوں گا؟“

پھر اس نے کہا۔ ”مجھے نظر آئے گی تو تمہیں ضرور دکھاؤں گا۔ کل یہاں آکر اسے تلاش کیا، وہ نظر نہیں آئی۔ ابھی تلخ کر کے باہر جاؤں گا پھر اسے تلاش کروں گا۔“

وہ تلخ کے بعد کانچ سے باہر آگیا پھر سڑک کے کنارے چلتا ہوا وہاں سے بہت دور آکر اس نے چپیت راؤ سے فون پر کہا۔ ”میں اس وقت ہنومان مندر کی طرف جا رہا ہوں۔ آ جاؤ۔“

”ابھی پندرہ منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ پندرہ منٹ کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے روبرو تھے۔ چپیت راؤ نے کہا۔ ”میں دور سے دیکھ رہا تھا۔ تم میڈونا کے ساتھ اس کے کانچ میں گئے تھے۔ کیا اس کا اعتماد حاصل ہو گیا ہے؟“

”اس کے باپ کا بھی اعتماد حاصل کر چکا ہوں۔ اسے یقین ہے کہ اس کا دشمن مراد میرے ہی ہاتھوں مارا جائے گا۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”تمہارے ہاتھوں تمہیں مار ڈالنے کے فریب میں مبتلا ہو گیا ہے۔ یار...! تم بڑی اچھی چال چل رہے ہو۔ آگے کیا ارادہ ہے؟“

مراد نے ایک ذرا سوچنے کے بعد کہا۔ ”اب تم مرینہ سے رابطہ کرو۔ اس سے بولو کہ آج کسی وقت میڈونا پر حملہ کرے۔ میں پھر اسے پہچاؤں گا۔ پھر مسکی براؤن کا اعتماد مستحکم ہوگا کہ میں مراد علی مسکی پر بھاری پڑ رہا ہوں۔“

اس نے مرینہ کے نمبر پر کال کی۔ رابطہ ہوتے ہی وہ بولی۔ ”چپیت راؤ تم کہاں ہو؟ کیا مراد نے تم سے رابطہ کیا ہے؟“

”نہیں، میں نے یہی پوچھنے کے لیے تمہیں کال کی ہے۔ اس نے تم سے یا ماسٹر کو بو سے رابطہ کیا ہوگا۔“

”مجھ سے تو نہیں ماسٹر سے کیا تھا۔ اس نے ماسٹر سے کہا ہے کہ وہ یہاں شملہ میں ہے۔ یہ بات مرینہ کو یعنی مجھ کو اور چپیت راؤ کو نہ بتائی جائے۔ وہ ہم سب سے چھپ کر مسکی براؤن کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ ماسٹر نے اسے سمجھایا ہے کہ وہ کم از کم مجھ سے نہ چھپے۔ میرے ساتھ رہ کر دشمنوں

پر زیادہ بھاری پڑے گا لیکن پتا نہیں اسے کیا ہو گیا ہے اس نے ماسٹر کی بات ٹال دی ہے۔“

وہ انجان بن کر بولا۔ ”کیا واقعی...؟“

مرینہ نے کہا۔ ”میں حیران ہوں کہ ماسٹر اس کی خود سری... اور گستاخی برداشت کر رہا ہے؟“

”تم ماسٹر کو بو کو اچھی طرح جانتی ہو۔ وہ صرف اپنا کام نکالنا جانتا ہے اور مراد پر اسے بھروسہ ہے کہ وہ میرے اور تمہارے بغیر یہاں بھی مسکی براؤن پر بھاری پڑے گا۔“

”وہ یہاں ہے تو میں ضرور اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔“

”اگر آج صبح کھڑی کے اسکیننگ... گراؤنڈ میں جاتیں تو ضرور اسے پکڑ لیتیں۔ میں نے سنا ہے وہاں میڈونا کے چھ پاؤں گا رڈز تھے۔ ان میں سے ایک مارا گیا ہے اور دوزخی ہوئے ہیں۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ مراد نے ہی یہ دلیری دکھائی ہے۔“

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”او گاڈ! وہ اکیلا قاتل کر رہا ہے۔ کہیں نہ کہیں گھیرا جائے گا۔ مارا جائے گا۔“

وہ ذرا رک کر بولی۔ ”اگر وہ اس لیے مجھ سے دور ہو گیا ہے کہ مجھے اپنی منکوہ نہیں بنانا چاہتا ہے تو نہ بتائے۔ میں اس کی سلامتی چاہتی ہوں۔ وہ مجھ سے صرف دوستی ہی رکھے، یہ بات اسے کیسے سمجھاؤں؟ مجھے غصہ آرہا ہے۔ اس نے فون کی سم بدل دی ہے، اس سے باتیں کیسے کروں؟“

”ایک راستہ ہے۔ میڈونا پر آج کسی وقت حملہ کرو۔ وہ بھی میڈونا کی تاک میں کہیں آس پاس ہوگا۔ وہ بھی اسے نقصان پہنچانے کے لیے حملہ کرے گا تو تم اسے پہچان لوگی۔“

”ہوں... ٹھیک کہتے ہو۔ وہ کسی وقت بھی کانچ سے نکلے گی تو ضرور اس پر حملہ کروں گی۔“

”میرے ماتحت دن رات اس پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ جب بھی کانچ سے باہر جائے گی میں تمہیں فون پر اطلاع دوں گا۔ ایسے وقت ہمیں ساتھ رہنا چاہیے۔ مجھے بتاؤ، ہماری ملاقات کہاں ہو سکتی ہے، میں وہاں آ جاؤں گا۔“

”سوری، جب تک مراد چھپا رہے گا، تب تک میں بھی اپنے نئے بہروپ میں چھپی رہوں گی۔ ماسٹر نہ کرنا تمہارے سامنے بھی نہیں آؤں گی۔“

”کوئی بات نہیں۔ ہم فون کے ذریعے ہی رابطہ رکھیں گے۔“

اس نے فون بند کر کے مراد کو دیکھا پھر کہا۔ ”وہ ہم پر بھروسہ نہیں کر رہی ہے۔“

”ہوں... اور میں اسے پہچاننا چاہتا ہوں کہ وہ کس

نے چہرے کے پیچھے خود کو چھپا کر مجھ تک پہنچنا چاہتی ہے۔
 "تم کسی وقت میڈونا کے ساتھ تفریح کے لیے نکلو۔
 مرینہ حلقہ کرے گی تو تم اسے پہچان لو گے۔"
 "میں ابھی کانچ میں جاؤں گا۔ کوشش کروں گا کہ وہ
 شاپنگ وغیرہ کے لیے کانچ سے باہر آئے۔ ابھی سکی براؤن
 کو کال کرو۔ میں بات کروں گا۔"
 چپت راؤ نے سکی براؤن کے نمبر پر فون کر کے فون مراد
 کو دیا۔ اس نے اسے لے کر کان سے لگا دیا۔ پھر رابطہ ہونے
 پر اپنی آواز اور لہجہ میں کہا۔ "مجھے پہچان رہے ہو؟"
 وہ بولا۔ "تم..... تم مراد بول رہے ہو۔ پھر کوئی دھمکی
 دینے آئے ہو۔ صبح تم نے دیکھ لیا کہ میڈونا کا ایک باڈی
 گارڈ کتنا ٹھنڈا ہے۔ تم قسمت کے دھنی ہو۔ اس سے بچ کر نکل
 گئے۔ آئندہ وہ دلیر جوان تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"
 مراد نے کہا۔ "مانتا ہوں، پہلی بار ایک پھر تجیلے دشمن
 سے مقابلہ ہوا تھا۔ میں مرتے مرتے بچ گیا۔ بری طرح زخمی ہو
 چکا ہوں۔ علاج کے لیے دہلی واپس جا رہا ہوں۔ ایک آدھ
 ہفتے میں چلنے پھرنے کے قابل ہوتے ہی شملہ پھر آؤں گا۔"
 وہ خوش ہو کر بولا۔ "وہ مارا۔ پہلی بار تم میدان چھوڑ
 کر بھاگ رہے ہو۔ اب میں دہلی میں بھی تمہارا پیچھا نہیں
 چھوڑوں گا۔"
 "میں زخمی شیر ہوں۔ تمہارا وہ آدمی دہلی آئے گا تو تمہیں
 اس کی لاش ہی ملے گی۔ میں اسکیٹنگ کے دوران اس کی
 صورت دیکھ نہیں پایا۔ اس کا آدھا چہرہ منظر میں اور آدھا
 اسنو گولف میں چھپا ہوا تھا۔ مجھے صرف اس کا نام بتا دو۔"
 اس نے قبضہ لگاتے ہوئے فون بند کر دیا۔ مراد نے
 فون کو دیکھتے ہوئے اسے چپت راؤ کو واپس کرتے ہوئے
 کہا۔ "وہ بہت خوش ہے۔ قبضہ لگا رہا تھا۔ اسے یقین ہو گیا
 ہے کہ میں یہاں نہیں ہوں۔ اب وہ بنی کو آزادی سے باہر
 کھونٹے پھرنے کی اجازت دے گا۔"
 "تو پھر کیا ارادہ ہے؟ کیا کرو گے؟"
 "وہی جو سوچا ہے۔ وہ میرے ساتھ باہر کہیں بھی
 کھونٹے پھرنے کے لیے راضی ہو جائے گی۔ میں اسے ڈر
 کے لیے کسی ایسے ریٹورنٹ میں لے جاؤں گا۔"
 وہ دونوں جدا ہو گئے۔ اب رات ہی کو کچھ ہونے
 والا تھا۔ مراد کسی طرح مرینہ کو نئے چہرے کے ساتھ پہچان
 لینا چاہتا تھا۔ یہ اندیشہ تھا کہ پہلے وہ پہچان لے گی تو گلے پڑ
 جائے گی پھر اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا اور وہ
 اس اجنبی کے پیچھے پڑ گئی تھی، جس سے پچھلی رات نکلنا ہوا

تھا۔ وہ دوسرے دن اسے تلاش کرتی ہوئی اسکیٹنگ گراؤنڈ
 کی طرف گئی تھی۔ مراد کو قریب سے دیکھتے ہوئے گزر گئی
 تھی۔ مراد نے بھی اسے دیکھا تھا لیکن وہ ایک دوسرے کو
 پہچان نہ سکے۔
 مرینہ نے اس وقت بھی چپت راؤ سے فون پر باتیں
 کرتے وقت اس اجنبی کو دیکھ لیا تھا۔ اب اس کا پیچھا کر رہی
 تھی۔ پہلے یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ وہ کہاں رہتا ہے اور تنہا
 کس طرح میڈونا کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے؟
 لیکن وہ اس کا تعاقب کرتے کرتے ٹھک گئی۔ وہ
 اجنبی میڈونا کے کانچ کے احاطے میں داخل ہو گیا تھا۔ یعنی
 وہ دشمن کا آدمی تھا۔
 وہ ایک قبوہ خانے کے باہر کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔
 "کیا یہ مراد نہیں ہے؟ سکی براؤن کا کوئی قابل اعتماد آدمی
 ہے۔ اسی لیے میڈونا کے کانچ میں گیا ہے۔"
 اس نے دوسرے پہلو سے سوچا۔ "کیا مراد وہی نیم مکمل
 رہا ہے؟ سکی براؤن کا دشمن تو ہے ہی اب دوست بن رہا
 ہے۔ ہاں وہ ایسی کوئی چال چل سکتا ہے۔ وہ اس دشمن کا اعتماد
 حاصل کر کے میڈونا کے پاس اس کے کانچ میں پہنچ گیا ہے؟"
 وہ صبح سوت میں سوچنے لگی۔ "ہاں۔ اس نے یہی کیا
 ہے۔ وہ فطرتاً طور پر کو ہلاک نہیں کرتا۔ جب مجھ سے دشمنی
 تھی تو اس نے مجھے زخمی کیا تھا۔ میری جان نہیں لی تھی۔ اسی
 طرح وہ میڈونا کے قریب پہنچ کر اسے ہلاک نہیں کرے گا۔
 سکی براؤن کو نقصان پہنچانے کے لیے کوئی اور ہی نیم مکمل
 رہے گا۔"
 ہونٹ کے ملازم نے اس کے سامنے قبوے کی چابی
 لا کر رکھی۔ وہ ہلک نی کا ایک گھونٹ لے کر سوچنے لگی۔ کتنی
 باتیں سمجھنے کو رہ گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جس کے پیچھے بھاگ
 رہی ہوں، وہ مراد ہی ہے۔
 اس نے دوسرا گھونٹ لے کر سوچا۔ "دوسری بات یہ
 کہ وہ سخت حفاظتی انتظامات میں سرنگ بنا کر میڈونا کے کانچ
 میں پہنچ گیا ہے۔ مجھے یہ کسی طرح معلوم کرنا ہو گا کہ میں مراد
 کو پہچاننے میں غلطی نہیں کر رہی ہوں۔"
 وہ غلطی یہ کر رہی تھی کہ دشمن کے آدمی کو مراد سمجھ رہی
 تھی اور یہ بات بھی صحیح تھی کہ مراد دشمن کا اعتماد حاصل کر کے
 میڈونا کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ وہ صبح سوت میں سوچنے کے
 باوجود یہ معلوم نہیں کر سکتی تھی کہ مراد اس کانچ میں موجود ہے
 اور جسے اس نے کانچ میں جاتے دیکھا ہے، وہ محض ایک
 فریب ہے۔

وہ حقیقتاً سکی براؤن کا ایک انڈین جاسوس دھرم ور
 تھا۔ پچھلی رات مرینہ سے اتفاقاً ٹکرایا تھا۔ اسے یہ معلوم ہو
 گیا تھا کہ مرینہ اس نے روپ میں ہے اور اسے مراد سمجھ کر
 دھوکا کھا رہی ہے۔ یعنی یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ مراد بھی اپنا چہرہ
 اور طبع بدل چکا ہے اور مرینہ اسے نہیں پہچان رہی ہے۔
 دھرم ور جانتا تھا کہ وہ کتنی خطرناک عورت ہے۔ اگر
 اس کے پاس کن ہوتی تو وہ اسے وہیں ختم کر دیتا۔ وہ غالی ہاتھ
 تھا۔ اس لیے اندھیرے میں اس سے کتہا کر نکل گیا تھا۔
 اس نے کانچ کے احاطے میں آ کر سکی براؤن سے فون
 پر کہا تھا۔ "ابھی مرینہ سے میرا ٹکراؤ ہوا تھا۔ افسوس کہ میں خالی
 ہاتھ تھا۔ اسے مجھ سے نہیں سمجھے اس سے خطرہ تھا۔ اس لیے میں
 تاریکی سے فائدہ اٹھا کر اس سے کتہا کر چلا آیا ہوں۔"
 "یہ تو تم نے سنبری موقع گنوا دیا۔ کیا تم اپنے پاس گن
 نہیں رکھتے ہو؟ خالی ہاتھ کیوں تھے؟"
 اس نے کہا۔ "تین انجانے دشمنوں سے ٹکراؤ ہوا تھا۔ دو
 کو میں نے مار گرایا۔ میری گن خالی ہو گئی تھی میں وہاں سے
 بھاگنے لگا تو تیسرے نے میرا پیچھا کیا۔ اس کی گن بھی خالی ہو
 گئی تھی۔ ایک جگہ ہم دونوں میں مقابلہ ہوا تو میں نے اسے مار
 گرایا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ ایسے وقت مرینہ مجھے کہیں سے
 دیکھ رہی تھی۔ مراد سمجھ کر میرے پیچھے پڑ گئی۔"
 "تم اسے اپنے پیچھے لگاؤ۔ ایسے وقت تمہارے آدمی
 اسے نظروں میں رکھیں گے۔"
 "ہمارا کوئی آدمی اسے نئے روپ میں نہیں پہچانے
 گا۔ میں ہی اسے قریب کروں گا۔ وہ میرے تعاقب میں
 رہے گی، میں کوئی مناسب جگہ دیکھ کر اسے گولی مار دوں گا۔"
 اس نے دوسرے دن یہی کیا۔ بھرا ہوا ریو الور لباس
 میں چھپا کر شملہ کی مختلف وادیوں میں اسے تلاش کرتا رہا۔
 ایسے وقت مرینہ بھی اسے ڈھونڈ رہی تھی۔ لیکن شام تک وہ
 نہ مل سکتی رہے۔ پھر مرینہ ہی اسے دیکھ کر چھپ گئی۔ یہ پہلے
 ہی ملے پر بھی تھی کہ چھپ کر اس کا تعاقب کرے گی۔ اس کی
 معمر دنیا کو دیکھتی رہے گی۔ یوں اس کی رہائش گاہ تک
 پہنچے گی۔
 اب اسے کانچ کے احاطے میں جاتے دیکھ کر حیران
 رہ گئی تھی۔ اس کے آدھے کھنٹے بعد مراد اس کانچ میں واپس
 آیا۔ مرینہ وہاں سے دور قبوہ خانے کے باہر بیٹھی ہوئی تھی۔
 وہ اسے دیکھ نہ سکی۔
 میڈونا نے پوچھا۔ "تم کہاں چلے گئے تھے؟ میں
 شاپنگ کے لیے جانا چاہتی ہوں اور پاپا نے تاکید کی ہے کہ

میں تمہارے ساتھ باہر نکلا کروں۔ کیا ابھی چلو گے؟"
 "ضرور چلوں گا۔ پہلے اپنے پاپا سے بات کر دو۔"
 اس نے باپ سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "مسٹر عادل آپ
 سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"
 اس نے فون مراد کو دیا۔ اس نے اسے کان سے لگا کر
 کہا۔ "ویلو مسٹر براؤن! آپ کی صاحبزادی شاپنگ کے
 لیے جانا چاہتی ہیں۔ میں پہلے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ مراد
 کہاں ہو سکتا ہے۔ میں نے اسکیٹنگ اسٹک سے حملہ کر کے
 اسے گرایا تھا۔ وہ برف پر دوڑتے ہوئے ٹھک گیا تھا۔ یقیناً زخمی
 ہوا ہو گا۔ آپ کے آدمی معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ یہاں کسی
 اسپتال میں ہے یا نہیں؟"
 وہ بڑی ترنگ میں بولا۔ "وہ دفع ہو گیا ہے۔ میں
 نے تھوڑی دیر پہلے معلوم کیا ہے۔ وہ علاج کے لیے دہلی چلا
 گیا ہے۔ شملہ میں نہیں ہے۔ تم میڈونا کو کانچ سے باہر لے
 جا سکتے ہو۔"
 "آپ اجازت دے رہے ہیں تو ضرور لے جاؤں گا
 لیکن ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے وہ دہلی نہ گیا ہو
 آپ کو غلط خبر دی گئی ہو۔ میں اپنی پلاننگ کے مطابق میڈونا
 کو باہر لے جاؤں گا۔"
 "تمہاری پلاننگ کیا ہے؟"
 "میں چاہتا ہوں، میرے قد اور میری جسامت والا
 کوئی آپ کا آدمی میڈونا کے ساتھ باہر جائے اور میں ذرا
 فاصلہ رکھ کر میڈونا کے لیے ڈھال بننا ہوں۔ دشمن یہاں ہو گا
 تو میرے قد کے آدمی کو دیکھ کر دھوکا کھائے گا اور اس پر گولی
 چلائے گا۔ میں آپ کی نینا پر آج بھی نہیں آنے دوں گا۔"
 "ہاں، میرا ایک جاسوس دھرم ور میڈونا کے ساتھ
 جائے گا۔ مرینہ اسے دیکھ کر دھوکا کھا چکی ہے۔ اسے مراد
 سمجھ رہی ہے۔"
 مراد نے انجان بن کر پوچھا۔ "یہ مرینہ کون ہے؟"
 "وہ مراد کی محبوبہ ہے۔ اسے شملہ میں ڈھونڈتی پھر
 رہی ہے۔ دو بھی ہماری دشمن ہے۔ بہت ہی خطرناک فائزر
 اور شوئر ہے۔ بس اس سے ٹکراؤ ہو تو یہ نہ سمجھتا کہ وہ عام
 عورتوں کی طرح کمزور ہوگی۔ کوئی بھی عورت مقابلے پر
 آئے اسے مرینہ سمجھ کر فوراً گولی مار دیتا۔ تم ایک ایسے کی بھی
 دیر کرو گے تو دوسرا لمحہ اس کا ہو جائے گا۔"
 "آپ فکر نہ کریں، میں محتاط رہوں گا۔"
 اس نے فون میڈونا کو دیا۔ باپ نے اس سے کہا۔
 "تم دھرم ور کے ساتھ باہر جاؤ گی۔ عادل کچھ فاصلے پر رہو

کر تھمارے قریب ہی رہے گا۔"

"او کے پاپا!" اس نے فون بند کر دیا۔

مراد نے کہا۔ "میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ آرام سے لباس بدل کر آؤں گا۔ ہم آدھے گھنٹے بعد یہاں سے نکلیں گے۔"

اس نے اپنے کمرے میں آکر دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر فون پر چپٹ راڈ کو بتایا کہ میڈونا ٹھیک آدھے گھنٹے بعد کالج سے نکلے گی اور مرینہ سے کہا جائے کہ وہ کالج سے دور اسے کسی دوسری جگہ کھیر لے لیکن اسے جانی نقصان نہ پہنچائے۔ انتظار کرے۔ ادھر مراد ضرور آئے گا۔

مرینہ کو فون پر اطلاع ملی تو اس نے چپٹ راڈ سے کہا۔ "ہاں مجھے پورا یقین ہے، مراد ضرور آئے گا۔ میں حملہ کرنے میں جلدی نہیں کروں گی۔ اسے میڈونا کے پاس پہنچانے کی کوشش کرتی رہوں گی۔ یہ سوچ لیا ہے کہ وہ نظروں میں آئے گا تو پھر میں بھی اس سے پردہ نہیں کروں گی۔"

مراد آدھے گھنٹے سے پہلے ہی کالج کے پچھلے راستے باہر چلا آیا پھر ایک لمبا چکر کاٹ کر سامنے کی طرف آیا تو میڈونا دھرم دیر کے ساتھ کار میں بیٹھی اچاٹے سے باہر آ رہی تھی۔ وہ ایک بائیک پر تھا۔ کار سے کچھ فاصلہ رکھ کر چلنے لگا۔ وہ کار ایک شاپنگ سینٹر کے سامنے رک گئی، مراد نے فون پر کہا۔ "میڈونا! کار میں بیٹھی رہو۔ پہلے میں عمارت کے اندر جا رہا ہوں۔ تم پانچ منٹ کے بعد آؤ۔"

اس نے مطمئن ہو کر کہا۔ "حیکم جو عادل!"

پھر وہ فون بند کر کے کار کی کھڑکی سے باہر اسے عمارت کے اندر جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔

مرینہ اسے دور سے کار کی کھڑکی کے پاس دیکھ رہی تھی۔ وہ دور جا کر کھڑی ہو گئی تھی اور اس پاس کے لوگوں کو توجہ سے دیکھتے ہوئے مراد کو پہچان لینے کی کوشش کر رہی تھی۔

جب میڈونا پانچ منٹ کے بعد کار سے نکلے تو اس کے ساتھ دھرم دیر بھی باہر آیا۔ مرینہ اسے دیکھ کر پھر الجھ گئی۔ اس نے پچھلی رات اسے تاریکی میں دیکھا تھا۔ اب دن کی روشنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ "کیا یہ مراد ہے؟"

وہ اسے توجہ سے دیکھنے لگی۔ اس کی چال سے اس کے انداز سے پہچاننے کی کوشش کرنے لگی اور اچھٹے لگی۔

دور چپے ہوئے مراد نے مرینہ کو دیکھا تو اسے شبہ ہوا۔ جب وہ مار دھاڑ کے لیے نکلتی تھی تو اس کے بدن پر چست پتلون اور سٹریٹ جری جیکٹ ہوتی تھی۔ اس جیکٹ کے اندر اس کا اسلحہ اور ہتھیار چھپے رہتے تھے۔ ایک بیگ

ٹانے سے لٹکا رہتا تھا۔ اس میں بھی موت کا سامان موجود رہتا تھا۔

اسی وقت وہ اسی لباس اور بیگ کے ساتھ دکھائی دے رہی تھی۔ مراد کو بڑی حد تک یقین ہو گیا تھا کہ وہ مرینہ ہی ہے۔ پھر وہ میڈونا سے کچھ فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چل رہی تھی اور جیسے کی تصدیق ہو رہی تھی۔

میڈونا دھرم دیر کے ساتھ شاپنگ سینٹر کی دکانوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ مرینہ انتظار کر رہی تھی کہ اس پاس کی طرف کوئی ایسا جوان نظر آجائے جس پر مراد ہونے کا شبہ ہو سکے۔

میڈونا لباس خریدنے کے لیے ایک بوتیک میں داخل ہوئی۔ مرینہ نے دل میں کہا۔ "مراد یہی ہے جس کے پیچھے میں کل سے بھاگ رہی ہوں۔ جب یہ میڈونا کے ساتھ ہے تو اور کہیں کیسے نظر آئے گا؟"

وہ بوتیک کے قریب آگئی۔ اندر میڈونا اور دھرم دیر دکھائی دے رہے تھے، مرینہ نے جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر دل میں کہا۔ "مراد کو بے نقاب کرنے کا یہی ایک راستہ ہے۔ میں میڈونا پر گولی چلاؤں گی۔ اسے زخمی کروں گی تو مراد مجھے مزید حملہ کرنے سے روکنے آئے گا۔"

اس نے جیکٹ کے اندر سے ریولور کو نکالتے ہی میڈونا کو نشانے پر لیا۔ اس کا خیال درست نکلا۔ مراد نظر تو نہیں آیا لیکن ظاہر ہو گیا۔ اس کی ایک گولی نے مرینہ کے ہاتھ سے ریولور کو گر ادیا۔ وہ انجانے حملے کے باعث لڑکھڑا کر گر پڑی۔ ادھر دھرم دیر نے اچھل کر پھٹے ہوئے اپنے لباس سے گن نکال لی۔

مرینہ اچھٹے ہوئے فرش پر گرے ہوئے ریولور تک پہنچنا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے ہی دھرم دیر نے ریولور کو ٹھوکر مار کر اس سے دور کر دیا۔ پھر اس کا نشانہ لیتے ہوئے بولا۔ "تم کل سے میرے پیچھے پڑی ہو۔ اب موت تمہارے سامنے آگئی ہے۔ مرنے سے پہلے سن لو۔ میں مراد نہیں ہوں۔"

یہ کہتے ہی وہ ٹیگر دبانے چاہتا تھا۔ اس سے پہلے مراد کی گن کا ٹیگر دوب گیا۔ چشم زدن میں ایک گولی دھرم دیر کی پیشانی میں آکر بہت ہو گئی۔ دوسری سینے میں مگس گئی۔ وہ فرش پر گر کر زرا دیر تڑپ کر ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا پڑ گیا۔

مرینہ نے چھلانگ لگا کر اس کی گن اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے چیخے ہوئے کہا۔ "مراد! مجھے بھانے والے صرف تم ہی ہو سکتے ہو۔ فار گاڈ سیک! مجھ سے نہ چھو۔ میں پاگل ہو رہی

ہوں۔ اپنی دکانوں کا دروازہ کھول دو، سامنے آ جاؤ۔"

وہ پاکو کی طرح پھٹتی ہوئی دوڑتی ہوئی اسے تلاش کر رہی تھی۔ میڈونا بوتیک میں بچھی ہوئی تھی۔ اسے رنگ نون نے مخاطب کیا۔ ٹیگس اسکرین پر عادل نواز کا فون نمبر تھا۔ اس نے فوراً ہی اسے کان سے لگا کر کہا۔ "تم کہاں ہو؟ میری جان نکل رہی ہے۔"

مراد نے کہا۔ "گھبراؤ نہیں۔ اب تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم باہر جا کر اپنی کار میں بیٹھو۔ میں مراد کو تلاش کر رہا ہوں۔ ابھی تمہارے پاس آؤں گا۔"

میڈونا نے فون کو بند کر کے بوتیک سے باہر دیکھا۔ اب اسے مرینہ کی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ مراد کو تلاش کرتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی تھی۔ مراد بہت پہلے ہی اس عمارت سے نکل گیا تھا۔

مرینہ بھی وہاں زیادہ دیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں گن تھی۔ اس لیے کوئی قریب نہیں آ رہا تھا۔ یقیناً پولیس کے سپاہی اسے آکر گھیر سکتے تھے۔ اسے بھی مجبوراً وہاں سے جانا پڑا۔

اس نے دل کو سمجھایا۔ "مراد بھی پولیس والوں سے بچنے کے لیے جا چکا ہے۔ وہ اس عمارت سے زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ میں اسے ڈھونڈ کر رہوں گی۔"

وہ شاپنگ سینٹر کے باہر زرا دور آس پاس اسے تلاش کرنے لگی۔ مراد میڈونا کے پاس آکر کار میں بیٹھ کر وہاں سے دور نکل آیا تھا۔ وہ بری طرح سبکی ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا مراد نے دھرم دیر کو گولی ماری ہے؟"

"ہاں اور تمہارے پاپا کو بھی ہے تھے کہ وہ بہت زخمی ہو کر علاج کے لیے دہلی چلا گیا ہے۔ انہوں نے مطمئن ہو کر جنس کالج سے نکلنے کی اجازت دے دی۔ وہ دشمن یہی چاہتا تھا۔ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ وہ شملہ میں ہی ہے۔"

مراد نے کالج میں پہنچ کر یہی بات سنی براؤن سے فون پر کہی۔ "اس نے آپ کو دھوکا دیا اور آپ قریب میں آ گئے۔ آپ کی صاحب زادی اب کالج میں قیدی بن کر رہے گی۔ اس سے بہتر ہے کہ یہ شملہ سے چلی جائے۔"

وہ بولا۔ "میں بھی یہی سوچ رہا ہوں، میں کل کسی فلائٹ میں سینیں کفرم کراتا ہوں۔"

مراد نے کہا۔ "آپ کیا سمجھتے ہیں مراد آپ کی بیٹی کو اتر پور تک خیریت سے جانے دے گا۔ اس کے ساتھ چٹا نہیں اور کہتے شوٹرز ہیں۔ وہ کہاں کہاں پھیلے ہوں گے۔ ٹرین سے اور کار سے بھی یہ جا سکتے تھے تو وہ راستے میں

اس کے کمرے گا۔"

"میں مانا ہوں وہ کسی بھی راستے میں موت بن کر آ سکتا ہے لیکن میڈونا کو تو وہاں سے نکالنا ہی ہوگا۔"

"ایک ہی راستہ ہے کہ اسے رازداری سے لے جائیں۔ آدھی رات کے بعد یہاں کی چیل پہل ختم ہو جاتی ہے۔ رات تین بجے کے بعد سب ہی گہری نیند میں ہوتے ہیں۔ میں چار بجے کالج کے پچھلے دروازے سے میڈونا کو کار میں لے جاؤں گا۔ ہم سے پہلے کالج گارڈز کی ایک گاڑی اس راستے پر آگے جا کر ہمارا انتظار کرے گی۔ ہم ان گاڑی کے پیچھے کل صبح دس یا گیارہ بجے تک دلی چکی جائیں گے۔ یہ مشہور ہے آپ دلی سے میڈونا کے لیے سیٹ بک کر لیں۔"

"بے شک ایسی رازداری سے تم میری بیٹی وید سے پاس لے سکو گے۔ میں ابھی سیج، بی، انٹر وینو، دیا ہوں۔ پھر دلی سے تم لوگوں کے لیے سینیں کفرم کر آؤں گا۔"

مراد رابطہ ختم کر کے اپنے کمرے میں آیا پھر دروازے کو اندر سے بند کر کے چپٹ راڈ کو فون پر مخاطب کیا۔ "بھئی آج رات چار بجے شملہ سے جاتا ہے۔ ابھی گرودج کے آشرم میں جاؤ۔ درگا سے ملو اور ان کے بھانے والوں سے بولو کہ وہ بھی ہماری خاطر شملہ چھوڑ دیں۔ ہم ان کے ساتھ ان کی بستی میں جا کر رہیں گے۔"

"کیا وہ میری بات مان لیں گے؟"

"تم وہاں جا کر اپنے فون پر مجھ سے بات کر آؤ۔ وہ ضرور مانیں گے۔"

"میں ابھی وہاں جا رہا ہوں۔"

"تم گرودج کے استھان سے واپس آ کر اپنی ایک گاڑی کا انتظام کرو گے۔"

"یہاں ہماری تین گاڑیاں ہیں۔"

"پھر تو گمانے بھانے والے بھی آسانی سے سڑ کر سکیں گے۔"

وہ تھوڑی دیر تک چپٹ راڈ کو اپنی پلاننگ سمجھاتا رہا۔ پھر اس نے رابطہ ختم کر کے میڈونا کے پاس آکر کہا۔

"کچھ کھانی کر تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤ۔ میں بھی کچھ نیند لوں گا۔ ہم چار بجے تک یہاں سے نکل جائیں گے۔"

اس نے میڈونا کے ساتھ رات کا کھانا کھایا پھر اپنے کمرے میں آکر دروازے کو اندر سے بند کر کے بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی چپٹ راڈ نے فون پر کہا۔ "یہ لو، ان گانے بھانے والوں کے بوڑھے بابا سے بات کرو۔"

مراد نے کناری اور منجھو کے بوڑھے باپ سے بات

کی۔ اس سے کہا کہ وہ جیسے کے لیے ان کی بستی میں جانا چاہتا ہے۔ اس کے عوض انہیں اتنی رقم ملے گی کہ وہ برسوں تک بیٹھ کر کھا سکیں گے۔

سکر راج الموت کے آگے کون نہیں جھکتا۔ وہ راضی ہو گئے۔ مراد رات کے گیارہ بجے سو گیا۔ فون کے الارم نے اسے دو بجے جگا دیا۔ اس نے ہاتھ روم میں آکر گرم پانی سے غسل کیا۔ تازہ دم ہو کر لباس بدل کر ہتھیاروں سے لیس ہو کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

میڈونا بھی اپنے ضروری سامان کے ساتھ تیار تھی۔ رات کے ساڑھے تین بجے مراد نے سکیورٹی افسر سے کہا کہ وہ اپنے مسلح گارڈز کے ساتھ پولیس چوکی سے آگے دو میل کے فاصلے پر رک جائے۔ وہ میڈونا کو کار میں لے کر آئے گا پھر وہ سب ایک ساتھ سڑکیں گے۔

وہ افسر اپنے ماتحت گارڈز کے ساتھ چلا گیا۔ چار بجے سے پہلے ہی مراد میڈونا کے ساتھ کالج کے پچھلے دروازے سے باہر آیا۔ وہاں ایک براؤن کھری مزدکار تھی۔ میڈونا اپنی کار میں نہیں جا رہی تھی کیونکہ اس کے دشمن اس کار سے اسے پہچان سکتے تھے۔ اس مزدکار کو صرف سکیورٹی افسر اور گارڈز ہی پہچان سکتے تھے کہ اس میں میڈونا آ رہی ہے۔

مراد نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔ پھر آگے جا کر ایک تاریک گلی میں رک گیا۔ وہاں پلاننگ کے مطابق چپٹ راؤ ایک کار کی اسٹیز تک سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ درگا اپنے بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔

وہ میڈونا سے بولا۔ "چلو اترو کار سے ہم دشمنوں کو دھوکا دینے کے لیے گاڑیاں بدل کر جائیں گے۔" میڈونا نے کہا۔ "لیکن ہمارے گارڈز تو ہمیں اس مزدکار کے ذریعے پہچانیں گے۔"

"مزدور ضروری نہیں ہے۔ ہم دوسری گاڑی میں رو کر بھی اپنی صورتیں دکھائیں گے تو وہ گارڈز ہمارے ساتھ چل پڑیں گے۔"

وہ دوسری گاڑی کی پچھلی سیٹ پر مراد کے ساتھ آکر بیٹھ گئی۔ چپٹ راؤ نے گاڑی آگے بڑھادی۔ موسم گرما کے باوجود رات کو سردی بڑھ جاتی تھی۔ اسی وقت جیسے پورا شہر سو رہا تھا۔ مکانات اور عمارتیں خاموش تھیں۔ سڑکیں ویران ہو گئی تھیں۔

پولیس چوکی پر انہیں روکا گیا۔ وہاں صرف دو سپاہی جاگ رہے تھے۔ باقی تھانے کے اندر اپنے افسر کے ساتھ سو

رہے تھے۔ چپٹ راؤ نے انہیں ایک ہزار کالوٹ دیا تو انہوں نے تماشائی نہیں لی۔ آگے جانے کی اجازت دے دی۔ وہاں سے آگے نکلنے ہی مراد نے ریوالور نکال کر میڈونا کو نشانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میں مراد ملی گئی ہوں۔" اس کا منہ حیرت اور خوف سے کھل گیا۔ وہ بولا۔ "آگے تمہارے گارڈز کی گاڑی سڑک کے کنارے ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ پلو سیٹ کے نیچے بیٹھ جاؤ۔ منہ سے ایک ذرا بھی آواز نکالو گی تو سمجھ سکتی ہو کیا ہوگا۔ ایک نہیں کئی گولیاں تمہارے اس خوب صورت چمکنے بدن میں گھس جائیں گی۔"

وہ بری طرح سکی ہوئی ریوالور کو دیکھتی ہوئی سیٹوں کے درمیان سٹ کر بیٹھ گئی۔ مراد نے بھی اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے فون پر سکیورٹی افسر سے رابطہ کیا اور کہا۔ "ہمیں کالج سے نکلنے میں دیر ہو رہی ہے۔ مسٹر براؤن کی کال آنے والی ہے۔ ہم اسے اینڈ کرنے کے بعد یہاں سے نکلیں گے۔" فون پر باتیں کرنے کے دوران میں سکیورٹی افسر نے چپٹ راؤ کی گاڑی کو اپنے قریب سے گزرتے دیکھا۔ فون پر کہا۔ "آل رائٹ سراسر ہم یہاں انتظار کرتے رہیں گے۔" رابطہ ختم ہو گیا۔ گاڑی ان کے سامنے سے گزر گئی۔ انہیں تو براؤن کھری مزدکار کا انتظار تھا۔ مراد نے میڈونا سے کہا۔ "اب سیٹ پر آکر آرام سے بیٹھو اور اپنا فون بجھے دو۔" وہ اپنا فون دیتے ہوئے خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "کیا مجھے مار ڈالو گے؟"

"تمہیں مارنا ہوتا تو یہاں تک زندہ نہ لاتے۔ گاڑیاں تبدیل کرنے سے پہلے ہی مار ڈالتے۔" وہ ذرا اعتماد سے بولی۔ "میں نے سنا ہے تم عورتوں کو ہلاک نہیں کرتے؟"

"تم میرے احکامات کی تعمیل کرتی رہو گی تو زندہ رہو گی۔" مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" کوئی سوال نہ کرو۔ خاموش بیٹھی رہو۔"

وہاں سے آگے منصوبے کے مطابق چپٹ راؤ کی دو گاڑیاں ان کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ ان میں گانے بجانے والے بیٹھے ہوئے تھے۔ چپٹ راؤ کے ماتحت انہیں بڑے آرام سے کھلاتے پلاتے لائے تھے۔

انہوں نے گاڑی روک دی۔ مراد پچھلی سیٹ سے باہر آ گیا۔ چپٹ راؤ اس کی جگہ آکر میڈونا کو ریوالور کے نشانے پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ ایک ماتحت درگا کے برابر ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا اور مراد گانے بجانے والوں کی ایک

گاڑی میں آکر اسے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھ گیا۔ دوسری گاڑیاں اس کے پیچھے چلنے لگیں۔ مراد کی گاڑی میں کناری بنیو اور ان کا بوڑھا باپ تھا۔ اس نے بوڑھے سے کہا۔ "میں اپنے دشمن کی بیٹی کو اغوا کر کے لایا ہوں۔ ایسی جگہ چھپنا چاہتا ہوں جو اس راستے سے دور بہت دور ہو۔ دشمنوں کو وہاں تک جانے کا خیال تک نہ آئے۔"

بوڑھے کے بولنے سے پہلے کناری نے کہا۔ "بھیا! ہم اس راستے سے دور ایسی جگہ رہتے ہیں جہاں سے یہ گاڑیاں گزر نہیں سکتیں۔ بہت اونچے نیچے راستے ہیں۔ وہاں پیدل چلنا پڑتا ہے۔ جن کے پاس پیسا ہوتا ہے۔ وہ انچرڈل پر بیٹھ کر جاتے ہیں۔"

بوڑھے نے کہا۔ "بیٹے! بہت تھکا دینے والا راستہ ہے۔ تمہارے ساتھ دو عورتیں ہیں۔ گود میں ایک بچہ ہے۔ کیا وہ عورتیں پیدل چل سکیں گی؟"

مراد نے فون پر چپٹ راؤ سے کہا۔ "آگے ایسی جگہ آئے گی جہاں سے گاڑیاں نہیں جا سکیں گی۔ میں میڈونا کو لے کر آگے جاؤں گا۔ تم درگا اور بچے کو لے کر وہاں سے واپس جاؤ گے۔ اس طرح گاڑیاں بھی وہاں رکی نہیں رہیں گی۔ تم اپنے ماتحتوں کے ساتھ انہیں لے جاؤ گے۔ دشمنوں کو وہاں نہ گاڑیاں نظر آئیں گی نہ وہ سوچیں گے کہ میں اس دشوار گزار پہاڑی راستوں سے میڈونا کو نہیں لے گیا ہوں۔"

چپٹ راؤ کو وہی کرتا تھا جو مراد چاہتا تھا۔ آگے اس دشوار گزار راستے تک پہنچ کر گاڑیاں روک رکھیں۔ مراد نے دو ریوالور اور ایک شات گن اپنے پاس رکھی۔ ہٹس کے کئی چیمبرز بیگ میں رکھے۔ کناری نے کہا۔ "ان علاقوں میں بجلی نہیں ہے۔ آپ فون کی بیٹری چارج نہیں کر سکیں گے۔" فی الحال مراد اور میڈونا کے فون کی بیٹری قفل چارج کی ہوئی تھی۔ چپٹ راؤ اور اس کے ماتحتوں نے اپنے اپنے فون کی بیٹریاں نکال کر انہیں دیں۔ تاکہ فون کئی دنوں تک کارآمد رہے۔ پھر چپٹ راؤ اور درگا بڑی محبت سے مراد کے گلے لگ کر جدا ہو گئے۔ ان کی تینوں گاڑیاں وہاں سے چلی گئیں۔

میڈونا رو رہی تھی کہ پتا نہیں اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے؟ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کب رہائی ملے گی اور اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے والا ہے۔

☆☆☆

ماروی کے لیے کہیں چھپ کر رہنا محال ہو گیا تھا۔ وہ

چاپچی اور چاچا کے ساتھ کراچی شہر سے نکل آئی تھی۔ پہلے ارادہ تھا کہ بستی سے آگے ریتی میں چاپچی کی بکن رہتی ہے۔ وہاں جا کر رہے گی لیکن مراد ایک بار اسے تلاش کرتا ہوا وہاں گیا تھا۔ محبوب اور سمیرا کو بھی معلوم تھا کہ ریتی میں ماروی کی کوئی عزیز رہتی ہے۔

اس نے وہاں جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ وہ آگے کہیں جانے سے پہلے گھر میں رک گئی تھی۔ وہاں بھی پولیس والے اسے اور چاپچی کو اچھی طرح جانتے تھے۔ چاپچی نے کہا۔ "ہمارے ساتھ یہ مسئلہ رہے گا۔ جس شہر میں بھی جا کر رہیں گے، وہاں کے مکملے والے اور تھانے والے کھوج لگائیں گے کہ وہ دو بوڑھے بوڑھی اور ایک جوان عورت کون ہے؟"

چاچا نے کہا۔ "طرح طرح کے سوالات کیے جائیں گے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ کرائے کے مکان میں رہتے آئے ہیں۔ ہم کہاں سے کہا کر لاتے ہیں اور کھاتے ہیں؟" ماروی نے پریشان ہو کر کہا۔ "ہمارے پاس لاکھوں روپے ہیں۔ یہ دھڑکا لگا رہے گا کڑا کو آکر لوٹ کر لے جائیں گے یا پولیس والے حصر طلب کرتے رہیں گے۔ اس بڑے وقت میں ہماری مدد کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ ہمیں بے یار و مددگار دیکھ کر لوگ کتوں کی طرح بھونکتے رہیں گے۔"

چاپچی نے کہا۔ "اس سے تو اچھا تھا کہ ہم کراچی میں ہی رہتے۔ وہاں ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کا نام تک نہیں جانتا۔ کوئی کسی کی نوہ میں نہیں رہتا۔ سب ہی دن رات کمانے کھانے کی فکر میں خود کو بھولے رہتے ہیں۔"

ماروی نے کہا۔ "میں وہاں محبوب سے چھپ کر نہیں رہ سکوں گی۔ تم نے دیکھا ہے، میں عباد اور نقاب میں تھی۔ پھر بھی محبوب کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں اس شہر میں ہوں۔"

وہ تینوں گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ تھوڑی دیر بعد ماروی نے کہا۔ "صرف محبوب سے جیسے کا مسئلہ ہے۔ ورنہ ہم دوسرے پہلوؤں سے محفوظ رہیں گے۔ یہ لاکھوں روپے تم کیلجے سے لگائے رکھتی ہو۔ وہاں گھر میں رکھنے اور چھپانے کی ضرورت نہیں ہو گی، یہ رقم پھر بینک میں رکھ دیں گے اور ضرورت کے مطابق بھی بھی رقم نکالتے رہیں گے۔"

چاپچی نے سر ہلا کر کہا۔ "ہاں کراچی میں سبوتیں زیادہ ہیں۔ وہاں سوائے محبوب کے اور کوئی ہماری کھوج میں نہیں رہے گا۔"

ماروی نے دل پر ہاتھ رکھ کر مراد کو تصور میں دیکھا پھر کہا۔ "وہ بھی مجھے وہاں تلاش کر رہا ہوگا۔"

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیلٹھے

رسالے حاصل کیجیے۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سائنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا، نیپال، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیمت ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

ایک کی طرف سے پتے پتوں کے لیے بہترین تجربہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مانی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شریعہ عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیئر 11 سٹیشن ڈینس باؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 021-35895313 021-35802551

ابھی طرح دیکھا تھا۔ وہ ایسی جگہ چہارہ کرکٹی دشمنوں کا مقابلہ
کر سکتا تھا۔

گمانے بھانے والوں کی طرح وہاں اور کئی لوگوں کی
بھرتلی جو پٹریاں بنی ہوئی تھیں۔ چھوٹے بڑے پتھروں
سے بنی ہوئی دیواریں تھیں۔ ان کی چھتیں چنگی تھیں۔ میڈونا
تن کر کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ مکان کے اندر جھک کر رہنا
ضروری تھا۔ کمر سیدھی کرنے کے لیے لینا پڑتا تھا یا باہر آنا
ضروری ہوتا تھا۔

اب وہ سبھی ہوئی نہیں تھی۔ یہ یقین ہو گیا تھا کہ مراد
اسے ہلاک نہیں کرے گا۔ وہ چپ چاپ سی رہتی تھی۔ مراد
نے کہا تھا۔ "کوئی سوال نہ کیا کرو۔ یہاں جب تک رہنا
ہے، تب تک مبرہ شکر سے رہو۔ ایک دن اپنے باپ کے
پاس ضرور جاؤ گی۔"

مراد نے وہاں پہنچ کر آرام سے ایک چٹان پر بیٹھ کر
ماسٹر کو بوبو کو فون پر کہا۔ "ہیلو ماسٹر! آپ کے لیے خوش خبری
ہے۔ میں میڈونا کو سخت سیکج رنی کی دلدل سے نکال کر ایک
ایسی جگہ لے آیا ہوں، جہاں اسے تلاش کرنے والے پہنچ
نہیں سکیں گے۔ اگر پہنچ بھی گئے تو میں تمہارا مقابلہ کر
سکوں گا۔"

ماسٹر نے خوش ہو کر کہا۔ "تمہارے لیے شملہ ایک
انہانی جگہ ہے۔ تم نے وہاں سے دشمن کی بیٹی کو اغوا کر کے
ناممکن کو ممکن بنا دیا ہے۔ میں تمہاری تعریف کیا کروں، تم نے
تو مجھے خرید لیا ہے مراد۔"

مراد نے کہا۔ "آپ میرے مزاج کو سمجھتے ہیں۔ مجھ
سے کبھی یہ توقع نہ کریں کہ میں میڈونا کو قتل کروں گا۔ اس
کے باپ نے آپ کی بیٹی اور داماد کو قتل کیا تھا۔ آپ سے
گزارش ہے کہ ہم سب اپنی دشمنی کو گھر کی عورتوں تک نہ
جانے دیں۔ ہم انسان ہیں۔ عورتوں اور بچوں کو سلامتی دینا
ہمارا فرض ہے۔"

اس نے کہا۔ "مراد! تم نے براؤن فیلڈ کے برنارڈ کو
ہلاک کیا۔ پھر اس فیلڈ کے پہلے سربراہ۔ سکی البرٹ کو وہی
میں موت کے گھاٹ اتارا۔ تمہارے دوست بپنے نے سکی
براؤن کے بیٹے روٹی براؤن کو لندن میں گولی ماری۔ تم ابتدا
سے ہی میرا کھینچا کھینچا کرتے آ رہے ہو۔ میں تمہاری بات
ضرور مانوں گا۔ میڈونا کو ہلاک کرنے کے لیے نہیں کہوں
گا۔ ابھی اس کے باپ سے ذیل کرنے کے بعد تمہیں کال
کروں گا۔"

ماسٹر نے مراد سے رابطہ ختم کر کے سکی براؤن کے

سم بدل دی تھی۔ جب وہ مرینہ سے شادی کر چکا ہے تو مجھ سے
کوئی رشتہ نہیں رہا ہے۔ پھر کیوں مجھے کال کر رہا ہے؟"
"کس نے کہا کہ وہ مرینہ سے شادی کر چکا ہے۔ وہ
تمہارا دیوانہ ہے۔ اپنا چہرہ بدل کر مرینہ سے دور ہو گیا ہے۔"
یہ ایسی خوش خبری تھی کہ ماروی کے سینے میں دل پاگل
سا ہو گیا۔ اس نے پوچھا۔ "آپ سچ کہہ رہے ہیں؟ میں
کیسے یقین کروں؟ وہ مجھ پر سوکن لانے والا تھا پھر اس نے
ارادہ کیوں بدل دیا؟"

"تمہاری محبت نے اسے بدل دیا ہے۔ وہ تمہاری
دوری برداشت نہیں کر رہا ہے۔ ابھی میرے ایک بہت اہم
کام میں مصروف ہے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ پھر تمہیں
ڈھونڈنے کے لیے پاکستان آئے گا۔ اسے نہ دوڑاؤ ماروی!
وہ ایک لفظی کرنے والا تھا، لیکن نہیں کی۔ میری بات کا یقین
کرو۔ وہ ہمیشہ کے لیے مرینہ سے دور ہو گیا ہے۔ غصہ تھوک
وہ اسے گلے لگا لو۔"

ماروی نے کھڑکی کی طرف رخ کیا۔ تازہ ہوا کے
جھوٹے آ رہے تھے۔ وہ خوابیدہ سی ہو کر بولی۔
"میں اس سے بات کرتا چاہتی ہوں۔"

ماسٹر نے کہا۔ "میرا وہ شیر دلیر میدان مار رہا ہے۔
ابھی وہ ایسے پہاڑی علاقے میں ہے جہاں بجلی نہیں ہے۔
فون کی بیٹری ختم ہو گئی تو اسے پھر چارج نہیں کر سکے گا۔ میں
اس سے تمہاری بات کراتا ہوں۔ اس کا نمبر SEND
کر رہا ہوں۔ فی الحال اس سے کبھی باتیں نہ کرنا اور ابھی
آدھے گھنٹے بعد اسے کال کرنا۔"

ماسٹر نے رابطہ ختم کر دیا۔ ماروی نے دھڑکتے ہوئے
دل سے وال کھاک کو دیکھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ دل کی
دھڑکنوں میں بیٹھے والا تھا۔ یکلفت پھر اس کی دنیا بدل رہی تھی۔

☆☆☆

وہ بہت ہی پیچیدہ اور اونچے نیچے جگہ راستوں سے
گزر کر گمانے بھانے والوں کے ساتھ ان کی ایک چھوٹی سی
بستی میں پہنچ گیا۔ میڈونا کو ایک ٹچر پر بٹھا کر لایا گیا تھا۔

وہ بہت ہی خوب صورت علاقہ تھا۔ ایک پہاڑی سے
جھرتا بیٹا رہتا تھا۔ ہر طرف ہریالی تھی اور رنگ رنگ پھول
کھلے ہوئے تھے۔ پیار کرنے والوں کے لیے وہ ایک
آئیڈیل جگہ تھی اور دشمنی کرنے والوں کے لیے گہری پستی
میں گرنے اور گرانے والی کھائیاں تھیں۔ چٹانوں کے پیچھے
سے حملے کرنے اور جھڑپوں کے پیچھے چھپنے کے کئی مقامات
تھے۔ مراد نے وہاں پہنچے ہی دور تک جا کر ایک ایک جگہ کو

چاہی نے کہا۔ "تلاش کرنے دو۔ میں نے تمہیں سمجھایا
تھا کہ اس کا سامنا کرو۔ دو ٹوک فیصلہ کرو۔ کوئی لحاظ نہ کرو۔ اس
سے صاف صاف کہہ دو۔ اگر وہ مرینہ کو ٹھکرا کر آئے گا اور
مجرموں کی زندگی نہیں گزارے گا تو اس کے ساتھ رہو گی ورنہ
اس کا سایہ بھی اپنے اوپر پڑنے نہیں دو گی۔"

چاہنے نے کہا۔ "یہ صاف صاف کیوں نہیں کہتیں کہ وہ
اس پر سوکن لانے کا تو اس سے طلاق لے لے گی۔"
اس نے مہر دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ "میں طلاق نہیں لوں گی۔"
"وہ تمہاری اس کمزوری کو سمجھتا ہے کہ اسے نہیں
چھوڑو گی۔ اسی کے نام سے زندگی گزارو گی۔"

"بہنی! ایک بار دل پر پتھر رکھ کر طلاق مانگو پھر دیکھو
وہ کس طرح تمہارے قدموں سے لپٹ کر رہے گا۔"
وہ مایوس ہو کر بولی۔ "کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو گا۔
وہ اب تک مرینہ کو اپنی منگو بنا چکا ہو گا۔"

"اگر ایسا کیا ہو گا تو تمہیں بھی اس پر لعنت بھیجتا ہو
گی۔ تمہیں اینٹ کا جواب پتھر سے دینا ہی ہو گا۔"

وہ خیالی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہم
اپنے اپنے طور پر اس کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ حقیقتاً
وہ کہاں ہو گا اور کیا کر رہا ہو گا ہم نہیں جانتے۔"

"کسی طرح جانتا چاہیے۔ معلوم کرنا چاہیے کہ وہ
مرینہ سے نکاح پڑھاؤ چکا ہے یا نہیں؟"

ماروی کے دل میں یہی سوال تھی۔ وہ بھی معلوم کرنا چاہتی
تھی کہ واقعی وہ بے سروت اور بے ایمان ہو چکا ہے یا نہیں؟
وہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی۔ مراد کے بارے میں
ماسٹر کو بوبو سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ ماسٹر جانتا تھا کہ وہ
مراد سے نفرت کرتی ہے۔ پھر نفرت کرنے والی اس کے
بارے میں کیا پوچھے گی؟

وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگی پھر اس نے فون اٹھا کر
ماسٹر کے نمبر پر کال کی۔ اسے کان سے لگا یا۔ دوسری طرف
تیل جاری تھی پھر اس کے پی اسے کی آواز سنائی دی۔
"ہیلو تم کون ہو؟"

اس نے کہا۔ "ماروی۔۔۔"

پھر مختصر سا مہی کافی تھا۔ ماسٹر جیسے دوڑا ہوا آیا۔ اس کی
آواز سنائی دی۔ "ماروی۔۔۔ واقعی یہ تم ہو؟ تم بول رہی ہو؟"

"ہاں، میں ماروی بول رہی ہوں۔"

"وہ تمہیں کال کرتے کرتے مایوس ہو گیا ہے۔ تم وہ
سم بدل چکی ہو۔ کیا یہ تمہارا نیا نمبر ہے؟"

"ہاں۔ میں اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے

نہر بچ گئے۔ اور وہ بنی کے لیے پریشان تھا۔ شملہ کے سیکر رتی افسر نے اسے فون پر اطلاع دی تھی کہ عادل نواز دشمن ہے۔ دھوکے باز ہے۔ وہ بڑی چال بازی سے میڈونا کو ان کے درمیان سے ٹکھن کے بال کی طرح نکال کر لے گیا ہے۔

وہ لوگ شملہ میں اور اس پاس کی وادیوں میں انہیں ڈھونڈ رہے تھے۔ رات سے صبح اور صبح سے دوپہر ہو گئی تھی اور ان کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ یہ خیال قائم کیا جا رہا تھا کہ وہ میڈونا کو دہلی کی طرف لے گیا ہے۔

ایسے وقت ماسٹر نے اس سے فون پر کہا۔ "نئی نیکی براؤن انچورنی ڈاگ! تیری بیٹی میرے پاس ہے۔"

نیکی کے دماغ میں جیسے پتھر آ کر لگا۔ وہ بغلخت اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ بے چینی سے بولا۔ "نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ تمہارے پاس کیسے پہنچی گئی؟ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"بیٹی کی آواز سن کر یقین ہو جائے گا۔ انتظار کرو۔ وہ ابھی تم سے بولے گی۔"

ماسٹر نے اس سے رابطہ ختم کر کے مراد سے کہا۔ "نیکی براؤن سے باتیں کرو اور اسے بیٹی کی آواز سناؤ۔ مجھے یقین ہے وہ ذلیل دشمن میرے سامنے کھٹے ٹھکنے کے لیے آئے گا۔"

مراد نے اس سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "ہیلو مسٹر براؤن! کیا عادل نواز کو آواز سے پہچان رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "تم... تم کون ہو؟ تم میرے دشمن کیوں ہو؟"

"میں عادل نواز نہیں، مراد علی سنگی ہوں۔ اب بولو۔ کیا دشمنی کی وجہ سمجھ میں آگئی؟"

اسے ذرا دیر کے لیے چپ لگ گئی۔ مراد نے کہا۔ "تم مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے لاکھوں ڈالر زانی کی طرح بہا رہے ہو۔ تمہارے درجنوں شورش میرے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔ تمہارا بہنوئی برنارڈ، تمہارا بھائی نیکی البرٹ اور تمہارے بیٹے رونی براؤن کو بھی جہنم میں پہنچا چکا ہوں۔ اب یہ تمہاری لاڈلی بیٹی میرے ٹھٹھے میں ہے۔ پہلے اس سے بات کرو اور یقین کرو کہ یہ میرے جوتوں میں پڑی ہوئی ہے۔"

میڈونا اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے فون اسے دے دیا۔ "یہ ہرگز نہ کہنا کہ تم ابھی کہاں ہو۔ اس علاقے کے متعلق کوئی اشارہ بھی دینا چاہو گی تو کوئی مار دوں گا۔"

اس نے فون لے کر کان سے لگا دیا۔ پھر اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مراد نے ریوالتور کی نالی اس کی پیشانی سے لگا دی۔ دوسری طرف سے باپ نے تڑپ کر

کہا۔ "میڈونا! باپ کی جان! یہ تم رو رہی ہو؟ تم ہی ہوتی؟" وہ ہنسنے لگی۔ "ہاں پاپا! میں آپ کی بیٹی میڈونا ہوں۔ میرا کیا ہوگا پاپا؟ میں مر جاؤں گی۔"

"کیا وہ تم پر غم کر رہا ہے؟"

"نہیں، اس نے مجھے ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے لیکن یہ غم کیا کم ہے کہ گھر سے بے گھر ہو گئی ہوں۔ آپ ہی مجھے گھر میں بلا سکتے ہیں۔ ان سے کوئی سمجھوتا کریں پاپا! مجھے جلدی اپنے پاس بلائیں۔ نہیں تو میں مر جاؤں گی۔"

مراد نے اس سے فون لے کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ "کیا یقین ہو گیا کہ بیٹی میرے پاس ہے؟"

"ہاں۔ یقین ہو گیا ہے۔ پلیز مجھ سے سمجھوتا کرو۔ اسے واپس پیچھے کے لیے کتنی رقم چاہتے ہو؟"

"سمجھوتا مجھ سے نہیں ماسٹر سے کرو اور میری یہ بات لکھ لو کہ میڈونا کو تلاش کرنے والے میرے قریب آئیں گے تو میں اسی لمحے میں اسے گولی مار دوں گا۔ بیٹی کو زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو پولیس اور انٹیلی جنس والوں سے رابطہ نہ رکھو۔ تمہارا کوئی شورش بھی نظر آئے گا تو بیٹی کی آخری چٹکی نہیں سن سکو گے۔ جاؤ ماسٹر سے باتیں کرو۔"

نیکی براؤن نے اپنے فون کو دیکھا۔ اب اسے اپنے بدترین دشمن کے آگے جھکنا تھا۔ برتری حاصل کرتے رہنے کی جنگ لڑتے رہنے کے بعد اب کتر ہوتا تھا۔ اس نے منہ سے تھملا کر اپنی بیوی مارا تھا کو ایک زوردار چھڑ رسید کیا۔ اسے گالیاں دیتے ہوئے بولا۔ "تم ماں بیٹی کی ضد مجھے کمزور بنا رہی ہے۔ میں اسے شملہ جانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا لیکن یار سے ملنے کے لیے بیٹی کی جوانی دیوانی ہو رہی تھی اور ماں اسے جانے کے لیے شد دے رہی تھی۔"

مارا نے کہا۔ "آپ بیٹی کی دیوانگی کو اور ماں کی نادانی کو کب خاطر میں لاتے ہیں؟ حکم تو آپ کا چلتا ہے اور آپ نے خوب سوچ سمجھ کر حکم دیا تھا۔ آپ کو یقین تھا کہ مراد وہاں میڈونا کو نقصان پہنچانے آئے گا تو اپنی مضبوط سیکورٹی کے ذریعے اور انڈین پولیس اور انٹیلی جنس والوں کی مدد سے وہاں اسے آسانی سے پھیر کر مار سکیں گے۔ مجھے مارنے سے یہ حقیقت نہیں چھپے گی کہ مراد کو ہلاک کرنے کے لیے اسے پھیرنے کے لیے بیٹی کو چار بار بنا کر وہاں بھیجا تھا۔"

بڑے بیٹے نیکی براؤن نے کہا۔ "پاپا! حقیقت یہی ہے۔ مام پر غصہ نہ دکھائیں۔ میں نے اور آپ نے مل کر یہی پلاننگ کی تھی۔ ہمیں ناکامی ہوئی ہے۔ ہم میڈونا سے محروم ہو گئے ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ لڑکیاں ایک دن پرانی

ہوتی ہیں۔ وہ بھی پرانی ہو گئی ہے۔ سیدھی سی بات ہے۔ آپ ماسٹر کو بوبو کے آگے نہیں جھکیں گے اس سے سمجھوتا نہیں کریں گے۔"

مارا نے کہا۔ "تم کیسے بھالی ہو؟ بہن کی شادی نہیں کی۔ اسے دشمن کے ٹھٹھے میں چھوڑ کر کہتے ہو وہ پرانی ہو گئی ہے۔"

نیکی نے کہا۔ "میری بہن کو عزت راس نہیں آتی۔ وہ یار سے ملنے گئی۔ میں نے پاپا نے اور آپ نے راضی خوشی اسے رخصت کیا تھا۔ لہذا اس پہلو سے بحث نہ کی جائے۔"

نیکی براؤن نے کہا۔ "میرا بیٹا ٹھیک کہتا ہے۔ ماما کہ وہ میرے جانی دشمن کے ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے لیکن وہ دشمن ایسا ہے کہ اسے نقصان نہیں پہنچائے گا۔ میں سمجھوتا نہیں کروں گا، شاید وہ ہمارے پاس بھی واپس نہیں آئے گی لیکن ہم مطمئن رہیں گے کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔"

اس نے فون اٹھا کر ماسٹر کو بوبو کے نہر بچ کیسے۔ پھر رابطہ ہونے پر بولا۔ "میں نے اپنی بیٹی سے بات کی ہے۔ یقین ہو گیا ہے کہ وہ اس وقت مراد کے ٹھٹھے میں ہے۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہارے ایسے جھکندوں سے جھک جاؤں گا یا نوٹ جاؤں گا۔ یہ خیال اپنے دماغ سے نکال دو۔"

"پلو نکال دیا۔ آگے بولو۔"

"آگے کی بات یہ ہے کہ میں بیٹی کو بھول گیا ہوں۔ اگر تم یاد دلانا چاہتے ہو تو واپس پیچ دو۔ ہم سب برعاشوں کی دنیا کے لوگ ہیں۔ ہماری بد معاشی یہ ہے کہ حالات مجبور کرتے ہیں تو ہم اپنی جوان بیٹیوں کو بھی دائرہ گرد دیتے ہیں۔"

یہ کہتے ہی اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ ماسٹر نے اپنے فون کو سوجھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ایک بہت بڑی بازی جیتنے کے بعد وہ خلاف توقع ہارنے والا تھا۔ نیکی براؤن نے یہ واضح کر دیا تھا کہ بد معاشی کے آگے بیٹی کی اہمیت نہیں ہے۔ ماسٹر میڈونا کو گول کرنے کی دھمکی دے کر اسے اپنے سامنے جھکا نہیں سکتا تھا۔ اس نے فون پر مراد سے کہا۔ "تمہاری محنت رائیگاں جا رہی ہے۔ نیکی براؤن کو پروا نہیں ہے کہ اس کی بیٹی کو قتل کر دیا جائے گا۔ وہ جھکے اور سمجھوتا کرنے کے لیے راضی نہیں ہے۔"

مراد نے کہا۔ "نیکی نے تو بازی ہی ہار دی ہے۔ اب ہم میڈونا کا کیا کریں گے؟ میں اسے کتنے دنوں تک یہاں چھپا کر رکھوں گا اور اسے اپنے پاس رکھنے سے حاصل کیا ہوگا؟"

"کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وہ تمہارے لیے وہاں بوجھ بن گئی ہے۔ اسے مار کر کسی کھائی میں پھینکو اور پلے آؤ۔"

"یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔"

"پھر تم سے کیا ہوگا؟"

"ابھی سوچتا ہوں۔ میرے سامنے آخری راستہ یہی ہوگا کہ اسے سلامتی سے رہا کر دوں۔"

"مراد! مجھے غصہ آ رہا ہے۔ یہ بہت اہم اور بڑی جان جو قسم والی مہم تھی۔ ہم ناکام ہو رہے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ کبھی ناکامی سے بھی دو چار ہونا چاہیے۔ اگلی مہم میں اس کا بیٹا نیکی براؤن میرے نشانے پر آئے گا۔ آپ اس مہم کے بارے میں سوچیں۔ دل کو اطمینان ہوگا۔"

وہ ماسٹر سے رابطہ ختم کر کے میڈونا کے پاس آیا پھر بولا۔ "کیا یقین کر دو گی؟ تمہارے باپ نے کہہ دیا ہے کہ ماسٹر کے آگے نہیں جھکے گا۔ چاہے تمہیں مل کر دیا جائے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میرے پاپا میری موت کا تصور بھی نہیں کریں گے۔"

"ابھی تم اپنے باپ سے بات کر دو گی۔ اس سے اپنی رہائی کی بات کر دو گی۔ پھر سنو گی کہ سچ کیا ہے؟"

اس نے میڈونا کے فون پر اس کے باپ کے نہر بچ کیسے۔ اس نے مراد سے فون لے کر کان سے لگا دیا۔ پھر باپ کی آواز سن کر پوچھا۔ "پاپا! آپ میری رہائی کے لیے کیا کر رہے ہیں؟"

وہ بولا۔ "میں تمہاری رہائی کے لیے اپنی جان دے سکتا ہوں لیکن دشمن کے آگے بھی سر نہیں جھکاؤں گا۔ ان کی کوئی شرط تسلیم نہیں کروں گا۔"

"پھر تو یہ مجھے رہا نہیں کریں گے۔ آپ بیٹی کے لیے جان دے کر کیا کریں گے؟ بیٹی کی جان بچانے کی بات کیوں نہیں کر رہے ہیں؟"

وہ بولا۔ "میڈونا! تم نے شملہ جانے کی ضد کی۔ اس کا نتیجہ سامنے ہے۔ اب جہاں بھی ہو، ذرا صبر سے رہو۔ وہ تمہیں کبھی قتل نہیں کرے گا۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ میں یقین سے کہتا ہوں تم جلد ہی واپس آؤ گی۔"

"یعنی آپ جان دینے کا دعویٰ کرنے کے باوجود کچھ نہیں کر رہے ہیں اور دشمن اتنا قاطع اعتماد ہے کہ آپ مجھے اس کے رحم و کرم پر چھوڑ رہے ہیں؟"

"تم کچھ بھی سمجھ لو۔ ہمیں اسی کے پاس رہنا ہے۔ اس کا دل جیتو اور چلی آؤ۔"

"آپ بیٹی کو ایک مرد کے بعد دوسرے مرد کو تڑپ کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں اور یہ میرے ناز و انداز

سے بھٹکنے والا نہیں ہے۔ اب آپ کی بیٹی مر جائے گی لیکن ایک بازاری عورت بن کر رہائی حاصل نہیں کرے گی۔"

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ پھر سر جھکا کر فون کو مرادی طرف بڑھایا۔ اس نے فون لپٹے ہوئے پوچھا۔ "کیا ہو؟" بھروسوں کی دنیا میں ماں بہن اور بیٹی کی اوقات معلوم ہو گئی؟

"ہاں، یہ معلوم کر کے تکلیف ہو رہی ہے۔ پاپا نے میری ضد سے مجبور ہو کر یہاں آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ وہ میرے ذریعے جیسے نہیں ٹریپ کرنا چاہتے تھے۔ وہ مجھے ایک مہرے کی طرح استعمال کر رہے تھے۔"

"باپ خود غرض ہونے کے باوجود تمہارے دل میں رہے گا۔ تم اس کے پاس جانا چاہو گی۔"

اس نے سر جھکا لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ مراد وہاں سے اٹھ کر جاتے ہوئے بولا۔ "میں سوچتا ہوں تمہیں دلی تک کیسے پہنچایا جائے۔"

کناری نے آکر کہا۔ "بھیا! کھانا تیار ہے۔ چلو کھاؤ۔"

"میں ابھی آتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد کھاؤں گا۔"

وہ وہاں سے چلا ہوا سوچتا ہوا اور ایک چٹان کے سائے میں آکر بیٹھ گیا۔ اس کے فون سے رنگ فون ابھرنے لگی۔ اس نے فون دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ "نیں ماسٹر؟"

وہ خوشی سے چیختے ہوئے بولا۔ "مراد! تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے کہ سنو گے تو اچھل پڑو گے۔ خوشی کے مارے تپنے لگو گے۔ آج میں تمہاری وفاداریوں کا ایسا انعام دے رہا ہوں جس کی تم نے توقع نہیں کی ہو گی۔"

وہ حیرانی سے بولا۔ "ایسی کیا خوش خبری ہے۔ ایسا کیا انعام ہے کچھ بولیں تو سہی؟"

"میرے بیٹے...! تم ابھی تھوڑی دیر بعد اپنی مرادی سے باتیں کرنے والے ہو۔"

وہ واقعی خوشی سے اچھل پڑا۔ بے یقینی سے بولا۔ "کیا کہہ رہے ہو ماسٹر؟ کیا مرادی کا پتا چل گیا؟ کیا وہ مجھ سے ناراض نہیں ہے؟ واقعی مجھ سے بات کرے گی؟"

"ناراض کیسے ہو گی؟ میں نے اس کو یقین دلایا ہے کہ تم نے مرینہ سے شادی نہیں کی ہے۔ تم اس پر سوچ نہیں لا رہے ہو۔"

"اوہ ماسٹر! میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ پلیز ابھی اس سے بات کراؤں۔"

"اپنا فون بند کرو۔ ابھی اس کی کال آئے گی۔"

اس نے فون کو بند کر کے اپنے دھڑکتے ہوئے دل سے لگا لیا۔ ابھی وہ فون مرادی کے سترنم لب و لہجہ میں بولنے والا تھا۔

ادھر ماسٹر نے مرادی سے رابطہ کر کے کہا۔ "ابھی میں نے مراد کا فون نمبر SEND کیا ہے۔ وہ نمبر بچ کر اور اپنے دیوانے سے باتیں کرو۔ وہ انتظار کر رہا ہے۔"

مرادی نے سٹیج کا جنن دبا کر وہ نمبر پڑھے۔ پھر دھڑکتے ہوئے دل سے انہیں بچ گیا۔ پھر رابطہ ہوتے ہی جیسے وہ انتظار میں تھا۔ اس کی آواز سنائی دی۔ "مرادی! میری مرادی! یہ تم ہو؟ تمہارا ہی نمبر ہے؟ میری جان! مجھے اپنی آواز سناؤ۔"

اس کی دس بھری آواز سنائی دی۔ "دوسری شادی مہارک ہو۔ تیسری کب کر رہے ہو؟"

وہ بڑے جذبات سے بولا۔ "میری زندگی میں مرادی کی جگہ کوئی نہیں لے سکے گی۔ تمہیں ماسٹر نے بتایا ہے۔ یقین کرو میں نے مرینہ سے نکاح نہیں پڑھایا ہے۔ وہ مجھے تلاش کرتی رہے گی۔ لیکن مجھے نے بہرہ واپس میں بھی پہچان نہیں پائے گی۔"

"اور بھی پہچان لے گی تو کیا ہو گا؟"

"ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ تم اندیشے میں نہ ہو۔"

"جب تم نظر نہیں آؤ گے تو وہ مجھ پر نظر کرے گی۔ تم کہیں بھی میرے ساتھ زندگی گزارو گے تو کیا پھر بھی تمہیں نہیں پہچانے گی؟"

وہ ذرا چپ رہا۔ فوراً ہی جواب سمجھ میں نہیں آیا پھر بولا۔ "ہم سن سنی میں رہیں گے۔ وہاں ماسٹر اسے قدم رکھنے کی اجازت بھی نہیں دے گا۔"

"یعنی تم ایک عورت کے ذریعے بھی میرے ساتھ سن سنی سے نہیں جاؤ گے۔ ہمارے اپنے پاکستان میں بھی نہیں رہو گے؟"

وہ ایک ذرا توقف سے بولی۔ "اور یہ تو ابھی صرف ایک مرینہ سے ڈرنے کی بات کر رہی ہوں۔ ورنہ تمہارا ایسا کون دشمن ہے جس کے پاس میری تصویر نہیں پہنچی ہے۔ تم چہرے بدل بدل کر مرادی کی صورت کو چھپاؤ گے اور وہ میرے ذریعے تمہیں آسانی سے پہچان لیں گے۔"

وہ بے بسی سے ایک لمبی سانس لے کر بولی۔ "ہم سلامتی سے کیسے رہیں گے؟ کیا دنیا میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ہم امن وامان اور سکون سے رہ سکیں؟"

وہ بے بسی سے بولا۔ "یہ ایک زبردستی چائی ہے۔ تم

اب تک اس لیے زندہ سلامت ہو کہ مجھ سے دور ہو۔ میں جانتا ہوں، تمام دشمنوں کی نظریں تم پر رہتی ہیں۔ وہ انتظار کر رہے ہیں کہ تم از دو ادنیٰ زندگی گزارنے کے لیے کسی کے ساتھ رہو میں جس بہرہ واپس میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گا۔ وہ تاک میں رہنے والے مجھے کوئی مار دیں گے۔ پھر شاید تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"ہم ایسی دنیا میں رہنے پر مجبور ہیں جہاں ہم بھی ایک ساتھ نہیں رہ سکیں گے۔"

"میرے ذہن میں ایک ہی بات آتی ہے۔ اگر تم میرے لیے ایک قربانی دو تو ہمیشہ ساتھ رہ سکیں گے۔"

"کیسی قربانی چاہتے ہو؟"

"میں بڑی رازداری سے تمہارا چہرہ تبدیل کراؤں گا۔ پھر کوئی تمہیں پہچان سکے گا نہ مجھے۔ جب کوئی دشمن ہمیں پہچان نہیں سکے گا تو میں تمہارا پیریک دوں گا اور ایک پراسن شہری کی طرح تمہارے ساتھ وہ خوب صورت زندگی گزاروں گا جس کے خواب ہم ہمیں دیکھتے آ رہے ہیں۔"

"میں تمہارے لیے قربانیاں دیتی آ رہی ہوں۔ یہ قربانی بھی دوں گی۔ میرا یہ چہرہ مرادی کی پہچان ہے۔ میں یہ پہچان مٹا دوں گی، تمہاری یہ تدبیر دل کو لگ رہی ہے۔ ہمیں کوئی نہیں پہچان سکے گا۔ میرے لیے سب سے خوشی کی بات یہ ہو گی کہ تم تمہارا پیریک دو گے۔ میرے پہلے جیسے مراد بن جاؤ گے۔"

وہ دونوں ایک بہترین اور پراسن زندگی گزارنے کی اچھی پلاننگ کر رہے تھے اور مسرتوں سے سرشار ہو رہے تھے۔ مراد نے کہا۔ "یہاں میرا کام ختم ہو چکا ہے۔ میں نے سوچا تھا تم سے فون پر باتیں کرنے کے بعد آج ہی یہاں سے روانہ ہو کر کل تک پاکستان آؤں گا۔ تمہیں دھڑکنوں سے لگاؤں گا لیکن سوچتا ہوں کہ ابھی نہیں آؤں گا۔ پہلے دور ہی دور رہ کر رازداری سے تمہارا چہرہ تبدیل کراؤں گا۔"

وہ بولی۔ "ایک بات یاد رکھو۔ چہرہ تبدیل کرانے کے سلسلے میں ماسٹر سے مدد نہیں لو گے۔ نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے ماسٹر سے بھی تعلق ختم کر دو۔"

"میں یہی کروں گا لیکن ہو سکتا ہے کہ صرف اپنے اور اس کی بیوی بھرنی کو رازدار بنانا پڑے۔ ویسے کوشش کروں گا کہ ان کے بغیر ہی ہم اپنے منصوبے میں کامیاب ہو جائیں۔"

"جو کرنا ہے، بہت سوچ سمجھ کر کرو۔ مجھ سے ملنے کی بے قراری میں جلدی نہ کرنا۔ میں ایک صاف ستھری نئی زندگی گزارنے کے انتظار میں مہینوں اور برسوں تمہارا

انتظار کرتی رہوں گی۔"

"میں جو کچھ کرتا رہوں گا، وہ تمہیں فون پر بتاتا رہوں گا۔ ابھی فون بند کر رہا ہوں۔"

اس نے فون کو بند کر کے خوشی سے ایک انگڑائی لی۔ پورے جسم کو کمان کی طرح کھینچ لیا۔ ایک مدت کے بعد چہرہ اور شخصیت تبدیل کرنے کی نئی تدبیر ذہن میں آئی تھی اور وہ ہر حال میں اس پر عمل کرنے والا تھا۔

سچ راستوں پر چلنے والے اپنے طور پر کوشش کرتے ہیں کہ غلط لوگوں سے گزرتے رہیں لیکن جب تک دنیا میں شیطان ہے اور شیطانیات ہے تب تک ان سے گزرنے کے باوجود گمراہ رہتا پڑتا ہے، شر سے پنجہ لڑائے بغیر خیر کا راستہ نہیں ملتا۔

☆☆☆

مرینہ اس کی تلاش میں باؤلی ہو رہی تھی۔ اسے یقین کی حد تک شبہ تھا کہ مراد میڈوٹا کے کالج میں ہے لیکن دوسری صبح معلوم ہوا کہ وہ کالج خالی ہو چکا ہے۔ اس نے حیرانی سے دیکھا۔ وہاں سے میڈوٹا اور گارڈز بھی چلے گئے تھے۔

اس نے چپت راؤ سے رابطہ کیا۔ اس وقت چپت راؤ اور درگا پہاڑیوں کے درمیان جھجیدہ اور اونچے نیچے راستوں پر تھے۔ وہ مراد، میڈوٹا اور گارڈز نے بھانے والوں سے رخصت ہو کر دہلی کی سمت جا رہے تھے۔

اس نے فون پر مرینہ کے نمبر پڑھے۔ پھر زیر لب کہا۔ "اس مصیبت سے کیا بات کروں؟ مجھ سے ملنے کو کہے گی تو بھید مکمل جائے گا کہ میں شملہ میں نہیں ہوں۔ اس سے کیا بھانہ کروں؟"

اس نے فون کو چھینے دیا۔ اسے اٹینڈ نہیں کیا۔ مرینہ نے اپنے فون کو ناگواری سے دیکھا پھر کالج کے مالک کے پاس آکر پوچھا۔ "کیا یہ کالج کرائے پر مل سکتا ہے؟"

اس نے کہا۔ "نہیں۔ یہاں کرائے دار ہیں۔"

وہ بولی۔ "میں نے کل رات تک سچ گارڈز کے ساتھ کرائے دار کو دیکھا تھا لیکن اب تو یہاں کوئی نہیں ہے۔"

وہ بولا۔ "ہاں۔ میں بھی حیران ہوں۔ پتا نہیں سب کے سب اچانک کہاں چلے گئے ہیں۔"

مرینہ کچھ رہی مگر کوئی ایسی بات ہوئی ہے کہ مطلوبہ دوست اور دشمن سب ہی غائب ہو گئے ہیں۔ اس نے پھر چپت راؤ کو کال کی۔ پھر اس نے اٹینڈ نہیں کی۔

جب اس کا ماتھا ٹھکا کہ اس کے ساتھ کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ چپت راؤ اور ماسٹر جانتے ہیں کہ مراد شملہ میں کہاں

ہے اور اب یہ بھی جانتے ہوں گے کہ کالج سے میڈونا کیس
گئی ہے تو مراد بھی اس کے پیچھے کیا ہے۔

چیت راؤ سے پہلے ماسٹر کا دست راست جگ دیو
تھا۔ ان دنوں مراد اور مرینہ کے درمیان دشمنی تھی۔ ماسٹر اور
جگ دیو پر مراد سے کام لینے رہتے تھے اور مرینہ سے
حقیقت چھپاتے تھے۔

اب مرینہ یقین سے سوچ رہی تھی کہ ماسٹر اور چیت
راؤ پھر اسے دھوکا دے رہے ہیں۔ اس نے فوراً ہی ماسٹر
سے فون پر کہا۔ "مراد اب تک یہاں نظر نہیں آیا ہے۔
میڈونا کا کالج خالی پڑا ہے اور چیت راؤ میری کال اینڈ
نہیں کر رہا ہے۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ مجھے بہت بڑا دھوکا دیا
جاءا ہے۔"

ماسٹر نے کہا۔ "دھوکا ہم سب کھاتے آرہے ہیں۔
مراد نے ہم سب سے چھپ کر ہمیں الجھا دیا تھا۔ ابھی ایک
گھنٹا پہلے اس نے فون پر بتایا ہے کہ اب وہ کالج خالی ہی
رہے گا۔ وہ میڈونا کو اغوا کر کے کہیں لے گیا ہے۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا..... اس نے میڈونا کو
اغوا کیا ہے؟ اوہ گاڈ! کیسے کیا ہے؟ اسے کہاں لے گیا ہے؟"

"اسے کہیں بھی لے گیا ہو۔ میں نے اس سے کہا کہ
میرے دشمن کی بیٹی کو کھنکھار کر دو لیکن وہ کہتا ہے کسی عورت کو
ہلاک نہیں کرے گا۔ وہ باغی ہو گیا ہے۔ میرا حکم بھی ماننے
سے انکار کر رہا ہے۔ اس کے باوجود میرے دشمن کی بیٹی کو
اس سے دور کر کے اسے دماغی طور پر تاراج کر رہا ہے۔ مجھے
دوسری طرح خوش کر رہا ہے۔ عجیب سربراہ ہے۔ کچھ
ایجنٹل سا ہو گیا ہے۔"

"چیت راؤ کہاں ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔ اسے ایک بار کال کی تھی۔ وہ اینڈ
نہیں کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہوگا۔"

"پلیز ماسٹر! مجھے مراد کا فون نمبر دیں۔ میں اس سے
بات کروں گی۔"

"میں نمبر SEND کر رہا ہوں لیکن اس سے رابطہ
نہیں کر سکی۔ وہ سم بدل چکا ہے۔"

ماسٹر نے استعمال میں نہ آنے والی ایک سم کا نمبر
اسے SEND کیا۔ مرینہ نے اس نمبر پر کال کی تو پتا چلا
واقعی اس نے سم بدل دی ہے۔ رابطہ نہیں ہوا۔

وہ جھانسنے میں آنے والی نہیں تھی۔ سوچنے لگی۔ اس
نے سم بدل دی ہے یا ماسٹر دھوکا دے رہا ہے۔ چیت راؤ
کے ساتھ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ سب مراد کے حمایتی

ہیں۔ اسے مراد سے دور رکھنے کے لیے چالیں چل رہے
ہیں۔ وہ فیصلے سے سوچنے لگی۔

وہ بھی میٹر سے بدلتا جاتی تھی۔ اس نے تموزی دیر
تک اچھی طرح سوچنے سمجھنے کے بعد یہی برائوں سے رابطہ
کیا۔ اس نے پوچھا۔ "ہیلو کون ہو تم؟"

"میں مرینہ بول رہی ہوں۔ تمہاری بیٹی کو مراد سے
جھین کر واپس لاسکتی ہوں۔"

وہ بے یقینی سے بولا۔ "تم اور مراد کے خلاف کوئی
کام کر دو گی؟ میں تو کیا کوئی اسے تسلیم نہیں کرے گا۔ تم کس
مقصد کے لیے یہ کہہ رہی ہو؟"

"نہ میں دھوکا دے رہی ہوں، نہ تم دھوکا کھاؤ۔ مجھ
سے دوستی بھی نہ کرو۔ بیٹی کی واپسی کے لیے میری کوئی شرط
نہ مانو۔ میں کسی شرط کے بغیر اسے واپس لاؤں گی۔ مجھے
صرف مراد کا فون نمبر بتا دو۔"

"عجب ہے۔ تم دونوں بلی مجنوں ہو اور بلی کو مجنوں
کا فون نمبر معلوم نہیں ہے۔"

"اب ہم بلی مجنوں نہیں رہے۔ اس کا نمبر SEND
کر دو۔ فائدہ میں رہے گا۔"

"ابھی SEND کر رہا ہوں۔"

اس کے پاس نمبر آ گیا۔ مرینہ جانتی تھی کہ وہ اس کا
فون نمبر پڑھتے ہی اپنا فون بند کر دے گا۔ لہذا اس نے سم
بدل کر اس کے نمبر پر کیے۔ پھر اسے کان سے لگا لیا۔ تموزی
دیر بعد اس نے دھکا بے عرقی کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو،
کون ہے؟"

وہ بولی۔ "کیا بتاؤں کہ کون ہوں؟ میری آواز سننے
ہی تمہارے اندر دھکا بھرا ہوگا۔"

وہ چپ رہا۔ اس نے عاجزی سے کہا۔ "کچھ تو پچھلی
مجنوں اور رفاقتوں کا خیال کرو۔ میں ابھی ملنے کو نہیں کہوں
گی لیکن فون پر تو دو باتیں کر لیا کرو۔"

وہ پھر چپ رہا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا تم سن رہے ہو؟"

اس کے منہ سے اس کی آواز سنائی دی لیکن وہ کچھ نہ بولا۔
وہ بولی۔ "میں نہیں جانتی۔ تم نے اچانک میرا ساتھ
کیوں چھوڑ دیا ہے؟ اگر میں کوئی غلطی کرتی تو تم مجھ سے
ڈکاتیں کرتے۔ میری ذات سے تمہیں کوئی نقصان پہنچتا
تو مجھ سے انتقام لیتے لیکن نہ میرے خلاف بول رہے ہو، نہ
مجھ سے دشمنی کر رہے ہو۔ پھر ایسا کیا ہوا ہے کہ اچانک مجھ
سے دور ہو گئے ہو؟"

اس نے بڑی دیر بعد کہا۔ "مرینہ! تم بہت اچھی ہو

لیکن میں مجبور ہو گیا ہوں۔ تم سے دور رہ کر تم سے ہر طرح کا
رشتہ توڑ کر ہی ماروی کو جیت سکتا ہوں۔ میں اس کے بغیر جی
نہیں سکوں گا۔ یاد کو مٹانے کے لیے ساری دنیا کو چھوڑنا پڑتا
ہے۔ میں سب کو چھوڑ کر اس کی ذات میں گم ہو جاؤں گا۔"

"بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ تم اور ماروی اپنے
چہرے بدلنے کے بعد بھی زیادہ دنوں تک چھپ نہیں سکو
گے۔ ہر ملک ہر شہر میں دشمن تمہاری بو سونگھتے پھریں گے۔
میں اس مسئلے میں بہت کچھ کہہ سکتی ہوں۔ بہت لمبی بحث ہو
سکتی ہے۔ میں ابھی صرف کام کی باتیں کروں گی۔"

وہ ایک ذرا توقف سے بولی۔ "یہ ابھی طرح جانتی
ہوں کہ اب تم ایک بار بھی مجھ سے ملنا نہیں چاہو گے۔
یو لو میں درست کہہ رہی ہوں؟"

"ہاں۔ میں نے ماروی کو زبان دی ہے۔ تم بھی مجھے
دور سے بھی نہیں دیکھ سکو گی۔"

"تو پھر شرط لگاؤ۔ اگر تمہارے پاس پہنچ جاؤں تو ہمار
مان کر میرے ہو جاؤ گے؟"

"نہیں۔ قریب آؤ گی تو پھر تم سے دور ہو جاؤں گا۔"

"تو پھر دور رہو۔ یہ یاد رکھو کسی دن پہنچنے والی
ہوں۔ وہ دن تمہاری اسیری کا ہوگا۔ پھر تم رہائی کے لیے
جان بھی دینا چاہو گے تو میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔ میں
پھر وہی مرینہ بن جاؤں گی جو تمہاری دشمن بھی تھی اور دیوانی
بھی تھی۔ تم یہی چاہتے ہو کہ میں دشمنی کرتے ہوئے محبت
کرتی رہوں۔"

مراد نے فون بند کر دیا۔ اس کے پہنچنے کو اس نے
اہمیت نہیں دی۔ وہ جس قدر اس کی دیوانی مگی، اس سے
زیادہ وہ عاشق ماروی کا دیوانہ تھا۔

اسی بات پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ سملا رہی تھی کہ وہ اتنی
محبت اس سے کیوں نہیں کرتا؟

وہ اسے تلاش کرنے کے دوران میں سوچتی رہی تھی
کہ جب وہ نہیں ملے گا تو اسے کس طرح اپنے سامنے آنے
پر مجبور کرے گی؟

ماروی..... وہی اس دیوانے کی جان تھی۔ وہ ماروی
کو ٹریپ کر کے اس کی آدمی جان نکال لے گی۔ باقی آدمی
جان ہو کر دوڑتا ہوا اس کے قدموں میں آ جائے گا۔

مراد نے آخری بار اسے بتایا تھا کہ ماروی اس سے
تاراض ہو کر کراہی مٹی مٹی ہے اور کہیں گم ہو کر چھپ کر رہنے
لگی ہے۔

مرینہ نے فیصلہ کر لیا وہ کراہی جائے گی اور کسی بھی

طرح اس گم ہو جانے والی کی شہرگ تک پہنچ جائے گی۔
وہ ایک ہندو دھرم بتی رہتا کے روپ میں تھی۔ اس
روپ میں ابھی تک کسی نے اسے مرینہ کے طور پر نہیں پہچانا
تھا۔ آئندہ وہ انڈیا سے لندن جانے والی تھی۔ وہاں سے نئی
پلاننگ کے ساتھ کراہی جانے کا ارادہ تھا۔

موجودہ حالت میں اس کے ساتھ ایک خوش نصیبی تھی
اور ایک بد نصیبی تھی۔ خوش نصیبی یہ کہ ماروی روپوشی سے باز
آگئی تھی اور رہائش کے لیے کراہی آگئی تھی۔ مرینہ کو اس کی
تلاش میں بھٹکانا پڑتا۔

اور بد نصیبی یہ تھی کہ ایسے وقت بشری اپنے بچے کے
ساتھ وہاں پہنچ گئی تھی۔ مرینہ کے لیے ماروی اب ترنوالہ نہ
ہوتی۔ اگرچہ بشری مرینہ کے مقابلے کی فائز تو نہیں تھی مگر
بھی اسے لوہے کے پنے چبوا دیتی۔

ماروی چاہتی اور چاہا کے ساتھ یہ مسائل تھے کہ وہ
لاکھوں روپے پیش اپنے پاس رکھ کر کسی شہر یا انجانے
ملاقاتوں میں نہیں رہ سکتے تھے۔ دھڑکا لگا رہتا کہ کوئی لوٹنے
آ جائے گا۔ پھر ماروی جوان تھی۔ اس کا حسن دوری سے
پکارتا تھا۔ ہر آنکھ اسے دیکھتی تھی اور دیکھنے کے بعد اسے
مانگتے لگتی تھی۔ تن کے اور دھمن کے ٹیڑوں سے پتہ محال تھا۔
اس لیے وہ پھر چاہتی چاہا کے ساتھ کراہی آگئی تھی۔

وہاں بھی وہی پرانا مسئلہ تھا۔ اپنے نامراد عاشق
محبوب ملی چاندیو سے چھپ کر رہتا تھا۔ پچھلی بار اس سے
چھپنے کے لیے مہا پیمانہ کر باہر نکلی تھی۔ منہ پر نقاب رہتا تھا۔
اس کے باوجود انٹیلی جنس کے افسر حاد صدیقی نے اسے دیکھ
لیا تھا اور محبوب کو اس کے پیچھے لگا دیا تھا۔ تقدیر اسے محبوب
سے بھی دور نہیں رکھتی تھی۔

اب وہ سوچ رہی تھی کیوں اس سے چھپ کر رہے؟
وہ بھی شادی کر چکا ہے۔ سیرا جی حسین اور ذہین بیوی کے
ساتھ رہتا ہے۔ اب عشق و محبت کی کتاب کو بند ہو جانا
چاہیے۔ اس کتاب کو پھر سے کھلنا نہیں چاہیے۔

سیرا نے ایک بار اس سے جان لیوا دشمنی کی تھی۔ اس
کے بعد شرمندہ ہو کر اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ ماروی کے
خدا کرنے پر ہی محبوب نے اس سے شادی کی تھی۔ سیرا کے
خواب پورے ہوئے تھے۔ وہ ماروی کی عقیدت مند ہو کر
اسے چاہنے لگی تھی۔

ماروی نے اسے فون پر مخاطب کیا۔ سیرا نے حیرانی سے
پوچھا۔ "تم کہاں ہو؟ محبوب کب رہے تھے کہ اس شہر سے دور
کہیں جا کر چھپ گئی ہو۔ آئندہ بھی یہاں نہیں آؤ گی؟"

"میں واپس آگئی ہوں۔ روپوش رہنے کے کچھ حق تجربات سے گزرنے کے بعد میری مجبوریاں مجھے واپس لے آئی ہیں۔ تم کسی طرح کا اندیشہ نہ کرنا میں مجبور کو بھی اپنے آس پاس سے نہیں دوں گی۔"

"ماروی! میں تمہیں بہت اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ تم اپنے مراد سے ناراض ہونے کے باوجود اس سے دور ہونے کے باوجود مجبور کو بھی قریب آنے نہیں دو گی۔" "جیسی یہ خوش خبری سناؤں کہ مراد سے صلہ ہو گئی ہے۔" "یہ واقعی میرے لیے بہت بڑی خوش خبری ہے۔ خدا تم دونوں کی دلی مرادیں پوری کرے گا۔ میری دعا ہے کہ تم دونوں یہاں امن و امان سے رہو اور دشمنوں کا سایہ بھی تم پر نہ پڑے۔"

"جب تک دوا نہ کرو، دعا اثر نہیں دکھائی۔ اپنے سماں کو لگام دو۔ اسے بتاؤ کہ میں آگئی ہوں لیکن ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھوں گی۔ تمہارا بھی فرض ہے کہ اپنے شوہر کو صرف اپنے نام رکھنے کے لیے اپنے حقوق کے لیے قائل نہ کرو۔"

"میں ضرور ایسا کروں گی۔ یہ شاور لے رہے تھے۔ ابھی کمرے میں آئے ہیں۔ میں پھر کسی وقت تمہیں کال کروں گی۔"

"میرا نے فون بند کر دیا۔ مجبور نے تو لیے سے گیلے بالوں کو پونچھتے ہوئے پوچھا۔ "کس سے باتیں کر رہی تھیں؟" "ماروی سے۔"

"وہ مختصر سا جواب ایسا تھا کہ وہ اچھل پڑا۔ ہاتھوں سے تو لیا چھوٹ گیا۔ اس کے حلق سے جیسے چیخ نکلی۔ "ماروی...!"

"وہ تیزی سے چلتا ہوا میرا کے پاس آیا۔ پھر اس نے فون کو اس کے ہاتھ سے چھین کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "وہ روپوش ہو گئی تھی۔ اس نے اچانک کال کی ہے۔ وہ کسی مشکل میں ہو گی۔"

"میرا اس کے ہاتھ سے فون لے کر بولی۔ "ایسی کوئی بات جیس ہے۔ وہ بہت خوش ہے۔ مراد سے اس کی صلہ ہو چکی ہے۔"

"وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "میں نہیں مانتا۔"

"آپ کیوں نہیں مانتے؟ کیا یہ چاہتے ہیں کہ وہ مراد سے بدکن ہے؟ وہ ایک اچھی ازدواجی زندگی نہ گزارے؟"

"میں یہ تو نہیں کہہ رہا ہوں۔"

"تو پھر ان کے لیے نیک خواہشات رکھیں۔ وہ بہت خوش ہے۔ اسے خوش رہنے دیں۔ اس کے معاملات میں نہ پڑیں۔" "تم کیا کہنا چاہتی ہو؟ کیا اس سے بات نہ کروں؟ اسے مبارکباد دے دوں؟"

"اگر وہ آپ کو کال کرے تب آپ اس کے معاملات میں بولیں۔ وہ چاہتی تو مجھے کال نہ کرتی، آپ کو کرتی لیکن وہ آپ سے کڑا رہی ہے۔ آپ کو بھی ایک ذرا ریزہ ریزہ ہونا چاہیے۔"

"وہ پھر اس کے ہاتھ سے فون لے کر بولا۔ "مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اس نے ماروی کے نمبر پر کیے۔ اسے کال سے لگایا۔ چند لمحوں کے بعد ہی اس کی آواز سنائی دی۔ "ہاں میرا۔۔۔ بولو۔"

"وہ چونکتے ہوئے بولا۔ "میں بول رہا ہوں ماروی! تم اچانک کہاں تم ہو گئی تھیں۔ ابھی تمہاری آواز۔۔۔"

"وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ لائن کٹ گئی تھی یا کال دی گئی تھی۔ اس نے رکی ڈائل کیا۔ اسے کال سے لگایا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ پھر فون خاموش ہو گیا۔ مجبور نے مایوس ہو کر فون کو دیکھا پھر رکی ڈائل کیا۔ پھر وہی ہوا، جو ہونا چاہیے تھا۔"

"میرا نے کہا۔ "آپ بار بار دسک ویٹ رہیں گے۔ وہ دروازہ نہیں کھولے گی۔ میں نے کہا نا، وہ آپ سے بات کرنا چاہتی تو پہلے آپ کو کال کرتی، مجھے نہ کرتی۔ کیا اتنی سی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے؟"

"مجھے نہ سمجھاؤ۔ وہ کیا کہہ رہی تھی؟"

"یہی کہ مراد کے ساتھ بہت اچھی زندگی گزار رہی ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔ مراد کے ساتھ اچھی گزارتی تو اسے چھوڑ کر سن سے یہاں تنہا نہ آتی۔"

"سماں بیوی کے درمیان ناراضگی ہو جاتی ہے پھر صلہ ہو جاتی ہے۔ ہر گھر میں یہی ہوتا ہے۔"

"تمہارے درمیان ایسا نہیں ہوتا۔ ہم ایک دوسرے سے ناراض نہیں ہوتے۔"

"آپ میرے اندر بیٹھ کر نہیں دیکھتے۔ جب ماروی سے دھیان لگائے رہتے ہیں تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ آپ کو سمجھنا چاہیے۔ دنیا کی ہر بیوی کو تکلیف ہوتی ہے جب اس کا شوہر دوسری عورت کا دیوانہ ہوتا ہے۔"

"وہ قریب ہو کر بولی۔ "آپ بہت اچھے انسان ہیں۔ دوسروں کے دکھ درد کو فوراً سمجھ لیتے ہیں اور انہیں دور بھی کرتے ہیں۔ یہ میری بد نصیبی ہے کہ صرف میری تکلیف نہیں

"کھینچتے۔۔۔۔۔ اور نہ میرے درد کی دوا کرتے ہیں۔" "وہ دور ہو کر الماری سے لباس نکال کر پہنتے ہوئے بولا۔ "فضول شکایت کر رہی ہو۔ میں دنیا کا ہر عیش و آرام تمہیں دیتا ہوں۔ میری دولت میرا کاروبار سب تمہارا ہے۔"

"آپ تمام دولت اور کاروبار ماروی کو دے دیں۔ صرف اپنا پیار میرے لیے رہنے دیں۔"

"میں نے شادی سے پہلے ہی تمہیں کہہ دیا تھا کہ ماروی میرے دل و دماغ سے بھی نہیں نکلے گی۔ تم اسے نکالنا چاہو گی تو میں تمہاری زندگی سے نکل جاؤں گا۔"

"وہ لباس پہن چکا تھا۔ اس کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے چلا گیا۔ شوہر یہی کرتے ہیں۔ جو روز حاصل ہوتی رہتی ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ میرا کو اندیشہ تھا کہ وہ ماروی سے اسے دور کرنا چاہے گی تو وہ دیوانہ پاگل اسے طلاق دے دے گا اور وہ ایک ارب پتی شوہر کو چھوڑنے کی نادانی نہیں کر سکتی تھی۔"

"وہ بے بسی سے جھکے ہوئے انداز میں بیٹھ گئی۔ مجبور پھر واپس آیا۔ میرا نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "وہ آج بھی مجھے دل میں چھپا کر رکھتی ہے۔ اس نے مجھے کال نہیں کی تم سے بات کی۔ جانتی ہو کیوں؟ وہ اس لیے کہ تم مجھے بتاؤ گی کہ وہ اب گمشدہ نہیں ہے۔ مری نہیں ہے۔ میرے لیے زندہ ہے۔"

"وہ اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "میں اس کے ناز و انداز کو سمجھتا ہوں۔ پہلے ہی دن سے اس کی زبان پر نہ ہے لیکن دل میں ہاں ہے۔ یہ اس کی دل کو سننے والی ادا ہے۔ وہ زبان سے نہیں بولتی۔ اداؤں سے سمجھا دیتی ہے۔ میں اس کے انکار کے باوجود اسے رفتہ رفتہ شادی کے مرحلے تک لے آیا تھا۔ یہ میری بد نصیبی ہے کہ نیوٹ بے بی کے باعث باپ بننے کا الزام اٹھا کر ناکام رہا۔ لیکن یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ اندر ہی اندر مجھ سے راضی رہتی ہے۔"

"اس نے قریب آ کر پوچھا۔ "سچ بولو۔ اس نے فون پر کیا کہا تھا؟ کچھ تو میرے متعلق کہا ہو گا؟"

"اس نے ہاری ہوئی عورت کی آنکھوں سے اسے دیکھا پھر کہا۔ "اس نے صاف لفظوں میں کہا تھا کہ میں آپ کو اس کی طرف جانے سے باز رکھوں۔"

"اس نے بتایا ہو گا کہ وہ کہاں ہے؟"

"وہ اس شہر میں واپس آگئی ہے۔"

"ہاں۔ یہی اس کی ادا میں تھی۔ وہ تمہارے ذریعے مجھے بتا رہی ہے کہ اب گمشدہ نہیں ہے۔ میں اسی شہر میں اسے

"حاش کر سکتا ہوں۔ اس نے اپنا ہاتھ نہیں بتایا ہو گا؟" "اس نے نہیں بتایا ہے۔"

"وہ چاہتی ہے کہ میں اس کے پیچھے دوڑوں۔ اسے حاش کروں۔ یہ تم دیکھتی آ رہی ہو مجھے اپنے پیچھے لگائے رکھنے کا یہ میل وہ شروع سے کھینچتی آ رہی ہے۔"

"اس کی بات سمیرا کے دل کو لگ رہی تھی۔ اس نے اس پہلو سے نہیں سوچا تھا کہ ماروی نے کال اسے کی ہے لیکن اس کے ذریعے اپنے دیوانے کو اطلاع فراہم کر رہی ہے کہ اسی شہر میں ہے جب چاہو، آ جاؤ۔"

"یہ بات بھی سمیرا کے دل کو لگ رہی تھی کہ وہ شروع ہی سے مراد اور مجبور کی محبہ بانی ہوئی ہے۔ دونوں کو اپنے پیچھے لگائے رکھتی ہے۔ مجبور سے کہا تھا کہ اس کی عزت کرتی ہے، اسے دل سے چاہتی ہے لیکن شادی مراد سے کرے گی اور ایسا کہہ کر مجبور کو یقین دلایا تھا کہ اس سے شادی نہ کرنے کے باوجود اسے دل سے چاہتی رہے گی۔"

"اور وہ یہی کر رہی تھی۔ اس نے کراچی واپس آتے ہی سمیرا کے ذریعے اطلاع دی تھی کہ وہ دیوانے کے شہر میں آگئی ہے۔"

"اگرچہ وہ ماروی کی احسان مند تھی اور اس سے بڑی عقیدت رکھتی تھی لیکن اچانک ہی اس کے خلاف سوچنے لگی۔ اسے اپنا شوہر مجبور بے قصور نظر آ رہا تھا۔ اب قصور وار وہ نظر آ رہی تھی۔ کراچی آتے ہی بڑی چالاکی سے بیوی کے ذریعے شوہر کو درخشا رہی تھی۔"

"وہ دونوں ہاتھوں سے سر قلم کر بولی۔ "آپ کا قصور نہیں ہے۔ آپ ابھی کچھ عرصے تک میرے ساتھ بہت ہی خوب صورت وقت گزار رہے تھے۔ کاروبار میں دل لگا رہے تھے۔ اس نے پھر یہاں آ کر آپ کو بھڑکا دیا ہے۔"

"وہ اس کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں تمہارا شوہر ہوں۔ تمہارا ہی رہوں گا۔ قانونی طور پر تم ہی میری شریک حیات ہو۔ وہ اس گھر میں نہ بی بی بنے آ رہی ہے، نہ آئے گی۔ مراد کو نہیں چھوڑے گی۔ اگر تمہارے درمیان عشق و محبت کا میل جاری ہے تو رہنے دو۔ تمہارا کیا بگڑ رہا ہے؟"

"وہ بولی۔ "مراد بھر مانہ زندگی گزار رہا ہے، اس کے بے شمار جانے انجانے دشمن ہیں۔ وہ آج نہیں شوکل ضرور مارا جائے گا پھر وہ آپ ہی کی طرف دوڑی چلی آئے گی۔ اسی لیے ابھی سے راستے ہموار کر رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں اسے مکھلے لک لوں گا لیکن وہ تمہارے حقوق بھی حاصل نہیں کر سکے گی۔ اربوں روپے کا

کاروبار نہ بھی سنبھال سکے گی۔ نہ بھی بزنس کیونٹی میں اور سوسائٹی میں ایک سانس بھی لے سکے گی۔ وہ ایک بے چاری سی سوکن بن کر آئے گی۔ اپنی ایک الگ زندگی گزارتی رہے گی۔ جنہیں ایسی سوکن کی بھی پروا نہیں کرنی چاہیے جو تھمارے حقوق بھی چھین نہیں سکے گی۔

سیرا اس کی طرف گھوم کر اس کے سینے سے لگ گئی۔ محبوب اسے بازوؤں میں لے کر محبت دینے لگا پھر بولا۔

”ہمیں معلوم ہوتا چاہیے کہ وہ کہاں رہتی ہے؟ اس کے کیا حالات ہیں اور وہ مراد جیسے مجرم کے ساتھ کس طرح آزادی سے زندگی گزار سکے گی۔“

سیرا نے فون پر اس کے نمبر بیچ کرتے ہوئے کہا۔

”ابھی معلوم کرتی ہوں۔“

اس نے فون کو کان سے لگا دیا۔ رابطہ ہوتے ہی ماروی کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو سیرا!۔۔۔ تم بول رہی ہو؟“

”ہاں، میں بول رہی ہوں۔ محبوب تم سے باتیں کرتا چاہتے تھے۔ تم نے انہیں بڑی طرح مایوس کیا ہے۔“

”اس کے باوجود وہ مجھ سے مایوس نہیں ہوں گے۔ تم انہیں سمجھاؤ کہ یہاں مجھے مراد کے ساتھ سکون سے رہنے دیں۔ میرے سامنے بھی نہ آئیں۔“

”کیا مراد یہاں تمہارے ساتھ ہے؟“

”ابھی نہیں ہے۔ جلد ہی آنے والا ہے۔“

”وہ تمہارے ساتھ یہاں آزادی سے کیسے رہے گا۔ پولیس اور انٹیلیجنس والے اسے گرفتار کر لیں گے۔“

ماروی نے کہا۔ ”ہم نے ساتھ رہنے کی کچھ پلاننگ کی ہے خدا نے چاہا تو مراد پولیس والوں سے اور اپنے دشمنوں سے محفوظ رہیں گے۔ پلیز مجھ سے یہ نہ پوچھنا کہ ہم نے پلاننگ کیا کی ہے؟“

”میں نہیں پوچھوں گی۔ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ کیا مجھ سے ملنا چاہو گی؟“

”اگر تم تھپا آؤ گی تو مجھے خوشی ہوگی۔“

”تمہاری رہائش کہاں ہے؟“

ماروی اسے رہائشی پتا بتانے لگی۔ وائز ایڈیکٹر آن تھا۔ محبوب کو اس کا پتا معلوم ہو گیا۔ وہ دونوں سن رہے تھے اور ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔

وہ ماروی سے بولی۔ ”میں آفس کے معاملات میں بہت مصروف ہوں۔ کل کسی وقت آؤں گی۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ سیرا نے پوچھا۔ ”اب آپ کیا کریں گے؟“

”معلوم کروں گا کہ مراد کے بارے میں وہ کس حد

تک سچ بول رہی ہے۔ واقعی اس سے صلح ہوگئی ہے یا نہیں؟ اگر صلح ہو چکی ہے تو مراد کہاں ہے؟ کیا آچکا ہے؟ چھپا ہوا ہے؟ اور اس سے چھپ کر رہتا رہتا ہے یا موجود نہیں ہے؟ یا کسی نہ کسی آنے والا ہے؟“

وہ سیرا کے پاس سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”اللہ تعالیٰ مجھے نیکیاں کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں ماروی کی خاطر مراد سے دشمنی نہیں کروں گا۔ اپنے ذرائع کے مطابق اسے سکیورٹی دوں گا۔ میں اسے ایک ہستی تھیلی زندگی گزارتے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

وہ بے فکر و شبہ ماروی کی خوشیاں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے مراد کو زندہ سلامت دیکھنا چاہتا تھا اور... اور مراد کے حالات اسے یہ اطمینان دلاتے رہتے تھے کہ وہ زیادہ دن نہیں جیے گا۔ اپنے دشمنوں کی یا پولیس والوں کی گولیوں سے ضرور مارا جائے گا۔

ہائے ری حسرت.....! وہ اسی امید پر ماروی سے آس لگائے بیٹھا تھا۔

☆ ☆ ☆

بشری اور بلا انرپورٹ کے وینک ہال میں آگئے۔ وہ بہت خوش تھی۔ اپنی دلی آرزو کے مطابق پاکستان جاری تھی۔ جہاز ایک ذرا تاخیر سے جانے والا تھا۔ فون کی رنگ فون نے بے کھٹا طلب کیا۔ اس نے بشری سے کہا۔ ”میکالو البرٹ بہت بے چین ہے، تیسری بار کال کر رہا ہے۔“

وہ بولی۔ ”اسے کب تک نظر انداز کرو گے؟ کال اینڈ کر لو؟ اسے اور نہ دوڑاؤ۔ ابھی دو نوک فیصلہ سناؤ۔“

اس نے جن کو دیا کہ فون کو کان سے لگا دیا۔ دوسری طرف میکالو شدید اضطراب میں مبتلا تھا، وہ چیخ کر بولا۔

”مراد! تم نے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ میرے تینوں بدترین دشمنوں کو ایک ہی دن میں ختم کر دیا ہے۔ اوگاڈا میں کن الفاظ میں تمہاری تعریفیں کروں؟ تم نے مجھے خرید لیا ہے۔ میں تمہارے لیے خزانے کا منہ کھول دوں گا بولو کیا چاہتے ہو؟ کتنا چاہتے ہو؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ بولا۔ ”تم نے کل یہ کام کیا حاصل کیے اور اب تک خاموش رہے۔ اپنی زبان سے مجھے یہ خوشخبری نہیں سنائی۔ ایک کال بھی نہیں کی۔ اور میری بھی کال اینڈ نہیں کر رہے تھے۔ تم نے اچانک خاموشی کیوں اختیار کی ہے؟“

بچے نے ہر دو لہجے میں پوچھا۔ ”تم مسلمانوں کے دشمن ہو۔ ڈیلو اے ایم کے ایک اعلیٰ عہدیدار ہو۔“

ادھر اسے چپ لگ گئی۔ پھر وہ جلدی سے بولا۔

”نہن۔۔۔ نہیں تو میرا بھلا ان سے کیوں تعلق ہوگا۔ وہ لوگ مسلمانوں کے دشمن ہیں اور میں تو تمہارا دوست ہوں۔ تمہارا قدر دان ہوں۔ معلوم ہوتا ہے، جنہیں کسی نے میرے خلاف بھڑکایا ہے۔“

وہ پھر سرد لہجے میں بولا۔ ”تم مراد علی منگی سے بات کر رہے ہو۔ میں آخری بار سچ بولنے کا موقع دے رہا ہوں۔ اگر فون بند کر دیا تو کسی بھی وقت تمہاری سانسیں بند ہو جائیں گی۔“

وہ بڑی طرح مضطرب ہو کر بولا۔ ”گاڈ پلیس نو۔ دشمن کے لہجے میں نہ بولو۔ آئندہ میرے تمہارے درمیان کروڑوں ڈالرز کی ڈیٹنگ ہوگی۔ پلیز مذہبی معاملات کو کوچ میں نہ لاؤ۔“

وہ سخت لہجے میں بولا۔ ”سنو۔۔۔ ایک خدا اور آخری رسول ﷺ میری غنمی میں مجھے ملے ہیں۔ یہ تو آخری سانس تک نہیں جائیں گے، لیکن میں جب چاہوں گا۔ تم دنیا سے چلے جاؤ گے۔ ایسی نے جنہیں بتایا ہوگا کہ ہمارے کچھکے میں میرے ساتھ سچ افراد آئے تھے۔ سن لو کہ وہ سب دین اسلام کے شیدائی ہیں۔“

”میں نے انہیں لاکھوں ڈالرز کے ہیرے مالی امداد کے طور پر دیے ہیں۔ آئندہ تم اس وقت تک زندہ رہو گے جب تک ہر ماہ پچاس لاکھ ڈالرز انہیں پہنچاتے رہو گے۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو مراد؟ کیوں مجھ سے دشمنی کر رہے ہو۔ ماہانہ پچاس لاکھ ڈالرز بہت ہوتے ہیں۔“

”گر دور مرچکا ہے۔ وہ شیدائی تمہارے بیٹے والٹر کو اس کی قید سے نکال کر لے جائیں گے۔ بیٹے کی بھی خیر سناؤ۔ آئندہ نظام بن عظیم سے تمہارا رابطہ رہے گا۔ میں اپنے فون کی سم بدل رہا ہوں۔ مجھے بھول جاؤ۔ جب تمہاری موت آئے گی تو ایک اندھی گولی کی طرح چلا آؤں گا۔“

اس نے فون بند کر کے سم بدل دی۔ حالات اسے تھدیلی کی طرف لے جا رہے تھے۔ آثار کہہ رہے تھے کہ وہ رفتہ رفتہ جرائم کی دنیا سے نکل جائے گا۔ فی الحال اس نے وہ شہر چھوڑ دیا۔

اس نے ایک طویل عرصے کے بعد بشری کے ساتھ اپنی پاک دھرتی پر قدم رکھا۔ وہ نیچنگ ہال سے اور کسٹم چیکنگ سے گزر کر باہر ویزٹرز لابی میں آکر بیٹھ گئے۔ ان دونوں کے چہرے شخصیت اور رکھ رکھاؤ بدل چکے تھے۔ اب وہ انگریزی فرفر بولتے تھے۔ پولیس والے اور دوسرے دشمن

انہیں پہچان نہیں سکتے تھے۔

پاسپورٹ اور دیگر اہم کاغذات کے مطابق اس کا نام اور پیشہ بدل گیا تھا۔ وہ لندن سے پاؤنڈز کے حساب سے دولت کما کر اپنی بیوی کے ساتھ اپنے وطن واپس آیا تھا۔ ان دونوں پر شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ جرائم کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابھی یہ سوچ کر آئے تھے کہ کسی ہوٹل میں رہیں گے پھر ایک چھوٹا سا مکان خرید کر وہاں رہائش اختیار کریں گے اور کم ہونے والی ماروی کو تلاش کریں گے۔ بچے نے فون پر ماسٹر سے کہا۔ ”ہم پلاننگ کے مطابق کراچی آگئے ہیں۔ آج ہی سے ماروی کی تلاش میں لگیں گے۔“

ماسٹر نے کہا۔ ”اس کی تلاش میں بھٹکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ماروی اسی شہر میں ہے۔ مراد سے اس کی صلح ہو گئی ہے۔ اب جنہیں اس سے دور رہ کر اس کی نگرانی اور حفاظت کرنی ہے۔“

بشری فون سے کان لگا کر سن رہی تھی۔ خوش ہو کر بولی۔ ”بڑا مزہ ہے، اس ملاپ میں۔ جب صلح ہو جائے، جنگ ہو کر۔“

بچے نے فون پر ہاتھ رکھ کر ڈانٹا۔ ”کیا تھیرا بولنا ضروری ہے؟ چپ کر۔ بات کرنے دے۔“

پھر اس نے پوچھا۔ ”کیا آپ جانتے ہیں، ماروی اس شہر میں کہاں رہتی ہے؟“

ماسٹر نے کہا۔ ”مراد کو معلوم ہوگا۔ میں اس کا موجودہ فون نمبر دے رہا ہوں۔ اس سے بات کرو۔“

مراد وہاں میڈیٹا کور ہائی دے کر جلد سے جلد اپنی اور ماروی کی پلاننگ پر عمل کرنے والا تھا۔ اس نے گانے بجانے والے ہارمونیم ماسٹر سے کہا۔ ”تم میڈیٹا کو دہلی تک پہنچاؤ۔ یہ وہاں سے خود ہی باپ کے پاس چلی جائے گی۔“

وہ خود میڈیٹا کے ساتھ ادھر جا کر دشمنوں کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ اس سے دور رہ کر اس کے پیچھے خود دہلی جانے والا تھا۔ میڈیٹا نے اس سے رخصت ہوتے وقت بڑی عقیدت سے کہا۔ ”تم انسان نہیں فرشتہ ہو۔ میں جنہیں بھی بھلا نہیں سکوں گی۔“

اس نے کہا۔ ”اچھا! کو اور نیکیوں کو سمجھتی رہو گی تو باپ کی بھرا نہ زندگی پر لعنت بھیج دو گی لیکن ایسا نہیں کرو گی۔ پیدائشی یہودی ہو۔ یہاں سے جاتے ہی نیکی اور انسانیت کو بھول جاؤ گی۔ بہر حال جاؤ یہاں سے۔“

وہ چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد اس نے اپنا سفری

ہمک اٹھایا۔ کناری، منہ اور ان کا بوڑھا باپ سب ہی رونے لگے۔ کناری اور منہ نے اس سے لپٹ کر کہا۔ ”بھیا! ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلیں۔ آپ کے بغیر یہ زندگی اب خالی خالی لگے گی۔“

اس نے کہا۔ ”تم سب دیکھ رہی ہو۔ میں خطرے سے بھرپور زندگی گزار رہا ہوں۔ میں نے اپنا فون نمبر لکھ کر دیا ہے۔ ایک فون خرید کر اپنے پاس رکھو۔ جب کناری اور منہ کی شادی ہو تو مجھے فون کرنا۔ میں یہاں آنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا اور یہاں سے جاتے ہی اپنی دونوں بہنوں کے لیے پانچ پانچ لاکھ روپے بھیج دوں گا۔“

دونوں بہنوں نے اسے چوم لیا۔ وہ انہیں روتا چھوڑ کر ایک ٹیچر پر بیٹھ کر وہاں سے چل پڑا۔ اپنے نیچے خطرناک راستوں سے گزرنے کے دوران اپنے فون پر اسے مخاطب کیا۔ اس نے پوچھا۔ ”ہاں ہے! کہاں ہو تم؟“

”میں کراچی آ گیا ہوں۔ مجھے معلوم ہوتا چاہیے کہ ماروی کہاں ہے؟ میں دور ہی دور سے اس کی نگرانی کرتا رہوں گا۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”یہ اچھا ہوا کہ تم وہاں پہنچ گئے ہو۔ محبوب اور اس جاسوس افسر صادق پر نظر رکھو۔ میں ابھی ماروی سے باتیں کرنے کے بعد اس سے تمہاری بات کراؤں گا۔ کوئی بھی ماروی کے لیے پراہم بنے گا تو وہ فوراً تمہیں اطلاع دے گی۔ فون بند کرو۔ میں ابھی کال کرتا ہوں۔“

مراد ٹیچر سے اتر کر ایک چٹان کے سائے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے فون پر ماروی کو مخاطب کیا۔ اس نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”تم خیریت سے ہوتا؟“

”خدا کا شکر ہے۔ خیریت سے ہوں۔ آج یا کل کسی فلائٹ سے لندن جاؤں گا۔ پھر وہاں بڑی رازداری سے تمہیں بلاؤں گا۔ تم تنہا آؤ گی۔ جب ہمیں یقین ہو جائے گا کہ تم کسی کی نظروں میں نہیں آئی ہو اور کوئی چھپ کر ہماری نگرانی نہیں کر رہا ہے تب کسی ماہر سرجن سے تمہارا چہرہ تبدیل کراؤں گا۔“

وہ بڑی بے تابی سے بولی۔ ”میں اس دن کا بڑی بے چینی سے انتظار کروں گی۔“

”ابھی ضروری بات یہ ہے کہ میرا قابل اعتماد ساتھی میرا دست راست بلال احمد عرف بلا اپنی بیوی کے ساتھ تمہیں سیکرٹ رنی دینے آیا ہے۔ تم اسے پہچانتی ہو۔“

”ہاں، وہ دو بار تمہاری ہدایت کے مطابق مجھ سے لاکھوں روپے لینے آیا تھا۔ میں اسے پہچانتی ہوں۔“

”اب نہیں پہچانو گی۔ اس کی بھی صورت بدل چکی ہے۔ ابھی وہ تمہیں کال کرے گا۔ اس سے باتیں کرو۔ اگر رازداری سے مل سکتی ہو تو ضرور اس سے ملاقات کرو۔ تم کسی بھی معاملے میں اس پر اعتماد حاصل کر سکتی ہو۔ میں اسے تمہارا فون نمبر دے رہا ہوں، ابھی وہ کال کرے گا۔“

پھر اس نے اپنے سے رابطہ کیا اور کہا۔ ”ماروی کو کال کرو۔ وہاں فی الحال سبکی براؤن کے آدمیوں سے خطرہ نہیں ہے۔ پولیس اور اٹلی جنس والے بھی تمہیں نہیں پہچانیں گے لیکن مجھے محبوب کھنک رہا ہے۔ تم محبوب اور صادق کی پرکزی نظر رکھو گے۔ مجھے بتاتے رہو کہ وہاں کیا کر رہے ہو۔“

اس نے ماروی کا فون نمبر بتا کر رابطہ ختم کر دیا۔ پھر ٹیچر پر بیٹھ کر آگے جانے لگا۔

ماروی کے فون سے رنگ فون ابھرنے لگی۔ ننھی سی اسکرین پر انہی نے نمبر دے دیے۔ وہ کچھ گنی بلا ہی ہوگا۔ اس نے ہنسنے لگا۔ ”ہیلو کون؟“

اپنے نے کہا۔ ”بھابی! میں ہوں، بلال احمد۔۔۔۔۔“

ابھی مراد نے آپ کا یہ نمبر دیا ہے۔“

”ہاں مراد نے مجھ سے کہا تھا تم کال کرنے والے ہو اور یہ کہ تم مجھے سیکرٹ رنی دینے یہاں آئے ہو۔“

”میں ابھی اپنی بیوی کے ساتھ پہنچا ہوں۔ اتر پورٹ کی ویزلز لابی میں بیٹھا ہوں۔ کبھی رننے کی جگہ بتانے سے پہلے آپ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔“

وہ ہنسنے ہوئے بولی۔ ”تم ابھی تک اسے یوں کہتے ہو؟“

”کیا کروں بیٹی کی طرح بچے مارتی ہے۔ یہ نام اس پر چلتا ہے۔ ابھی مجھ سے چپک کر فون سے کان لگائے بیٹھی ہے۔“

وہ اونچی آواز میں بولی۔ ”بھابی! السلام علیکم۔ میں آپ سے ملنے کے لیے تڑپ رہی ہوں۔ مجھے بہن سمجھ کر اپنے پاس بلا لیں۔ میں اڑنی ہوئی چلی آؤں گی۔“

ماروی نے کہا۔ ”انشاء اللہ ہم ضرور ملیں گے اور ملنے کے لیے ضروری ہے کہ دشمنوں کی نظروں سے چھپ کر رہیں۔“

اپنے نے بشری سے کہا۔ ”خدا کے لیے مجھے بات کرنے دے۔ معلوم تو ہو کہ یہ کہاں رہتی ہیں اور ہمیں یہاں سے جا کر کہاں رہنا چاہیے۔“

ماروی نے کہا۔ ”میں یہاں قائم آباد کے علاقے میں ہوں۔ تم کہاں رہنا چاہو گے؟“

”آپ کے قریب ہی رہوں گا۔ اس علاقے میں کرائے کا کوئی مکان حاصل کروں گا۔“

”میں چاہا سے کہتی ہوں۔ وہ آس پاس کوئی مکان

ڈھونڈیں گے۔ یہ رازداری ابھی رہے گی۔ پہلے ہم اپنی محلے دار ہوں گے۔ پھر شائسی ہوگی پھر دوستی ہو جائے گی۔ کسی کو ہم پر شبہ نہیں ہوگا۔“

یہ ابھی تدبیر تھی۔ وہ عمل کرنے والے تھے اور دوسری طرف مرید اپنی تدبیر پر عمل کر رہی تھی۔ وہ شملہ سے روانہ ہو کر دہلی کی سمت جا رہی تھی۔ ارادہ تھا کہ مراد یہاں نہ ملا تو کل تک لندن جائے گی پھر وہاں سے کراچی ماروی تک پہنچے گی۔

اسے دہلی تک جانے کے لیے ہوائی جہاز میں سیٹ نہیں ملی۔ اس نے دوسرے دن کا انتظار نہیں کیا۔ تیرہ بجے ٹرین کے ذریعے وہاں سے چل پڑی۔ وہ جلد سے جلد دہلی پہنچنا چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مراد میڈونا کو بائی ٹرین یا بائی روڈ لے گیا ہوگا۔ دہلی کے اتر پورٹ میں اس سے ٹکراؤ ہو سکتا تھا۔

بعض اوقات اندازے درست ہوتے ہیں۔ وہ کھلونے جیسی ٹرین دس گھنٹے جانے کے بعد ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی۔ وہاں مرید میڈونا کو دیکھ کر چونک گئی۔ وہ ایک ہندوستانی غریب آدمی کے ساتھ اسی کپارمنٹ میں سوار ہوئی تھی اور اس سے کچھ فاصلے پر آ کر ایک سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ میڈونا تنہا آزادی سے کیوں سفر کر رہی ہے؟ اسے انکار کرنے والا مراد کہاں ہے؟

وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر کپارمنٹ میں ہر طرف نظر دوڑانے لگی۔ مقل کہہ رہی تھی کہ وہ میڈونا کے آس پاس کبھی ہوگا۔ وہ کپارمنٹ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام مردوں کو گن رہی تھی۔

ان میں کئی ایسے تھے جن کی مراد نے وجاہت اور شخصیت کے باعث ان پر مراد کا شبہ کیا جاسکتا تھا لیکن وہ قد میں چھوٹے تھے یا پھر مراد کی طرح صحت مند نہیں تھے۔ اس سے مشابہت رکھنے کے باوجود یا تو دبلے پتلے تھے یا موٹے اور بھدے سے تھے۔

اسے مایوسی ہو رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میڈونا کے قریب آ کر رک گئی۔ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھی کھڑکی کے باہر منہ کیے فون کو کان سے لگائے باتیں کر رہی تھی۔ ہارمونیم ماسٹر اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ مرید نے اس سے بیٹھنے کے لیے جگہ مانگی تو وہ ایک طرف ذرا کھسک گیا۔ وہ میڈونا کے شانہ بشانہ بیٹھ گئی۔

وہ فون پر بول رہی تھی۔ ”پاپا! آپ نے تو مجھے دشمن

کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ اگر وہ فرشتہ نہ ہوتا تو میں ابھی زندہ نہ ہوتی۔“

وہ دوسری طرف کی بات سننے کے بعد بولی۔ ”ہاں۔ اس کی نیکی آپ کی نظروں میں حماقت ہے۔ اس نے دشمن کی بیٹی کو رہا کر دیا۔ ایسے فرشتوں کو جرائم کی دنیا میں نہیں رہنا چاہیے۔“

وہ باپ کی باتیں سننے کے بعد بولی۔ ”میں اس سے متاثر ضرور ہوں لیکن آپ میرے پاپا ہیں۔ چاہے جیسے بھی ہوں۔ آپ ہی سے محبت کرتی رہوں گی۔ آپ یہ بتائیں مجھے اپنے پاس کس طرح بلا رہے ہیں؟ میں آج رات دہلی پہنچوں گی۔“

وہ باپ کی باتیں سننے لگی۔ مرید کو یہ معلوم ہوا کہ مراد نے دشمن کی بیٹی کو رہا کر دیا ہے۔ اس سے لاقطع ہو گیا ہے۔ اب میڈونا کے آس پاس اسے تلاش کرنا حماقت ہوگی۔

اس نے سوچا۔ لیکن میں میڈونا کو پھر ٹریپ کر کے مراد کو چیلنج کر سکتی ہوں۔ اس کی نیکی بر باد کروں گی تو وہ جوابی کارروائی کے لیے مجھ سے ٹکرائے گا تب اس سے سن لوں گی۔

اس نے اپنے فون پر سبکی براؤن کے نمبر ڈیال کیے۔ وہاں سے اٹھ کر ذرا دور آ گئی۔ دوسری طرف کال تیل جا رہی تھی۔ پھر فون خاموش ہو گیا۔ وہ مرید کو لفت نہیں دے رہا تھا۔ اس نے دوسری بار کال کی۔ نیکی نے پھر لائن کاٹ دی۔

مرید نے گھور کر اس کی بیٹی کو دیکھا۔ ذرا سوچا پھر اس کے پاس آ کر بولی۔ ”میرے فون میں کچھ پراہم ہے۔ کیا ایک منٹ کی کال کے لیے اپنا فون دو گی؟“

میڈونا نے اسے فون دیا۔ مرید نمبر ڈیال کرتی ہوئی ذرا دور آ گئی۔ جلد ہی دوسری طرف سے نیکی کی آواز سنائی دی۔ ”ہاں بولو میڈونا۔ میں بہت مصروف ہوں۔“

مرید نے بڑی سفاکی سے کہا۔ ”تمہاری بیٹی کے فون سے اس کی موت بول رہی ہے۔“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”تم...؟“

”تم نے دو بار میری کال کو کاٹا۔ میری کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اب تو تمہارا باپ بھی باتیں کر رہے گا۔“

وہ پھر بیٹی کو جیت کر ہارنے والا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”تم...؟ تم کیا چاہتی ہو؟“

”میں چاہتی ہوں، ابھی میڈونا سے فون پر کچھ نہ بولو۔ وہ اپنی موت سے بے خبر ہے۔ پہلے مجھے کال کرو۔“

اس نے فون کو بند کیا۔ پھر میڈونا کے پاس آ کر اسے

شکر کے ساتھ فون واپس کر دیا۔ اب اس کے اپنے فون سے کالنگ فون ابھر رہی تھی۔ اس نے پھر میڈیٹا سے دور ہو کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ”یہ کہاوت سچ ہے کہ نیرمی انگلی سے مٹی لکھا ہے۔ کیا اب لائن کاٹ سکتے ہو؟“ مجھ سے باتیں کرنے سے انکار کر سکتے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”میری بیٹی کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ تمہارا جو بھی مطالبہ ہوگا وہ پورا کروں گا۔“

”میرا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔ میرا ایک چھوٹا سا کام کرو گے تو بیٹی سستے میں چھوٹ جائے گی۔“

”کام بتاؤ؟“

”میں تمہارے دشمن مراد کو زیر کرنا چاہتی ہوں۔ اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تم بھی یہی چاہتے ہو۔“

”یہ تو سنی صدر میرے دل کی بات کہہ رہی ہو۔ یوں تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“

”مراد کو فون پر کہو کہ مرینہ اس کی نیکی برباد کر رہی ہے۔ تمہاری بیٹی اس کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔ اسے خدا کا واسطہ دے کر اٹھا کر دو کہ وہ میڈیٹا کو مجھ سے نجات دلائے۔ اس طرح وہ میرے مقابلے پر آئے گا۔ میں اسے سنے بہرہ میں دیکھ سکوں گی۔“

”میں تمہاری چال سمجھ گیا ہوں۔ ابھی اسے کال کرتا ہوں۔“

مراد ایک ٹیکسی کرائے پر حاصل کر کے دہلی کی طرف جا رہا تھا۔ وہ نیرمی کی فرین جس میں مرینہ اور میڈیٹا سفر کر رہی تھیں اس سے کئی کلومیٹر آگے جا رہی تھی۔ اس نے اپنے فون پر نیکی براؤن کے نمبر پر کال کر اسے انیڈ کیا پھر کہا۔ ”تمہاری بیٹی نے بتایا ہوگا کہ میں نے اسے آزاد کر دیا ہے؟“

”ہاں۔ اس نے مجھے بتایا ہے۔ میں تم سے جانی دشمنی کر رہا ہوں اور تم نے میری بیٹی کو جان کی سلامتی دی ہے۔ لیکن تمہاری یہ مہربانی یہ احسان ادھورا رہ گیا ہے۔ وہ کہکتی مرینہ اس کے قریب پہنچ گئی ہے۔ میڈیٹا ابھی اس دشمن کی قربت سے بے خبر ہے۔ فارگاڈ سیکٹ اسے اس وجہ لپیٹی سے بچاؤ۔“

مراد نے پوچھا۔ ”کیا مرینہ نے کوئی مطالبہ کیا ہے؟“

”ہاں وہ چاہتی ہے کہ میں تمہیں فون پر بتاؤں کہ وہ تمہاری نیکی کو خاک میں ملائے والی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ میڈیٹا کے ذریعے تمہیں زیر کرنا چاہتی ہے۔“

”میں اس کے جھکندوں کو سمجھتا ہوں۔ میں نے میڈیٹا کو اغوا کیا، اسے اس کے گھر پہنچانا میرا فرض ہے۔ میں ابھی یہ ذمہ داری پوری کروں گا۔“

مراد نے فون بند کر دیا۔ نیکی براؤن مسکراتے لگا۔ مراد اور مرینہ دونوں ہی اس کے خطرناک دشمن تھے اور وہ ابھی آپس میں مکرانے والے تھے۔ ان کے مکراد سے اسے فائدہ پہنچنے والا تھا۔

دہلی میں اس کے کئی تابعدار اور شورش تھے۔ اس نے فون کے ذریعے ان سے کہا۔ ”تیار رہو مراد اور مرینہ ادھر آنے والے ہیں۔ وہ دونوں میڈیٹا کے آس پاس ہوں گے اور شاید ایک دوسرے سے دشمنی کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ تم سب انہیں میڈیٹا کے ذریعے پہچان سکو گے۔“

مراد نے نیکی سے بات کرنے کے بعد کچھ سوچا۔ پھر جیسی ڈرائیور سے پوچھا۔ ”فرین ہم سے بہت آگے جا رہی ہوگی۔ کیا تم رفتار بڑھا کر اس فرین تک پہنچ سکتے ہو؟“

وہ رفتار بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”وہ تو کھلونے کی طرح چلتی ہے۔ جیسے اسے چابی دے کر چھوڑ دیا گیا ہو۔ ہم ایک گھنٹے میں اس سے آگے نکل جائیں گے۔“

”اس سے آگے نہیں جانا ہے۔ وہ جس اسٹیشن پر رکے گی وہیں میں یہ ٹیکسی چھوڑ دوں گا اور فرین سے آگے جاؤں گا۔ تمہیں پورا کرنا ہے۔“

اس نے نیکی کی رفتار کچھ بڑھا دی۔ مراد نے مرینہ کے فون نمبر پر کال کی۔ وہ اپنے فون پر اس کے نمبر پر ہتے ہی خوش ہو گئی۔ میڈیٹا سے دور ہو کر فون کو کان سے لگا کر بولی۔

”میں اپنے تیل کی گردن میں رسی ڈال کر کھینچتا جا رہی ہوں۔ آخر کھینچنے چلے آئے میرے سرکار میرے در پر۔“

وہ چپ رہا۔ اس نے پوچھا۔ ”چپ کیوں ہو؟“

وہ بولا۔ ”تم بولتی جاؤ۔ میں سن رہا ہوں۔“

”میں نہیں چاہتی جیسے تم نے جان کی سلامتی دی ہے اسے مار ڈالوں۔ اس کی سلامتی چاہتے ہو اسے بخیریت گھر پہنچنے دیکھنا چاہتے ہو تو میرے سامنے آ جاؤ۔“

”میں نے ہر بار تمہیں معاف کیا۔ جان سے نہیں مارا۔ زخمی کر کے چھوڑ دیا۔ اس بار تم سیدھی اوپر جاؤ گی۔ بے وقوف عورت! تم نے اس وقت نیکی براؤن کے ذریعے یہ اطلاع دے کر غلطی کی ہے کہ تم اسی فرین میں میڈیٹا کے پاس ہو جس میں میں سفر کر رہا ہوں۔ میں نے تمہیں سستے بہرہ میں دیکھ لیا ہے۔ اب مجھ سے چھپ نہیں سکو گی اور مجھے بھی پہچان نہیں سکو گی۔“

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ اس کا سوچ آف کر دیا۔ وہ یہ سن کر پریشان ہو گئی اور مہربانی کہ مراد اسی فرین میں ہے اور اسے سستے چہرے کے ساتھ پہچان چکا

ہے۔ وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ”نہیں۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میں نے پورے کپارمنٹ میں تمہیں تلاش کیا ہے۔ تمہارے قد اور تمہاری جسامت کا کوئی۔۔۔“

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ یہ معلوم ہوا کہ وہ فون بند کر چکا ہے۔ اس نے سم کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مراد اسے دیکھ لے اور وہ اسے نہ دیکھ سکے۔ قتل میں بات آئی کہ اس نے ایک کپارمنٹ میں اسے ڈھونڈا تھا۔ پوری فرین میں تلاش نہیں کیا تھا۔

مراد نے اسے اچھی طرح الجھا دیا تھا۔ وہ اسے تلاش کیے بغیر ایک جگہ سکون سے نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر کپارمنٹ سے باہر آ گئی۔ فرین اپنی مخصوص دھیمی رفتار سے جا رہی تھی۔ وہ فرین سے اتر کر دوڑتی ہوئی دوسرے کپارمنٹ میں آ گئی۔ پھر وہاں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایک ایک مسافر کو توجہ سے دیکھنے لگی۔

اسے ایک نہیں تین قد آور صحت مند جوان نظر آئے۔ وہ ایک دوسرے سے دور مختلف سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پہلے جس جوان پر نظر گئی وہ کچھ مراد جیسا ہی لگ رہا تھا۔ عاشق مزاج تھا۔ اپنے سامنے بیٹھی ہوئی ایک مسافر لڑکی سے گفت لے رہا تھا۔

اس جوان کی نظریں مرینہ سے ملیں تو وہ ذرا ہچکچایا۔ اس سے نظریں جدا کر لڑکی کو دیکھنے لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دوسری عورت کو دیکھنے سے لڑکی ناراض ہو جائے۔

مرینہ نے سوچا یہ مجھ سے نظریں جدا رہا ہے۔ چور بکڑا گیا ہے۔ مہربان رہا ہے۔ وہ خوش ہو گئی کہ اس نے مراد کو بھی سستے بہرہ میں دیکھ لیا ہے۔ وہ بے چارہ پریشان ہو رہا تھا۔ چور نظروں سے مرینہ کو اپنے قریب آتے دیکھ رہا تھا۔

وہ قریب آ کر اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ پھر اس کی طرف جھک کر بولی۔ ”میں نے کہا تھا کہ اپنے تیل کی گردن میں رسی ڈال کر کھینچتا جا رہی ہوں۔“

وہ بولا۔ ”لگ۔۔۔ کون ہو تم؟ کیا کہہ رہی ہو؟“

وہ فتح مندی سے مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں نے ڈھونڈ لیا ہے تو اب تمہاری زبان لڑکھڑاہی ہے۔“

وہ لڑکی اپنے عاشق کو قہقہے سے دیکھنے لگی۔ وہ اپنے ایک کان کو چھو کر بولا۔ ”ماں جسم میں نہیں جانتا یہ کون ہے؟“

لڑکی نے ناراضگی سے منہ پھیر لیا۔ وہ نوجوان سے بدعنوان ہو گئی تھی۔ وہ مرینہ کی طرف گھوم کر بولا۔ ”تم کون ہو؟ کیوں مجھ سے نفرت ہو رہی ہو؟ کیا پاگل خانے سے آئی ہو؟“

وہ اس کی طرف جھک کر ازدارانہ انداز میں بولی۔ ”ابھی تمہارے سامان کی تلاشی لوں گی تو سن اور پلٹس لٹیں گے۔ میں نہیں چاہتی کہ یہاں ہماری اصلیت ظاہر ہو جائے۔“

اس نے اپنا بیگ سرینہ کو دیا۔ پھر سیٹ کے پیچھے سے ایک اپنی کو کھینچ کر کہا۔ ”لو، یہ میرا سامان ہے۔ ان سب میں گن اور پلٹس بھرے ہیں۔ چلو مجھے گرفتار کرو۔“

مرینہ نے پریشان ہو کر سوچا۔ یہ مراد ہوتا تو اسے کی تلاش کے لیے نہ کہتا۔ یہ تمام مسافر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے کوئی بات بتانی ہوگی۔

اس نے اونچی آواز میں کہا۔ ”میں سی آئی اے کی ایک افسر ہوں مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس فرین میں ایک دہشت گرد اپنے گروہ کے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ اس کا چہرہ اور حلیہ اس جوان کی طرح بتایا گیا ہے۔ میں اپنی ذیوقی سے مجبور ہوں۔“

وہ بیگ اور اپنی کی تلاشی پس پونہی لینے لگی۔ فرین ایک اسٹیشن پر رک رہی تھی۔ نیکی ڈرائیور نے مراد کو پہلے ہی وہاں پہنچا دیا تھا۔ اس نے فون پر میڈیٹا سے پوچھا۔

”کیا تمہارے پاس کوئی عورت بیٹھی ہوئی ہے؟“

وہ بولی۔ ”نہیں۔۔۔ مگر تھوڑی دیر پہلے بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر کسی دوسرے کپارمنٹ میں چلی گئی ہے۔“

”تم فوراً باہر آؤ۔ وہ عورت تم لوگوں کی جانی دشمن مرینہ ہے۔ ایک لمحے کی دیر نہ کرو۔ میں پلیٹ فارم پر ہوں۔ فوراً آؤ۔“

میڈیٹا کو اپنے محسن پر اعتماد تھا۔ وہ ہارمونیم ماسٹر کے ساتھ فرین سے اتر کر باہر آئی۔ مراد پلیٹ فارم پر موجود تھا۔ اس کے ساتھ چلتی ہوئی اسٹیشن سے باہر آ گئی۔ مراد نے نیکی ڈرائیور کو روکنے کے لیے کہا تھا۔ وہ میڈیٹا کے ساتھ جیسی میں بیٹھے ہوئے ہارمونیم ماسٹر سے بولا۔ ”اب تمہاری ضرورت نہیں ہے، تم واپس جاؤ۔“

نیکی وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ مرینہ نے کام خلاشی کے بعد وہاں سے اٹھتے ہوئے اس نوجوان سے کہا۔

”سوری، میں نے تمہیں پریشان کیا ہے۔ میں اپنی ذیوقی سے مجبور ہوں۔“

وہ وہاں سے چلتی ہوئی کپارمنٹ سے باہر آ گئی۔ فی الحال میڈیٹا اس کے لیے اہم تھی۔ وہ اس کپارمنٹ میں واپس آئی تو اس کی سیٹ خالی تھی۔ اس نے ایک مسافر سے پوچھا۔ ”یہاں ایک انگریز عورت بیٹھی ہوئی تھی، وہ کہاں گئی؟“

اس نے کہا۔ "ابھی اتر کر اسٹیشن کے باہر گئی ہے۔" وہ پلٹ کر تیزی سے دوڑتی ہوئی اسٹیشن کے باہر آئی۔ اس نے دو رنگ دیکھا۔ جہاں سے نکل گئی تھی، وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔ "ادھر ایک انگریز عورت آئی تھی، وہ کدھر گئی ہے؟" وہ بولا۔ "جو ادھر زمین سے پہلے پہنچنا چاہتے ہیں وہ ٹیکسی میں جاتے ہیں۔ وہ بھی ٹیکسی میں ادھر گئی ہے۔" وہ دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "فوراً اس کے پیچھے چلو۔"

ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی پھر تیز رفتاری سے جانے لگا۔ مرینہ نے پوچھا۔ "اس کے ساتھ اور کون تھا؟" وہ دو آدمیوں کے ساتھ اسٹیشن سے باہر آئی تھی۔ ایک غریب سا آدمی بس میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔ دوسرا کوئی شخص نہیں تھا۔ اسے اپنے ساتھ لے گیا ہے۔"

وہ سمجھ گئی کہ مراد نے اسے الوداع کیا ہے۔ وہ ٹرین میں نہیں تھا۔ اسے میڈونا سے دور جا کر پوری ٹرین میں ڈھونڈنے کی ترغیب دی۔ وہ باؤلی ہو کر اسے تلاش کرنے لگی تھی اور میڈونا کو ہار گئی تھی۔

اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔ "کیا اس رفتار سے اس ٹیکسی تک ہم پہنچ سکیں گے؟"

"میڈم! یہ پہاڑی راستے ہیں۔ تیز رفتاری خطرناک ہوگی۔ آگے دو ٹیکسی بھی سست رفتاری سے جا رہی ہوگی۔ آپ فکر نہ کریں! میں بھی رفقار بڑھاتا رہوں گا۔" تھوڑی دیر بعد ہی آگے جانے والی ٹیکسی نظر آنے لگی۔ مرینہ نے کہا۔ "شاباش! تھوڑی رفتار بڑھاؤ پھر اس سے آگے نکل کر اس کا راستہ روک دو۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "میڈم! کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی؟" وہ اس کے اندر سے گن نکالتے ہوئے بولی۔ "تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ جو کہہ رہی ہوں وہ کرتے رہو۔"

مراد میڈونا کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پیچھے سر ہٹا کر دیکھا ایک ٹیکسی آ رہی تھی۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ پھر وہ قریب سے گزرتی ہوئی ان سے آگے جانے لگی۔ ایسے وقت اس نے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھی ہوئی اس عورت کو دیکھا جسے ایک بار شملہ میں دیکھ چکا تھا۔ اسے شبہ ہوا تھا کہ وہ مرینہ ہو سکتی ہے۔

اب وہی عورت پھر نظر آئی تھی۔ اس کی ٹیکسی ذرا آگے گئی تھی پھر تیز چلی ہو کر راستہ روک کر کھڑی ہو گئی تھی۔ یوں راستہ ٹکڑے ہی مراد چونک گیا۔ وہ عورت ہاتھ میں گن لیے

دروازے سے نکل کر دوڑتی ہوئی ٹیکسی کی دوسری طرف جا رہی تھی۔

اس نے بھی ایک لمبے کی دیر نہیں کی۔ اپنی سیٹ پر سے تڑپ کر باہر آیا۔ وہ ٹیکسی بھی ڈرا تڑپتی ہو کر رک گئی تھی۔ وہ اپنی گن نکالتا ہوا میڈونا سے بولا۔ "سیٹ کے نیچے لیٹ جاؤ۔"

وہ ٹیکسی کے پیچھے آ گیا۔ ادھر مرینہ نے اپنی ٹیکسی کو اُحال بنا لیا تھا۔ اس کے پیچھے دونوں ہاتھوں سے گن تھامے مراد سے کہنے لگی۔ "اب ہم ایک دوسرے سے چھپ کر نہیں رہیں گے۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے اور تم بھی مجھے پہچان رہے ہو۔"

مراد نے کہا۔ "ہم پہلے دوست تھے۔ میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ دوست بن کر رہو اور فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔"

وہ بولی۔ "دوست ساتھ چھوڑنے کے لیے نہیں ہوتے۔ ساتھ رہنے سے دوستی اور محبت بڑھتی رہتی ہے۔"

"تم اچھی طرح جانتی ہو۔ میری محبتوں کا مرکز صرف ماروی ہے۔ میں اس کا حق کسی کو نہیں دوں گا۔"

"اور تم میری محبتوں کا مرکز ہو۔ ہائی گاڈ! میری زندگی کے پہلے اور آخری مرد ہو۔"

وہ اپنی گن کو چھپتے ہوئے بولی۔ "میں جان کی بازی لگا کر بھی تمہیں اپنا بنا کر رہوں گی۔"

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ کیا میں اتنا کمزور ہوں کہ مجھے جبراً اپنا بنا لوں گی؟"

"یاد کرو۔ ایک بار بنا لیا تھا۔ تمہیں زخمی کرنے کے بعد جھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر اپنا دوا نہ بنا لیا تھا۔ اگر محبت سے تمہیں مانو گے تو آج بھی وہی کروں گی۔"

"تو پھر آؤ۔ مجھے گھیر تو لیا ہے۔ اب پہلے کی طرح گولیوں سے زخمی کرو اور اپنا بیچ بنا کر لے جاؤ۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی پہاڑوں کی ویرانی میں ایک فائر کی آواز گونجی۔ مرینہ نے ہلکی گولی چلائے ہوئے کہا۔ "یاد رکھو! اگر میں تمہیں اپنا بنا کر نہ لے جاؤں اور مجھے یہاں سے فرار ہونا پڑا۔ تب میں پاکستان جاؤں گی اور ماروی کے وجود کو حرفِ ظلم کی طرح مٹا دوں گی۔ پھر نہ وہ رہے گی اور نہ تمہاری دوا ہوگی۔"

مراد نے گولی چلائی۔ اس کی ٹیکسی کا ایک پہیہ دھماکے سے ناکارہ ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "یہ لو ٹیکسی رہے گی۔ نہ فرار ہو سکو گی۔ نہ میری ماروی تک پہنچ سکو گی۔ کم آن اور چلاؤ گولی۔"

"میری گاڑی کو ناکارہ بنا کر تم نے اچھا نہیں کیا۔ اس ویرانے سے جانے کے لیے ایک تمہاری ہی ٹیکسی رو گئی ہے۔ اب تو اسے بھی حاصل کرنا ہوگا۔"

اس نے بڑی مکاری سے ہاتھوں میں الجھاتے ہوئے نشانہ لے کر گولی چلائی۔ بے شک اسے نشانہ بازی میں مہارت حاصل تھی۔ مراد بال بال یوں ہچا کہ گولی ٹیکسی کی محبت سے ٹکرا کر بہک گئی۔ اس کے سر کے بالوں کو چھو کر گزر گئی۔ گویا اس میدانِ جنگ میں موت نے پہلی آنچ دی تھی۔ وہ زمین پر لیٹ گیا۔ دور اس ٹیکسی کے چلنے جھپٹے میں مرینہ کے دونوں پاؤں نظر آرہے تھے۔ اس نے اپنی ٹیکسی کے نیچے ہاتھ بڑھا کر نشانہ لیا۔ پھر تڑا تڑی شور مچاتی ہوئی آوازوں کے ساتھ مسلسل تین گولیاں چلا گئیں۔ مرینہ کی جججج ابھری۔ دونوں بیروں میں گولیاں لگی تھیں۔ وہ کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ زمین پر گر پڑی۔

تھوڑی دیر تک اس فائرنگ کی آوازیں گونجتی رہیں پھر سنا ہوا چھپا گیا۔ وہ لڑھکتی ہوئی ذرا دور چلی گئی تھی۔ مراد کو نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ کھڑی نہیں رہ سکے گی لیکن میدان چھوڑنے والی عورت نہیں تھی۔ رہتی ہوئی مقابلہ کر سکتی تھی۔

مراد نے کہا۔ "مرینہ! اب تم کھڑے رہنے کے بھی قابل نہیں رہیں۔ زندہ رہنا چاہتی ہو تو ہتھیار میری طرف پھینک دو۔"

وہ تکلیف سے کراچے ہوئے بولی۔ "آہ! میں اٹھنے کے قابل نہیں ہوں۔ فارگڈ سیک مجھے فوراً کسی اسپتال میں لے چلو۔ یہ لو میں گن پھینک رہی ہوں۔"

اس دوسری ٹیکسی کے پیچھے سے ایک گن فضا میں اُڑتی ہوئی آ کر مراد کی ٹیکسی کے سامنے گری۔ وہ زمین سے اٹھ کر بولا۔ "ایک ہتھول تمہاری جاکھ سے بندھا رہتا ہے۔ اسے بھی پھینکو۔"

وہ ہتھول بھی سامنے آ کر گرا۔ وہ واقعی بارمان بن چکی تھی۔ مراد نے کہا۔ "تم رہتی ہوئی میرے سامنے آ سکتی ہو۔"

وہ دونوں ٹھنوں سے اور دونوں ہاتھوں سے رہتی ہوئی کراچے ہوئے بھی کرتی بھی سنبھلتی ہوئی اس کی نگاہوں کے سامنے آئی پھر ادھم سے منہ زمین پر گر پڑی۔ تب وہ مطمئن ہو کر ٹیکسی کے پیچھے سے نکل کر اس کے سامنے آیا۔ اپنی گن کی نال کو نیچے کرتے ہوئے بولا۔ "تمہاری ضد نے تمہیں دونوں بیروں سے اپنا بیچ بنا دیا ہے۔ اب تم کئی ہتھوں اور میٹوں تک چل پھر نہیں۔"

اس کی بات ادھر رہی رو گئی۔ فائرنگ کی آواز کے ساتھ ایک گولی اس کے شانے کی ہڈی کو توڑتی ہوئی گزر گئی۔ وہ آفت کی پرکالہ مرتے مرتے بھی مارا جاتی تھی۔ وہ ادھم سے منہ زمین پر اسی لیے گری تھی کہ لباس کے اندر سے تیسری گن نکال سکے۔ مراد کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر ذرا فاصلہ پر جا گری تھی۔ اس جنگ باز عورت نے اسے ہتھاکر دیا تھا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے بھی گن چلا سکتا تھا۔ وہ اسے زمین سے اٹھانے کے لیے جھکا تو دوسری گولی نے اس کے قدم اکھاڑ دیے۔ گولی اس کے ایک گھٹنے میں آ کر لگی تھی۔

مرینہ نے اسے اپنے سے زیادہ ناکارہ بنا دیا۔ وہ زمین پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھوں سے اس کا نشانہ لیتے ہوئے بولی۔ "مراد! وقت خود کو دہرا رہا ہے۔ میں پھر تمہیں اپنا بیچ بنا کر جھکڑیاں پہنا کر اپنی زخموں کا اسیر بناؤں گی۔" اس نے تیسری گولی چلائی۔ وہ مراد کے دوسرے پاؤں میں لگی۔ وہ زمین پر چاروں شانے چت ہو گیا۔ وہ ٹھنوں کے بل چلتی ہوئی اس کے قریب آئی۔ اس کا نشانہ لے کر بولی۔ "ایک گولی اور پھر تم ہوش میں آنے کے بعد خود کو زخموں میں دیکھو گے۔"

مرینہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اپنی زخمی لات چلا سکے گا۔ ایک لات پڑتے ہی اس کے ہاتھ سے گن نکل گئی۔ فضا میں اُڑتی ہوئی دور چلی گئی۔ وہ لنگڑی ٹھنوں کے بل ادھر جانا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے لنگڑے نے اسے دیو بچ لیا۔

وہ زبردست فائرنگ بھی لیکن مراد کے گھٹنے سے نکل نہیں پاری تھی۔ مراد نے اس پر سوار ہو کر ایک ہاتھ سے اس کی گردن کو جکڑ لیا تھا۔ وہ سانس نہیں لے پاری تھی۔ اس کے نیچے پھڑ پھڑا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ ٹھنڈی پڑ گئی۔ جیسے دم نکل گیا ہو۔ مراد نے کہا۔ "اب میں تمہارے قریب میں نہیں آؤں گا۔ تم آسانی سے میرا پیچھا نہیں چھوڑو گی۔ دیکھو میں کیا کرتا ہوں؟"

وہ اچانک ہی اسے چھوڑ کر زمین پر لڑھکا ہوا اپنی گن کے پاس آیا۔ وہ بھی مکاری دکھا رہی تھی۔ نہات پاتے ہی لڑھکتی ہوئی اپنی گن کے پاس آ گئی۔ اسے اٹھا کر پلٹ کر فائر کرنا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے ہی مراد کی گولی نے پھر اس کے ہاتھوں سے گن کو گرادیا۔ گولی اس کی پہلی میں لگی تھی۔ دوسری گولی بھی ظالم تھی۔ اس کے شانے میں آ کر لگی۔

اب وہ اٹھنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ جیسے آخری

سائیس لیتی ہوئی مراد کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بولا۔ "میں نے اپنی مادی کو بہت دکھ دیے ہیں۔ اب نہیں دوں گا۔ اس کے ساتھ ایک نیا گھر بنانے اور ساری دنیا سے چھپ کر رہنے کے لیے اس کے دشمنوں کو ختم کر دوں گا۔ تم مادی کو ختم کرنے کی حسرت لے کر جاؤ۔"

یہ کہہ کر اس نے آخری کوئی اسے ماری۔ پھر وہاں سے نکلنا ہوا جیسی کی پچھلی سینٹ پر میڈونا کے پاس آ کر گر پڑا۔ دشمن کی بیٹی تو دشمن ہی ہوتی ہے۔ دوست نہیں ہو سکتی۔ وہ پچھلی سینٹ کے کنارے کھڑکی سے لگ گئی تھی۔

مراد وہاں آ کر گر تو اس کا سر میڈونا کے زانو پر آ گیا۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے گہری سانس لی۔ اسی تربت کے لیے وہ ترستی رہی تھی اور وہ منہ پھیرتا رہا تھا۔

اب حالات نے اس کی گرد میں اسے پہنچا دیا تھا۔ تقدیر مہربان تو سنگدل محبوب قربان۔ وہ جیسے قربان ہونے کے لیے خود ہی اس کی آغوش میں آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ اس کے ہاتھ سے گن چوٹنے والی تھی۔ میڈونا نے فوراً ہی اسے لپک لیا۔ ہتھیار ہاتھ میں آتے ہی اس نے فاتحانہ انداز میں اپنے مطلوب کو اپنے گھن کو دیکھا پھر ڈرائیور سے کہا۔ "اس کا کارہ جیسی کو دھکا دے کر ایک طرف کر دو اور فوراً یہاں سے چلو۔ بری اپ ویرن کرو۔"

مرینہ جس جیسی میں آئی تھی، وہ راستہ رو کے کھڑی تھی۔ اس کا ایک پیسا بے کار ہو چکا تھا۔ دونوں ڈرائیوروں نے اسے دھکا دے کر ایک طرف کیا۔ وہ کھڑکی کے باہر مرینہ کو دیکھ رہی تھی۔ وہ پتھر۔ ملی زمین پر ایک لاش کی طرح بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ میڈونا جا کر دیکھنا نہیں چاہتی تھی کہ وہ مر چکی ہے یا ابھی اس میں جان باقی ہے؟

مراد کی بھی جان لگی جا رہی تھی۔ اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کی موت کی تصدیق کرتا۔ وہ زخموں سے چور تھا۔ اس نے پچھلی سینٹ پر میڈونا کے پاس آ کر گرتے ہوئے کہا۔ "فارگڈ سیک انجھے اسپتال پہنچاؤ۔"

دوسری جیسی کو ایک طرف ہٹا دیا گیا۔ راستہ صاف ہو گیا۔ وہ جیسی تیز رفتاری سے آگے جانے لگی۔ میڈونا پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ "اسے کہاں لے جاؤں؟ کیا اسپتال پہنچاؤں؟"

ایک خیال آیا۔ کیا پاپا کو بتاؤں کہ ان کا بدترین دشمن میری آغوش میں نیم مر رہا ہے؟ اور اس کا ریوالور میرے ہاتھوں میں ہے۔ میں غائب ہوں۔ یہ شکست خوردہ

ہے۔ کیا پاپا کو بولوں کہ ابھی یہ دشمن میرے نشانے پر ہے جس نے آپ کے درجنوں شوٹرز کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ میرے بھائی روٹی براؤن کو مار ڈالا ہے۔ لیکن مجھے زندہ چھوڑ دیا۔ ہائے... ابھی احسان پاگل کر رہا ہے۔ بے شک یہ عورتوں کے لیے فرشتہ ہے۔ اس نے میرے بدن کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔

اس نے سر جھکا کر مراد کو دیکھا۔ اس کا سر اس کے زانو پر رکھا ہوا تھا۔ خون بہت بہہ گیا تھا۔ کزوری کے باعث اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ دل اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔

وہ اس پر جھک کر اس کے چہرے پر اپنا چہرہ رکھتے ہوئے بولی۔ "پاپا خود غرض ہو گئے تھے۔ انہوں نے مجھے تمہارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ میں تو پاپا کے لیے ایک طرح سے مر چکی ہوں۔ ان کے دشمن مراد نے میری عزت سے کھیل کر مجھے مار ڈالا ہے۔ ان لمحات میں یہ میری نئی زندگی سے اور میری آغوش میں یہ ایک فرشتہ ہے۔ میں اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں گی۔"

وہ زیر لب بول رہی تھی۔ اس کے چہرے کو اپنے چہرے سے سہارا رہی تھی۔ اسے بڑے جذبے سے چوم رہی تھی۔ وہ ڈر اس کا سہا سہا۔ اس میں یہ بولنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ ایسا نہ کرو۔

مراد کے گہرے زخم زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے اور وہ بھوکی اسے مانگ رہی تھی۔ اہمان اپنی اپنی بھوک کے مطابق خوراک مانگتا ہے۔ میڈونا کو بڑے نصیب سے یہ موقع ملا تھا۔ اگر کہیں تنہا ہوتی تو جانے اس کے ساتھ کتنی حسرتیں پوری کرتی۔ اس وقت تو مال قیمت کی طرح وہ جس حد تک میسر تھا اتنا ہی کافی تھا۔

"ہائے کیا مرد میدان ہے۔ درجنوں مسلح گارڈز اور کئی شوٹرز کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اسے کانچ سے نکال لیا تھا۔

"اس نے مرینہ جیسی خطرناک دشمن سے مجھے بچایا ہے اور اس حال کو پہنچ گیا ہے۔ میں اسے بچانے کے لیے اس پر قربان ہو جاؤں گی۔ اسے کسی بھی قریبی اسپتال میں پہنچاؤں گی۔"

اس نے سسکتے ہوئے لبوں کو اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ اس کے وجود میں جذبہ ہونے لگی۔ وہ اس کے

جذبات سے بے خبر نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی احسان مند ہونے والی اس کے لیے پاگل ہو رہی ہے۔

جیسی تیز رفتاری سے بھاگی جا رہی تھی۔ میڈونا کے اندر بھی جذباتی بھاگ دوڑ جا رہی تھی۔ آخر وہ کالکا کے اسپتال میں پہنچ گئی۔ وہاں کے بڑے ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ پولیس کیس ہے۔ جب تک تمہارے دار نہیں آئے گا، ہم اسے ہاتھ نہیں لگا سکیں گے۔"

مراد نے اسے رہا کرتے وقت تیس ہزار دیے تھے۔ اس نے پانچ ہزار روپے ڈاکٹر کی جیب میں رکھے تو اس نے فوراً ہی اس کی مرہم پٹی کی۔ اس کے جسم میں نیا خون پہنچانے لگا۔ ڈاکٹر اور اس کے ہاتھوں نے پولیس والوں تک یہ بات پہنچنے نہیں دی کہ کوئی گولیوں سے زخمی ہو کر آیا ہے۔

وہ بے ہوش پڑا تھا۔ زخم گہرے تھے۔ جلدی مرنے والے نہیں تھے۔ دونوں پاؤں بے کار ہو گئے تھے۔ ایک گولی شانے کی ہڈی توڑ کر گزری تھی۔ اس ہڈی کے بڑنے میں بھی کئی ہفتے یا مہینے لگ جاتے۔

میڈونا نے مراد کے سفزی بیگ میں دیکھا۔ اسلحہ اور ہتھیار کے علاوہ ابھی خاصی رقم تھی۔ اس نے ڈاکٹر کو مزید دس ہزار روپے دیے۔ وہ خوش ہو گیا۔ اس نے مراد کو ایک الگ کمرارہ بننے کے لیے دیا۔ میڈونا نے اس سے کہا۔ "اسے جلد سے جلد چلنے پھرنے کے قابل بناؤ۔ میں تیس ہزار روپے دوں گی۔"

ڈاکٹر نے وعدہ کیا کہ دن رات اس کے علاج میں مصروف رہے گا۔ میڈونا نے اس کے جانے کے بعد دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ ایسے وقت منتقلی نے سمجھا یا کہ وہ محض جذباتی ہو رہی ہے۔ اس سے لگی رہے گی اور علاج کرائی رہے گی تو کسی دن کسی بھی وقت اس کے باپ کے زرخیز شوٹرز وہاں پہنچ جائیں گے۔

ایسے ہی وقت اس کے فون سے کالنگ فون ابھرنے لگی۔ سیکی براؤن کال کر رہا تھا۔ اس نے فون کے من کھول دیا۔ اسے کان سے لگا دیا۔ باپ کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو باپ کی جان! سو سو ری۔ میں دوسرے معاملات میں مصروف ہو گیا تھا۔ تمہیں کال نہ کر سکا۔ تمہیں تو کرنا چاہیے گی۔"

وہ بولی۔ "پاپا! آپ مجھے باپ کی جان نہ کہا کریں۔ جینی سے خواہ مخواہ شدید محبت ظاہر نہ کریں۔ میں آپ کی لڑائی

جیت کو ابھی طرح سمجھ چکی ہوں۔"

"پلیز میڈونا... اب آپ کو غلط نہ سمجھو۔"

"آپ کو غلط سمجھ لینے کے باوجود باپ کا مان مرتبہ دوں گی۔ آخر جینی ہوں۔ میں دہلی پہنچنے کے بعد آپ کو کال کروں گی۔ ابھی فون بند کر رہی ہوں۔"

"جست اسے منت وہ عورت کہاں ہے جس نے تمہارا فون لے کر مجھ سے بات کی تھی؟"

"آپ نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ ایک عورت نے میرے فون پر آپ سے بات کی تھی؟"

"اس نے دھمکی دی تھی کہ تمہیں اس کی اصلیت نہ بتاؤں۔" اور آپ نے دھمکی میں آ کر مجھے اس ظالم عورت کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ وہ مرینہ تھی۔"

وہ ہنچکاتے ہوئے بولا۔ "وہ... وہ میڈونا... وہ بات یہ ہے کہ اس نے..."

وہ بولی۔ "اپنی صفائی پیش نہ کریں۔ آپ کو بتا دوں کہ پھر ایک بار مراد نے آ کر مجھے اس سے نجات دلانی ہے۔" وہ حیرانی سے چیخ کر بولا۔ "اوہ گاڈ! کیا کچ بول رہی ہو؟ کیا مراد تمہارے ساتھ ہے؟"

وہ دشمن باپ کو یہ نہیں بتانا چاہتی تھی کہ وہ شہزادہ اس کے رحم و کرم پر ہے۔ اس نے کہا۔ "نہیں، وہ پھر کہیں چلا گیا ہے۔ جب تک میں دہلی نہیں پہنچوں گی اور کسی فلاحیت سے آپ کی طرف نہیں آؤں گی، وہ دور ہی دور سے چھپ کر میری حفاظت کرتا رہے گا۔ میں آپ سے کہتی ہوں۔ میری فکر نہ کریں اور نہ ہی اپنے ہاتھوں کو میری نگرانی اور حفاظت کے لیے بھینکیں۔ اگر مراد سے ان کا ٹکراؤ ہو گا تو پھر گولیاں چلیں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ مجھے رہا کرنے والا دوست پھر سے دشمن بن جائے۔"

"جب وہ دہلی تک تمہاری نگرانی کرتا رہے گا تو وعدہ کرتا ہوں میرا کوئی شوٹرز اس سے ٹکرانے نہیں آئے گا۔"

"اور میں یقین سے کہتی ہوں کہ آپ کے شوٹرز کی فوج دہلی میں موجود ہوگی جس نے میری عزت کو میٹا نہیں کیا، مجھے رہائی دی۔ دوسری بار مجھے مرینہ سے بچایا، اسے آپ زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ اسے ہلاک کرنے کے لیے آپ ایک عرصے سے پاگل ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ اسے جینی کا سہارا لے کر ضرور فریب کریں گے۔"

"تم خواہ مخواہ دشمن بن کر بول رہی ہو۔ شملہ میں ہی تمہارا دل اس پر آ گیا تھا۔ اس لیے تم نے ایمان ملی کی چھٹی کر دی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بھی تمہیں قبول کر لیا

ہے۔ کچ بتاؤ وہ کہاں ہے؟ تم ابھی اس کے ساتھ کہاں ہو؟“
میڈوٹا نے پریشان ہو کر مراد کو دیکھا۔ وہ اپنی طرف
آنے والے دشمنوں سے بے خبر تھا اور مکی براؤن کو شبہ ہو گیا
تھا کہ جی اس کے ساتھ کہیں وقت گزار رہی ہے۔

وہ بولی۔ ”آپ یقین کریں یا نہ کریں۔ وہ صرف
اپنی ماروی کا دیوانہ ہے۔ مجھ سے اب بھی دور کہیں ہے۔
میں اس وقت کالا کے ریلوے پلیٹ فارم پر ہوں۔ میری
سیٹ ہو چکی ہے۔ پندرہ منٹ بعد ٹرین یہاں سے دہلی کے
لیے روانہ ہوگی۔“

”میرے بارے میں تمہارا خیال درست ہے۔ کالا
سے آگے میرے شوٹرز کسی اسٹیشن پر اس ٹرین میں آئیں
گے۔ تمہاری نگرانی کریں گے اور اسے ٹرین میں تلاش
کریں گے۔“

یہ کہہ کر باپ نے فون بند کر دیا۔ میڈوٹا نے اطمینان
کی سانس لی۔ اسے معلوم تھا کہ پندرہ منٹ بعد وہاں سے
دہلی کے لیے ٹرین جانے والی ہے۔ اس کے باپ کے شوٹرز
اس ٹرین میں اسے اور مراد کو تلاش کرنے کے لیے بھٹکتے
رہیں گے پھر ادھر پلٹ کر نہیں آئیں گے۔ کل دہلی میں ان کا
انتظار کریں گے۔

اس نے عارضی طور پر دشمنوں کو مراد سے دور کیا تھا۔
یہ مسئلہ پریشان کن تھا کہ وہ یورپی حسینہ وہاں لاکھوں میں
پہچانی جاتی تھی۔ مراد اس کے ساتھ محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔
آج نہ سہی کل یا پرسوں یا کسی دن بھی اس کے پاپا کے آدمی
پلٹ کر ادھر آسکتے تھے۔

اب تو درگا کا سابقہ شوہر جے جے بھاسکر بھی مکی کا
ساتھ دے رہا تھا۔ اس کے آدمی بھی ایک انگریز عورت کو
دیکھ کر یہی کہتے کہ وہ میڈوٹا ہے۔

یہ بات سمجھ میں آرہی تھی کہ وہ مراد کو اپنے ساتھ چھپا
کر نہیں رکھ سکے گی۔ وہ پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگی پھر کھینچی
ہوئی اس کے پاس بیڈ پر آگئی۔ اس سے لگ کر لیٹ
گئی۔ دل مچل رہا تھا۔ اس سے لپٹ گئی۔ اس پر ہاتھ
پھیرتے ہوئے کہنے لگی۔ ”میں کیا کروں؟ تمہیں ہمیشہ کے
لیے حاصل نہیں کر سکوں گی۔ میں کیا کروں؟ تم ہوش میں
آنے کے بعد مجھے قریب آنے نہیں دو گے۔ چلنے پھرنے
کے قابل ہو جاؤ گے تو پھر مجھے چھوڑ کر غائب ہو جاؤ گے۔“

وہ اسے چومتی اور سہلاتی ہوئی اس پر چھا گئی۔ ہوس کہہ
رہی تھی کہ بس یہی موقع ہے۔ جس حد تک اسے حاصل کر سکتی
ہے، کر لے۔ کچھ تو تسلی ہوگی کہ اسے پالیا ہے۔

اس کا نفسیاتی تجربہ کرنے والے ماہرین یہی کہتے کہ
وہ ایک جنسی مریضہ ہے۔ اس کے اندر جذبات چیتے رہتے
ہیں۔ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہے۔

وہ بے ہوش پڑا تھا۔ یہ نہیں جان سکتا تھا کہ اس کے
ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ایسے وقت وہ چونک گئی۔ یوں لگا،
چوری پکڑی گئی ہے۔ کوئی اس کی تنہائی میں آ گیا تھا۔

فون کی گھنٹی اسکرین نے بتایا کہ ایمان علی آیا ہے۔
اس کی زندگی سے نکالے جانے کے بعد وہ پہلی بار اسے کال
کر رہا تھا۔ وہ نصف مراد کے حجر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایسے
وقت اسے اہمیت نہیں دے سکتی تھی جسے چھوڑ چکی تھی۔ اس
نے کال کٹ کر دی۔

پھر اچانک ہی اس کے ضمیر نے کہا۔ ”مجھے پہلے مراد
کی سلامتی کی فکر کرنی چاہیے اور میں ایمان علی کے ذریعے
اسے تحفظ فراہم کر سکتی ہوں۔ وہ یہاں آ کر اسے لے جائے
گا۔ اس کا علاج کرائے گا۔ میں اس سے دور ہو جاؤں گی تو
کوئی دشمن نہ اسے پہچان سکے گا، نہ اس کے قریب آ کر اسے
نقصان پہنچا سکے گا۔“

وہ مراد سے الگ ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے دل پر جبر کیا
پھر ہوس پر قابو پا کر ایمان علی کو فون پر مخاطب کیا۔ وہ بولا۔
”میں نے ابھی کال کی تھی تم نے لائن کاٹ دی۔ میری سمجھ
میں نہیں آتا، تم اچانک بے وفا کیوں ہو گئیں؟ مجھے اپنی
زندگی سے کیوں نکال دیا ہے؟“

وہ بولی۔ ”میری ایک بات مانو گے؟“

وہ محبت کے جوش میں بولا۔ ”ہزار باتیں مانوں گا۔“

اس نے کہا۔ ”مجھے بھول جاؤ ایمان!“

”یہ کیا کہہ رہی ہو؟“

”مجھ سے بڑی بھول ہو گئی۔ میں ہوس کی ماری

تھی۔ تمہارے ساتھ جو بھی وقت گزرا ہے اسے بھول
جاؤ۔ میں مراد کی طلب میں پاگل ہو رہی ہوں۔“

وہ ناگواری سے بولا۔ ”کیا تمہارا کوئی دین ایمان نہیں

ہے؟ مراد کے بعد پھر کسی اور کی آغوش میں چلی جاؤ گی۔“

”ہرگز نہیں۔ مراد مل جائے گا تو پھر کسی کی تمنا نہیں

کروں گی اور کوئی خواہش نہیں کروں گی۔“

”ہوس میں مبتلا رہنے والوں کی کوئی خواہش آخری

نہیں ہوتی۔ یہ لکھ لو کہ وہ کبھی تمہیں گھاس نہیں ڈالے گا۔“

”تم رقیب بن کر بول رہے ہو۔“

”میں دوست بن کر سمجھا رہا ہوں۔ وہ صرف اور

صرف... اپنی ماروی کا دیوانہ ہے۔“

"مجھے کوئی تدبیر بتاؤ کہ وہ میرا ہو جائے۔ میں اس کی خاطر اپنے باپ سے بغاوت کر رہی ہوں۔ اس نے مجھ پر بڑے احسان کیے ہیں۔ یہ مجھے پاگل کر رہا ہے۔ اس وقت زخموں سے چور ہو کر کالکے ایک اسپتال میں پڑا ہے۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟ وہ میرا پار ہے ابھی کہاں ہے؟ تم کیسے جانتی ہو کہ وہ اسپتال میں ہے؟"

اس نے مختصر کرداد سنائی کہ اس کے اور مراد کے ساتھ اب تک کیا ہو چکا ہے۔ پھر کہا۔ "میں چاہتی ہوں تم یہاں آؤ اور کسی طرح مراد کو علاج کے لیے دہلی لے جاؤ۔ میں اس کے ساتھ رہوں گی تو پاپا کے شوئر سیر سے ڈرے لے اسے پیمان لیں گے۔ ابھی اسے موجودہ بہروپ میں کوئی نہیں پہچانتا۔"

"میں اپنے پار کو لینے ابھی آؤں گا۔"

"ابھی کیسے آ جاؤ گے؟"

"تمہارے باپ نے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں فوراً تمہیں چھوڑ کر شملہ سے چلا جاؤں۔ ورنہ پیچھاؤں گا۔ میں اپنی سلامتی کے لیے شملہ سے کالکے آ گیا۔ مجھے شاک پہنچا ہے۔ میں ابھی دہلی نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس لیے تمہیں دونوں سے یہاں ایک ہو کر میں ہوں۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ یہاں ہوں۔ تم مراد کے ساتھ کس اسپتال میں ہو۔ مجھے بتاؤ میں ابھی آ رہا ہوں۔"

اس نے اسپتال کا نام اور بتا کر فون بند کر دیا۔ پھر بڑی حسرت سے مراد کو دیکھا۔ وہ اس کی سلامتی کے لیے اس سے بچھڑنے والی تھی۔

وہ پھر اس کے بند پر آگئی۔ اس پر چھانگنی پھر اس سے لپٹ کر اسے پیار کیا تو اس غصے سے آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے کہ اسے حاصل نہیں کر سکے گی۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس پتھر کو اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ جان دے کر بھی اسے جیت نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

ایک بیابان عورت کتنا فصد دکھا سکتی ہے؟ نہیں دکھا سکتی۔ کچھ کر دکھانے کے لیے اپنی طاقت یا اپنی اہمیت سے کام لیتا ہوتا ہے۔ وہ شہر زور نہیں مگر کہ مرینہ کی طرح ہاتھ پائی کرتی۔ ایک بار مرینہ نے بندوق کے زور پر مراد کو حاصل کیا تھا۔ وہ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ایک سیدھی سادی عام سی گھریلو عورت تھی۔

پہلی کہاوت کے مطابق رفتہ رفتہ گھر کی مرغی دال برابر ہونے لگتی ہے۔ اسے اخلاقاً شریک حیات تسلیم تو کیا

جاتا ہے لیکن وہ اپنے حقوق منوانے والی اہمیت سے محروم ہو جاتی ہے۔

وہ مراد کو فصد دکھا کر اس سے دور ہو کر اس سے وصل کے رہنمائی جگہ چھین کر اسے جدائی کی سزا دے کر گئی تھی۔ تب یہ عقل آئی کہ سزا تو وہ خود کو بھی دے رہی ہے۔ خود کو وصل کے رہنمائی جگہ سے محروم کر کے ایک طویل جدائی کا عذاب اٹھا رہی ہے اور جسے سزا ملنی چاہیے وہ آتی جاتی سو کنوں کے ساتھ شاد و آباد ہے۔

ہر بیابان کی زندگی میں ایسا وقت آتا ہے جب اس کی انا زخمی ہوتی ہے۔ خوش نہیں ختم ہوتی ہے اور وہ حالات سے سمجھوتا کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

بشری اور بے کواسی کھلے میں مکان مل گیا تھا۔ وہ ماروی سے کچھ فاصلے پر آکر آباد ہو گئے۔ انہوں نے معمولی سا فرنیچر اور چوبیسے ہانڈی کا سامان خرید لیا تاکہ وہ پوری طرح گھر کر رہتی والے نظر آتے رہیں۔

انہوں نے فون پر ماروی کو اطلاع دی کہ وہ اسی جگہ کے تیسرے مکان میں آگئے ہیں۔ ماروی نے چاہنی چاہا سے کہا۔ "بلا اپنی بیوی کے ساتھ آ گیا ہے۔ آپ دونوں وہاں جائیں۔ انہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو ان کی ہر ضرورت پوری کریں۔ اس بھانے میل ملاپ شروع ہوگا۔" وہ بہت محتاط ہو کر وہاں رہنا چاہتے تھے۔ چاہنی نے کئی گھنٹے کے بعد آکر کہا۔ "گھر کا سامان سیٹ کرنے میں اتنی دیر ہوگئی۔ بشری تو تمہاری دیوانی ہے۔ تم سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہے۔ میں نے رات کے کھانے پر انہیں بلایا ہے۔"

ماروی کا دھیان مراد کی طرف تھا۔ اس نے صبح فون پر کہا تھا کہ وہ دہلی جا رہا ہے۔ وہاں سے لندن جائے گا پھر بڑی رازداری سے اپنی جان حیات کو وہاں بلا کر اس کا چہرہ تبدیل کرائے گا۔

آئندہ انہیں بڑے اہم مراحل سے گزرنا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ بڑی کامیابی سے روپوش رہ کر امن و امان سے ایک خوش حال زندگی گزار سکتے تھے۔ وہ پھر اس سے باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن انتظار کر رہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ شام تک وہ خود ہی اسے فون کرے گا۔ شام ہوتے ہی بشری اور ملا آگئے۔ بشری نے ماروی کو دیکھتے ہی آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگالیا۔ پھر اس کے رخسار کو چوم کر بولی۔ "جنگ جنگ جیوے میری بھابی۔ میں نے لندن میں کتنی بار اپنے سے کہا کہ تمہارے پاس لے

چلے لیکن کیا کریں بڑی مجبوریاں تھیں۔"

وہ ہاتھ بچا کر بول رہی تھی اور اچھی لگ رہی تھی۔ ماروی مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "تم تو مجبوریاں جانتی ہو۔ ہم سب چوروں کی طرح چھپ کر زندگی گزار رہے ہیں۔ اپنے عہد کرنے والوں سے بھی مل نہیں سکتے۔ لیکن ریت چاہے تو کسی کو بھی کسی وقت ملا دیتا ہے۔ یہی دیکھو کہ ہم کتنی انجمنوں سے گزرنے کے بعد یہاں آکر مل رہے ہیں۔"

بچے نے کہا۔ "مٹی خدا کے لیے چپ ہو جا۔ جب بولتی ہے تو ریکارڈ کی طرح جتنی جلی جاتی ہے۔ چپ ہونا جانتی ہی نہیں۔"

ماروی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بولنے دو۔ بہت پیاری لگتی ہے۔ تم نے یہ بولنے والی مینا کہاں سے لی ہے؟"

"اس کی بات رہے دیں۔ میں آپ سے ملنے ہی بہت اہم بات کہنا چاہتا تھا لیکن یہ مصلحت کی طرح بچنے لگی تھی۔"

وہ ہاتھ بچا کر بولی۔ "اب تو چپ ہوں۔ بھابی کو میرا بولنا کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ یہ مجھے مینا کہہ رہی ہیں مگر تم تو کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہو جب میں بولتی ہوں۔"

اس بات پر سب ہی ہنسنے لگے۔ بچے نے کہا۔ "بھابی! محبوب کو کیسے معلوم ہوا ہے کہ آپ یہاں رہتی ہیں۔ میں نے تمہاری دیر پہلے اسے یہاں دیکھا ہے۔"

اس نے اچانک ہی چونکا دینے والا سوال کیا تھا۔ ماروی نے باہرنگی کے دروازے کو پریشان ہو کر دیکھا پھر حیرانی سے پوچھا۔ "محبوب اور یہاں...؟"

"ہاں، وہ ایک چھوٹی سی کارڈ رائیو کرتا ہوا آپ کے مکان کی طرف دیکھتا ہوا گیا ہے۔"

اس نے کہا۔ "یا خدا...! سمیرا مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے یہاں کا پتا بتایا تھا۔"

بشری نے کہا۔ "آپ نے گھر والی کو پتا بتایا۔ گھر والا دیوانہ ہو کے چلا آیا۔ یہ مراد ایک ہی عورت کے ساتھ زندگی کیوں نہیں گزارتے۔ دوسری کے پیچھے بھاگے چلے جاتے ہیں۔"

بچے نے کہا۔ "محبوب بہت اچھے انسان ہیں۔ انہیں ہر پہلو سے فرشتہ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن عشق کے معاملے میں وہ جھٹلی ہو جاتے ہیں۔ انہیں عقل سے سوچنا سمجھنا چاہیے۔ ان کا فرض ہے کہ بیابان عورت کی نیک نائی کا خیال کریں۔ اسے عزت سے اپنے شوہر کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے دیں۔"

بشری نے ہاتھ بچا کر کہا۔ "کیا ان کی بیوی سے کوئی

عشق کرے گا تو انہیں تکلیف نہیں ہوگی؟ حب انہیں اپنے اعمال پر شرم نہیں آئے گی؟"

ماروی نے کہا۔ "تم دونوں ذہانت کی عقل کی بات کر رہے ہو اور عشق عقل سے نہیں دل سے ہوتا ہے۔ دل کو لاکھ سمجھاؤ یہ کسی کی نہیں مانتا۔ یہ ایسا روگ ہے کہ جنون میں جتا کر کے دین و دنیا سے بچا نہ کر دیتا ہے۔"

اس نے فون پر سمیرا کو بھی حب کیا پھر پوچھا۔ "آج تم مجھ سے ملنے کے لیے یہاں آنے والی ہیں۔ تم تو نہیں آئیں۔ تمہارے میاں صاحب میری گلی کے پتھر کا کر گئے ہیں۔"

سمیرا نے طنز یہ انداز میں کہا۔ "تم یہی چاہتی ہو کہ تمہارے ایک نہیں دو دیوانے ہوں اور وہ دن رات تم سے تمہیں مانگتے ہوں۔ تم نے شروع ہی سے دونوں کو پاگل بنا رکھا ہے۔"

ماروی نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہو سمیرا؟" "جو بچ ہے، وہی کہہ رہی ہوں۔ تم روپوش ہو گئی تھیں۔ یہاں آنے کے بعد بھی روپوش رہ سکتی تھیں لیکن تم نے میرے ذریعے محبوب کو اطلاع دی کہ آگئی ہو۔ میں بھی نادان تھی۔ یہ نہ سمجھ سکی کہ میرے کاندھے پر بندوق رکھ کر چلا رہی ہو اور محبوب کو پھر دیوانہ بنا رہی ہو۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ تم میرے طریقہ کار کو غلط زاویے سے بیان کر رہی ہو۔"

"تم اپنی صفائی میں کچھ بھی کہہ لو لیکن شروع سے یہ ثابت کرتی آ رہی ہو کہ ایک مرد سے تمہارا گزارہ نہیں ہو رہا ہے اسی لیے دوسرے کو بھی اپنے آگل سے باندھ کر رکھتی ہو۔"

وہ غصے سے بولی۔ "بکواس مت کرو۔ تمہیں محبوب کی محبت اور توجہ نہیں مل رہی ہے تو فصد مجھ پر اتار رہی ہو۔ آئندہ ہوش و حواس میں رہ کر شرافت سے گفتگو کرو گی تو فون اٹینڈ کروں گی ورنہ جاؤ۔ غرور کی جہنم میں جلتی رہو۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ بشری نے کہا۔ "میں سمجھ گئی۔ وہ میاں کو لگام دینے میں ناکام ہو رہی ہے اور اس کے بچکنے کا الزام آپ کو دے رہی ہے۔"

وہ بڑے ڈکھ سے بولی۔ "ہاں، وہ بہت ہی شرمناک باتیں کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ ایک مرد سے میرا دل نہیں بھرتا ہے۔ میں نے دو کو پھانس رکھا ہے۔"

ماروی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ دوپٹے سے آنکھیں پونچھنے لگی۔ بشری نے تڑپ کر کہا۔ "میں اس کا منہ توڑ دوں گی۔ ایسی بات کہنے کی اسے جرأت کیسے ہوئی۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ وہ رہتی کہاں ہے مجھے بتائیں؟"

جئے نے کہا۔ "اے... تو جوش میں نہ آتا۔ سیرانے
بھائی کی توہین کی ہے۔ ہم اس سے منہ لیں گے۔"
ماروی نے کہا۔ "ایک عورت سے منہ کر ساری دنیا
کی زبان بند نہیں کر سکو گے۔"
وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولی۔ "میں ایک
عرسے سے محبوب کے ساتھ بدنام ہوئی آری ہوں۔ سب
یہ کہتے ہیں کہ دوسروں کے درمیان عیش و عشرت سے
زندگی گزار رہی ہوں۔"
وہ بڑے کرب سے بولی۔ "میں سختی ہوں تو مجھے کتنی
تکلیف ہوتی ہے یہ میرا خدا ہی جانتا ہے۔"
پھر وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "میں نے سوچا
تھا کہ مراد سے شادی ہونے کے بعد لوگوں کو چپ لگ
جائے گی۔ لیکن محبوب کی دیوانگی ختم نہیں ہو رہی ہے اور وہ
کچھ نہیں رہے ہیں کہ میرے لیے ان کی جو تکلیفیں ہیں وہ پھر
سے مذا ب بن رہی ہیں۔"
اس نے فون اٹھا کر محبوب کے نمبر پر کال کی۔ پھر رابطہ
ہونے پر کہا۔ "میں بول رہی ہوں۔"
وہ خوش ہو کر بولا۔ "میں ابھی دعا مانگ رہا تھا کہ تم
کسی طرح مجھ سے بولنے لگو۔ میں جانتا ہوں تم کہاں رہتی
ہو۔ تمہاری دیر پہلے تمہاری گلی سے گزر کر آیا ہوں۔"
ماروی نے پوچھا۔ "مجھے بدنام کرنے کے لیے اور
آپ کیا کیا کریں گے؟ آئیں، میری گلی میں میرے
دروازے کے سامنے دھرتا دے کر چھو جائیں۔"
"یہ کیا کہہ رہی ہو؟ میں اور تمہیں بدنام کروں گا؟
نہیں اس سے پہلے مر جاؤں گا۔"
"کیا آپ کی یادداشت کمزور ہے؟ کیا میں پہلے
ایک داشتہ کے طور پر بدنام نہیں ہوئی رہی؟ کیا اس وقت
آپ نے مجھے نیک نامی... دی گئی؟ کیا میری گلی سے گزر کر
سوئی ہوئی رسوائی کو پھر سے بیدار کرنے نہیں آئے تھے؟"
وہ بڑی اندامت سے بولا۔ "یا خدا...! مجھے کیا ہو
جاتا ہے؟ میں کتنا خود غرض ہو جاتا ہوں؟ دیوانگی طاری ہوتی
ہے تو تمہاری بدنامی کو بھول جاتا ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔
اب تم پر کوئی انگلی نہیں اٹھائے گا۔"
"انگلی اٹھ چکی ہے۔ ابھی تمہاری شریک حیات نے
فون پر کہا ہے کہ ایک مرد سے میرا گزارہ نہیں ہو رہا ہے اس
لیے دوسرے کو اپنے آٹھل سے باندھنے آئی ہوں۔"
"کیا...؟" وہ چیخ پڑا۔ اس کی چیخ بتا رہی تھی کہ وہ
پھٹ پڑا ہے۔ "کیا سیرانے ایسی بات کہی ہے؟"

"اس پر غصہ دکھا کر آپ ساری دنیا کی زبانیں بند
نہیں کر سکیں گے۔ ویلو... محبوب... ویلو..."
ماروی نے اپنے گونگے فون کو دیکھا پھر پریشان ہو کر
کہا۔ "یا خدا...! وہ تو پاگل ہو گئے ہوں گے۔ پتا نہیں سیرا
کے ساتھ کیا کرنے والے ہیں۔"
بشری نے نذرت سے کہا۔ "اچھا ہے اسے لاتیں
جو تے پڑیں گے۔ اسے ضرور سزا ملنی چاہیے۔"
"میں نہیں چاہتی ان کی ازدواجی زندگی میں دراڑ
پڑے۔" وہ پریشان ہو رہی تھی۔ "یا خدا...! میں کیا
کروں؟ یہ بتانا ضروری تھا کہ ان کے گھر سے ہی میری
بدنامی شروع ہو رہی ہے۔ لیکن نہیں بتانا چاہیے تھا۔ مجھ سے
نکلی ہو گئی ہے۔"
جئے نے کہا۔ "جو جگہ ہے وہ کہنا تھا، آپ نے کہہ دیا
لیکن محبوب بیوی پر غصہ اتارے گا۔ یہ نہیں سمجھے گا کہ آپ
اسی کی حرکتوں سے بدنام ہو رہی ہیں۔ کوئی اپنے غلط رویے
کو نہیں سمجھتا۔ وہ بھی نہیں سمجھے گا۔"
چاہتی نے دست خوان لگا دیا۔ وہ سب کھانے کے لیے
بیٹھ گئے۔ ماروی نے کہا۔ "میں صبر کر رہی ہوں۔ مراد یہاں
آجائیں گے تو ساری بدنامیاں اور پریشائیاں ختم ہو جائیں
گی۔ ہم یہاں سے کہیں دور بہت دور چلے جائیں گے۔"
وہ چپ چاپ کھانے لگے۔ کھانے کے دوران سب
یہ اپنے اپنے طور پر سوچنے لگے۔ ماروی کا مسئلہ سب ہی کا
مسئلہ تھا۔ سب ہی پریشان ہو رہے تھے۔ بلا دل میں کہہ رہا
تھا۔ "بھائی...! آپ مراد کے ساتھ کتنی دور جائیں گی؟
اس کے ساتھ چھپ کر رہنا ممکن نہیں ہے۔ بدنامی اور دشمنی
پوچھا نہیں چھوڑیں گی۔"
ماروی نے طے جیسے رازدار سے بھی یہ نہیں بتایا کہ وہ
اپنا چہرہ تبدیل کرے گی تو پھر کوئی اس کے ذریعے مراد تک
نہیں پہنچ سکے گا۔ وہ بڑی رازداری سے محتاط رہ کر دوستوں
اور دشمنوں کی نظروں سے گم ہونے والے تھے۔ کیسے کیسے
خواب ہوتے ہیں جن کی تعبیر نہیں ملتی۔ کیسے کیسے ارادے
ہوتے ہیں جو تکمیل کے مرحلے تک پہنچ نہیں پاتے۔ پھر بھی
انسان خواب دیکھتا ہے اور ارادے باندھتا رہتا ہے اور یہ
بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ ناممکن کو ممکن بناتا رہتا ہے۔
ماروی نے کھانے کے بعد کہا۔ "مراد نے کہا تھا جلد ہی
مجھے کال کرے گا لیکن صبح سے شام اور شام سے رات ہو گئی
ہے۔ وہ خاموش کیوں ہے؟ کال کیوں نہیں کر رہا ہے؟"
اس نے فون اٹھا کر اس کے نمبر پر کال کی۔ پھر اسے

کان سے لگا یا۔ جلد ہی دوسری طرف سے کسی اجنبی کی آواز
سنائی دی۔ "ہیلو!"
ماروی نے پوچھا۔ "ہیلو، آپ کون ہیں؟"
"میں بھی یہی پوچھ رہا ہوں۔ آپ کون ہیں؟"
"میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں جس کا فون آپ
کے ہاتھ میں ہے۔"
"یعنی آپ مراد سے باتیں کرنا چاہتی ہیں۔ جسٹ
اسے منٹ..."
وہ ذرا چپ ہوا پھر بولا۔ "آپ ماروی ہیں؟ میں
ایمان ملی بول رہا ہوں۔ شاید مراد نے کبھی میرا ذکر کیا ہوگا۔"
"ہاں، میں نے آپ کا نام سنا ہے۔ مراد کہاں ہیں؟"
"میں کیا بولوں، آپ کو یہ سن کر صدمہ ہو گا کہ یہ
بولنے کے قابل نہیں ہے۔"
ماروی کا کیکبا دھک سے رہ گیا۔ اس نے تڑپ کر
پوچھا۔ "کیا ہوا ہے؟ وہ بولنے کے قابل کیوں نہیں ہے؟"
ماروی کی یہ بات سن کر بشری اور جئے چونک
گئے۔ پریشان ہو کر اس کے فون کو دیکھنے لگے۔ وہ بے چینی
سے پہلو بدلتی ہوئی بول رہی تھی۔ "اسے کیا ہو گیا ہے؟ وہ
بولنے کے قابل کیوں نہیں ہے؟ سننے کے تو قابل ہے؟ اپنا
فون اس کے کان سے لگاؤ۔ میں بولوں گی تو وہ سنے گا۔"
ایمان ملی نے کہا۔ "پلیز حوصلہ کریں۔ میری بات
سنیں۔ وہ بے ہوش تھا۔ تمہاری دیر پہلے ہوش میں آیا ہے۔
ذاکتر نے ٹریسٹ دی ہے، اسے جگنا مناسب نہیں ہے۔ ابھی یہ
گہری خیند میں ہے۔ اسے جگنا مناسب نہیں ہے۔"
وہ سن رہی تھی۔ پریشان ہو رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔
"اسے کیا ہوا ہے؟ وہ بے ہوش کیوں ہو گیا تھا؟"
وہ بولا۔ "ہماری زندگی میں پھول برستے ہیں۔ اس
کی زندگی میں گولیاں برستی رہتی ہیں۔ اس ہار مقابلہ دشمنوں
سے نہیں ہوا تھا۔ دوست بن کر رہنے والی مرینہ سے ہوا تھا۔
آپ کے لیے یہ اچھی خبر ہے کہ سوکن کا کاٹنا ہمیشہ کے لیے
نکل گیا۔ مراد نے اسے جہنم میں پہنچا دیا ہے۔ ابھی کے
ساتھ بری خبر یہ ہے کہ مرینہ نے اسے گولیوں سے چھلکی کر
دیا ہے۔"
اس سے بڑی خوشخبری کوئی ہو نہیں سکتی تھی کہ وہ
سہاگن کا گھر جلانے اور دل جلانے والی عورت مر گئی تھی اور
جس یار سے شکایت تھی اسی نے اس سے نجات دلا کر ثابت
کیا تھا کہ وہ بے وفا اور ہرجائی نہیں ہے۔ اس کی خاطر حسین
ترین عورتوں کو ٹھوکر مار سکتا ہے۔

حیرت انگیز

کیا آپ کو پتا ہے؟ ایک ایسا جملہ... جسے
آپ ہونٹوں کو حرکت دیے بغیر کہہ سکتے ہیں۔ وہ
ہے۔
لا ایلہ الا اللہ۔
آپ جانتے ہیں کیوں؟
کیونکہ سائنس کہتی ہے جب کوئی انسان مر
رہا ہوتا ہے تو وہ اپنے ہونٹوں کو ہلانے کی طاقت کھو
دیتا ہے لہذا اللہ پاک نے انسان کے لیے مرتے
وقت بھی یہ کلمہ کہنا آسان بنا دیا۔ سبحان اللہ۔
مرسلہ۔ محمد جاوید، تحصیل ملی پور

یہ بہت بڑی خوش خبری تھی اور ساتھ ہی یہ دل دہلا
دینے والی خبر تھی کہ مرینہ نے مرتے مرتے اس کے مراد کو
گولیوں سے چھلکی کر دیا تھا۔ اسے بھی زندگی اور موت کے
درمیان لڑکا کر گئی تھی۔
"یا اللہ...! وہ سن رہی تھی اور صدمے سے کانپ
رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "میرے بھائی...! وہ کس حال
میں ہے۔ زیادہ تشویش ناک حالت تو نہیں ہے؟"
"آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ خطرے سے باہر ہے۔
تشویش کی بات یہ ہے کہ یہ ہفتوں اور مہینوں تک چلنے
پھرنے کے قابل نہیں ہو سکے گا اور تب تک اسے دشمنوں
سے چھپا کر رکھنا ہے۔"
ماروی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بشری
اس کے پاس آ کر خاموشی سے اسے تھپک رہی تھی۔ اس نے
پوچھا۔ "آپ اسے دشمنوں سے کیسے چھپائیں گے؟ میرا دل
ڈوب رہا ہے۔"
"میں نے کہا تھا پریشان نہ ہوں۔ میں دشمنوں کو
اپنے پار کی ہوا بھی گلے نہیں دوں گا۔ یہاں سے دہلی سات
آٹھ گھنٹے کا سفر ہے میں نے ایک ایسویٹس کرائے پر
حاصل کی ہے۔ اسے آرام سے لے جاؤں گا۔ مراد کو موجودہ
بہرہ دپ میں دشمن نہیں پہنچائیں گے۔"
"بھائی! آپ رحمت کا فرشتہ ہیں۔ آپ دوستی کا فرض
ادا کر رہے ہیں۔ میں آپ کے اور مراد کے لیے دعا کریں
مانگتی رہوں گی۔ آپ وعدہ کریں۔ وہ جیسے ہی نیند سے بیدار
ہوں گے آپ ان سے میری بات کرا لیں گے۔"
"میں وعدہ کرتا ہوں۔ ایسویٹس آگئی ہے۔ میں
اسے لے کر جا رہا ہوں۔ یہ جیسے ہی بیدار ہوگا، میں آپ کو

کال کروں گا۔" رابطہ ختم ہو گیا۔ ماروی دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ بشری نے اس کے سر کو اپنے شانے پر رکھ کر کہا۔ "بھائی حوصلہ کریں۔ بھائی کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ وہ زندہ ہیں اور دشمنوں سے دور ہیں۔ کوئی رحمت کا فرشتہ ان کے ساتھ ہے۔ وہ کون ہے بھائی؟"

"وہ مراد کا ایک دوست ایمان علی ہے۔ اسے علاج کے لیے دہلی لے جا رہا ہے۔ کہتا ہے دشمن اسے پہچان نہیں سکیں گے۔"

بٹے نے کہا۔ "پھر تو آپ کو مطمئن ہونا چاہیے۔ کیا اس نے بتایا ہے کہ کن لوگوں نے اس پر گولیاں چلائی تھیں؟"

وہ بولی۔ "اس بار دشمنوں سے نہیں داشت بن کر رہنے والی مرینہ سے مقابلہ ہوا تھا۔ مراد نے اسے مار ڈالا ہے۔ اس کا قصہ ہی ختم کر دیا ہے۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ مراد کو آپ سے جھینٹنے والی نا ہو چکی ہے۔"

بٹے نے کہا۔ "آپ مراد کو اسی لیے چھوڑ کر آئی تھیں کہ وہ مرینہ سے نکاح پر مامورے والا ہے۔ دیکھ لیں بھائی! وہ آپ کا کیسا دیوانہ ہے۔ اس نے آپ کو حاصل کرنے کی خاطر اسے جہنم میں پہنچا دیا ہے۔ کیوں بشری! مانتی ہو کہ مرد و قادر ہوتے ہیں؟"

"کوئی نہیں ہوتے۔" وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "بھائی نے غصہ دکھا کر منہ پھیر کر من منی سے یہاں آ کر روپوش ہو کر اپنی قدر و قیمت بڑھا لی ہے۔ جب بھائی کو قتل آئی ہے۔"

ماروی نے کہا۔ "ہلیز! بحث نہ کرو۔ مراد میری قدر نہ کرتے، ذہیت بن کر مرینہ کو میری سوکن بنا دیتے تو میں غصہ دکھا کر روپوش ہو کر کیا حاصل کر لیتی؟ یہ میں بچپن سے دیکھتی آ رہی ہوں۔ وہ میرے دیوانے ہیں۔ ہر حال میں میرے ہی رہیں گے۔"

ماروی کے فون نے اسے پکارا۔ ننھی سی اسکرین پر انجانے نمبر تھے۔ اس نے پوچھا۔ "ہیلو! آپ کون ہیں؟"

ایمان علی کی آواز سنائی دی۔ "میں اپنے فون سے بول رہا ہوں۔ آپ یہ نمبر SAVE کر لیں۔ میں اس وقت ایک ایبویٹس میں مراد کو لے جا رہا ہوں۔ بہت لمبا سفر ہے۔ کسی وقت دہلی پہنچوں گا۔ آپ کسی طرح کی فکر نہ کریں۔"

"کیا وہ ابھی تک گہری نیند میں ہیں؟"

"ابھی کچھ دیر پہلے نیند میں کسمسا یا تھا۔ اس نے ایک ذرا آنکھیں کھول کر دیکھا تھا۔ پھر نیند میں ڈوب گیا۔"

بٹے نے کہا۔ "پھر تو آپ کو مطمئن ہونا چاہیے۔ کیا اس نے بتایا ہے کہ کن لوگوں نے اس پر گولیاں چلائی تھیں؟"

وہ بولی۔ "اس بار دشمنوں سے نہیں داشت بن کر رہنے والی مرینہ سے مقابلہ ہوا تھا۔ مراد نے اسے مار ڈالا ہے۔ اس کا قصہ ہی ختم کر دیا ہے۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ مراد کو آپ سے جھینٹنے والی نا ہو چکی ہے۔"

بٹے نے کہا۔ "آپ مراد کو اسی لیے چھوڑ کر آئی تھیں کہ وہ مرینہ سے نکاح پر مامورے والا ہے۔ دیکھ لیں بھائی! وہ آپ کا کیسا دیوانہ ہے۔ اس نے آپ کو حاصل کرنے کی خاطر اسے جہنم میں پہنچا دیا ہے۔ کیوں بشری! مانتی ہو کہ مرد و قادر ہوتے ہیں؟"

"کوئی نہیں ہوتے۔" وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "بھائی نے غصہ دکھا کر منہ پھیر کر من منی سے یہاں آ کر روپوش ہو کر اپنی قدر و قیمت بڑھا لی ہے۔ جب بھائی کو قتل آئی ہے۔"

ماروی نے کہا۔ "ہلیز! بحث نہ کرو۔ مراد میری قدر نہ کرتے، ذہیت بن کر مرینہ کو میری سوکن بنا دیتے تو میں غصہ دکھا کر روپوش ہو کر کیا حاصل کر لیتی؟ یہ میں بچپن سے دیکھتی آ رہی ہوں۔ وہ میرے دیوانے ہیں۔ ہر حال میں میرے ہی رہیں گے۔"

ماروی کے فون نے اسے پکارا۔ ننھی سی اسکرین پر انجانے نمبر تھے۔ اس نے پوچھا۔ "ہیلو! آپ کون ہیں؟"

ایمان علی کی آواز سنائی دی۔ "میں اپنے فون سے بول رہا ہوں۔ آپ یہ نمبر SAVE کر لیں۔ میں اس وقت ایک ایبویٹس میں مراد کو لے جا رہا ہوں۔ بہت لمبا سفر ہے۔ کسی وقت دہلی پہنچوں گا۔ آپ کسی طرح کی فکر نہ کریں۔"

"کیا وہ ابھی تک گہری نیند میں ہیں؟"

"ابھی کچھ دیر پہلے نیند میں کسمسا یا تھا۔ اس نے ایک ذرا آنکھیں کھول کر دیکھا تھا۔ پھر نیند میں ڈوب گیا۔"

بٹے نے کہا۔ "پھر تو آپ کو مطمئن ہونا چاہیے۔ کیا اس نے بتایا ہے کہ کن لوگوں نے اس پر گولیاں چلائی تھیں؟"

وہ بولی۔ "اس بار دشمنوں سے نہیں داشت بن کر رہنے والی مرینہ سے مقابلہ ہوا تھا۔ مراد نے اسے مار ڈالا ہے۔ اس کا قصہ ہی ختم کر دیا ہے۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ مراد کو آپ سے جھینٹنے والی نا ہو چکی ہے۔"

بٹے نے کہا۔ "آپ مراد کو اسی لیے چھوڑ کر آئی تھیں کہ وہ مرینہ سے نکاح پر مامورے والا ہے۔ دیکھ لیں بھائی! وہ آپ کا کیسا دیوانہ ہے۔ اس نے آپ کو حاصل کرنے کی خاطر اسے جہنم میں پہنچا دیا ہے۔ کیوں بشری! مانتی ہو کہ مرد و قادر ہوتے ہیں؟"

"کوئی نہیں ہوتے۔" وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "بھائی نے غصہ دکھا کر منہ پھیر کر من منی سے یہاں آ کر روپوش ہو کر اپنی قدر و قیمت بڑھا لی ہے۔ جب بھائی کو قتل آئی ہے۔"

ماروی نے کہا۔ "ہلیز! بحث نہ کرو۔ مراد میری قدر نہ کرتے، ذہیت بن کر مرینہ کو میری سوکن بنا دیتے تو میں غصہ دکھا کر روپوش ہو کر کیا حاصل کر لیتی؟ یہ میں بچپن سے دیکھتی آ رہی ہوں۔ وہ میرے دیوانے ہیں۔ ہر حال میں میرے ہی رہیں گے۔"

ماروی کے فون نے اسے پکارا۔ ننھی سی اسکرین پر انجانے نمبر تھے۔ اس نے پوچھا۔ "ہیلو! آپ کون ہیں؟"

ایمان علی کی آواز سنائی دی۔ "میں اپنے فون سے بول رہا ہوں۔ آپ یہ نمبر SAVE کر لیں۔ میں اس وقت ایک ایبویٹس میں مراد کو لے جا رہا ہوں۔ بہت لمبا سفر ہے۔ کسی وقت دہلی پہنچوں گا۔ آپ کسی طرح کی فکر نہ کریں۔"

"کیا وہ ابھی تک گہری نیند میں ہیں؟"

"ابھی کچھ دیر پہلے نیند میں کسمسا یا تھا۔ اس نے ایک ذرا آنکھیں کھول کر دیکھا تھا۔ پھر نیند میں ڈوب گیا۔"

والا تھا مگر کچھ اور ہو گیا۔ وہ ہلنٹوں اور مہینوں کے لیے اپنا حق ہو گیا تھا۔ یہ کہا نہیں جاسکتا تھا کہ وہ کب تک چلنے پھرنے کے قابل ہوگا۔

محبت کرنے والے ساری دنیا سے لڑ جاتے ہیں مگر... اپنی تقدیر سے لڑ نہیں پاتے۔

میرا ذرا رنگ روم میں جینھی معروف جچی سے ہاتھیں کر رہی تھی۔ اس وقت محبوب نے اپنے بیڈ روم میں ماروی سے فون پر بات کی تھی۔ اس کے بعد ہی وہ فیصے سے پاؤں پٹختا ہوا ذرا رنگ روم میں آیا۔ میرا کے سامنے آ کر سخت لہجے میں بولا۔ "اھو..."

وہ اس کے تجرہ کو کچھ کر سہم گئی۔ فوراً ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا تم نے ماروی سے یہ کہا ہے کہ ایک مرد سے آپ کا گزارہ نہیں ہو رہا ہے۔ اس لیے وہ دوسرے کو اپنے آپ کو سے باندھنے آئی ہے؟"

وہ پریشان ہو گئی کہ کیا جواب دے۔ اس کا چہرہ اور اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ مارنے مرنے کے لیے آیا ہے۔

وہ گرجتے ہوئے بولا۔ "چپ کیوں ہو؟ اگر کچ نہیں بولو گی، ہاتھیں بٹاؤ گی، جسمیں کھاؤ گی، جب بھی جھین نہیں کروں گا۔ ماروی نہ بھرا نہ بھری جاتی ہے۔ نہ محبت ہوتی ہے۔"

میرا نے گھست خوردہ لہجے میں کہا۔ "آپ ماروی پر ایمان لا چکے ہیں۔ اس کے آگے میں جھوٹی ہی جھلاؤں گی۔ اس لیے آپ جو سمجھتے ہیں وہی سچ ہے۔"

محبوب نے ایک زوردار چہرہ رسید کیا۔ اس کا منہ دوسری طرف گھوم گیا۔ وہ ٹوکھڑا کر مونسے پر گر پڑی۔ معروف جچی تیزی سے چلتا ہوا ان کے درمیان آ گیا۔ میرا کے آگے ڈھال بنے ہوئے فیصے سے بولا۔ "کیا تعصیب یافتہ اور مہذب شوہر اپنی بیوی پر اس طرح ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ خیم آن ہو۔ تم اس کے عشق میں پاگل تو ہو ہی گئے تھے، اب جالی گنوار اور جلاؤنگی بن رہے ہو۔"

وہ فیصے سے میرا کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ پیپے اس سے پوچھیں۔ اس نے یہ جو ماروی سے انتہائی شرمناک بات کی ہے، کیا یہ تعصیب یافتہ اور مہذب ہے؟"

وہ معروف کی طرف گھوم کر بولا۔ "میں جہالت کا جواب جہالت سے دے رہا ہوں۔ میں اس عورت کو برداشت نہیں کروں گا۔ اس نے ماروی کو دوسروں سے دل بہلانے والی بے حیا اور بدچلن عورت کہا ہے۔ میں اسے ابھی طلاق دیتا ہوں۔"

معروف نے اسے ایک طمانچہ مارتے ہوئے کہا۔ "خبردار طلاق کا لفظ زبان پر نہ لاتا۔ یہ میری بیٹی ہے۔" یہ ایک ننھی اور انہونی سی بات ہوئی۔ معروف جچی خواہ کتنا ہی بزرگ، قابلِ اعتماد اور وقار مشیر ہو، آخر حلازم تھا۔ اس نے آقا کو طمانچہ مارا تھا۔

ایسی جرأت ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ لیکن وہ مفرور اور بددماغ آقا نہیں تھا۔ معروف جچی کو باپ کی طرح مانتا تھا۔ اس نے کہا۔ "آپ میرے بزرگ ہیں۔ مجھے اور ماریں لیکن میں ایک سی بات جانتا ہوں۔ یہ ماروی کی دشمن ہے۔ میں اسے دوسری طلاق دیتا ہوں۔"

میرا نے دھڑکیں مار کر روتے ہوئے کہا۔ "نہیں میں مر جاؤں گی۔"

معروف نے اس کا گریبان پکڑ کر مضبوطی سے ہونے کہا۔ "تم اسے طلاق نہیں دے سکتے۔"

وہ اپنا گریبان چھڑاتے ہوئے بولا۔ "میں دوں گا۔ آپ بھی مجھے نہیں روک سکیں گے۔ ماروی کو گالی پڑی ہے وہ بھی آکر مجھے نہیں روک سکے گی۔"

معروف نے اسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ "خدا روک رہا ہے۔ اسے طلاق نہیں ہو سکے گی۔ یہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے۔"

محبوب کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے چونک کر میرا کو دیکھا۔ وہ مونسے پر اوندھی پڑی رو رہی تھی۔ وہ بھی چونک کر سر اٹھا کر معروف کو دیکھنے لگی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ "عالمہ عورت کو طلاق نہیں ہوتی۔ تم تین بار نہیں تین سو بار طلاقیں دیتے رہو وہ قابلِ قبول نہیں ہوں گی۔"

یہ چونکا دینے والی اور خوش کرنے والی بات تھی۔ وہ ایک بچے کا باپ بننے والا تھا لیکن ماروی کے آگے تمام خوشیاں بچھ گئیں۔ اس نے کہا۔ "میں دوں گا۔ آج نہ سہی، بچے کی ذلیبوری کے بعد دوں گا۔ اس نے ماروی کو گالی دی ہے۔ میں اسے طلاق کی گالی دوں گا۔ اسے ایک سسے کے لیے اپنے گھر میں برداشت نہیں کروں گا۔ اسے پس اندھ یہاں سے۔ اپنی اوقات میں آجا۔ جو سامان لے جاسکتی ہے یہاں سے لے جا۔"

معروف نے کہا۔ "تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔ یہ مت بھولو کہ یہ صرف تمہاری شریک حیات ہی نہیں ہے۔ تمہارے بزنس کی "مانٹر کی" ہے۔ یہ بزنس کی کمزوریوں کو ہی نہیں، تمہارے کاروباری چور کھاتوں اور کالے دھن کو بھی

جاتی ہے۔ یہ جانے کی تو دیکھتے ہی دیکھتے اربوں کا کاروبار
 دوڑی کا ہو جائے گا۔
 "سرواف صاحب! آپ مجھے نہ ادا کریں۔ میں
 مارولی کو پانے کے لیے اپنی تمام کشتیاں جلا چکا ہوں۔ بہت
 پہلے ہی کاروبار سے عاقل ہو چکا ہوں۔ مارولی نہیں تو یہ
 کاروبار بھی نہیں۔ یہ دیکھا نہیں۔ میں اپنا داروبار چھوڑ کر جوگ
 لے لوں گا۔ کہہ دیا مارولی نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں
 ہے۔ میں اس کے لیے جوگی بن کر پھر آؤں گا۔"
 وہ دروازے کی طرف جانے ہوئے ہوا۔ "اس
 محنت کے بچے اس عورت کے ساتھ نہیں رہوں گا۔ دو گھنٹے
 بعد وہاں آؤں تو یہ مجھے یہاں نظر نہ آئے۔"
 وہ دروازہ کھول کر باہر چل گیا۔ وہ دونوں بکھوڑے رنگ
 گھر سے رہے۔ پھر سرواف بھی اس کے پاس آکر بیٹھ
 گیا۔ وہ اس کے شانے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ سرواف نے
 کہا۔ "یہ ناہان ہو چکا ہے۔ مارولی نے اسے ابھی طرح
 پاگل بنا دیا ہے۔"
 وہ اسے اپنے شانے سے الگ کرتے ہوئے ہوا۔
 "لیکن تم نے بھی ابھی کینٹھ ہو کر جہالت کی انتہا کی ہے۔ تم
 نے مارولی کے لیے جو اٹھا رکھے تھے انہیں کیا وہ نہیں زیب
 دیتے تھے؟"
 وہ آنسو پھینکتے ہوئے بولی۔ "جب یہ ابھی طرح
 کچھ میں آ گیا کہ وہ مجھ کو زبردستی کرنے دو بارہ یہاں
 آئی ہے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ اگر میں نے گالی دی
 ہے تو یہ بھوت نہیں ہے۔ اسے ایک بار احساس نہیں ہے کہ
 وہ محبوب اور مراد کے درمیان گالی بن گئی ہے۔"
 وہ گہری سنجیدگی سے ہوا۔ "نہ مارولی کو احساس ہوگا
 نہ محبوب اور اسی سے باز آئے گا۔ وہ گاؤں... ابھی وہ
 بہت ہی تباہ کن اور جاہل نہ قدم اٹھا رہا تھا۔ اگر میں نہ کہتا کہ
 تم اس بننے والی ہو تو ابھی نہیں حلاق ہو چکی ہوتی۔"
 وہ بولی۔ "میں آپ کے منہ سے یہ سن کر حیران رہ گئی
 تھی۔ بلی گاؤں آپ بہت ہی ذہین اور حاضر دماغ ہیں۔ آپ
 نے اچانک بھوت ہوں کر مجھے ڈاؤن سے بچا رہے۔"
 "آئندہ نہیں بچ سکوں گا۔ آگے وہ چاروں میں بیدار
 جائے گا کہ جس میں اس کی جہالت سے بچنے کے لیے بھوت
 کہا تھا۔ مارولی کو سننے والی گالی اس کے دماغ میں گونجتی
 رہے گی۔ بھوت جتنے ہی وہ جس طلاق دے گا۔"
 وہ بے بسی سے رونے کے انداز میں بولی۔
 "سرواف صاحب! میں کیا کروں؟ میرا چارہ کیریز تباہ

ہو جائے گا۔ وہ ایک ایسی مرنی کیوں نہیں ہے؟"
 وہ کچھ ہی سرواف نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔
 "اس کی موت لازمی ہے۔ اور اس موت جتنے سے پہلے
 اسے مر جانا چاہیے۔"
 سیرانے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ اسے
 چھپکنے ہوئے ہوا۔ "مجھے ایک بڑا قدم اٹھانا ہوگا۔ میں اس
 کے دل کے روتے سے کاروباری مشیر ہوں۔ یہ میرے
 سچے جیسا ہے۔ میں اس کی بہتری چاہتا ہوں اور یہ دیکھ رہا
 ہوں کہ قہراری جیسی الگ پارٹنری اسے اور اس کے کاروبار
 کو سنبھال سکتی ہے۔"
 وہ اسے چھپکنے ہوئے ہوا۔ "جو اپنا ضروری سامان
 لے آؤ۔ ہم ایک نئے منصوبے کے مطابق کام کریں گے۔"
 وہ اس سے الگ کر بیڑہ روم کی طرف چلی گئی۔ وہ غار
 میں بچتے ہوئے سو پڑے گا۔ اپنے ذہن میں ایک منصوبے کو
 پکارتے گا۔ پھر اس نے فون پر مراد صاحب سے پوچھا۔ "کیا
 بہت سرواف ہو؟"
 اس نے کہا۔ "ابھی کرسل کی غائبی کی اطلاع ملی کر رہا
 ہوں۔ کوئی خاص مصروفیت نہیں ہے۔ آپ سچ کر رہیں۔"
 "تم سے ملتا چاہتا ہوں۔ ایک اہم معاملہ درپیش ہے۔"
 "آپ جہاں ہیں گئے تھے آ جاؤں گا۔"
 "آؤ مجھے بعد میں اس کے مکان میں آ جاؤ۔"
 "اوکے۔ آ رہا ہوں۔"
 رات گزر رہی تھی۔ ایک عازم سیر کا سامان باہر گاڑی
 میں باندھ رہا تھا۔ اب وہ الگ پارٹنری کے محلے کے گل
 بڑے پارٹنری کے محلے سے جنگ اپنے جا رہی تھی۔
 وہ وہ چلا
 محبوب نے ساحل سمندر پر آکر گاڑی روک
 دی۔ وہاں تمام رات عورتوں اور بچوں کا میلا
 رہتا تھا۔ اس بات کا شوق کے وہ پہلے ساحل اور سمندر اور رنگ
 دکھائی دیتے تھے۔ محبوب کا دماغ گرم تھا۔ مارولی کے
 بارے میں ایک شرمناک بات کہی گئی تھی کہ وہ اب تک سچ و
 تاب کھا رہا تھا۔ اس نے دماغ کو سکون پہنچانے اور اس
 بھری آواز سننے کے لیے اس کے سر پر ہاتھ کیے پھر ابد ہوتے
 ہی کہا۔ "میں بول رہا ہوں۔"
 مارولی نے کہا۔ "آپ کو کیا ہو گیا تھا؟ آپ نے
 باتیں کرتے کرتے اچانک ہی لائن کاٹ دی تھی۔ آپ کو
 میری چوری بات تو سننی چاہیے تھی۔"
 "اور سننے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ گالی نہیں

نہیں مجھے پڑی ہے۔ اس وقت بھی میرے اندر ایک قوی
 ہولی ہے۔"
 "آپ کے عشق کے پہلے دن سے پہلے مجھ پر
 اچھا چاری ہے۔ لیکن آج اس لیے عشق میں آگے کہ مراد
 اتارنے کے لیے ایک جی جی گھر میں ہے۔ جی جی میں آپ
 نے سیرانے کوئی زیادتی تو نہیں کی ہے؟"
 "میں نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔"
 "کیا؟" وہ بڑے اچھے سے بولی۔ "یہ آپ کیا تھا
 رہے ہیں؟ اسے وہاں لے کر آئیں۔"
 "میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا۔ میں تو ابھی
 اسے حلاق رہے رہا تھا۔"
 وہ بچ کر بولی۔ "کیا آپ پاگل ہو گئے ہیں؟"
 "ابھی نہیں دی ہے۔ یہ معلوم ہوا کہ عازم عورت کو
 حلاق نہیں دی جاتی۔"
 "یا خدا! آپ اپنے ہونے والے بچے کی ماں پر علم
 کرنے والے تھے؟"
 "وہ تو کروں گا۔ تم سے شرمناک باتیں سننے والی کو
 معاف نہیں کروں گا۔ نو ماہ بعد بیٹھ کے لیے اس کی جمنی
 کروں گا۔"
 وہ حیرانی سے منہ کھلے سن رہی تھی پھر غصے سے
 بولی۔ "آپ کچھ پاگل ہو گئے ہیں۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ
 اسے حلاق اسے کر مجھے خوش کریں گے؟"
 "اسے سزا دینی چاہیے۔"
 وہ غصے سے بولی۔ "میں ایک بیاتنا کی
 زندگی رہا لیکن ہونے والی کی۔ آپ ابھی قسم کھا کر مجھ
 سے وعدہ نہیں کریں۔ آپ میرا ایک صلی معاف کر دیں گے۔ کبھی
 حلاق کا بیٹا نہان پر نہیں لائیں گے۔"
 "تم نے ایک بار پہلے ہی قہراری تھی۔ مجھے سیرانے
 شادی کرنے پر مجبور کیا تھا۔ آج میں قسم نہیں کھاؤں گا۔ کوئی
 وعدہ نہیں کروں گا۔"
 "تو پھر میں نہیں۔ آج کے بعد فون پر بھی میری آواز
 نہیں سنیں گے۔ میں پھر نہیں جا کر تم ہو جاؤں گی۔"
 وہ بڑھ کر بولی۔ "تم مجھے کیوں مجبور کر رہی ہو۔ میں
 قہراری تو بن کر نے والی عورت کے ساتھ نہیں رہوں گا۔"
 "میری تو جین آپ کر رہے ہیں۔ دیا انے ہو کر
 میرے پیچھے آتے ہیں اور مجھے جہنم کرتے ہیں۔
 یا خدا... آپ کو اپنی صلی کچھ میں کیوں نہیں آتی؟ سرواف
 صاحب ایک بار کہہ رہے تھے کہ چوری بڑے کیونکی میں نہیں

بڑا ہوتا ہے کہ میں اور مردوں سے کھینچنے والی عورت ہوں۔
 آپ کتنے لوگوں کی زبانیں بند کریں گے؟ کیا مجھے دل و
 دماغ سے نکال کر بھول نہیں سکتے؟ آپ نے میرے لیے
 بڑی قربانیاں دی ہیں۔ کیا مجھے بدلتی سے بچانے کے لیے
 اور قربانی نہیں دے سکتے؟ صرف مجھے بھول جاتا ہے۔ میں
 آپ سے یہی ایک قربانی چاہتی ہوں۔"
 وہ بڑھ کر بولی۔ "پھر بڑے کرپ سے بولا۔ "تم
 اپنی قربانی چاہتی ہو تو میرے لیے بامعنی ہے۔ نہیں
 بھولنے کا مطلب ہے میں مر جاؤں۔ نہ رہوں گا نہ یاد
 کروں گا نہ جیسے آؤں گا نہ قہراری بدلتی ہوگی۔"
 "خیر! محبوب! اس نے کی بات نہ کریں۔ آپ زندہ
 رہیں گے۔ میں اپنی قسم اسے دیتی ہوں۔ یوں میں آپ زندہ
 رہیں گے۔"
 وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "تم نے ہر طرح
 سے الجھا دیا ہے۔ مجھے سو پڑے۔ ابھی اس منت بعد کال
 کروں گا۔"
 اس نے فون بند کر دیا۔ وہ بے معنی سے الٹا کر کے
 لگی۔ سو پڑے گی یہ کیا ہو رہا ہے؟
 مراد نے پھر سے اس کا پیار پانے کی خاطر اسے
 مرید بھی سوکن سے نہات دلائی ہے۔ محبوب اس کی تو جین
 نہ برداشت کرتے ہوئے سیرانے کو حلاق دیتا چاہتا ہے۔
 اس بیاتنا کو جیتنے کی طلاق کے نام پر مردہ بنانے والا
 تھا۔ دونوں ہی اس کے دل سے گزر رہے تھے۔ دونوں ہی اس کے
 عشق میں جنوں کی حد سے گزر رہے تھے۔
 تہذیب کی آنکھ سے دیکھا جائے تو محبوب کی طلب
 جائز نہیں تھی۔ اب اسے بیاتنا مارولی کی صلب سے باز آ جانا
 چاہیے تھا۔ لیکن دماغ اسے خود کو بھول جاتے ہیں تو تہذیب کو کیا
 یاد دہیں گے؟
 اسے کوئی کچھ نہیں سکتا تھا۔ وہ پیار کے پہلے دن سے
 مارولی کے لیے اپنا سب کچھ دیتا چلا آ رہا تھا۔ ہر طرح کی
 قربانیاں دیتا آ رہا تھا اب آخری قربانی دینے والا تھا۔
 اس نے اس منت کے بعد فون پر کہا۔ "تم چاہتی ہو
 میں جسیں بھول جاؤں اور زندہ بھی رہوں۔"
 "خدا کے لیے ایک بار سننے والی زندگی کی قدر کرو۔"
 "میں آخری بار قہراری یہ بات مان لیتا ہوں لیکن
 میں اس طرح بھول سکتا ہوں کہ تم بھی مجھے بھول جاؤ۔
 میرے بارے میں نہ سوچو کہ میں کہاں ہوں اور کس حال
 میں ہوں۔"



تحفہ

بابر نعیم

دل ہار کے کسی کو پانے کی خواہش کرنا اور... خواہشوں کے جنون میں کسی کے آنکھ اپنی ذات کو ہارنے میں زمین آسمان جیسا فرق ہوتا ہے... بس یہی فرق اس نادان نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی اور... یہی یہ پروائی اس کے عشق، حسن حتیٰ کہ زندگی کی بھی دشمن بن گئی۔

مٹی میں دنیا کو قید کرنے کے جنون میں جتنا ایک ہوں زود حیات کا ماجرا

ہیرس پوکر کوئی شریف آدمی نہیں تھا اور یہ میں بہت پہلے سے جانتی تھی۔ دراصل ہم دونوں اتنی تیزی سے قریب آئے تھے کہ مجھے کچھ سوچنے اور سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ میں اس کی شخصیت نہیں بلکہ دولت سے مرعوب ہو گئی تھی۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں مجھ سے بے تکلف ہو گیا تھا۔ میں نے بھی اس کی دست درازی کا برا نہیں منایا جس سے اس کا حوصلہ بڑھا اور پھر ہم ہفتے میں ایک یا دو بار اس کے اپارٹمنٹ میں ملنے لگے، گوکہ اس کی شخصیت میں اتنی کشش نہیں تھی لیکن اس کے

”ہم ایسا اندھیر نہیں ہونے دیں گے۔“
”تم کیا کر لو گے حاد؟ میں اس کا بزرگ مشیر ہوں۔ وہ ایک بے نیکی کی طرح میری عزت کرتا ہے۔ مجھے اپنا باپ ماننا ہے لیکن ماروی کے معاملے میں میری کوئی بات نہیں سنا۔“
”میرا نے کہا۔“ ”محبوب کو اپنے کاروبار کی پروا نہیں ہے۔ یہ نہیں سوچتے کہ جتنی دیانت داری سے میں کاروبار سنبھال رہی ہوں کوئی اس طرح نہیں سنبھالے گا۔“
”معروف نے کہا۔“ ”میں بڑھاپے میں کب تک اتنے بڑے بزنس سیٹ اپ کو قائم رکھ سکوں گا۔ اسے اس بات کی پروا نہیں ہے کہ کاروبار دینہ جائے گا اور وہ نکال ہو جائے گا۔“
”مجھے تو فکر ہے۔ میں ان کی شریک حیات ہوں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، کیا کروں؟ دو چار مہینوں میں یہ جھوٹ کھل جائے گا کہ میں حاملہ نہیں ہوں۔ پھر تو وہ اور زیادہ طیش میں آ کر مجھے ٹھکرادیں گے۔“

”معروف نے کہا۔“ ”حادث! تم محبوب کے وفادار ہو۔ میرے ذہن میں ایک ہی راستہ ہے جہاں سے محبوب واپس آ سکتا ہے اور ہمارا ہی ہو کر رہ سکتا ہے۔“
”حادث نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ معروف نے پوچھا۔“ ”کیا اس کی بہتری کے لیے وہ کرو گے جو میں کہوں گا؟“
”میں ان کی بہتری کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“
”معروف نے کہا۔“ ”ماروی کے وجود کے بارے میں سوچو۔ وہ بیاہ کر مراد کے ساتھ ملک سے باہر چلی گئی تھی۔ اس کا وجود یہاں نہیں رہا تھا، تب محبوب رفتہ رفتہ مارل ہو گیا تھا اور کاروبار میں پوری طرح دلچسپی لے رہا تھا۔“
”حادث نے تائید میں سر ہلایا۔ معروف نے کہا۔“ ”اب وہ آئی ہے تو پھر اپنا مارل ہو گیا ہے۔ پہلے سے زیادہ پاگل ہو رہا ہے۔ ماروی کا وجود پھر نہیں رہے گا تو وہ پھر مارل ہو جائے گا اور میں چاہتا ہوں ماروی نہ رہے۔“

اس نے حاد کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ حاد اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”نہ رہے گا ہانس نہ بیچے گی ہانسری۔ اس مصیبت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دو۔“
”میرا نے چونک کر معروف جی کو دیکھا۔ حاد نے ایک گہری سانس لے کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔“ ”سمجھ لیں، مصیبت ختم ہو چکی ہے۔“

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز کردار ابام کسی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ سلا حلقہ فرمائیں

”یہ تو ضرور معلوم کروں گی کہ مجھے بھول کر زندہ سلامت رہتے ہو یا نہیں؟“
”اس شہر میں نہیں رہوں گا تو کیسے معلوم کر دوں گی؟ کسی سے میرے بارے میں پوچھوں تو پھر بدنام ہونے لگوں گی کہ دوسرے مرد کے پیچھے پڑ گئی ہو۔“
”آپ اس شہر میں کیوں نہیں رہیں گے؟“
”جہیں یہ پوچھنے کا حق نہیں ہے۔ میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں کہ اپنی طبیعتی عمر تک زندہ رہوں گا۔ اس کے بعد اپنی کوئی بات منواؤں گی تو نہیں مانوں گا۔“

”میں جانتی ہوں۔ آپ زبان کے سچے ہیں۔ مجھ سے وعدہ کیا ہے تو سلامتی سے زندہ رہیں گے۔ میں اور کوئی بات نہیں منواؤں گی۔“
”یہ لو۔ میں تمہیں بھولنے کی ابتدا کر رہا ہوں۔“
یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ گویا اسے اپنی زندگی سے نکال دیا۔ دوسرے لفظوں میں اس کی زندگی سے نکل گیا۔

یہ تو ماننے والی بات نہیں تھی۔ وہ اس کی زندگی سے تو شاید نکل سکتا تھا لیکن اسے اپنی زندگی سے نہیں نکال سکتا تھا۔ چونکہ اپنے تن سے ’من‘ سے الگ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے کہیں گوشہ نشین ہونے جا رہا تھا۔ شہر چھوڑنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ شاید مجنوں کی طرح کہیں صحرائیں بھٹکنے والا تھا۔ وہ وہاں سے کارڈرائیو کرتا ہوا اپنی کوشی میں آیا۔ وہ کوشی سمیرا کے وجود سے خالی ہو چکی تھی۔

سمیرا کے گھر کے ڈرائنگ روم میں معروف جی اوز حاد صدف جی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ معروف اسے محبوب ماروی اور سمیرا کی موجودہ روداد سنا رہا تھا۔ سمیرا انہیں کھانے پلانے میں مصروف ہو گئی تھی۔ اس وقت گرما گرم کافی پاری تھی۔

حاد صدف جی نے تمام روداد سننے کے بعد کہا۔ ”محبوب صاحب تمام دنیاوی معاملات میں بے حد ذہین ہیں لیکن ماروی کے معاملے میں وہ ذہانت سے بالکل ہی محروم ہو جاتے ہیں۔“
اس نے سمیرا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بڑے افسوس کی بات ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اپنی ذہین اور باصلاحیت شریک حیات کو طلاق دینا چاہتے ہیں۔“
”معروف نے کہا۔“ ”میں نے ایک جھوٹ بول کر تین چار ماہ کے لیے طلاق کے معاملے کو کھٹائی میں ڈال دیا ہے لیکن اس کے بعد وہ وہی کرے گا جو اس کے دماغ میں سما گیا ہے۔“

اپارٹمنٹ کی خوب صورتی اور آرائش نے مجھے مبہوت کر دیا تھا۔ اونچی اونچی مٹھن چھتیں، وسیع و عریض بالکونی اور نیو یارک کا دلکش نظارہ یہ سب کچھ میرے لیے سحر زدہ تھا۔

پہلی ملاقات کے تین ماہ بعد بھی بیرس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ پھر اس نے اپنا مطلب نکل جانے کے بعد مجھے ایک جانب دھکیل دیا۔ میں اپنے جسم کو چادر سے لپیٹ کر بستر کے کنارے پر چلی گئی اور وہ اطمینان سے بیٹھ کر سگریٹ سلگانے لگا۔ سگریٹ کے دھوئیں کی بو سے لگتا تھا کہ وہ کوئین سے بھرا ہوا ہے۔

"بہتر ہوگا کہ تم مارلین کے کمر آنے سے پہلے چلی جاؤ۔" مارلین اس کی بیوی کا نام تھا جو وال اسٹریٹ کے کسی دفتر میں کام کرتی تھی۔ میں نے اس کی دھمکی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو تمہارے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کے ارادے سے آئی تھی۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ اس طرح کے مواقع مشکل سے ہی ملتے ہیں۔"

اس نے مجھے غصے سے گھورا اور اپنے سونے سونے بازوؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "کیا ابھی تمہارا دل نہیں بھرا؟"

"تم چاہتو میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہ سکتی ہوں۔" "یہ تو بہت اچھی بات ہوگی۔" اس نے جواب میں کہا لیکن مجھے اس کی آواز میں کھوکھلا پن محسوس ہوا۔ وہ مجھ سے ہمیشہ مارلین کی برائیاں کرتا رہتا تھا۔ وہ بہت بد مزاج اور چمچھوری ہے۔ اسے نشہ کرنے کی عادت ہے۔ وہ ہر وقت بیرس کو سوتا ہونے کا طعنہ دیتی رہتی ہے اور اس کا بالکل خیال نہیں رکھتی وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب باتیں سن کر میں سوچتی کہ اگر وہ اتنی ہی بری ہے تو بیرس اسے گھر سے کیوں نہیں نکال دیتا۔ ان کا تو کوئی بچہ بھی نہیں تھا جس کی وجہ سے بیرس کو یہ قدم اٹھانے میں دشواری ہوتی۔ مارلین اتنی بے وقوف نہیں تھی کہ بیرس جیسے دولت مند شخص کو چھوڑ کر چلی جاتی۔ اس کا تعلق بھی ایک دولت مند گھرانے سے تھا اور یقیناً اس کے پاس آمدنی کے اور ذرائع بھی ہوں گے۔ اس کے باوجود بیرس کی جان کو چٹنی ہوئی تھی۔ بہر حال میں سرکھپانا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے تو صرف اپنے منصوبے پر عمل کرنا تھا۔

"ڈرائنگ روم مجھے بتاؤ کہ کیا چاہتے ہو؟" میں ایک ادا سے بولی۔ "اس وقت تمہیں کس چیز کی خواہش ہے؟" اس نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور بولا۔ "تم جانتی ہو کہ مجھے اس وقت کس چیز کی طلب محسوس ہو رہی ہے۔" میرا خیال تھا کہ ابھی اس کی گل بانی ہے اور وہ مجھ سے

کوئی خاص فرمائش کرنے والا ہے، لہذا اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔ "جانتی ہوں کہ تم کیا چاہ رہے ہو۔" مجھے اس وقت فرہنگی کے یہاں کا بنا ہوا برگر چاہیے۔ "وہ بستر پر سگریٹ کی راکھ بھارتے ہوئے بولا۔ میں بستر کی قیمتی چادر کا حشر دیکھ کر گھبرا گئی جس پر سگریٹ کی گرم راکھ پڑنے سے جگہ جگہ سوراخ ہو گئے تھے لیکن بیرس کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی، وہ ان کی جگہ لینن کی چادریں بچھالیتا جن کی قیمت میرے ذرا ناگفتہ بہ ایک ماہ کے کرایے سے بھی زیادہ تھی۔

"فرہنگی کا برگر۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔ جانتی تھی کہ وہ عام برگر کے مقابلے میں بہت مہنگا ہوتا ہے اور پیسے والے لوگ بھی خاص خاص مواقع پر ہی اس سے شوق فرماتے ہیں۔

"ہاں۔" بیرس کے جزیروں کی سختی اب مسکراہٹ میں تبدیل ہو گئی اور اس کی آنکھوں میں ایک نئی نئی شے کی سی طلب نظر آنے لگی تھی۔ "تم اپنے لیے بھی منگوالو۔"

"نہیں مجھے اس کی خواہش نہیں ہے۔" میں نے اپنے خوب صورت اور چمچر سے بدن پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے پھر میں دونوں ہی کھا لوں گا۔" اس کے چہرے پر برہنگی کے آثار نمودار ہونے لگے اور وہ کھٹکا ہوٹ دباتے ہوئے بولا۔ "کیا تم بھی مارلین کی طرح مجھے منا پے کا طعنہ دو گی۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ سوری ہے اور کھانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔"

اس نے اپنا سگریٹ سائڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے گلاس میں بچھایا اور گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ "میں نہانے جا رہا ہوں تم سے پھر ملاقات ہوگی۔"

"خدا حافظ۔" میں نے مردہ سی آواز میں کہا۔ جیسے مجھے اس سے بچھڑنے کا غم محسوس ہو رہا تھا۔ جبکہ مجھے خود بھی غسل کی خواہش ہو رہی تھی لیکن جیسے ہی ہاتھ روم سے پانی کرنے کی آواز آئی تو میرا ارادہ بدل گیا۔ میں بستر سے اتر کر اپنا حلیہ درست کیا اور جوتے پہن کر مارلین کے ڈریسنگ روم میں داخل ہو گئی۔ اس کمرے کی خوب صورتی اور سجاوٹ دیکھنے سے تعلق رہتی تھی۔ دیواروں پر قد آدم آئینے لگے ہوئے تھے اور فرش پر قیمتی پھول دار قالین بچھایا گیا تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ بہت بڑا شیلف نصب تھا جس میں دنیا بھر کے قیمتی برانڈز کے جوتے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے ایک جوتا اٹھا کر دیکھا لیکن وہ گیارہ نمبر کا تھا یعنی میرے ناپ سے تین نمبر زیادہ۔ میں نے مایوس ہو کر اسے اپنی جگہ پر رکھ دیا پھر میں نے اسٹارف اتارا اور اسے ڈریسنگ ٹیبل کے کنارے پر

اس طرح چھوڑا کہ مارلین اسے کسی بھی طرح نظر انداز نہ کر سکے۔ اب میری نگاہوں کا مرکز اس کی ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ مارلین کو چیزیں ترتیب سے رکھنے کی عادت تھی۔ اس لیے تمام سامان قرینے سے رکھا ہوا تھا۔ وہ بہت ہوشیار اور عقل مند تھی اور اسی لیے اپنے تمام زیورات الماری میں بند کر کے جاتی تھی لیکن اس کے باوجود سنگھار میز پر جو سامان رکھا ہوا تھا وہ میرے لیے کسی قیمتی خزانے سے کم نہ تھا۔ میں نے ایک کریم کی کیمیشی اٹھائی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کی قیمت پانچ سو ڈالر تھی۔ میں نے جلدی سے وہ شیشی اپنے بیگ میں ڈال لی۔ مجھے پر فیوم کا زیادہ شوق نہیں تھا لیکن میں اس کرسٹل کی بوتل کو کیسے نظر انداز کر سکتی تھی جس کی قیمت سترہ سو ڈالر تھی۔ ان چیزوں کے غائب ہوجانے پر مارلین ضرور پریشان ہوگی اور سمجھ جائے گی کہ اس کی غیر موجودگی میں کوئی عورت اس کے اپارٹمنٹ میں آتی رہی ہے اور میرا مقصد بھی یہی تھا۔

اچانک ہی میری نظر کفر کاغذ کے ایک ٹکڑے پر پڑی جو ایک بوتل کے نیچے دبا ہوا تھا۔ میں نے اس پر ایک اپچی ہوئی نظر ڈالی۔ لکھا تھا۔ "بد چلن عورت، تم میرے شوہر کے لیے بہت مناسب ہو۔"

میرا خون غصے سے کھول اٹھا۔ گویا وہ میرے اور بیرس کے تعلق کے بارے میں جانتی تھی لیکن اس نے میرے منہ پر کبھی بے بات نہیں کی مالا کھوہ میری موجودگی میں دوسرے دفتر آچکی تھی لیکن وہ میرے سامنے سے گزرا کر بیرس کے کمرے میں چلی گئی اور اس نے مجھے ہیلو تک کہنا بھی گوارا نہیں کیا۔ اس لمحے میرے دل میں شدت سے یہ خواہش ابھری کہ میں فوراً ہی اس اپارٹمنٹ سے چلی جاؤں۔ وہ کسی وقت بھی واپس آسکتی تھی اور مجھ میں اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ میں ڈریسنگ روم سے باہر آئی اور اس کا دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔ ہاتھ روم سے ابھی تک پانی کے گرنے کی آواز آرہی تھی۔ لگتا تھا جیسے بیرس کی ہمتوں سے نہیں نہایا تھا۔ گوکہ وہاں مجھے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا لیکن میں خود اپنے آپ کو چور محسوس کر رہی تھی پھر جب میں اس کے ہیونگ روم میں داخل ہوئی تو وہاں کی سجاوٹ اور نفاس دیکھ کر یہ احساس ماند پڑ گیا۔ اس میں فراموشی نوادرات کے ساتھ ساتھ نادر ایشیائی۔ اشیاء بھی رکھی ہوئی تھیں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ اس گھر کی مالکن بن جانے کے بعد کیا تبدیلیاں لاؤں گی تاہم اپنے ذوق اور مزاج کے مطابق کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا تاکہ اس گھر پر میری چھاپ آ سکے۔

میں نے پلن کے فون سے فرہنگی کو برگر لانے کے لیے

کہا۔ ایک سو پچاس ڈالر کا برگر خریدنا بیرس کے لیے معمولی بات تھی۔ اس کے لیے بیسوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور وہ ایک نو عمر لڑکے کی طرح برگر کھانے کا شوقین تھا۔ فون پر آرڈر دینے کے بعد میں نے الماری سے ایک گلاس نکالا اور اسے اپنے ہونٹوں سے اس طرح لگا دیا کہ اس پر میری لپ اسٹیک کا نشان آجائے پھر میں نے وہ گلاس کاؤنٹر پر رکھ دیا تاکہ اس پر نظر پڑے ہی مارلین کو یقین آجائے کہ میں نے رات ہی کے فٹ میں گزار دی تھی۔ اگر وہ اپنا بھروسہ برقرار رکھنا چاہتی ہے تو اسے یہ گھر چھوڑنا ہی ہوگا۔

دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میں نے پھر شوق نگاہوں سے پلو تک روم کی طرف دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے پہلے سے ہی یہاں رہ رہی ہوں۔ یہ احساس میرے لیے خوش گوار ہونے کے ساتھ ساتھ اذیت ناک بھی تھا۔ میں یہاں رہنے کے لیے ہر قیمت دینے کو تیار تھی چاہے وہ بیرس کا ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔

☆☆☆

فٹھ ایونو سے باہر آنے.... اور سینٹرل پارک کے ساتھ ساتھ چلنے کے دوران بھی میں اسی تصور میں کھولی رہی۔ میں اپنے آپ کو صبح کے وقت سینٹرل پارک میں جا ٹنگ کر رہے ہوئے دیکھ رہی تھی پھر میں نے اپنے آپ کو جم میں ہوگا کی مشق کرتے ہوئے دیکھا۔ میں قرب و جوار کے ہوٹلوں میں گج کرنے کا خواب دیکھ رہی تھی پھر میں نے خیالوں ہی خیالوں میں اپنے آپ کو آرٹ میوزم کی میٹنگ میں شرکت کرتے دیکھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ دوسری معزز خواتین کی طرح صرف کرسی پر بیٹھ کر سر نہیں ہلاؤں گی بلکہ میوزیم کے لیے عملی کام بھی کروں گی۔

آرٹ سے مجھے ویسے بھی بہت دلچسپی تھی۔ جب شروع شروع میں نیو یارک آئی تو مجھے کئی آرٹ گیلریوں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ میرا خیال تھا کہ ان گیلریوں میں آرٹ کے دلدادہ امیر کبیر نوجوان آتے ہیں۔ جین ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی میری زندگی کا ساتھی بن جائے لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ وہاں آنے والے بھی میری طرح خستہ حال تھے۔ وہ گیلری کا چکر لگاتے، تصویروں پر حسرت بھری نگاہ ڈالتے اور خستہ آہیں بھرتے ہوئے واپس چلے جاتے۔ ایک دو نے مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی لیکن ان کی مالی پوزیشن مجھ سے بھی بدتر تھی۔ چھ سال تک جدوجہد کرنے کے بعد میں نے دفتر میں ملازمت کر لی۔ وہاں میرا واسطہ بھانت بھانت کے لوگوں سے پڑا لیکن ان میں سے کوئی بھی میرے

معیار پر پورا نہ اترتا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور اب میں تیس سال کی ہو چکی تھی۔ ایک دولت مند اور اسارت شخص کے لئے کی امید ختم ہوتی جا رہی تھی چنانچہ مجھے بھی اپنی خواہشات کی فہرست میں ترتیم کرنا پڑی اور اب مجھے دولت کے علاوہ کسی شے کی آرزو نہیں تھی۔

بہرسے راہ و رسم بڑھانے کا مطلب بھی یہی تھا کہ میرا معیار کس حد تک پست ہو چکا ہے۔ مجھے نہیں تھا کہ کوئی بھی لڑکی اسے پسند نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا قد درمیانہ تھا لیکن اس نسبت سے اس کا وزن کہیں زیادہ تھا۔ صرف اسی سال کی عمر میں اس کے سر کے کافی بال جڑ گئے تھے۔ اس کی ہتھیلیاں پیسے سے تر رہتی تھیں اور جسم سے بدبو آتی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے دانتوں سے ناخن کترنے کی عادت تھی لیکن وہ پیسے کمانے کا ہنر جانتا تھا اور یہی وہ خوبی تھی جس کی وجہ سے میں اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

☆ ☆ ☆

کام کے دوران وہ مجھے نظر انداز کر دیتا جبکہ میں زیادہ سے زیادہ اس کے قریب رہتا جا رہی تھی۔ مجھے اس کے دفتر میں استقبالی کلرک کی ملازمت مل گئی تھی۔ مجھ سے پہلے اس جبکہ پر کام کرنے والی لڑکی ایک دولت مند تاجر سے شادی کر کے چلی گئی تھی چنانچہ میں نے بھی اس کے نقش قدم پر چلنے کا فیصلہ کر لیا لیکن مجھے بہرس کے فیسے سے ڈر لگتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے امید تھی کہ وہ میری جانب ضرور متوجہ ہوگا لیکن وہ دن گزر جانے کے باوجود بھی اس نے مجھے لفت نہیں کروائی تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں دفتر کا وقت ختم ہونے کے بعد اس کے کمرے میں چلی گئی۔

"میں تمہیں بہت یاد کر رہی ہوں ڈارلنگ۔" میں نے کسی شوق محبو کی طرح اٹھلاتے ہوئے کہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری اس ادھر پر پاگل ہو جائے گا لیکن وہ انتہائی رکھائی سے بولا۔ "اس وقت میں مصروف ہوں۔" اس کی نگاہیں کمپیوٹر اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی میز پر تین کمپیوٹر کھے ہوئے تھے جن کی مدد سے وہ دنیا بھر کی مارکیٹوں میں ہونے والے اتار چڑھاؤ پر نظر رکھ سکتا تھا۔ پورا کمر اسکرین کے دھوکے سے بھرا ہوا تھا حالانکہ دفتر میں سگریٹ پینے پر پابندی تھی لیکن مالکان اپنے جیسے نیجروں کا راض نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ انہیں ہماری منافع کھا کر دیتے تھے۔

"کیا تم آج کی شام میرے ساتھ گزارنا پسند کرو گے؟" میں نے بے شرم بن کر کہا۔

"نہیں۔"

اگر میں اس کی باتوں کی پروا کرتی تو یقیناً میرے جذبات مجروح ہو جاتے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ "میں چاہتا ہے کہ تمہیں اس کمزری سے دعا دے دوں؟" لیکن اپنے فیسے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"کوئی بات نہیں اگر تم مصروف ہو تو میں کل آ جاؤں گی۔" "نہیں۔" ایک بار پھر اس نے انکار کر دیا۔

میرے لیے یہ امر بڑا تکلیف دہ تھا کہ اس نے ایک مرتبہ بھی آنکھ اٹھا کر میری جانب نہیں دیکھا۔ ایک عورت کی اس سے زیادہ تو جین کیا ہو سکتی ہے لیکن میں بھی انکار کی وجہ جانے بغیر اپنی آسانی سے اس کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ میں نے اس کے قریب ہونے ہوئے کہا۔

"کیا تمہاری بیوی گھر پر ہے؟"

"ہاں۔" اس نے بے زاری سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا تم قریب اس کا کہیں باہر جانے کا ارادہ ہے؟"

"ہاں وہ اگلے ہفتے مجھے چھوڑ کر پولو کا بیچ دیتے ہیں۔"

بارہاؤں جا رہی ہے۔

میں نے اس کے لہجے میں جیسے کرب کو واضح طور پر محسوس کیا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کی عدم موجودگی کی وجہ سے افسردہ ہے۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"حیرت ہے، وہ تمہیں اس طرح چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہے۔" میں موقع ملنے ہی اس کی ران پر بیٹھ گئی اور اس کے گلے میں ہاتھیں ڈالتے ہوئے بولی۔ "اے تو شکر ادا کرتا چاہیے کہ قدرت نے اسے تم سے بے پناہ شوق کر دیا۔"

وہ میری قربت سے پھلک گیا اور اس کی ساری مصروفیت دھری کی دھری رو گئی۔ جب ہم ایک چھوٹے سے ڈرائے کے بعد فارغ ہوئے تو اس کا سارا جسم پیسے میں بھیگ چکا تھا۔ البتہ میری حالت نسبتاً بہتر تھی۔

میں نے دیوار پر لٹے ہوئے آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور میک اپ درست کرنے لگی۔ میری خواہش تھی کہ دفتر کا کوئی فرد ہم دونوں کو اس حالت میں دیکھ لے اور موقع کا گواہ بن کر بعد میں میرے کام آ سکے۔

"تمہارے ساتھ کچھ وقت گزار کر مجھے لطف آیا۔" وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ "جب میری بیوی شہر سے باہر جانے کی تو تمہیں بتا دوں گا۔ اس طرح ہمیں کچھ وقت مزید ساتھ گزارنے کے لیے مل جائے گا۔"

میں کہنا چاہ رہی تھی کہ تم جیسے آدمی کے ساتھ ایک ٹپ گزارنا بھی میرے لیے انتہائی تکلیف دہ ہے لیکن اپنی غرض

کے ہاتھوں مجبور تھی۔ اس لیے منافقات مسکراہٹ چہرے پر جاتے ہوئے بولی۔ "ڈارلنگ! میں اتنا اظہار نہیں کر سکتی۔" اگر اس کی جگہ کوئی ذہین شخص ہوتا تو میرے لہجے میں چھپے ہوئے طنز کو سمجھ لیتا لیکن وہ اپنی ذات میں مگن اور خود پسند بندہ تھا۔ اس لیے اس نے میرے لہجے پر غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ جب میں واپس جانے کے لیے اٹھی تو اس نے آواز دے کر کہا۔ "میرے لیے بیڑا منگوا دو اور اگر تمہیں خواہش ہو تو اپنے لیے بھی۔"

☆ ☆ ☆

اگلی مرتبہ جب میں بہرس کے ایارمنٹ میں گئی تو پوری طرح ہتھیاروں سے لیس گئی تاکہ وہ مکمل طور پر میری زلف کا اسیر ہو جائے اور مارلین کو کسی بوسیدہ رودی کے کاغذ کے مانند اپنی زندگی سے نکال دے۔ میں نے انتہائی نفاست سے میک اپ کیا اور اپنے جسم کو ایک مخصوص خوشبو سے مہکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک رومانوی شاعری کی کتاب بھی خریدی جسے میں اپنے منصوبے کے مطابق بہرس کے بستر پر ساڑھ خیل پر چھوڑ آئی۔ مارلین اچھی طرح جانتی تھی کہ بہرس کو ایسی کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس طرح میں اسے یہ پیغام دینا چاہتی تھی کہ وہ یہ جنگ ہار رہی ہے۔ اس کے علاوہ میرا ارادہ تھا کہ وہ اس کے آنے سے پہلے اس کی ڈریسنگ خیل پر ایک تحریر چھوڑ آؤں گی۔ جس پر لکھا ہوگا۔ "تمہاری تمہارا مقدر بن چکی ہے۔"

جب میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے اس کی سنگھار میز پر گئی تو وہاں پہلے سے ہی کریم کی شیشی کے نیچے ایک چھوٹا سا کاغذ رکھا ہوا تھا۔ "میرے شوہر کا پیچھا چھوڑ دو۔ یہاں سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔"

مجھے بڑے زور کی ہنسی آگئی اور میں سوچنے لگی کہ کیا یہ عورت پاگل ہو گئی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اس طرح کی تحریروں سے میں خوف زدہ ہو جاؤں گی۔ اس کے انداز سے گھبراہٹ عیاں تھی اور وہ جان گئی تھی کہ میں اس کے گھر میں نقب لگا چکی ہوں۔ اب اس کے پاس اپنے دفاع کا واحد راستہ یہی تھا کہ اس طرح کے دھمکی آمیز بیانات سے مجھے ڈرانے کی کوشش کرے۔ اس کے لیے میری اس گھر میں آمد خطرے کی علامت تھی۔ وہ میرا نام نہیں جانتی تھی اور نہ ہی اسے میرے بارے میں کوئی اور معلومات تھیں لیکن وہ اتنا ضرور سمجھ گئی تھی کہ اس خیل میں میرا لہجہ بھاری ہے۔

ابھی تک یہ واضح نہیں تھا کہ میں اس جیت کا انعام کس طرح وصول کروں گی۔ یہ سچ ہے کہ میں نے مارلین کی غیر موجودگی میں اس کے قیمتی لباس پہن کر دیکھے لیکن میں اپنے

لیے اس طرح کے کپڑے خود خریدنا چاہتی تھی۔ میں نے اس کی سنگھار میز سے قیمتی کریمیں اور لوشنز چرائے لیکن میری تسلی نہیں ہوئی۔ میں اپنے آپ کو مارلین کی جگہ رکھ کر اپنی مرضی سے ان چیزوں کی خریداری کرنا چاہتی تھی۔ حالانکہ اس کی سنگھار میز ان عورتوں کے لیے کسی طرح بھی ایک بڑے اسٹور سے کم نہ تھی جو اپنے آپ کو پرکشش اور جوان رکھنے کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔

"بہتر ہوگا کہ تم اس کی طرح بے مقصد اور کھوکھلی نظر آنے کی کوشش نہ کرو۔" بہرس نے ایک دن مجھ پر ناراض ہوتے ہوئے کہا۔ اس وقت میں سنگھار میز کے آئینے کے سامنے کھڑی غور سے ان ہلکی ہلکی لکیروں کو دیکھ رہی تھی جو میری آنکھوں کے نیچے نمودار ہوتی جا رہی تھیں۔ اگر بہرس کی نظر ان پر پڑ جاتی تو وہ فوراً مجھے اپنی زندگی سے نکال دیتا۔ میں اس کے حراج سے واقف ہوتی جا رہی تھی۔ وہ من مانی کرنے کا عادی تھا۔ میں نے ایک ہفتہ اس کے ساتھ رہ کر جان لیا کہ وہ ایک حیوان صفت انسان تھا۔ اسے ظالم تو نہیں کہا جاسکتا لیکن وہ کسی دوسرے کی ضرورت کا احساس نہیں کرتا تھا۔ وہ اکثر اپنے لیے کھانے کا آرڈر دیتے وقت میرے بارے میں بھول جاتا اور جب میں شکایتی نظروں سے اس کی جانب دیکھتی تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا۔ قربت کے لمحات میں بھی وہ مجھ سے غلاموں جیسا سلوک کرتا لیکن میں اسے خوش رکھنے کے لیے اپنے آپ کو مطمئن و سرور ظاہر کرتی۔ ایک رات جب اس نے کوئین کا نقشہ پورا کرنے کے لیے بستر کی دوسری جانب دھکیلا تو مجھے غصہ آ گیا اور میں نے جل کر کہا۔

"کیا تم اپنی بیوی کے ساتھ بھی ایسا سلوک کرتے ہو؟"

"نہیں۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"کیوں؟" میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "کیا اس سے بہت محبت کرتے ہو؟"

"ہاں نہیں، لیکن ہمیں اس طرح کے مواقع بہت کم ملتے ہیں۔ اس لیے میں دوسری لڑکیوں کے ساتھ وقت گزارنے پر مجبور ہوں۔"

"دوسری لڑکیاں؟" میں چونک اٹھی اور میری ریزہ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ "گو یا تمہارے دوسری لڑکیوں سے بھی تعلقات ہیں۔ تم انہیں بھی یہاں بلاؤ ہم مل کر پارٹی منائیں گے۔" میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"فی الحال میں تمہارے علاوہ کسی اور سے نہیں مل رہا۔" اس نے اپنا تپ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن مجھ سے پہلے تمہارے دوسری لڑکیوں سے تعلقات رہے ہیں۔" میں نے اسے کریدنے کی کوشش کی۔

ہاں۔ اس نے ایک نیا سرٹ سگاتے ہوئے کہا۔
 پھر ان کا کیا بنا؟ ان تعلقات کے ختم ہونے کی کیا وجہ تھی؟
 کبھی میں اس کا کیا اور کبھی انہوں نے اپنا راستہ بدل
 لیا۔ بس یوں مجھ کو کہ ہر تعلق کے ختم ہونے کی کوئی نہ کوئی وجہ
 ضرور ہوتی ہے۔

”کیا تم نے بھی مارلین سے تعلق ختم کرنے کے
 بارے میں سوچا؟“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

”لیکن تم نے ابھی تک اس پر عمل نہیں کیا؟“
 ”ایک دفعہ یہ کوشش کر چکا ہوں۔“ اس نے صاف گوئی
 سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”واقعی؟“ میرا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ ”پھر کیا ہوا؟“
 ”میں ایک اور لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا اور ہم دونوں
 شادی کرنے والے تھے لیکن یہ معاملہ آگے نہ بڑھ سکا اور
 ہمارے تعلقات ختم ہو گئے۔“

”کیا مطلب..... میں کچھ سمجھتی نہیں۔“
 ہیرس نے جواب میں کچھ نہ کہا بس بستر سے ٹیک
 لگائے صحت کو گھورتا رہا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا تو وہ میری
 طرف دیکھے بغیر بولا۔ ”میں نے کہا تھا کہ ہماری بات نہ بن سکی
 اور وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔“

”اور اس طرح مارلین تمہاری زندگی میں دوبارہ واپس آ گئی۔“
 ”ہاں اس کے ساتھ زندگی گزارنا آسان نہیں حالانکہ
 میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا۔ میں اس سے نفرت کرتا
 ہوں۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر دوسری عورتوں
 کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع فراہم کرتی ہے چنانچہ میں
 اسے برداشت کر رہا ہوں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ بیوی کو بھی
 میری قربت گوارا نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی
 تیرنے لگی۔

”تمہارا مطلب ہے کہ اسے تمہاری خوشی کا کچھ خیال
 نہیں؟“ میں اس کے اوپر جھنجھٹے ہوئے بولی۔

”وہ تمہارے جیسی نہیں ہے۔“ ہیرس میرے چہرے
 پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”تم نے تو مجھے نہال کر دیا ہے
 اگر وہ چلی گئی تو کیا تم اس کی جگہ لینا پسند کرو گی؟“

”کیا تم یہ بات مجھ سے پوچھ رہے ہو؟“ میں اپنے
 اندر کے جوش کو دباتے ہوئے بولی۔ تمام تر ناگواری اور
 کراہیت کے باوجود میں اس کے لیے تیار تھی اور اس کے
 خوب صورت اپارٹمنٹ میں رہنا چاہتی تھی۔

”ہاں۔“ وہ غصہ سے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں اکیلا

نہیں رہنا چاہتا۔ اگر وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی تو تمہیں نورانیات
 آتا ہوگا۔“

”میرا خیال ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔“
 ”تمہارے ساتھ رہنے کا مزہ ہی کچھ اور ہوگا کیونکہ تم ہر

وقت میرے پاس رہو گی اور مارلین کی طرح کئی کئی دنوں کے
 لیے مجھے چھوڑ کر میرے پانے کے لیے نہیں نکل جاؤ گی، وعدہ کرو۔“

”کبھی نہیں۔“ میں نے اپنے سینے پر کراس بناتے
 ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گی۔“
 ”تب پھر میں شرط یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا وقت بہت

اچھا گزرے گا۔“
 میرا دل چاہا کہ اس کے منہ پر تھپڑ مار دوں۔ اس کے

بات کرنے کا انداز ایسا تھا جیسے یہ فیصلہ صرف اسی کا ہو۔ اس
 میں میری مرضی کا کوئی دخل نہیں۔ دراصل اسے اپنی ملازمت
 اور دولت پر بہت غرور تھا اور میں اسی دولت میں سے اپنا حصہ

وصول کرنے کی خاطر اسے برداشت کرنے پر مجبور تھی۔
 ”میں تمہیں مارلین سے کہیں زیادہ خوش رکھوں گی۔“
 میں نے منافقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

ہیرس کے اپارٹمنٹ میں کافی وقت گزارنے کے بعد
 جب باہر آئی تو کافی خوش تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے اس
 کی بے مردانی اور خود غرضی پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ اسے اتنی توفیق
 بھی نہیں ہوئی کہ مجھے گھر تک جانے کے لیے ٹیکسی کا کرایہ ہی
 دے دیتا۔ کوکہ اس کی کسر میں نے مارلین کی سنگھار میز سے

پوری کر لی تھی اور میرا بیگ چھوٹی موٹی کئی چیزوں سے بھرا ہوا
 تھا۔ جن میں قیمتی پرفیوم، جلد کو نکھارنے والے لوشن اور

کریٹیم، میک اپ کا سامان اور چاندی کی بالیوں کی ایک
 جوڑی بھی شامل تھی جنہیں مارلین نے تالے میں بند کرنا

ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی فیور موجودگی سے
 فائدہ اٹھاتے ہوئے ہیرس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات

میرے لیے انسانی خوشی کا باعث تھے۔
 میں جانتی تھی کہ وہ ہیرس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔

اس لیے سیر و تفریح کے بہانے گھر سے باہر نکل جاتی ہے تاہم
 وہ اس سے ٹیکس کی یا طلاق نہیں چاہتی اور اگر اسے یہ معلوم

ہو جاتا کہ وہ میرے ساتھ راتیں گزار رہا ہے تو وہ گھر میں ہی
 رہنے کو ترجیح دیتی۔
 اس خیال کے آتے ہی میں خوف زدہ ہو گئی اور اگر ایسا ہوتا تو

میری ساری محنت رانگیاں چلی جائے گی۔ میں نے اپنے گھر
 جانے کے لیے زیر زمین راستے کی جانب دیکھا لیکن مجھ میں اس

کی میز صیال اترنے کی ہمت نہیں تھی۔ مجھے ان نگوں سے
 خوف آ رہا تھا جب اپنے تنگ دتار یک سیلن زدہ کمرے میں
 قدم رکھتی۔ میں اس جگہ کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دینا
 چاہتی تھی۔ میرے قدم گھر جانے کے بجائے ایک گرجا کی
 طرف اٹھ گئے اور تھوڑی دیر بعد میں نے اپنے آپ کو گرجا

کے ہال میں پایا۔
 میں کئی سالوں بعد کسی گرجا میں گئی تھی۔ شاید اس لیے

کہ کبھی مجھے اعتراف کا خیال ہی نہیں آیا اور شاید اب بھی میں
 اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہاں اور بھی کئی لوگ بیٹھے ہوئے

تھے۔ شاید پادری کا وعظ شروع ہونے والا تھا۔ میں نے اپنا
 بیگ کھول کر مارلین کی لکھی ہوئی تحریر نکالی جس پر لکھا ہوا تھا۔

”میرے شوہر کا چچا چھوڑ دو، یہاں سے تمہیں کچھ
 نہیں ملے گا۔“

میں سوچنے لگی کہ اس سے پہلے مارلین نے نہ جانے
 کتنی عورتوں کے لیے یہ تحریر چھوڑی ہوگی جن کے ساتھ اس کا

شوہر بے ایمانی کرتا رہا۔ میں اس قطار میں سب سے آخر میں
 کھڑی تھی اور پھر اچانک ہی مجھے یہ سب کچھ فضول لگنے لگا۔

مجھے ہیرس سے محبت نہیں تھی لیکن میں اس کے اپارٹمنٹ میں
 رہ کر اس جیسی زندگی گزارنا چاہتی تھی لیکن میں آنے والے

وقت کا تصور کر کے کانپ اٹھی جب ہیرس کا دل مجھ سے بھر
 جاتا یا اس کی زندگی میں کوئی اور عورت آ جاتی تو وہ مجھے دھتکار

دیتا جیسا کہ وہ اب تک دوسری عورتوں کے ساتھ کرتا آیا تھا۔
 میں یہ سب کچھ نلکا کر رہی تھی اور اس کا جو نتیجہ نکلتا اس کے بعد

کہیں کی نہ رہتی۔
 ”ہینک رگ جاؤ۔“ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ہیرس

کے علاوہ بھی اس دنیا میں امیر لوگ موجود ہیں، میں کسی بھی
 شریف آدمی کے ساتھ اپنا تعلق قائم کر سکتی تھی۔ میں نے اسی

وقت فیصلہ کر لیا کہ ہیرس کی مزید چاہلوسی نہیں کروں گی اور اگر
 اس نے میرا پیچھا کیا تو کسی اور کا دامن تھام لوں گی جو مجھے تحفظ

اور عزت دے سکے۔ مجھے کوئی نہ کوئی بہتر شخص مل ہی جائے گا۔
 ☆ ☆ ☆

میں تقریباً تین ماہ تک اپنے ارادے پر قائم رہی۔ اس
 نے کئی بار مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی لیکن میں کوئی نہ کوئی

نہیں رکھتی۔“
 اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہونے لگے
 جیسے میں نے اس کی دھمکی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ میں اس کی

بے بسی سے محفوظ ہوتی رہی۔
 اسی دوران ہنگال سے میرے تعلقات استوار ہو گئے

تھے۔ وہ بھی ہیرس کی طرح فنڈ فنجر تھا۔ اس کے ساتھ میرا ایک
 مہینا بہت اچھا گزرا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں جنت میں پہنچی گئی ہوں

پھر ایک دن ایسا آیا جب میں واقعی مرنے کے قریب پہنچی گئی۔ وہ
 مجھے ایک پرائیویٹ جہاز میں برمودا لے گیا۔

”تمہاری یہی بات مجھے بہت اچھی لگتی ہے کہ تم کوئی
 رکاوٹ کھڑی نہیں کرتیں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ اس نے پیار سے میری
 گردن پر ہاتھ پھیرا پھر اچانک ہی میرا گلا گھونٹنا شروع

کر دیا۔ میں نے جھانکنا چاہا لیکن میرے منہ سے کوئی آواز نہیں
 نکلی۔ اس کی سبز آنکھیں خوشی سے پھیل گئیں اور میری تکلیف

کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں کی چمک بھی بڑھتی گئی پھر میں
 بے ہوش ہو گئی جب ہوش آیا تو میں فرش پر پڑی ہوئی تھی اور

وہ کمری پر بیٹھا سگار کے کش لگا رہا تھا۔
 ”کوکہ تم بری طرح زخمی ہو گئیں لیکن مجھے بہت مزہ

آیا۔“ وہ سفاک لہجے میں بول رہا تھا۔
 اس کی مضبوط گرفت کی وجہ سے میری گردن پر گہرا

نشان پڑ گیا تھا لیکن اب وہ ہینکس کے نیچے چمپ کیا تھا۔ اس
 واقعے کے بعد ہیرس مجھے دوبارہ اچھا لگنے لگا۔ خاص طور پر اس

لیے بھی کہ وہ ہر طرح سے مجھے منانے میں لگا ہوا تھا۔ وہ مجھے
 فون کرتا اور پھول بھیجتا رہتا پھر اس نے میرے لیے ایک

خوب صورت برہمیلیٹ خریدا۔ جب اس سے بھی بات نہ بنی
 تو میری ڈسٹن کے یہاں سے یہ ہینکس لے کر آ گیا۔ وہ نہیں

جانتا تھا کہ میرے دور ہونے کی وجہ کیا ہے لیکن مجھے حاصل
 کرنے کے لیے سب کچھ کرنے پر تیار تھا جب اس نے یہ

بات مجھ سے کہی تو میں نے شرط عائد کر دی کہ وہ مارلین کو اپنے
 گھر سے چلتا کر دے اور اس نے ایسا ہی کیا۔

دوسرے ہی دن میں اس کے اپارٹمنٹ میں چلی آئی۔
 مارلین نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ اس نے نہ تو کوئی گلاس توڑا،

اور نہ ہی گھر کی کسی چیز کو نقصان پہنچایا۔ اس کے برعکس اس نے

اپنے کپڑے، جیولری اور دوسرا ذاتی سامان سمیتا اور گھر سے

چلی گئی۔ ہیرس کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گئی ہے۔ البتہ

اس کے کچھ کپڑے اور جوئے سینک رہ گئے تھے مگر سنگھار میز کا

سارا قیمتی سامان وہ اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ حسب عادت وہ

میر سے لیے بھی ایک تحریر چھوڑ گئی تھی جس پر لکھا تھا۔
 "اب وہ مکمل طور پر تمہارا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو اس سے لطف اندوز ہوتی رہو۔"
 مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس نے کوئی بھڑک نہیں کیا اور شور مچا کر مجھے بغیر یہاں سے چلی گئی۔ کیا اس نے میرا مذاق اڑانے کے لیے یہ تحریر چھوڑی تھی یا وہ مجھے عدم تحفظ اور مجرم ہونے کا احساس دلانا چاہ رہی تھی جبکہ میرے خیال میں یہ اس کی شکست تھی۔ میں نے اس تحریر کے پرزے پرزے کیے اور اسے ڈسٹ بین میں پھینک دیا۔

بیرس کے بارے میں میرے خدشات بہت جلد حقیقت کا روپ دھار گئے۔ اس کے ساتھ رہنے کا مطلب پنگ منا نہیں تھا جب سے اس کے پارٹنرٹ میں آئی تھی میرا پرس خالی تھا۔ بیرس نے مجھے کبھی پیسے نہیں دیے۔ ایک دو مرتبہ میں نے اس سے پیسے مانگے تو کہنے لگا۔

"جیسے جس چیز کی بھی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ میں تمہارے لیے لیتا آؤں گا۔"

میں نے پہلے ہی اپنی مطلوبہ اشیا اور ضروری کاموں کی فہرست تیار کر رکھی تھی جن میں سب سے اوپر ایک ماہر جلد کا نام تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ محلہ قون کی بزمی ہوئی عمر اور اس کے اثرات کو روکنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

بیرس وہ فہرست دیکھتے ہی بھڑک اٹھا اور بولا۔ "کیا تم مجھ سے مذاق کر رہی ہو، مارلین بھی اس طرح کے فضول شوق پر کافی پیسے ضائع کرتی تھی اب ایسا نہیں ہوگا۔"

البتہ اس نے میرے کپڑوں پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور میرے لیے کچھ ملبوسات کا آرڈر دے دیا دوسرے روز ہی وہ کپڑے آ گئے۔ ان کے ساتھ مارلین کے لیے بھی ایک باکس تھا جو کسی ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے آیا تھا اور اس کے میک اپ کا سامان تھا جو وہ ہر صبح منگواتی تھی۔ اسے دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس میں بیرس کے مشہور برانڈ کی کریمیں اور لوٹن موجود تھے۔ اس لوٹن کی قیمت چھ سو ڈالر تھی اور یہ جلد کے مردہ خلیوں کو تیزی سے بحال کر دیتا تھا۔

اسے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اب مجھے کسی جلد کے ماہر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں وہ شیشی لے کر تیزی سے باتھ روم کی طرف بھاگی۔ اپنا چہرہ پانی سے دھویا اور اس پر تھوڑا سا لوٹن لگا دیا فوراً ہی میری جلد میں کانٹے سے چپنے لگے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ لوٹن اپنا کام کر رہا ہے۔ میں نے کریم کی شیشی کھولی اور انگلیوں کی مدد سے

اپنے چہرے پر آہستہ آہستہ کریم لٹے گئی۔ میرے چہرے اور انگلیوں میں سستا ہٹ ہونے لگی تو میں کبھی کبھی بہت ہی مٹوٹر کریم سے پھر میں نے ایک باس کی شیشی اٹھائی جو جلد کو نرم کرنے کے لیے تھا لیکن اسے چہرے پر لگاتے ہی شدید جلن ہونے لگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے میری جلد کی اوپری تہ اتار دی ہو۔ میں چلائی اور پانی سے اپنا چہرہ دھوئے گئی لیکن جب میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو میری جینیں نکل گئیں۔ میرے چہرے کی جلد مکمل طور پر سرخ ہو چکی تھی اور میری آنکھیں اوپر کو چڑھی ہوئی تھیں۔

بہت جلد ہی
 "تیزاب سے لگے ہوئے زخم آسانی سے نہیں بھرتے۔" ڈاکٹر نے میری جانب ہاسٹ سے دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ بات انہوں نے مجھے کافی دنوں بعد بتائی جب میرے درد کی شدت میں کمی آگئی تھی اور میں قدرے پرسکون ہو گئی تھی۔ میں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنا چاہتی تھی لیکن انہوں نے اس کی اجازت نہیں دی۔

"پلاسٹک سرجری سے تمہارا چہرہ اصل حالت میں واپس آ سکتا ہے لیکن اس کے لیے ہمیں کئی آپریشن کرنا ہوں گے جبکہ ان کے اخراجات انشورنس کمپنی سے منے والے معاوضے سے پورے نہیں ہو سکتے۔ کیا کوئی شخص تمہاری مالی مدد کر سکتا ہے؟"

"ہاں، میرا بوائے فرینڈ۔" میں یہ مشکل اتنا ہی کہہ سکی کیونکہ میرے ہونٹ بھی جھلس گئے تھے۔

"خفک ہے، جب وہ تم سے ملنے آئے گا تو ہم اس سے بات کر لیں گے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

بیرس صرف ایک بار مجھے دیکھنے کے لیے آیا۔ وہ بھی اس وقت جب میں سو رہی تھی۔ یہ بات مجھے ایک نرس نے بتائی۔ میں اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرتی رہی پھر نرس سے کہہ کر اسے فون کروایا پھر میں نے خود بھی اسے فون کرنے کی کوشش کی لیکن اس سے رابطہ نہ ہو سکا۔ بیرس کبھی نہیں آیا پھر ایک شام نرس نے مجھے ایک لفافہ لا کر دیا۔ میں نے لرزاتے ہاتھوں سے لفافہ کھول کر کانڈر نظر ڈالی اس پر لکھا ہوا تھا۔

معاذات! پیاری لیس! مجھے افسوس ہے کہ ہمارے درمیان ت درست انداز میں نہ چل سکے۔ مگر میں تمہاری بہتری کے لیے دعا گو ہوں۔"

اس خط پر کسی کا نام نہیں لکھا ہوا تھا لیکن اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ میں مارلین کی لکھا کی اچھی طرح پہچانتی تھی۔

بارش بہت تیز تھی اور حادثہ بہت شدید تھا۔ کئی فن ورنی ریل انجن نے اس مضبوط کڑی کے پرٹے اڑا دیے تھے کم سے کم اٹھارہ تو بھل جاوا ہو گیا تھا۔ کڑی کے پرزے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایک مرد کی

شلت لاش پڑی تھی۔ اس سے تھوڑے دور کڑی کی نشست کے ساتھ بندھی اور اس سے چپک جانے والی محرم کی لاش تھی۔ یہ حصہ بھی کڑی سے الگ ہو گیا تھا۔ شاید تیسری لاش ایک نوجوان لڑکی کی تھی جو کڑی کے نیچے جانے والے تھیں

مضبوط فیصلہ

سریم کے حنان

اکٹوبر کے نزدیک دینے والے ایٹم مطلوب کسی برا چھپی بری بات سے آگاہ اور ہر راز سے واقف ہوتے ہیں... مگر جب بھی جانکاری ان کے لیے ایسا ہتھیار بن جائے جس سے مطلوب کی زندگی تباہ اور خواب بکنور کر دیوہ ویزہ ہو جائیں تو دل پر بہت شدید چوت لگتی ہے... چاہتوں کی شدتیں ہمیشہ کہیں سموارتی ہیں اور کہیں بٹاز کی انتہا کر دیتی ہیں۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اس کے حصے میں ایسی چاہت آئی کہ مقافانم رہی اور نہ ہی وقاسانہ رہی۔

محبت کا انتقام محبت سے لینے والی ایک حسینہ کی

نفرتوں کی انتہا



کچھ معاملات زیر بحث آج آج کے۔ وہ ملازموں کے سامنے
گھر کے معاملات پر بات نہیں کرتے تھے۔ ریاض ملی نے
ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور ریمانہ ان کے برابر میں
آگئیں۔ فرمانہ پیچھے آگئی۔ اس نے سیٹ بیلٹ باندھ لی تھی
کیونکہ وہ جھن جھن کر رہی تھی۔ آج صبح سے اسے ایک لمحہ
آرام کا نہیں ملا تھا۔ گاڑی چلی تو چند منٹ بعد وہ سو چکی تھی۔
سڑیوں کھینے کا تھا۔ ریمانہ نے سڑیوں سے اٹھ کر اسے سوتے دیکھا اور
آہستہ سے بولی۔

"یہ لڑکا فرمی کے قابل نہیں ہے۔"

"تو کے میں برائی نہیں ہے۔" ریاض ملی نے اس کا
دفاع کیا۔ "مگر فرمی ابھی بچہ نہیں ہوئی ہے۔ شادی کے
لیے اسے مزید وقت چاہیے۔"

ریمانہ نے سڑیوں سے اٹھ کر دیکھا۔ "میری بیٹی میں
کوئی کمی ہے کیا اس کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ
آئے گا۔"

فرمانہ کا بیگ ڈرا سا کھلا ہوا تھا اور اس سے اس کا نیا
آئی فون جھانک رہا تھا۔ ریمانہ نے ہاتھ بڑھا کر آئی فون
نکل لیا اور اس کا کیمرا آن کر کے سوتی فرمانہ کی ویڈیو
بنانے لگی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "یہ میری خوب صورت اور مصوم
بیٹی ہے۔"

"جو تم پر مبنی ہے۔" ریاض ملی ہنسا۔ "شکر ہے مجھ پر
نہیں مبنی ہے۔"

"مگر ہے یہ آپ کی بیٹی۔" ریمانہ ویڈیو میں خود کو
اور ریاض کو بھی شامل کرنے لگی۔

"میرا خیال ہے وہ ہمارے پیچھے ہے۔" ریاض نے
عقبی آئینے میں عامر کی اسپورٹس کار دیکھ کر کہا۔ ریمانہ کا منہ
بن گیا۔

"پلیز اس کا ذکر مت کرو، اس وقت میں بہت اچھے
موڈ میں ہوں۔"

ریاض ملی ہنسا۔ "او کے نہیں کرتا۔"

پراڈوریلوے کراسنگ کے پاس پہنچ گئی تھی جہاں سرخ
جی جی مل رہی تھی اور اس کا مطلب تھا کہ ٹرین آنے والی ہے۔

کراسنگ پر ہیڈ میز نہیں تھا اور انہی ٹرین نہیں آتی تھی۔ پیچھے
عامر کی کار بھی آ کر رک گئی۔ ریمانہ نے کہا۔ "میرا خیال ہے ہم
کراس کر سکتے ہیں، ابھی ٹرین دور ہے۔"

☆☆☆

فرمانہ کو ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھی۔ اس کے بازو
سے ایک کیٹولا لگا ہوا تھا اور بائیں بازو پر کھانسی پلاسٹر میں

جکڑی ہوئی تھی۔ مائے پر پرورے سر کو گھیرنے والی بیٹی نکلی
تھی۔ اس نے ذہن پر زور دیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا مگر
اسے کچھ یاد نہیں آیا۔ آخری یاد جو اس کے ذہن میں تھی کہ
وہ گاڑی میں بیٹھی تھی اور وہ لوگ گھر جا رہے تھے۔ پھر وہ سو
گئی اور اب اس کی آنکھ کھلی تو وہ یہاں تھی۔ وہ یہاں کیوں
تھی؟ اس نے گھبرا کر سوچا۔ کیا پاپا کی گاڑی کو کوئی حادثہ
پیش آیا تھا؟ وہ ابھی سوچ رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور ڈاکٹر
کے ساتھ ایس بی حادہ ملی اندر آیا۔ وہ دروی میں تھا۔ اس
کے پیچھے اس کی بیوی ناصرہ تھی۔ وہ اسے ہوش میں دیکھ کر
تیزی سے آگے آئی۔ "فرمی! کیسی ہو تم؟"

"ٹھیک ہوں لیکن میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

حادہ خاموش رہا کیونکہ اس دوران میں ڈاکٹر فرمانہ کو
چیک کر رہا تھا۔ اس نے فرمانہ سے چند سوالات کیے اور
اسے ٹھیک قرار دے کر کمرے سے چلا گیا۔ اس کے جانے
کے بعد حادہ آگے آیا۔ اس کا چہرہ سنا ہوا تھا۔ "بچا جان کی
گاڑی کو ریلوے کراسنگ پر حادثہ پیش آیا۔ وہ ریل انجن
سے ٹکرائی تھی۔"

فرمانہ کو لگا کہ اس کا دل رک گیا ہے۔ وہ اٹھتے
ہوئے بولی۔ "پاپا اور ماما۔۔۔ وہ کہاں ہیں؟"

ناصرہ اسے لٹانے کی کوشش کرنے لگی اور حادہ ہچکچوں
سے رونے لگا۔ اس کے آنسو ساری کہانی سنا رہے
تھے۔ ریمانہ اس کی غالتھی اور ریاض چچا۔۔۔ اسے دونوں

طرف سے صدمہ ہوا تھا۔ جب اس کی پوسٹنگ دفاتی پولیس
میں ہوئی تو وہ ریاض ملی کی کوگی میں رہ رہا تھا۔ ان دونوں

میاں بیوی کے پاس ایک پورشن تھا۔ ناصرہ نے سائیکالوجی
میں ایم فل کیا تھا اور ان دونوں یونیورسٹی میں پڑھانے کے

ساتھ ساتھ وہ پلی ایج ڈی کی تیاری بھی کر رہی تھی۔ فرمانہ
ماں باپ کی وفات کا سن کر وہاں پر مار کر رونے لگی۔ ناصرہ

اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ مشکل اس کی آواز
رک کر آگے نہیں تھم رہے تھے۔ ڈاکٹر آگیا اور اس نے

کہا۔ "پلیز انہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

"میں انجکشن نہیں لوں گی۔" فرمانہ نرس کو انجکشن تیار
کرتے دیکھ کر بولی۔ حادہ آگے آیا۔ اس نے فرمانہ کا بیگ

اس کے پاس رکھا۔

"اس میں تمہاری چیزیں ہیں جو جائے حادثہ سے ملی تھیں۔"

"آپ مت جانے گا۔" فرمانہ نے اس سے التھاکہ۔
"تم فکر مت کرو، میں یہیں رہوں گا۔" حادہ نے
اسے تسلی دی۔ انجکشن کھنے کے ایک منٹ کے اندر فرمانہ

گہری نیند میں جا چکی تھی۔ حادہ نے ناصرہ سے کہا۔ "تم یہاں
رکو، میں کچھ منٹ سے آتا ہوں۔" فرمانہ ان کے دوسرے لوگ آتے
شروع ہو گئے ہوں گے۔ پھر بچا اور بیٹی کی باڈیز اسپتال
سے بھی لیتی ہیں۔"

"تم جاؤ، میں دیکھ لوں گی۔" ناصرہ نے کہا۔ وہ تقریباً
چھبیس برس کی دہلی اور کسی قدر طویل قامت عورت تھی۔ اس

کا چہرہ استخوانی تاثر دیتا تھا مگر اس میں ایک خاص نوع کی
کشش تھی۔ رشتے میں وہ حادہ کی دور کی خالہ زاد تھی۔ ان کا

رشتہ خاندان والوں کی مرضی سے ہوا تھا۔ اس خاندان میں
زیادہ تر شادیاں آپس میں ہوتی تھیں۔ حادہ کو ریاض سے

بہت محبت تھی کیونکہ باپ کے مرنے کے بعد ریاض ملی نے
اسے پالا تھا۔ کمرنالوئی میں ماسٹر کے بعد اس نے سول

سروس کا امتحان دیا اور کامیاب ہو کر پولیس سروس جوائن کی
تھی۔ ریاض ملی کی خواہش تھی کہ وہ بزنس میں اس کے ساتھ

شامل ہو مگر جب اس نے سروس کرنے۔۔۔ کا فیصلہ کیا تو
ریاض ملی نے کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ وہ اس پر بیٹے کی

طرح احسان دیکھتا تھا۔ حادہ فرمانہ سے دس سال بڑا تھا۔ ایک
سال پہلے ریاض اور ریمانہ نے اس سے فرمانہ کے لیے

بات کی تھی مگر اس نے اسی وقت واضح کر دیا تھا کہ فرمانہ اس
کے لیے صرف بہن ہے اور وہ ساری عمر اس کی بہن رہے

گی۔ یہ بات فرمانہ کے ظہن میں نہیں تھی جو حادہ کو بچپن سے
بھائی سمجھتی اور کہتی آئی تھی۔

☆☆☆

فرمانہ یونیورسٹی سے نکل رہی تھی تو شام ہو گئی۔ آج
کلاسز سے زیادہ اس کا وقت لائبریری میں گزرا تھا۔ ماسٹر کا

آخری سیمسٹر قریب تھا۔ دو سال پہلے اس کے ماما پاپا کی
تدفین کے بعد عامر اس سے تعزیت کرنے آیا تو اسے امید

تھی کہ وہ اب شادی کر سکیں گے مگر فرمانہ نے اس سے اسی
وقت کہہ دیا تھا کہ وہ پہلے اپنے ماں باپ کی آخری خواہش

پوری کرے گی۔ یعنی ماسٹر کرے گی اور اس کے بعد وہ
شادی کا سوچے گی۔ اس نے عامر سے کہا۔ "میں جانتی ہوں

دو سال بہت طویل عرصہ ہے لیکن میں تم پر زور نہیں ڈالوں
گی۔ اگر تم اتنے عرصے تک رک سکتے ہو تو۔۔۔؟"

"میں انتظار کروں گا۔" عامر نے اسی وقت فیصلہ سنا
دیا۔ "تم دو سال کی بات کر رہی ہو، میں دو سو سال انتظار کر

سکتا ہوں۔ مرنے دم تک انتظار کر سکتا ہوں۔"

فرمانہ اسے چپ چاپ دیکھتی رہی۔ اس نے
یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ مگر بکجیشن میں اکٹھا اس کا مضمون

تھا مگر ماسٹر کے لیے اس نے سوشالوئی چنا۔ ویسے اس کی
کلاسز صبح ہوتی تھیں مگر کچھ اچھے پچھرارز دوپہر اور شام کے
وقت آتے تھے اس لیے کبھی کبھی اسے یونیورسٹی میں دیر ہو
جاتی تھی۔ اس دن بھی وہ نکل تو شام ہو چکی تھی اور سردیوں

کے مختصر دن تیزی سے رات میں ڈھل جاتے تھے۔ وہ
پارکنگ تک آئی اور گاڑی کا دروازہ کھول رہی تھی کہ اسے لگا

کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے چونک کر اس پاس دیکھا
تو باؤں کے پاس ایک ہیولاسا نظر آیا اور جیسے ہی فرمانہ نے

اسے دیکھا، وہ تیزی سے باؤں کے پیچھے روپوش ہو گیا۔ اس
نے اپر ہینڈ رکھا تھا اور اس کا سرپوش اس کے سر پر تھا۔ اس

لیے فرمانہ اس کی صورت دیکھنے میں کام رہی لیکن وہ کوئی
لڑکا تھا۔ کم سے کم جرمانہ سے تو ایسا ہی لگا تھا۔ فرمانہ ڈر

گئی، وہ جلدی سے گاڑی میں بیٹھی اور گھر کے لیے روانہ ہو
گئی۔ وہ گھر پہنچی تو حادہ ملی اسے لاؤنج میں بل گیا۔ وہ کافی کا

ٹک تھا اسے کسی سوچ میں گم تھا۔ فرمانہ کو کچھ کراس نے کہا۔
"آج تم نے دیر کر دی؟"

"ہاں، لائبریری میں دیر ہو گئی۔" فرمانہ بیگ رکھ
کر اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی اور ٹاک سیکڑ کر

بولی۔ "کافی۔۔۔ اف! مجھے اس وقت کافی کی کتنی شدید
خواہش ہے۔"

"میں نے خود بنائی ہے جہاں سے لیے بھی جاتا
ہوں۔" حادہ نے پیشکش کی اور اٹھ کر لیکن والے حصے میں

آیا۔ فرمانہ میز پر ٹک گئی۔ "تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟"

حادہ کی بات پر فرمانہ چونکی۔ "نہیں پریشان تو نہیں
ہوں لیکن آج ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں یونیورسٹی سے

نکل رہی تھی اور اپنی کار میں بیٹھنے لگی تو میں نے ایک اپر پہنے
فحص کو دیکھا۔ مجھے لگا وہ میری گمرانی کر رہا ہے۔"

حادہ چونکا۔ "گمرانی۔۔۔ یہ احساس کیوں ہوا؟"

"پتا نہیں، میں نے جب دیکھا تو اس نے فوراً
جہازوں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی۔"

"ممکن ہے یونیورسٹی کا کوئی لڑکا ہو، شرارت کر رہا ہو۔"

فرمانہ نے سوچا اور سر ہلایا۔ "ہاں، شاید آپ ٹھیک
کہہ رہے ہیں۔"

اس حادثے کے بعد فرمانہ چپ چاپ رہنے لگی تھی۔
وہ یونیورسٹی سے آنے کے بعد زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی

تھی اور عام طور سے کھانے کے وقت ہی کمرے سے باہر
آتی تھی۔ ماں باپ کی حادثاتی موت نے اس پر گہرا اثر ڈالا
تھا۔ حادہ کو ریاض نے ساتھ رکھا تھا، اب نہ وہ رہا تھا اور نہ

ی رہمانہ اس لیے جاہ کو بہا مناسب نہیں لگتا تھا۔ اس نے فرمان کو پیش کی تھی کہ اگر وہ چاہے تو جاہ اور نامہ اپنا بندوبست کر سکتے ہیں مگر فرمانہ نے سختی سے منع کر دیا۔ "میرے پاس اب آپ ہی تو ہیں، اکیلے رہ کر میں گھٹ کر مر جاؤں گی۔"

ریاض علی کی عیس کے مگر یلو آلات بنانے کی فیکٹری تھی جس کی مصنوعات ایک مشہور برانڈ کے تحت فروخت کی جاتی تھیں۔ فیکٹری کے معاملات اب جاہ دیکھتا تھا اور تمام ضروری فیصلوں کی منظوری فرمانہ دیتی تھی۔ کاغذات پر سائن بھی اسی کے ہوتے تھے۔ دو سالوں سے بزنس ٹھیک چل رہا تھا۔ جنرل خیر اور دوسرا اسٹاف ریاض علی کے پرانے اور با اعتماد افراد پر مشتمل تھا جو ابھی تک بزنس کو بہترین انداز میں چلا رہے تھے۔ فرمانہ مطمئن تھی کہ اسے اس طرف توجہ نہیں دینا پڑتی تھی۔ اس نے ابھی اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اس کی ساری توجہ ماسٹر مکمل کرنے پر تھی۔ جاہ نے اس کے سامنے کافی کام رکھا تو وہ چونگی۔ اس نے شکر یہ کہہ کر گم اٹھالیا۔ جاہ نے کہا۔ "تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچا؟"

نہیں۔ "وہ بولی۔

جاہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "میرا خیال ہے جسے تبدیلی کی ضرورت ہے۔ تم اس بارے میں سوچو۔"

فرمانہ جاہ کا مطلب سمجھ رہی تھی۔ وہ پہلے بھی اسے ڈھکے چھپے انداز میں مشورہ دے چکا تھا کہ اب اسے شادی کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ اسی لیے نامہ باہر سے آئی۔ وہ انہیں دیکھ کر ہلکی اور پھر آگے آئی۔ جاہ نے اس سے پوچھا۔ "تم بھی کافی بھوکے؟"

"کیوں نہیں۔" وہ جھکے جھکے انداز میں کرسی پر ٹک گئی۔ "آج بہت تھکا دینے والا دن تھا۔ تین بچے اور پھر اپنے دائیہ کی تیاری۔" اس نے فرمانہ کی طرف دیکھا۔ "اور تم ساؤ۔"

وہ زبردستی مسکرائی۔ "میں ٹھیک ہوں۔"

جاہ نے اس کے لیے کافی بنا کر میز پر رکھی اور لاؤنج کی طرف چلا گیا۔ اس نے ٹی وی آن کر لیا تھا۔ نامہ نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔ "اسے بیوی کے پاس بیٹھنا گوارا نہیں ہے۔"

فرمانہ پہلے ہی خفیف ہو رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "تم جا کر بیٹھ جاؤ۔"

"میں اسی کے پاس تو آئی تھی۔" وہ تلخ لہجہ میں بولی۔

اور اپنا ٹک اٹھا کر سیز جیوں کی طرف بڑھ گئی۔ فرمانہ محسوس کر رہی تھی کہ پچھلے کچھ عرصے سے نامہ کا رویہ عجیب سا تھا اور وہ اکثر یوں بات کرتی تھی جیسے اسے یا جاہ کو کچھ سنا رہی ہو۔ فرمانہ نے پہلے توجہ نہیں دی تھی مگر جب کئی بار ایسا ہوا تو وہ توجہ دینے پر مجبور ہو گئی۔ پھر وہ بھی اپنا ٹک اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ نیچے کا پورشن اس کا تھا۔ اوپر والا مکمل پورشن جاہ اور نامہ کے پاس تھا۔ نامہ نے زیادہ تر اپنے پورشن تک محدود رہتی تھی البتہ جاہ دو دنوں حصوں میں آزادانہ گھومتا پھرتا تھا۔ کوئی میں چار مستقل ملازم تھے۔ ایک کارڈ، ایک مالی، ایک خادما اور ایک باورچی جو اسی خادما کا شوہر تھا۔ یہ تمام افراد سرورٹ کوارٹرز میں رہتے تھے۔ فرمانہ کے پاس نئی کار بھی۔ ریاض علی نے حادثے سے چند مہینے پہلے ہی اسے دلائی تھی۔ فرمانہ نے اسے بہت اچھی طرح استعمال کیا تھا اور آج تک اس پر ایک اسکرین بھی نہیں آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

عامر ورکشاپ میں ایک گاڑی کا انجن دیکھ رہا تھا۔ یہ بہت مہنگی اور اعلیٰ درجے کی گاڑی تھی۔ اس کی ورکشاپ میں عام طور سے ایسی ہی گاڑیاں مرمت کے لیے آتی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی وہ اچھی قسم کی پرانی یا حادثہ شدہ گاڑیاں لے کر ان کو ریکونڈیشن کر کے فروخت کرتا تھا۔ فروخت کے لیے اس نے سڑک کے پار موجود آؤٹسٹورم کے مالک ممتاز ہاشمی سے معاہدہ کر رکھا تھا۔ ممتاز ہاشمی اسی علاقے میں رہتا تھا اور اپنے بیٹے بلال کے ساتھ بزنس چلا رہا تھا۔ یہ سڑک اسی قسم کے کاموں کے لیے مخصوص تھی۔ یہاں کئی شوروم اور ورکشاپیں تھیں۔ مقب میں کوئی گاڑی رکھی اور پھر دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو عامر مڑے بغیر جان گیا کہ فرمانہ آئی ہے۔ اس نے پوچھا۔ "آج کیسے نصیب جاگ گئے میرے؟"

"تم جان گئے؟" فرمانہ اس کے پاس آئی۔

"ہاں تم جو مخصوص خوشبو لگاتی ہو، وہ تمہاری اپنی خوشبو سے مل کر منفرد ہو جاتی ہے۔ میں نے اسے پہچان لیا۔"

فرمانہ کا رنگ گلابی ہوا۔ "جسے انجینئرنگ کے بجائے شاعری پڑھنی چاہیے تھی۔"

"اب پڑھ رہا ہوں۔" عامر نے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ "کہو کیسے آتا ہوا؟"

"میری کار کے بریک کچھ مسئلہ کر رہے ہیں۔" وہ بولی۔ "لگا نے پر ذرا دیر سے لگتے ہیں۔"

عامر اس کی کار تک آیا اس نے بریک سسٹم کا معائنہ

کیا اور چند منٹ میں حالت چلا لیا۔ ڈسک ذرا لوز ہو گئی تھیں۔ اس نے ٹائٹ کیں اور فرمانہ سے ٹرائل لینے کو کہا۔ اس نے کار چلا کر چیک کی، بریک ہر بار درست لگے۔ وہ واپس پلٹ کر آئی۔ "اب اوکے ہے۔"

"لیکن میں اوکے نہیں ہوں۔" عامر کھڑکی پر جھکا۔

"تمہارا فاضل سسٹمز دیکھ ہے۔"

فرمانہ نے اس سے آنکھیں چرائیں۔ "ہاں۔"

"اس کے بعد؟"

"ابھی میں نے سوچا نہیں۔"

"تو سوچو۔" عامر نے اصرار کیا۔ "تم نے اپنے ماما پاپا کی خواہش پوری کر دی ہے۔"

"ہاں وہ پوری ہو گئی ہے۔"

"تب مجھے کیوں ترس رہی ہو؟"

فرمانہ نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔

"سوچوں گی۔"

فرمانہ نے گاڑی آگے بڑھائی تو اس کی نظر بلال پر گئی۔ بلال نے اسی یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا تھا جہاں وہ پڑھ رہی تھی اور بلال چھ مہینے پہلے ڈگری ہولڈر ہوا تھا۔ یونیورسٹی میں اس سے سامنا ہوتا رہتا تھا مگر فرمانہ کی اس سے زیادہ ویلو ہائے نہیں تھی۔ وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ یونیورسٹی میں فرمانہ نے محسوس کیا کہ بلال اس سے بات کرنا چاہتا ہے مگر وہ اس کی ہمت نہیں کر پاتا تھا۔ وہ خوش شکل اور اچھی جسامت کا نوجوان تھا لیکن لڑکیوں سے گھبراتا تھا۔ فرمانہ کی ساتھی لڑکیاں جو ذرا شوخین مزاج تھیں، ان کے الفاظ میں بلال دیو لڑکا تھا۔ آج کل لڑکیاں اس قسم کے لڑکوں کو پسند نہیں کرتی ہیں۔ آج کے دن بھی مصروفیات بہت زیادہ تھیں۔ ان کے گروپ کا ایک وزٹ تھا۔

وہ ایک بچی آبادی گئے تھے جہاں انہیں عورتوں کو صاف پانی کی اہمیت اور پینے کے پانی کو صاف کرنے کے طریقوں پر سمجھا تھا۔ وہ شام تک وہیں رہے تھے۔ ان کے گروپ کے لڑکے سامان لے کر گئے تھے اور انہوں نے آبادی کے لیے موجود کنویں کو کھڑکی کی مدد سے یوں ڈھک دیا کہ اب کوئی چیز کنویں میں نہیں جاسکتی تھی۔ لڑکیاں آبادی کی عورتوں کو بتا رہی تھیں کہ وہ کن عام سے طریقوں پر عمل کر کے خود کو اور اپنے گھر والوں کو پانی سے پھیلنے والی بیماریوں سے بچا سکتی تھیں۔ یہ وزٹ ان کے تھیسز کا ایک حصہ تھا۔ فرمانہ شام کو وہاں سے نکلنے لگی تو اس کی ایک دوست بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ ایک عام گھرانے

سے تعلق رکھتی تھی اور اس کے پاس ذاتی کنویں نہیں تھی۔ فرمانہ اسے ڈراپ کرتی، گھر پہنچ کر اس نے اصرار کر کے فرمانہ کو ایک کپ چائے پر روک لیا۔ فرمانہ وہاں سے نکلی تو تاریکی چھا گئی تھی۔ وہ گھر کی طرف روانہ ہوئی تو راستے میں جاہ کی کال آگئی۔

"تم کہاں ہو؟"

"راستے میں۔" اس نے جواب دیا۔ "آج وزٹ تھا، ابھی فارغ ہوئی ہوں۔"

"اوکے۔" جاہ نے اتنا کہا تھا کہ فرمانہ کی نظر مقبی آئینے پر گئی اور اس کے منہ سے نیچے نکلی۔ گاڑی لہرائی اور فٹ پاتھ پر چڑھ کر گرین ہیلٹ کے ساتھ گلی لوہے کی گرل سے جا گرائی۔

☆ ☆ ☆

جاہ اور نامہ آپس میں بات کر رہے تھے۔ نامہ کہہ رہی تھی۔ "حادثے کے اثرات ابھی تک پوری طرح اس کے ذہن سے نکلے نہیں ہیں۔"

"اس کا ان اثرات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" جاہ بولا۔ "کوئی گاڑی کی پچھلی نشست پر تھا کیونکہ فٹ میٹ پر مٹی کے نشانات موجود ہیں۔"

"ممکن ہے وہ پہلے کی ہو۔"

"مٹی تازہ اور نمی۔"

"تب وہ آدمی کہاں گیا؟"

"حادثے کے بعد کچھ دیر کے لیے فرمانہ کے حواس گم ہو گئے تھے، اس سے فائدہ اٹھا کر وہ فرار ہو گیا۔"

"اگر وہ بچ بچ اسے کوئی نقصان پہنچاتا چاہتا تھا تو اس کے پاس بہترین موقع تھا۔"

"نہیں، حادثہ ہوتے ہی کئی لوگ اس طرف آئے تھے اور دو گاڑیاں بھی رکی تھیں۔ اس کے پاس صرف فرار کا موقع تھا۔"

"کسی نے اسے فرار ہوتے دیکھا؟"

"نہیں۔" جاہ نامہ کی جرح سے بھنبھلا گیا تھا۔ نامہ کا خیال تھا کہ یہ پوچھ فرمانہ کا وہم تھا۔ جبکہ جاہ کے خیال میں وہ کوئی حقیقی شخص تھا جو فرمانہ کے پیچھے بڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ ان کی بحث آگے بڑھتی، کال تیل گئی۔ کچھ دیر بعد عامر لاؤنج میں داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی جاہ کے تاثرات سخت ہو گئے تھے۔ عامر کے ہاتھ میں موجود بو کے بتا رہا تھا کہ وہ فرمانہ کو دیکھنے آیا ہے۔ عامر نے آگے آ کر جاہ سے ہاتھ ملایا تو اس نے بلا تہمید کہا۔

ہیلمٹ

دو دوست پریشانی کے عالم میں مگی کے کونے پر بیٹھے ہاتھیں کر رہے تھے۔

ایک نے کہا۔ "یار! ڈاکوؤں نے بقول تمہارے تمہیں لوٹا مگر وہ نقدی اور سو بائل وغیرہ چھوڑ کے چلے گئے۔ بھرم یہاں بیٹھے کیوں رونا رو رہے ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہاری قیمتی چیزیں بچ گئیں اور ڈاکو خالی ہاتھ لوٹ گئے۔"

دوسرے نے کہا۔ "نہیں یار! وہ میری سب سے قیمتی چیز لے اڑے۔"

پہلے نے حیرانی سے پوچھا۔ "وہ کیا۔"

دوسرے نے روہا کی آواز میں کہا۔ "میرا ہیلمٹ!"

مرسلہ۔ الطہر حسین، کراچی

بلال نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔ "واقعی؟"

عامر کا فصر بے قابو ہونے لگا۔ اس نے سر دھجے میں کہا۔ "فرحانہ سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے بہتر ہوگا اس کا ذکر کرنے سے بھی گریز کرو۔"

وہ کہہ کر اندر چلا آیا۔ فرحانہ کی گاڑی میں خاصا کام تھا۔ سامنے کا بونٹ، بھیر اور ریڈی ایٹر تباہ ہو گیا تھا۔ سرست کے ساتھ ڈینٹنگ پیٹنگ کا کام بھی تھا۔ اس نے فرحانہ کو کال کی۔ "گاڑی بننے میں ایک ہفتہ لگ جائے گا، کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔ میرے پاس ایک وٹر ہے۔ ابھی مکمل کی ہے۔ اسے ون کنڈیشن میں، میں وہ بیچ دیتا ہوں جب تک تم اسے استعمال کرو۔"

"ضرورت نہیں ہے۔ صبح عامر بھائی مجھے چھوڑ دیں گے اور شام میں کسی کو لیک کے ساتھ آ جاؤں گی۔"

عامر نے کہنا۔ "اوکے، ویسے اگر تم محسوس کرو کہ ضرورت ہے تو مجھے کال کر دیتا۔ میں اسی وقت بھیج دوں گا۔"

جب تک تمہاری گاڑی ٹھیک نہیں ہو جاتی، میں اسے ہاشمی صاحب کے شوروم میں نہیں بھیجوں گا۔ تم ہاشمی صاحب کو جانچی ہو، ان کا بیٹا بلال تمہاری بی بی نیورٹی میں پڑھ چکا ہے۔"

فرحانہ نے کسی قدر توقف کے بعد کہا۔ "جانچی

اسے روک کر کہا۔

"میری بات سنو۔"

عامر اس کی طرف مڑا۔ "کیسے ایس بی صاحب۔"

"فرحانہ میری بہن نہیں ہے لیکن بہن جیسی ہی ہے اور کوئی بھائی پسند نہیں کرتا کہ کوئی ایسا شخص اس کی بہن کے نزدیک آئے جو اس کا استحقاق نہیں رکھتا ہو۔ میری بات سمجھ رہے ہو؟"

"سمجھ رہا ہوں۔"

"بس تو آئندہ اس کا خیال رکھنا۔"

عامر باہر نکل گیا اور عامر نے دروازہ بند کر لیا۔ وہ مڑا تو نامزد ایک ہی کھڑی تھی۔ اس نے کہا۔ "تم فرحانہ کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی حساس ہو رہے ہو۔ وہ کوئی بچی نہیں ہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا لیکن ہماری ایک تہذیب اور رسم و رواج ہیں۔ اس میں مرد و عورت کا اس قدر گھلنا اچھی بات نہیں ہے۔" عامر سیزیموں کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ "شاید تمہیں یاد ہوگا جب ہماری بات طے ہوئی تو اس کے بعد شادی تک میں نے تمہاری ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی حالانکہ ہم بچپن سے ساتھ کھیلے ہیں۔"

"ہاں مگر فرحانہ شہر اور مختلف ماحول میں پٹی بڑھی ہے۔" نامزد اس کے پیچھے آئی۔ "سب سے بڑھ کر وہ... خود مختار ہے اور اپنی مرضی کر سکتی ہے۔"

عامر نے رک کر نامزد کو دیکھا۔ "فرحی کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتی جو اس کے کردار کو گرا دے۔"

☆☆☆☆

عامر فرحانہ کی کار کا معائنہ کر رہا تھا کہ اسے نزدیک کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو بلال پاس کھڑا ہوا تھا۔ عامر نے ہاتھ ہلایا۔ اس نے جواباً ہاتھ ہلایا اور بولا۔ "یہ فرحانہ کی کار ہے؟"

عامر چونکا۔ "ہاں لیکن تم کیسے جانتے ہو؟"

بلال مسکرایا۔ "تم بھول رہے ہو، میں اس کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھ چکا ہوں اور وہ اکثر یہاں تمہاری ورکشاپ میں آتی ہے۔ میرا خیال ہے وہ بینک سے گاڑی ٹھیک کرائی ہے۔"

عامر کو اس کے منہ سے فرحانہ کا ذکر اتنی بے تکلفی سے من کر فصر آنے لگا۔ اس نے کہا۔ "میں صرف اس کی گاڑی ٹھیک نہیں کرتا ہوں، میں اس کا منیجر بھی ہوں۔"

کے گھر ڈراپ کرتے ہوئے کچھ دیر کے لیے اندر گئی تو اسے گاڑی میں ٹھیسے کا موقع مل گیا۔"

عامر نے سر ہلایا۔ "پولیس نے گاڑی میری ورکشاپ پہنچا دی ہے۔ اس کے پیچھے دونوں دروازوں کے لاک درست حالت میں پائے گئے ہیں۔"

"یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔" فرحانہ بولی۔ "وہ اترتے ہوئے مین دبا کر دروازہ لاک کر سکتا تھا۔"

"مین لاک بھی ٹھیک ہے اور اس میں گز بڑ کے آثار نہیں ہیں۔"

فرحانہ کسی قدر جھنجھلا گئی۔ "میں کیا کہہ سکتی ہوں مگر میں نے جو دیکھا، مجھے اس پر پورا یقین ہے۔"

"میں تمہیں غلط نہیں سمجھ رہا۔" عامر نے نرمی سے کہا۔ "میں صرف اتنا بتا رہا ہوں کہ اس نے کوئی نشان نہیں چھوڑا ہے۔"

"عامر بھائی نے بتایا ہے کہ فٹ سیٹ پر تازہ منی کے نشان ملے ہیں۔"

"مگر اس سے اس شخص کی نشان دہی نہیں ہوگی۔ آخر وہ کیوں تمہارے پیچھے بڑ گیا ہے؟"

"میں نہیں جانتی مگر اب میرے دل میں خوف بیٹھ گیا ہے۔ میں شاید پہلے کی طرح بے خوفی سے باہر نہیں جا سکوں گی۔"

عامر نے بینڈ کے کنارے بیٹھے ہوئے اس کا نازک ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں لے لیا۔ "میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تمہیں مسئلہ ہو تو مجھے ایک کال کر دینا، میں جہاں بھی ہوا آ جاؤں گا۔"

فرحانہ نے آگے ہو کر اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔

"عامر! مجھے تمہارا بہت سہارا ہے۔"

عامر نے اس کے بال سہلائے۔ "میں جانتا ہوں اور اسی لیے چاہتا ہوں کہ تم جلد از جلد میری زندگی میں آ جاؤ تاکہ میں ہر طرح سے تمہاری دیکھ بھال اور حفاظت کر سکوں۔"

"بس میرے پیچھے نہ ہو جائیں، پھر میں جلد فیصلہ کر لوں گی۔" فرحانہ نے اس سے وعدہ کیا۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور

عامر اندر آیا تو فرحانہ جلدی سے عامر سے دور ہو گئی اور وہ کھڑا ہو گیا۔ عامر کا چہرہ تن گیا تھا مگر اس نے صرف اتنا کہا۔

"فرحی! تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

"اوکے میں چلتا ہوں۔" عامر نے کہا۔

"بائے۔" فرحانہ بولی اور عامر باہر نکل آیا۔ عامر اس کے پیچھے تھا۔ وہ دروازے تک اس کے ساتھ آیا اور

"ڈاکٹر نے اسے آرام کرنے کو کہا ہے۔"

عامر مایوس ہوا اس نے بو کے عامر کی طرف بڑھایا۔ "اوہ۔ کوئی بات نہیں، یہ اسے میری طرف سے دیکھیں گے۔"

"میرا خیال ہے وہ مل سکتی ہے۔" خلاف توقع نامزد نے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

عامر خوش ہو گیا اور عامر گہری سانس لے کر وہ گیا۔ فرحانہ بینڈ پر سر ہانے سے ٹپک لگائے بیٹھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ نامزد نے اندر آ کر کہا۔ "عامر ملے آیا ہے۔"

فرحانہ اٹھ بیٹھی۔ "بلاؤ۔"

عامر اندر آیا اور اس نے بو کے اس کی طرف بڑھایا۔ "کیسی ہواب؟"

"ٹھیک ہوں۔" فرحانہ نے کہا۔ اسے نامزد کی موجودگی سے بے چینی ہو رہی تھی۔ اس نے بھانپ لیا اور بولی۔

"عامر! تمہارے لیے جائے کافی کیا بھجواؤں؟"

"نو ٹھیکس۔" اس نے کہا۔ "میں زیادہ دیر نہیں رکوں گا۔"

نامزد دروازہ بند کرتی ہوئی پٹی گئی۔ عامر نے اب نظر ہٹا کر فرحانہ کو دیکھا تو اس کا رنگ سرخ ہونے لگا۔ "ہوا کیا تھا؟"

"بہت اچانک ہوا۔ میں گھر آ رہی تھی اور عامر بھائی کی کال آئی تھی کہ میں نے بیک سر میں ایک اپر پش کو بیک سیٹ پر دیکھا۔ میں بدحواس ہو گئی اور اسی میں گاڑی فٹ

پاٹھ پر چڑھ کر لوہے کے ڈنگے سے ٹکرائی۔ میرا سراشیئر ٹک پر لگا اور مجھے ہوش نہیں رہا۔"

"تمہی دیر بے ہوش رہی؟"

"مشکل سے ایک منٹ۔"

"جب تمہیں ہوش آیا تو پچھلی سیٹ پر کوئی نہیں تھا؟"

"وہ جو بھی تھا، اس موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ چکا تھا۔"

عامر ہچکچایا۔ "فرحی! ممکن ہے یہ تمہارا دہم ہو۔"

فرحانہ کو فصر آ گیا۔ "خدا کے لیے تم مجھے نامزد کی طرح نفسیاتی مریض مت سمجھو۔"

"نامزد۔" وہ چونکا۔

فرحانہ نے سر ہلایا۔ "اس کا خیال ہے میں اس کی بات سے بے خبر ہوں مگر میں جانتی ہوں وہ کچھ دیر ہے کہ... اپر پش میرا دہم ہے اور اس کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، وہ گاڑی میں کیسے آیا؟"

"وہ میرا پیچھا کر رہا ہوگا اور جب میں اپنی فیلو کو اس

ہوں مگر سرری سا۔

”وہ تو کہیں بہت اچھی طرح جانتا ہے۔“

”جانتا ہو گا۔“ فرحانہ نے بے پردائی سے کہا۔ ”ویسے بھی وہ دوسرے ڈپارٹ میں تھا اور ہمارا سامنا بھی کم ہوتا تھا۔“

”او کے اپنا خیال رکھتا۔“ عامر نے کہا اور موبائل رکھ دیا۔ وہ سڑک کے پار متاز ہاشمی کے شوروم کی طرف دیکھ رہا تھا جس کے باہر نئی اور استعمال شدہ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان گاڑیوں کی مالیت کروڑوں میں تھی۔

☆☆☆

فرحانہ بیڈ پر نیم دراز ہوئی اور ریوٹ اٹھا کر نئی دی آن کر کے چمچل تھامنے لگی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے اور وہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔ شاید اس لیے اس نے نئی دی لگا لیا۔ ایک نیو چمچل لگا یا تو رک گئی۔ اس پر رات کی تاریکی میں آگ کا سحر دکھارہے تھے۔ شعلوں سے لگ رہا تھا کہ آگ بہت پھیلی ہوئی ہے اور کسی بڑی جگہ لگی تھی۔ فرحانہ نے خبر سننے کے لیے آواز تیز کی۔ موقع سے خبر دیئے والا رپورٹر کہہ رہا تھا۔ ”آگ ایک گھنٹا پہلے لگی اور اس نے دیکھتے ہی دیکھتے اس پورے آٹو شوروم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آگ گاڑیوں کے فیول ٹینکس تک پہنچی تو اس میں مزید شدت آگئی۔ فائر بریگیڈ کی مزید گاڑیاں یہاں آ رہی ہیں۔ مگر ایسا لگ رہا ہے، آگ ان کے قابو سے باہر ہو گئی ہے۔“

پس سحر میں فائر بریگیڈ کا سائرن بھی سنائی دے رہا تھا۔ کیرا گھوما اور اس نے نئی آنے والی گاڑی کو دکھایا تو اس کے پیچھے اے اے آٹو زکا بورڈ دکھائی دیا۔ اے اے آٹو ز عامر کی ورکشاپ کا نام تھا اور اس کے مخالف سمت میں متاز ہاشمی کا آٹو شوروم تھا۔ آگ اسی میں لگی ہوئی تھی۔ فرحانہ کے پاس بلال کا نمبر تھا۔ اس نے سوچا اور پھر اسے کال کی۔ ”بلال! میں فرحانہ بات کر رہی ہوں نئی دی پر دکھا رہے ہیں کہ تمہارے شوروم میں آگ لگ گئی ہے۔“

وہ موقع پر موجود تھا اور روہنا سا ہو رہا تھا۔ ”ہم تباہ ہو گئے، پاپا کو ہارٹ ایک ہو گیا ہے۔ وہ اسپتال میں ہیں۔“

”میرے خدا! مجھے بہت افسوس ہوا سن کر۔ مگر یہ ہوا کیسے ہے؟“

”جانتیں، یہاں کا چوکیدار غائب ہے۔“

”ممکن ہے آگ کسی حادثے کی وجہ سے لگی ہو۔“

”کسی بھی وجہ سے لگی ہو لیکن ہم تباہ ہو گئے۔ شوروم میں دو کروڑ کی گاڑیاں تھیں اور اس میں سے کچھ نہیں بچا ہے۔“

فرحانہ نے پھر افسوس کیا اور کال کاٹ دی۔ اسی لمحے اس کا موبائل بولا۔ عامر کی کال تھی۔ ”تم کس سے بات کر رہی تھیں؟“

”بلال سے۔“ فرحانہ نے جواب دیا۔ ”ابھی میں نے نئی دی پر دیکھا ہے، ان لوگوں کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔“

”کاروبار میں انسان کو نقصان بھی ہوتا ہے۔“ عامر نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ ”میں بھی یہیں ہوں۔ نئی دی پر دیکھ کر آیا ہوں۔“

”تمہاری ورکشاپ کو تو خطرہ نہیں ہے؟“

”نہیں، یہ سڑک کے پار اور محفوظ ہے۔“ عامر نے کہا۔ ”اب میں گھر جاؤں گا۔“

☆☆☆

عامر اپنی کار کی طرف جا رہا تھا اور اس نے دروازہ کھولا تھا کہ عقب سے کسی نے اس کا بازو پکڑا۔ وہ چونک کر مڑا۔ اس کا ہاتھ پکڑنے والا بلال تھا۔ اس نے سر دھچکے میں کہا۔ ”تم نے اچھا نہیں کیا۔“

عامر نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چمڑا لیا۔ ”کیا اچھا نہیں کیا؟“

بلال کا چہرہ سنا ہوا تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے شعلوں میں گھرے شوروم کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں اس کی بات کر رہا ہوں۔“

”تمہارا دماغ خراب ہے، میں ایسا کیوں کروں گا۔“

”کیونکہ میں جانتا ہوں یہ تم ہی کر سکتے ہو۔ بس کل ذرا پولیس رپورٹ آنے دو پھر میں تم سے بات کروں گا۔“ بلال نے کہا اور جھٹکے سے سڑکروں سے چلا گیا۔ عامر کچھ دیر اسے دیکھتا رہا مگر اس کے چہرے پر غصے کے بجائے سکراہٹ تھی۔ پھر وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اگلے دن وہ ورکشاپ پہنچا تو کچھ دیر بعد ہی ایک انسپکٹر اس کے پاس آیا۔ شوروم میں لگی آگ بجھ چکی تھی مگر اس نے وہاں مزید جلنے کے قابل کچھ چھوڑا نہیں تھا۔ عمارت اور اندر موجود تمام گاڑیاں جل کر لمبے کا ڈھیر بن گئی تھیں۔ چھت کرنے سے کچھ گاڑیاں بچک کر رہ گئی تھیں۔ راکھ اور فائر بریگیڈ کی طرف سے ڈالا جانے والا پانی اب سیاہ کچڑ بن کر سڑک پر جمع تھا جسے صاف کی جا رہا تھا۔ انسپکٹر نے پہلے اس سے تعارف لیا اور کچھ سوالات کے بعد بولا۔

”تمہارے متاز ہاشمی سے کیسے تعلقات ہیں؟“

”کاروباری۔“ عامر نے جواب دیا۔ ”میں گاڑیاں رتی کندہ بیٹھ کر کے ان کے شوروم کے توسط سے فروخت کرتا ہوں۔“

”لیکن گزشتہ رات شوروم میں تمہاری کوئی گاڑی نہیں تھی۔“

”میں عام طور سے سینے دو سینے میں ایک گاڑی بنا کر دیتا ہوں۔ میں نے بھی ایک سے زیادہ گاڑیاں نہیں دیں۔ ابھی ایک گاڑی تیار ہے مگر میں نے پرسنل پوز کے لیے اسے روک کر رکھا ہے۔ شاید اسی وجہ سے یہ پتہ لگی۔“ عامر نے اندر کھڑی وٹز کی طرف اشارہ کیا۔

”متاز ہاشمی کے بیٹے بلال ہاشمی نے الزام لگایا ہے کہ یہ تمہارا کام ہے۔“

عامر نے برہمی سے کہا۔ ”اس کا دماغ خراب ہے۔ میں ایسا کام کیوں کرنے لگا؟ تو اپنے پیٹ پر لات مارنے والی بات ہوگی۔ اب میرا کام بھی تو رک گیا ہے۔ بلال نے وجہ نہیں بتائی کہ میں ایسا کیوں کروں گا؟“

انسپکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس نے کوئی وجہ نہیں بتائی۔“

”میرا تعلق متاز ہاشمی سے ہے۔ بلال سے میری بہت بات ہوئی ہے۔ شاید اسی لیے وہ مجھے پسند نہیں کرتا ہے اور اس نے میرا نام لے دیا۔ متاز صاحب کا کیا بیان ہے؟“

”وہ ہارٹ ایک کی وجہ سے آئی سی یو میں ہیں۔“ انسپکٹر نے جاتے ہوئے کہا۔ عامر نے دیکھا کہ پولیس والے جانے وقوع کا معائنہ کر رہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد انسپکٹر دوبارہ آیا اور اس بار اس کے ہاتھ میں ایک سیلا سا کپڑا تھا۔ یہ تو لیا تھا کپڑا تھا جو عامر اپنی ورکشاپ میں صفائی کے لیے استعمال کرتا تھا۔ وہ یہ کپڑا ہول سیل سے وٹن کے حساب سے خریدتا تھا۔ ہاتھ پاؤں کے بعد اس سے فرش اور پرزے صاف کیے جاتے تھے اور جب کپڑا بالکل ہی سیلا ہو جاتا تو اسے ڈسٹ بن میں ڈال دیا جاتا تھا۔ انسپکٹر نے کپڑا عامر کو دکھایا۔ ”یہ تمہاری ورکشاپ میں استعمال ہوتا ہے؟“

”لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔“ عامر نے کہا۔ ”لیکن یہاں موجود تمام ورکشاپس اور آٹو شوروم کو یہی کپڑا سپلائی کیا جاتا ہے۔“

”جیلے ہوئے شوروم سے ایسے کم سے کم دو کپڑے ملے ہیں جو آگ لگا کر اندر پھینکے گئے تھے لیکن کسی وجہ سے ان کی آگ بجھ گئی۔ کئی جگہوں سے ایسی راکھ ملی ہے جو اسی قسم کے کپڑے کے جلنے سے بنتی ہے۔“

عامر نے حیرت سے کہا۔ ”آپ کا مطلب ہے کہ کسی

نے شوروم میں آگ لگائی ہے؟“

”بالکل۔“ اب یہ سچ ہو رہا ہے۔

”خیر میرا اس معاملے میں کوئی ہاتھ نہیں ہے۔“ عامر نے ہاتھ اوپر کیے۔ ”چوکیدار کہا ہے؟“

”اس کا کہنا ہے کہ وہ پانی لینے نہ لگا۔ ریکٹ تک گیا تھا اور جب وہاں آیا تو یہاں آگ لگ چکی تھی۔ کام کسی ایسے فرد کا ہے جو چوکیدار کی رواجی سے واقف تھا۔“

”میں قطعی بے خبر تھا اور میں شام سات بجے تک ورکشاپ بند کر کے گھر چلا جا ہوں۔“

”کل بھی تم سات بجے چلے گئے تھے؟“

”ہاں شاید سو اسات بجے تک۔“

”اس کے بعد تم وہاں نہیں آئے؟“

”آگ لگنے کی نیوز نئی دی پر بھی تو آیا تھا مگر پھر چل گیا تھا۔“

”کوئی ایسا فرد جو گواہی دے سکے کہ تم سات سے گیارہ کے درمیان گھر میں تھے؟“

عامر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کوئی گواہ نہیں ہے۔ میں اکیلا رہتا ہوں اور اتفاق سے کسی سے ملاقات بھی نہیں ہوتی۔“

انسپکٹر چلا گیا اور عامر سوچ رہا تھا کہ بلال نے فرحانہ کے حوالے سے ہونے والی سچ کلامی کا ذکر انسپکٹر سے کیوں نہیں کیا؟ جبکہ اس کے خیال میں عامر نے شوروم میں آگ اسی وجہ سے لگائی تھی۔ وہ فرحانہ کی کار پر کام کر رہا تھا اور اس کا سڑ جانے والا چیلنجر میڈیا کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس میں نیار یڈی ایئر لگتا۔ ہونٹ الگ کر کے اس کے ورکر ٹھیک کر رہے تھے۔ مرمت کا مکمل ہو جانے کے بعد پینٹ کیا جاتا۔ وہ کام کر رہا تھا کہ ایک کار آر کر کی اور اس سے فرحانہ اتری۔ اسے دیکھ کر عامر کھل اٹھا۔ وہ ہاتھ صاف کرتا ہوا باہر آیا۔ فرحانہ نے پہلے افسوس سے جیلے ہوئے شوروم کو دیکھا اور پھر اس کی طرف آئی۔ ”کیسے ہو تم؟“

”ٹھیک ہوں۔“ عامر نے سرسری سے انداز میں کہا۔ ”بلال نے مجھ پر الزام لگا دیا ہے کہ میں نے شوروم میں آگ لگائی ہے۔“

فرحانہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”سچ میں؟“

”بالکل سچ لیکن میرے لیے یہ جوک آف دی ڈے ہے۔“

”وہ احمق ہے۔ تمہیں بھلا کر کرنے کی کیا ضرورت ہے بلکہ شوروم سے تمہارا بھی بزنس چلتا ہے۔“

”تھا۔“ عامر نے شوروم کی طرف دیکھا۔ ”اب اگر متاز ہاشمی نے اسے دوبارہ سے بتا لیا تب بھی میں اس سے

بزنس نہیں کروں گا۔

”میں تمہیں بتانے آئی ہوں کہ کل سے کلاسز آف ہو رہی ہیں اور دو ہفتے بعد سپر ز ہیں۔“

عامر ذرا آگے جھکا۔ ”اور اس کے بعد؟“

فرحانہ کارنگ لگائی ہو گیا۔ ”میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کے فوراً بعد ہم شادی کر لیں گے۔“

عامر کے چہرے پر ناقابل یقین خوشی نمودار ہوئی۔ اگر وہ سرعام نہ ہوتے تو شاید وہ کوئی حرکت کر جاتا۔ اس نے دونوں مٹھیاں پہنچ کر ہلکی سی چیخ ماری۔ ”یس۔“

”میں آج حامد بھائی کو بھی بتا دوں گی۔“ فرحانہ اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بولی۔

”ایس پی صاحب لازمی رکاوٹ ڈالیں گے۔“ عامر نے یقین سے کہا۔

”تم حامد بھائی کی فکر مت کرو۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں اور میری مرضی میں خوش ہوں گے۔“

”وہ مجھے ناپسند کرتے ہیں۔“

”ماما پاپا بھی تمہیں پسند نہیں کرتے تھے۔“ ماں باپ کا ذکر کرتے ہوئے فرحانہ کا لہجہ دھیما ہو گیا تھا۔ ”مگر میں تمہاری ہونے والی ہوں۔ اسی طرح کسی اور کی پسند ناپسند سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

وہ اپنے جوش پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”میں ابھی سے تیاری شروع کر دیتا ہوں۔“

”عامر! میں کتنی ہی آزاد خیال اور بولڈ کسی لیکن ہماری کچھ روایات ہیں۔“

”کیسی روایات؟“

”ایک تو یہ کہ ہم اب شادی سے پہلے نہیں ملیں گے۔“

”مجھے منظور ہے۔ مگر سب ملے کون کرے گا؟“

”حامد بھائی۔“ فرحانہ نے جواب دیا۔ ”شادی

سادگی سے ہوگی اور اس میں دونوں طرف سے بس چند لوگ شریک ہوں گے۔“

”مجھے منظور ہے۔“

”اور ہم شادی کے فوراً بعد ہنی مون منانے پہاڑوں

میں تمہارے کایچ پر جائیں گے۔“

عامر چونکا۔ ”اتنی جلدی۔ ہم بعد میں بھی جاسکتے ہیں۔“

”نہیں، ہم شادی کے فوراً بعد جائیں گے۔“ فرحانہ

نے حتمی لہجہ میں کہا۔ ”میری خواہش ہے کہ ہماری شادی کی پہلی رات وہیں گزرے۔“

عامر کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے سر

ہلایا۔ ”ٹھیک ہے اور کوئی شرط۔“

”اس میں کوئی بھی شرط نہیں ہے، میری خواہش ہے،

کیا تم میری خواہش پوری نہیں کرو گے؟“ فرحانہ نے یوں کہا کہ عامر پھسل گیا۔

”کیوں نہیں کروں گا۔“

”تب شادی تک کے لیے بائے۔“

”رکو..... میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔“

فرحانہ منع کرنے والی تھی مگر عامر کی ملتی جلتی صورت دیکھ کر رک گئی۔ ”ٹھیک ہے، گاڑی نکالو۔“

عامر جلدی سے گاڑی نکال لایا۔ اس نے راستے میں کہا۔ ”شادی کے بعد تو تم میرے ساتھ رہو گی۔“

فرحانہ نے سر ہلایا۔ ”بالکل..... میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔“

”تھینک یو کیونکہ میں سسرال میں رہنے کا بالکل بھی قائل نہیں ہوں۔“

”میں بھی اسی بات کی قائل ہوں کہ بیوی شوہر کی ذمہ داری ہوتی ہے۔“

”ایس پی صاحب اور ان کی بیگم کو بھی میں رہیں گے؟“

”ہاں جب تک وہ اس شہر میں ہیں، یہیں رہیں گے۔

یہ پاپا کی اور اب میری خواہش ہے۔ یوں سمجھ لو کہ حامد بھائی ہی میرا میکا ہوں گے۔“

عامر نے فرحانہ کو اس کی کونٹھی پر چھوڑا اور واپس

ورکشاپ آگیا۔ اب اسے انتظار تھا کہ کب حامد اس کے

پاس آتا ہے۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اگلے ہی

دن حامد اس کی ورکشاپ پر آیا۔ وہ سادہ لباس میں تھا اور

اس نے اندر آنے کے بجائے عامر کو باہر آنے کا اشارہ

کیا۔ حامد نے بلا تمہید کہا۔ ”تم جانتے ہو یہ شادی فرحانہ کی

خواہش پر ہو رہی ہے۔“

”میری تو خواہش ہے کہ آپ سب بھی اس میں خوش ہوں۔“

حامد نے اس کی بات نظر انداز کی۔ ”اگلے اتوار تک

تم اپنے گھر والوں کو لے آؤ تاکہ بات چکی ہو جائے اور

سب کچھ ملے ہو جائے۔“

عامر کہتے کہتے رک گیا کہ آپ کی لاڈلی بہن سب

ملے کر چکی ہے اور اس کے گھر والوں کے لیے کچھ نہیں چھوڑا

ہے۔ اس نے پھر سر ہلایا۔ ”میں لے آؤں گا۔“

”فرحانہ کو فریئر میں دوں گا۔ اپنا ایڈریس دے دو

فریئر وہاں پہنچ جائے گا۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس بار عامر کا لہجہ بھی

سرد تھا۔ "میرا... مگر تیار نہیں ہوا ہے اور یہ سب فرمانہ کو پسند آئے گا۔"

حامد نے اصرار نہیں کیا۔ اس نے نظر ہٹا کر عامر کو دیکھا۔ "فرمانہ معصوم لڑکی ہے۔ اس نے دنیا بہت زیادہ نہیں دیکھی ہے مگر میں آدمی کو ابھی طرح جانتا ہوں۔ یاد رکھنا اگر اسے ذرا بھی تکلیف ہوئی تو تمہیں اس کا حساب دینا ہوگا۔"

"میں اس سے محبت کرتا ہوں اور آدمی جس سے محبت کرتا ہے اسے تکلیف نہیں دیتا۔"

"بعض اوقات وہی آدمی دنیا میں سب سے زیادہ تکلیف دیتا ہے جس سے محبت کی جائے۔" حامد نے کہا اور رخصت ہو گیا۔ سڑک کے پار چند مزدور چلے ہوئے شوروم کا لمبا اٹھا کر ایک ٹرک میں ڈال رہے تھے۔ بلال کھڑا ہوا ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ عامر اس کی طرف بڑھا۔ بلال نے اسے نظر انداز کیا مگر وہ خود اس کے پاس پہنچ گیا۔

"ہاشمی صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" وہ سرد لہجہ میں بولا۔ "یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ شوروم میں کسی نے آگ لگائی مگر یقین کر دو وہ میں نہیں ہوں۔"

بلال نے منہ پھیر لیا۔ اس کا اشارہ واضح تھا کہ وہ اس سے بات کرنا نہیں چاہ رہا مگر عامر بھی اس سے بات کرنے نہیں آیا تھا۔ وہ اسے اطلاع دینے آیا تھا۔ "دو ہفتے بعد میری اور فرمانہ کی شادی ہے۔"

بلال نے جھٹکے سے اس کی طرف دیکھا۔ اس لیے عامر کو اس کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت نظر آئی۔ اس نے گھٹے ہوئے لہجہ میں کہا۔ "چلے جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔ اس سے پہلے کہ میرا ضبط جواب دے جائے۔"

عامر یوں مسکرایا جیسے بلال نے اسے مبارکباد دی ہو۔ "ویسے تو کم لوگ ہوں گے مگر تم بھی شریک ہوئے تو مجھے خوشی ہوگی۔"

بلال ایک قدم آگے آیا مگر عامر آگے بڑھ گیا تھا۔ بلال رک کر اپنے ہونٹ کا تارہ کیا۔

☆☆☆

حامد اور ناصر کے فلور سے ان کے تیز تیز بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ فرمانہ نیچے بیٹھی تھی اور وہ جانتی تھی کہ موضوع گفتگو وہی ہے۔ کچھ دیر پہلے حامد اس سے بات کر کے گیا تھا۔ وہ اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ عامر سے شادی کا فیصلہ بدل دے۔ حامد کا کہنا تھا کہ عامر وہ

نہیں، جو نظر آتا ہے۔ اگر شادی کے بعد اس کی اصل شخصیت سامنے آئی تو فرمانہ کو دھچکے لگے گا۔ اس لیے بہتر ہے وہ ابھی فیصلہ کر لے۔ مگر فرمانہ نے حامد سے کہا۔ "مجھے عامر پر پورا اعتماد ہے اور میں اسے اب سے نہیں برسوں سے جانتی ہوں اور جہاں تک نگاہ باطن میں فرق کی بات ہے تو آپ جانتے ہیں، تقریباً ہر شخص کے نگاہ و باطن میں فرق ہوتا ہی ہے۔ مجھے یقین ہے میں شادی کے بعد اس کے ساتھ خوش رہوں گی۔"

حامد کا کام ہو کر دوپہر گیا تو ناصر اس سے اچھے لگی کہ اسے فرمانہ کو سمجھانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ بچی نہیں ہے۔ اپنا اچھا برا سمجھتی ہے۔ حامد نے جواب دیا اور بات بڑھتی گئی۔ اب دونوں تھک چکے تھے۔ ان کی آوازوں سے قطع نظر فرمانہ سکون سے بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد ناصر اوپر سے ایک بیگ لے کر اتری اور اس نے شرر بار نظروں سے فرمانہ کو دیکھا۔ "میں اس گھر سے جا رہی ہوں۔"

"ضرور جائیں۔" فرمانہ نے غلاب توقع اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ "آپ نے حامد بھائی کو سوائے فیشن کے اور دیا ہی کیا ہے؟"

ناصر نے زبردستی لہجہ میں کہا۔ "جس عورت کے شوہر کو سوائے اس کے دنیا کی ہر عورت کی فکر ہو تو اسے فیشن کے سوا اور کیا دے سکتے ہیں۔ وہ شوہر میرا ہے لیکن یہاں تمہارے ساتھ رہنے کے لیے مرا جا رہا ہے۔"

"آپ کی اس گھٹیا بات کا جواب ہے میرے پاس مگر کچھ میں ہتھ مار دو تو مجھ سے خود پر آتے ہیں۔" فرمانہ نے آرام سے کہا۔ "بہتر یہی ہوگا آپ چلی جائیں۔"

ناصر پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی اور کچھ دیر بعد اوپر سے حامد بیٹھے آیا۔ اس کا چہرہ زرد و زور ہا تھا۔ فرمانہ اٹھ کر اس کے پاس آئی اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ میں سمجھ رہی ہوں کہ آپ کس مشکل میں ہیں۔ میری طرف سے کوئی دباؤ نہیں ہے۔ اگر ناصر الگ رہنا چاہتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"تم نے اس کا رویہ دیکھا۔" حامد کا لہجہ شکایتی تھا۔ "میں نے اس سے کہا کہ بس چند دن انتظار کر لے۔ تمہاری شادی ہو جائے تو میں اسے الگ گھر لے کر دے دوں گا مگر وہ یہاں رہنے کے لیے بالکل تیار نہیں ہے۔"

"وہ ٹھیک ہو جائے گی۔"

"وہ ٹھیک نہیں ہوگی۔" حامد نے جتنی سے کہا۔ "وہ سائیکا لوجی پڑھ رہی ہے مگر وہ خود سائیکو ہو چکی ہے۔ وہ مجھے

چھوڑ کر جا چکی ہے۔"

فرمانہ نے حامد کو صوفے پر بٹھایا اور خود اس کے برابر بیٹھ گئی۔ "اگر وہ چلی گئی ہے تو میں ہوں نا آپ کے پاس۔"

حامد نے چونک کر فرمانہ کو دیکھا۔

☆☆☆

"فرمانہ ولد ریاض علی تمہیں عامر حسین ولد امر حسین سے نکاح قبول ہے؟" نکاح خواں نے اس سے پوچھا اور تین بار پوچھنے کے بعد جب فرمانہ نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے نکاح کا اعلان کر دیا۔ نکاح نامے پر سائن پہلے ہی ہو چکے تھے۔ تقریب میں دونوں طرف سے مشکل سے ایک درجن افراد شریک تھے۔ عامر کے گھر والوں کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ صرف بیٹے کی وجہ سے ایسی شادی پر آمادہ ہوئے تھے ورنہ ان کے ہاں سادگی سے شادی گناہ سے کم نہیں سمجھی جاتی۔ حامد نے تمام انتظامات کیے تھے۔ اس نے کھانے کے لیے کیرٹک والوں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ناصر نے شادی میں آنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ خاندان کے چند ایک قریبی ممبر شریک تھے۔ ان میں حامد کی ماں بھی تھی جو فرمانہ کی خالہ تھی۔ اسی نے سرپرست کی حیثیت سے فرمانہ کو رخصت کرنا تھا۔ تقریب دن کی تھی اور شام کے وقت رخصتی تھی۔ فرمانہ کا ذاتی سامان عامر کی گاڑی کی ڈکی میں رکھ دیا گیا تھا۔ رخصتی سے پہلے حامد، عامر کو ایک طرف لے گیا اور بولا۔

"میری بات یاد رکھنا، فرمانہ کو کوئی تکلیف ہوئی تو اس کی ادائیگی نہیں کرنا ہوگی۔"

"فکر مت کریں، اب وہ میری ذمہ داری ہے۔" عامر نے جواب دیا۔ روائی کے وقت اس کا سوڈا اس دھمکی پر کچھ دیر خراب رہا تھا مگر جب وہ کونٹھی سے نکل آئے تو برابر میں بیٹھی فرمانہ کے پاس سے آتی خوشبو نے خود یہ خود اس کا سوڈا اچھا کر دیا۔ وہ چپ تھی اور سر جھکائے بیٹھی تھی۔ عامر کی باتوں کے مختصر جواب دے رہی تھی۔ اس کی جھجک محسوس کرتے ہوئے عامر خود بھی خاموش ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ شرمارہی ہے۔ عامر کا فیملی کا بیج دار حکومت سے کچھ دور پہاڑوں میں تھا۔ ایک گھنٹے کی ڈرائیو تھی۔ کانج کی دیکھ بھال کے لیے ایک چوکیدار ہوتا تھا۔ کانج میں نیچے ایک بیڈروم، ایک لاؤنج اور ایک کچن تھا۔ ایک اچھا ہاتھ اور ایک کامن تھا۔ اوپری منزل میں ایک بیڈروم اور تھا۔ وہ ایک گھنٹے سے بھی پہلے وہاں پہنچ گئے۔ رات ہو چکی تھی۔ چوکیدار موجود تھا۔ عامر نے اس سے کانج کی چابی لی

اور حال احوال پوچھ کر اسے رخصت کر دیا اور خود فرمانہ کا سامان نکال کر اندر لایا۔ فرمانہ نے شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا اور میک اپ بھی تیار تھا۔ وہ وہن تو نظر نہیں آرہی تھی مگر عامر کو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ شاید اس لیے بھی کہ اب وہ اس کی تھی۔ حامد نے ان کے لیے کھانا بھی پیک کر دیا تھا۔ عامر نے فرمانہ سے پوچھا۔

"کھانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "بھوک لگی ہے۔"

وہ کچن میں آگئے۔ عامر پیکٹ کھول کر گرم کرنے لگا پھر اس نے میز پر رکھا۔ فرمانہ خاموش بیٹھی رہی۔ کھانے کے دوران عامر نے اس سے پوچھا۔ "تم خاموش کیوں ہو؟"

"مجھے ماما پاپا یاد آرہے ہیں۔"

"اوہ۔" عامر نے گہری سانس لی۔ "یہ فطری امر ہے۔"

"عامر! اس روز وہاں کیا ہوا تھا؟" فرمانہ نے پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے۔"

"ہاں لیکن میں تمہاری زبانی سننا چاہتی ہوں۔ میں نے آج تک تم سے نہیں پوچھا۔"

عامر سوچ کر کہنے لگا۔ "میری کار تمہاری گاڑی کے پیچھے تھی۔ بارش بہت تیز تھی۔ جب ہم کراٹک کے پاس پہنچے۔۔۔۔۔ سنکل ریڈ تھا اور ٹرین آنے والی تھی۔ مگر اس کی روشنی ابھی نظر نہیں آتی تھی۔ اصل میں بارش کے شور میں نہ اس کی آواز آئی اور تیز بارش کی وجہ سے روشنی بھی دکھائی نہیں دی تھی۔ شاید تمہارے پاپا نے سوچا کہ ٹرین کے آنے سے پہلے وہ لائن کراس کر لیں گے۔ انہوں نے گاڑی آگے بڑھائی اور اسی وقت ٹرین آگئی۔" عامر بولتے بولتے رکا۔ "اس کے بعد تمہیں معلوم ہے۔"

فرمانہ کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔ "پتا نہیں میں کیسے بچ گئی۔"

"تم پچھلی سیٹ پر تھیں اور ٹرین نے گاڑی کے اگلے حصے کو کمر ماری تھی جہاں تمہارے ماما پاپا تھے۔"

فرمانہ نے ہاتھ روک لیا۔ "بس میں نے کھالیا ہے۔"

فرمانہ نے برتن اٹھائے اور سٹک میں رکھنے لگی۔ عامر اس کا ہاتھ ہٹا رہا تھا۔ وہ دونوں کچن کی کھڑکی کے سامنے تھے۔ شیشے کے پار لوہے کی گرل لگی تھی۔ اچانک کوئی گرل کے سامنے سے گزرا اور فرمانہ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ عامر نے بھی دیکھا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں دیکھتا ہوں۔"

"نہیں۔" فرمانہ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ "یہ وہی اپرپوش تھا، میں نے خود دیکھا ہے۔"

”میں دیکھتا ہوں۔“ عامر نے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ وہ بینہ روم میں گیا اور اس نے اپنا ہسٹل نکالا۔ وہ کانچ میں اسلحہ رکھتا تھا کیونکہ یہ جنگ تھا اور بعض اوقات یہاں کچھ بھی آجاتے تھے۔ فرحانہ پریشان تھی۔ عامر نے باہر جانے سے پہلے اس سے کہا۔ ”دروازہ اندر سے بند کر لو اور جب تک میری آواز نہ سنو دروازہ مت کھولنا۔“

عامر کے باہر جاتے ہی اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا اور اپنا آئی فون نکالا۔ یہ وہی آئی فون تھا جو ریاض علی نے اسے گفٹ کیا تھا۔ اس نے اب تک اسے سنبھال کر رکھا تھا۔ اس نے عامر کو کال کی اور روہانے لہجے میں بولی۔ ”وہ یہاں بھی آ گیا ہے۔“

”کون؟“ عامر بے چین ہو گیا۔ ”تم حیک ہو؟“ ”وہی اپر پوش اور عامر اسے دیکھنے باہر گیا ہے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

”تم نے دروازہ اندر سے بند کیا ہے؟“ ”ہاں۔“ فرحانہ نے کہا اور اسی لمحے فائر کی آواز آئی۔

عامر نے بھی فائر کی آواز سنی۔ وہ فرحانہ کو پکارنے لگا مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ لائن موجود تھی مگر فرحانہ اس کو جواب نہیں دے رہی تھی۔ عامر نے سوبائل جیب میں رکھا اسلحہ نکال کر الماری سے اپنا سرورس ہسٹل نکالا۔ وہ نیچے آیا اور اپنی گاڑی نکالی۔ گیٹ سے باہر آتے ہی وہ ہر ممکن تیزی سے روانہ ہو گیا۔ عامر کے کانچ کی لوکیشن اس کے علم میں تھی۔ اس نے ہائی وے پر آتے ہی مقامی ہیڈ کوارٹر کال کی اور اپنا تعارف کراتے ہوئے اس نے آپریٹر کو ہدایت کی کہ وہ اس پہاڑی علاقے کے پولیس اسٹیشن کال کرے وہاں سے پولیس کو فوری طور پر مذکورہ پتے پر جانے کو کہے۔ وہاں ایمر جیسی تھی اور کچھ لوگوں کی جان خطرے میں تھی۔ عامر جانتا تھا کہ عام طور سے پولیس کسی کی جان بچانے کے لیے بہ مشکل ہی وقت پر حرکت میں آتی تھی مگر اس نے ایس پی کی حیثیت سے کال کی تھی اس لیے امید تھی کہ اس کا فوری رد عمل ہوگا۔

عامر ہسٹل لیے کانچ کے اس طرف آیا جہاں اس نے اور فرحانہ نے اپر پوش کو دیکھا تھا۔ وہ بہت محتاط تھا اور اس نے ہسٹل آگے کیا ہوا تھا۔ اچانک اسے درختوں کے درمیان کسی کی جھٹک دکھائی دی اور اس نے بے ساختہ فائر کیا۔ مگر وہ بس ایک جھٹک تھی۔ اس کی چلائی ہوئی گولی نہ

جانے کہاں گئی تھی۔ وہ درختوں کی طرف بڑھا۔ کانچ اس پہاڑی ڈھلان پر سڑک سے کوئی سو گز اوپر تھا اور اس کے اوپر دو رنگ پہاڑ پر گھٹا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ اس علاقے میں درست کانچ پر پابندی تھی اس لیے یہاں کا جنگل محفوظ تھا۔ عامر کو جھٹک اوپر کی طرف دکھائی دی تھی۔ درختوں کے پاس آکر وہ سست ہو گیا۔ یہاں تاریکی تھی اور روشنی کی ضرورت تھی مگر اس کے پاس سوائے سوبائل کے اور کچھ نہیں تھا اس نے سوبائل نکال کر اس کا ایل ای ڈی لیمپس آن کر لیا۔ اس کی روشنی محدود تھی مگر کچھ فاصلے تک دکھا رہی تھی۔ وہ بالکل تاریکی میں نہیں تھا۔

ڈھلان زیادہ نہیں تھی مگر اسے قدم جما کر رکھنے پڑے تھے۔ یہاں گرنے کی صورت میں چوٹ اور نیچے لڑھکنے کا پورا امکان تھا۔ عامر اندر سے جھنجھکا رہا تھا۔ آج اس کی زندگی کا اہم ترین دن تھا۔ اس دن کے لیے اس نے کیا نہیں کیا تھا اور کتنے خواب دیکھے تھے مگر جب یہ دن آیا تو ساتھ ہی کوئی محسوس اس کی خوشیوں کا دشمن بن کر چلا آیا تھا۔ اس وقت عامر کے دل میں اتنا غمیش تھا کہ اپر پوش سامنے آتا تو وہ اسے شوٹ کرنے سے گریز بھی نہ کرتا۔ اس نے گولی چلا کر اپنے عزائم کا اظہار کر دیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ پہلی جھٹک کے بعد اپر پوش نے اس کے سامنے آنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ عامر کان لگا کر بن رہا تھا کہ شاید اپر پوش کے قدموں کی آواز سنائی دے مگر کوئی آواز نہیں تھی۔ وہ غاصا اوپر آ گیا تھا۔ اچانک ہی نیچے کانچ کی طرف سے بجلی سی نسوانی چیخ سنائی دی۔ اسے لگا کہ چیخ فرحانہ کی تھی۔ وہ بے تحاشا نیچے کی طرف بھاگا۔

کانچ کے پاس آتے ہی وہ چیخ چیخ کر فرحانہ کو آواز دی دینے لگا مگر اس کی طرف سے جواب نہیں آ رہا تھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ وہ آندھی طوفان کی طرح کانچ میں داخل ہوا۔ اس کا دروازہ کھلا دیکھ کر وہ ٹکر مند ہو چکا تھا اور اس کا غصہ درست ثابت ہوا جب اس نے اندر فرحانہ کو نہیں پایا۔ دروازے کے سامنے فرش پر بھی مونی درزی یوں مست گئی تھی جیسے کسی کو اس پر پہنچ کر لے جایا گیا ہو۔ عامر پاگل ہونے لگا۔ اس کے منہ سے گالیاں نکل رہی تھیں۔ وہ پھر کانچ سے باہر آیا اس نے دہاڑ کر کہا۔ ”کہاں ہو تم، فرحانہ کو چھوڑ دو۔“ وہ میری ہے صرف میری۔ کوئی اس کے اور میرے بیچ میں آیا تو میں اسے قتل کر دوں گا۔“ سنا تم نے۔“

”جیسا کہ تم نے میرے ماں باپ کو کیا تھا؟“ عامر کو عقب سے فرحانہ کی آواز آئی تو وہ بھڑک کر اس کی طرف

بڑھا۔ فرحانہ کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ عامر اس کی طرف بڑھا تھا کہ عقب سے کوئی چیز اس کی پشت چیرتی ہوئی اس کے جسم میں داخل ہو گئی۔ وہ کراہ کر زمین پر گر گیا اور اس نے پلٹ کر دیکھا تو بلال کو پا کر حیران ہوا۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا اور اس نے اپر پہن رکھا تھا جس کا ہڈ اب اس کے شانوں پر تھا۔ اس نے اسی خنجر سے عامر کی پشت پر وار کیا۔ ”تم۔“ عامر نے نفرت سے کہا اور ہسٹل نکالا ہاتھ اٹھا چاہا مگر اس سے پہلے کہ وہ ہسٹل سیدھا کر سکا فرحانہ نے اس سے ہسٹل چھین لیا۔ وار کاری تھا اور وہ کڑوا رہا گیا تھا۔ فرحانہ نے بلال سے کہا۔

”تم کانچ میں جاؤ، مجھے اس سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ اس سے پہلے کہ یہ مر جائے۔“

بلال خاموشی سے اندر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی فرحانہ نے عامر کے پاس بیٹھتے ہوئے آئی فون نکالا اور اس پر ایک ویڈیو چلائی۔ یہ وہی ویڈیو تھی جو فرحانہ نے بنائی تھی۔ فرحانہ سوری تھی اور اس کے ماں باپ اس کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ریاض علی نے گاڑی ٹکرا کر اس پر روکی ہوئی تھی۔ ٹرین نزدیک آ رہی تھی۔ اچانک ان کی گاڑی کو جھٹکا لگا اور ریاض علی چلتا ہوا۔ ”یہ کیا ہے؟“

فرحانہ نے مڑ کر دیکھا اور دہشت زدہ لہجے میں بولی۔ ”میرے خدا۔“ وہ اپنی کار سے ہماری گاڑی کو لائن پر دھکیل رہا ہے۔“

ریاض علی اور فرحانہ دونوں چلانے لگے۔ ریاض نے بریک دبائے مگر عامر کی اسپورٹس کار کا طاقتور انجن... یہ آسانی وزنی گاڑی کو لائن پر لے آیا اور اسی لمحے ٹرین آگئی۔ ریاض اور فرحانہ کو لگنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ اس کے بعد ویڈیو الٹ پلٹ گئی اور اس میں انسانوں اور وحاشات کی سب خراش آوازیں شامل ہو گئیں۔ فرحانہ کانپ رہی تھی وہ جب یہ ویڈیو دیکھتی اس کی یہی حالت ہو جاتی تھی۔ عامر پر سخت طاری تھا۔ اس کا جرم سامنے تھا۔ وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے پاس ایک ہی جواز تھا۔ اس نے کانپتا ہوا ہاتھ فرحانہ کی طرف بڑھایا۔ ”یہ میں نے تمہارے لیے کیا۔“

”میرے لیے۔“ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ ”ڈسٹ فکس اقم نے میرے لیے میرے ماں باپ کو اتنے اذیت ناک طریقے سے موت کے منہ میں دھکیل دیا۔“

”میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“ ”اور میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ جس دن میں نے

پہلی بار یہ ویڈیو دیکھی، مجھے تم سے شدید ترین نفرت ہو گئی اور ہرگز رتے دن اس نفرت میں اضافہ ہوتا رہا۔“ ”تب یہ سب کیا تھا؟“ عامر اب اسے گھبراہٹ سے دیکھتا تھا۔ خنجر نے عقب سے اس کے دل کی اوپری شریان کو چھید دیا تھا اور وہ خون بہنے سے رفتہ رفتہ موت کی طرف جا رہا تھا۔ ”مجھ سے شادی کیوں کی؟“

فرحانہ اس کی طرف جھگی۔ ”تاکہ تم بھی وہی اذیت محسوس کرو جو میرے ماں باپ نے مرتے وقت محسوس کی... ہوگی۔ وہ بہت خوش تھے اور تم بھی آج بہت خوش ہو۔ میں نے اسی لیے اس کانچ میں آنے پر اصرار کیا تھا کہ تمہارے گھر میں، میں یہ سب نہیں کر سکتی تھی۔ میں نہیں خواہ کو چھونے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔“

”تم نے بلال کو کیسے ساتھ ملا یا؟“ ”اس کے شور و کم کو آگ لگا کر۔“ فرحانہ بولی۔ ”وہ مجھے پسند کرتا ہے۔ یونیورسٹی میں اپر پوش وہی تھا۔ وہ چھپ کر مجھے دیکھتا تھا مگر گاڑی والا ڈراما میں نے خود کیا تھا تاکہ دوسروں کو یقین آجائے کہ کوئی میرا چچا کر رہا ہے۔ بلال کو تمہارے خلاف استعمال کرنے کے لیے شور و کم کو آگ لگا لی اور اس کا شک تم پر کیا۔“

”مگر کیوں؟“ ”تاکہ میں تمہیں یوں ٹھکانے لگا سکوں کہ کسی کو مجھ پر شک نہ ہو۔“ فرحانہ نے کہا اور اپنے سوبائل سے ویڈیو ڈیلیٹ کر دی۔ اب اسے دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ عامر کا رنگ سفید ہو رہا تھا اور اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ ”فرحانہ! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“

فرحانہ اسے دیکھتی رہی۔ اس کے سوبائل نے ڈائریکشن کی۔ اس پر عامر کی کال آ رہی تھی مگر اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ عامر نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ ”تمہیں بلال پسند ہے؟“

”نہیں۔“ مجھے اس سے بھی نفرت ہے۔“ فرحانہ بولی۔ ”اس نے میری ایک یونیورسٹی کی دوست کو محبت میں دھوکا دیا اور اس نے خودکشی کر لی۔ وہ اس کے ساتھ میل رہا تھا۔ جلد وہ بھی اپنے کے کا مڑ چکے گا۔“

”لیکن میں نے تمہیں دھوکا نہیں دیا۔ کل بھی تم سے محبت کی تھی اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔“ عامر کا جسم جھٹکے لینے لگا تھا۔ فرحانہ نے منہ پھیر لیا۔ وہ بولنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کے منہ سے خون کے بلبلیوں کے ساتھ ٹوٹنے پھوٹنے الفاظ نکل رہے تھے۔ ”آئی۔ او۔“

شیخ سماء الدین

نبی تنیم بگرامی

انسان کو اللہ نے اتنی قدرت دی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے لیے رستوں کا انتخاب کر سکتا ہے لیکن ہدایت کا یہ تحفہ قسمت والوں کو ہی ملتا ہے... آپ کا شمار بھی انہی خوش نصیب لوگوں میں ہوا جن کی کرامات و برکات سے بنی نوع انسان نے فیض حاصل کیا... کم عمری میں ہی آپ کی ذات میں پوشیدہ وہ تمام اشارے نظر آنے لگے تھے جن کی بدولت آپ کا شمار ولیوں میں ہونے لگا۔

دینی دنیہ اور باقی آخرت کے لئے کھولیں

اتارنے والی ایک برگزیدہ ہستی کی داستان



ملتان کے شیخ سماء الدین کی عمر ابھی بارہ سال کی تھی کہ ہر ایک پر یہ بات واضح اور ثابت ہو گئی کہ لڑکا غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے اور روحانی اور باطنی فیوض و برکات میں بے مثل ہے۔ صغیر ہی سے عبادت اور ریاضت میں انہماک اس طرح ظاہر ہو چکا تھا کہ ہر نماز سے پہلے وضو ضرور فرماتے۔ پاکی و طہارت کا خاص خیال رکھتے۔ اب شیخ سماء الدین کی ماں اور بھائی شیخ اسحاق اس فکر میں رہنے لگے تھے کہ اس باکمال شخص کو کس پیر کامل کی مریدی میں دیا جائے۔

تھی اور امید تھی کہ اولین پیشی پر فرحانہ کو با عزت بری کر دیا جائے گا۔ اس نے اقرار کیا تھا کہ اپنے شوہر کے قتل کے بعد اپنی عزت اور جان بچانے کے لیے اس نے بلال کو اپنے شوہر کے پستول سے قتل کیا تھا۔ دیگر شواہد بھی اس کے خلاف تھے۔ پستول پر اس کی انگلیوں کے نشانات تھے اور اس کے ہاتھ پر بارودی ذرات پائے گئے تھے۔ مگر بلال کا جرم بھی واضح تھا۔ اس کی انگلیوں کے نشانات نجر پر پائے گئے تھے اور یہ اسی کا نجر تھا۔ بلال کا عامر کے خلاف بیان ریکارڈ پر تھا۔ اپر پوش والی اسٹوری بھی پولیس کے علم میں تھی۔ اس لیے حامد کو یقین تھا کہ فرحانہ با عزت بری ہو جائے گی۔ حامد نے اس سے پوچھا۔

”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

”میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ فرحانہ نے جواب دیا۔ ”میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔“

فرحانہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”اس حیثیت سے نہیں بلکہ اس حیثیت سے جو بھی آپ چاہتے تھے مگر میری وجہ سے پیچھے ہٹ گئے تھے۔“

حامد چونکا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ”تم جانتی ہو؟“ فرحانہ نے سر ہلایا۔ ”کون لڑکی ہوگی جو اپنی طرف اٹھنے والی پسند کی نظر نہ پہچان سکے۔ آپ تو میرے رشتے دار ہیں، بچپن سے ساتھ رہے ہیں۔“

حامد نے گہری سانس لی۔ ”تو تم جانتی تھیں تو یہ بھی جانتی ہوگی کہ میں نے چچا جان اور خالہ کے سامنے تمہیں بہن کیوں قرار دیا تھا؟“

”ہاں کیونکہ آپ جان گئے تھے کہ میں عامر سے محبت کرتی ہوں۔“

”اور اب۔۔۔“ حامد نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”اب وہ ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔ میں آپ سے کبھی یہ بات نہ کہتی مگر میں جانتی ہوں تاہم آپ سے طمع لے رہی ہے اور اس کے بعد آپ میری طرح اکیلے رہ جائیں گے۔ میں اکیلے نہیں رہ سکتی اور میں نہیں چاہتی کہ آپ اکیلے رہیں۔“

حامد کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے فرحانہ کے نازک ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اسے علم نہیں تھا کہ یہ نازک ہاتھ کتنے مضبوط فیصلے کرتا ہے۔

یہ۔۔۔ فرجی۔“ فرحانہ نے جواب نہیں دیا اور عامر نے آخری جھکا لے کر دم توڑ دیا۔ فرحانہ کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ اسی لمحے کا سچ کی طرف سے بلال آتا دکھائی دیا۔ اس نے نزدیک آتے ہوئے کہا۔ ”تم کیا کر رہی ہو؟ میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا، مجھے واپس بھی جانا ہے۔“

”اب تمہیں انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔“ فرحانہ نے سر ہلچے میں کہا۔ ”یہ مر چکا ہے۔“ بلال کے چہرے پر خوشی نمودار ہوئی۔ اس نے نجر سے کہا۔ ”مجھے نجر استعمال کرنے میں مہارت ہے۔ میں نے تاپ تول کروا کر کیا تھا۔“

”تم اس کے قاتل ہو، میرے شوہر کے قاتل۔“ فرحانہ کھڑی ہو گئی۔ اسی لمحے نیچے ہائی دے پر کسی گاڑی کی روشنی نمودار ہوئی۔ بلال نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟ میں نے اسے تمہارے کہنے پر قتل کیا ہے۔“

”ہاں مگر اس کے قاتل تم ہی ہو۔“ فرحانہ نے پستول والا ہاتھ سیدھا کیا اور ٹریگر دبائے۔ گولی نکلنے پر بلال کا جسم جھٹکا کھاتا۔ تیسری گولی پردہ نیچے گر گیا مگر فرحانہ نے ہاتھ نہیں روکا۔ وہ اس وقت تک گولیاں چلائی رہی جب تک کہ پستول خالی نہیں ہو گیا۔ پھر وہ کالچ کی طرف لپکی اور اس نے کھلے دروازے سے اپنا سواہل اندر پھینکا اور واپس آگئی۔ اس نے جبکہ بلال کو چیک کیا۔ وہ مر چکا تھا۔ پھر وہ عامر کی لاش کی طرف بڑھی اور جب حامد کی گاڑی آکر کالچ کے پاس رکی تو وہ عامر کی لاش کے پاس دوڑا تو بیٹھی رو رہی تھی۔ خالی ہو جانے والا پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ حامد دوڑتا ہوا آیا۔ پھر وہ عامر اور بلال کی لاشیں دیکھ کر ٹھٹکا مگر فرحانہ کو ٹھیک پا کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ اس نے جلدی سے اپنی جیکٹ اتار کر لڑائی فرحانہ کے گرد لپیٹی اور اسے اٹھاتے ہوئے کالچ کی طرف بڑھا۔ وہ اسے سلی دے رہا تھا۔

”اُس اوکے۔۔۔۔۔ سب ٹھیک ہے۔ تم پریشان مت ہو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

☆☆☆

حامد نے کافی کا گم فرحانہ کے سامنے رکھا۔ آج تیسرا دن تھا۔ تمام کارروائیاں ختم ہو چکی تھیں۔ عامر کی تدفین اس کے آبائی شہر میں ہوئی تھی جبکہ بلال کی لاش اس کا باپ اپنے علاقے میں لے گیا تھا۔ حامد کی زیر نگرانی پولیس نے اس واقعے کا چالان عدالت میں پیش کرنے کی تیاری کر لی

ورنہ اس جوہر کامل کی تربیت میں کوتاہی کے خطا کار ٹھہریں گے۔

جب شیخ کے والد کو اپنی زندگی کے بارے میں شک و شبہ ہونے لگا تو انہوں نے ایک شب جبکہ یہ نصف گزر چکی تھی انہیں..... بستر سے اٹھایا اور کہا۔ "بیٹے! ساء الدین! آ میرے ساتھ چل۔"

ساء الدین چپ چاپ اٹھ کر باپ کے ساتھ ہو گئے۔ وہ انہیں اپنے کمرے میں لے گئے اور فرمایا۔ "بیٹے! ساء الدین! میں کچھ دنوں کے لیے دہلی جانا چاہتا ہوں۔ وہاں کسی سرائے میں قیام کروں گا اور کوشش کروں گا کہ وہیں کسی مصافقات میں زمین لے کر باغ لگاؤں، کاروبار کروں اور سامانِ بیش و عشرت مہیا کروں۔"

ساء الدین نے حیرت سے پوچھا۔ "آپ دہلی میں کتنے دن قیام کریں گے؟"

باپ نے جواب دیا۔ "چند ہفتے یا پھر ماہ ڈیڑھ ماہ۔"

ساء الدین کو ہنسی آگئی، بولے۔ "بادا جان! آپ مجھ سے مذاق تو نہیں فرما رہے؟"

باپ نے پوچھا۔ "اس میں مذاق کی کیا بات ہے؟"

بیٹے نے جواب دیا۔ "جب آپ ہفتوں یا ماہ ڈیڑھ ماہ کے لیے دہلی جائیں گے اور وہاں کی کسی سرائے میں قیام فرمائیں گے تو پھر یہ زمین اور باغات کی آپ کو کیا سوجھی؟ کاروبار اور بیش و عشرت کے منصوبے کیسے؟"

باپ نے بڑی تنبیہ کی سے کہا۔ "بیٹے! میں تم سے جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، میرے نزدیک اس کے لیے یہ بہترین حکمراہ بیان تھا۔ یہ دنیا چاہے کتنی لمبی عمر رکھتی ہو مگر انسان لمبی عمر لے کر..... نہیں آتا۔ دنیا سرائے فانی ہے۔ اس سرائے میں چند روزہ قیام کا چین رکھنے کے باوجود اگر انسان ایسے منصوبے بنائے گویا اسے یہاں ہمیشہ رہنا ہے تو یہ اس کی حماقت نہیں تو اور کیا کہلائے گی۔ میں نے اس دنیا میں سرائے کے مسافر کی طرح قیام کیا ہے۔ تمہیں بھی یہی کرنا ہے۔ جب تک زندہ رہو اپنے رب کو مت بھولو اور انسانوں کے کام آؤ کیونکہ انسان کے ذمے دوسرے کے حقوق واجب الادا ہیں، حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ حقوق اللہ کا تعلق اللہ اور انسان کے درمیان ہے اور حقوق العباد کا تعلق انسان اور انسان کے درمیان ہے۔ اگر تم نے شخص حقوق اللہ پر زور دیا اور حقوق العباد کو فراموش کر دیا تو اللہ تم بہت خسارے میں رہو گے اور ناقابلِ مصلحتی نقصان اٹھاؤ گے۔ اس لیے کامیاب انسان وہی ہے جو حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد میں بھی پورا اترتا ہے۔"

باپ کی پراثر باتوں نے ساء الدین کو بہت متاثر کیا، دل بھر آیا اور آنکھیں نم ہو گئیں، پوچھا۔ "بادا جان! پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

باپ نے جواب دیا۔ "کسی مرشدِ کامل کا ہاتھ پکڑ لو اور اس کی راہنمائی میں اپنی منزلِ مراد کو پہنچو۔"

ساء الدین کی ابھی عمر ہی کیا تھی، پھر بھی انہوں نے اپنے ماحول میں کسی مرشدِ کامل کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ ان کی نظر انتخاب اس عہد کے مشہور صوفی شیخ الشارح شیخ اسماعیل پر پڑی۔ شیخ اسماعیل صدر الدین راجہ قتل کے ولی مہد تھے۔ صدر الدین راجہ قتل ان کی ماں کے پیر و مرشد تھے۔

ساء الدین کسی کو وسیلہ بنائے بغیر شیخ اسماعیل کی خدمت میں پہنچ گئے اور نہایت ادب سے عرض کیا۔ "حضرت! میں بڑی امیدیں لے کر حاضر ہوا ہوں، امید ہے کہ آپ اس پر ضرور غور فرمائیں گے اور مجھ کو مایوس نہیں کریں گے۔"

شیخ اسماعیل روشن ضمیر تھے، بولے۔ "شاید تو یہ چاہتا ہے کہ میں شفقت اور مہربانی سے تیری پرورش کروں اور اپنی نصیحتوں سے تیری پریشانیوں دور کر دوں۔"

ساء الدین نے جواب دیا۔ "بیشک میرا یہی مدعا ہے اگر آپ سے مجھے فیض پہنچے گا تو اس سے آپ کے کمالات میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔"

شیخ اسماعیل نے فرمایا۔ "میرے بھائی شیخ فضل اللہ بڑے اہل کمال اور صاحبِ حال ہیں اگر تم رضامندی ظاہر کر دو تو میں ان کے پاس پہنچا دوں گا اور ان سے خرقہ بھی دلوا دوں گا۔"

ساء الدین نے سکوت اختیار کیا اور شیخ اسماعیل کے پاس ہی رہنے لگے۔

چند دنوں بعد ساء الدین نے پھر وہی درخواست کی اور شیخ اسماعیل نے پھر وہی جواب دیا اور وہی پیشکش دہرائی۔

شیخ سماء الدین

ساء الدین نے بڑی عاجزی اور محبت سے عرض کیا۔ "آقا! میری مریدی اور ارادت کا جہاں تک تعلق ہے، ان کا معاملہ دل اور محبت سے متعلق ہے اور اس سلسلے میں میں نے جب بھی اپنے دل کو تنویرا وہاں آپ کے سوا کوئی بھی نہیں ملا، اس لیے اگر آپ میری پرورش اور تربیت کی ذمہ داری قبول فرمائیں گے تو خیر ورنہ میں اسی طرح زندگی بھر آپ کی خدمت کر جا رہوں گا۔"

شیخ اسماعیل نے بے ساختہ اٹھ کر انہیں سینے سے لگایا اور اپنے حجرے میں لے گئے۔ وہاں کچھ دیر ذکر کی تحقیق کرتے رہے اس کے بعد دوکانہ دار کرایا اور خرقہ خاص عطا فرمایا۔ ساء الدین نے محسوس کیا جیسے کوئی کہہ رہا ہے۔ "یہ اللہ کا فضل ہے جس کو جتنا چاہے دے دے۔"

یہ اپنے حجرے کی محبت میں رہنے لگے اور ان کی پوری توجہ صفائی قلب اور باطنی علوم کی تحصیل پر رہنے لگی۔ اگر کسی عابری علوم کی تحصیل کا خیال بھی آیا تو یہ سوچ کر جھٹک دیا کہ فی کمال اس کو ترک کر دینا ہی بہتر ہے۔

ایک دن شیخ اسماعیل نے ساء الدین کو اپنے حجرے میں بلا کر پوچھا۔ "ساء الدین! کیا بات ہے، تھک رہا ہے؟" دل سے علوم عابری کا خیال کیوں نکال دیتے ہو؟

ساء الدین نے جواب دیا۔ "حضرت! جس کو باطنی علوم حاصل ہو جائیں اسے عابری علوم کی ضرورت؟" شیخ اسماعیل نے فرمایا۔ "ساء الدین! یہ کیا خیال خام دل میں آیا ہے۔ شرع کی بنیاد اور دین کی اساس علوم عابری پر ہے۔ میری خواہش اور کوشش یہ ہے کہ تم لوگوں کو علوم عابری اور علوم باطنی سے یکساں فائدہ سے پہنچاؤ مگر تم، معلوم نہیں کیوں اس سے گریز کر رہے ہو۔"

ساء الدین سخت شرمندہ ہوئے اور اس دن سے علوم عابری کی حصولیابی میں بھی کوشاں نظر آنے لگے۔

☆ ☆ ☆

ساء الدین کورات کی تاریکی میں کھلے آسمان تلے کھڑا کر دیا گیا۔ ان کے والد نے ایک خاص ستارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ساء الدین! اس خاص ستارے اور اس کے قریب وقوع کو پہچان لو۔ یہ جب بھی تمہیں اس جگہ نظر آئے تم یہ کچھ لیتا کہ اب تہجد کا وقت ہو چکا ہے۔"

ساء الدین نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے حجرے میں چلے گئے۔ چند دنوں بعد نہیں معلوم کس نے یہ اطلاع دی کہ ساء الدین تہجد والے ستارے کو دیکھتے بغیر ہی نماز پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ جب ان سے اس بارے میں استفسار کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا۔

"میں تہجد کے ستارے کو اپنے حجرے میں سے ہی دیکھ لیتا ہوں۔ اس لیے تہجد کی نماز پڑھنے لگتا ہوں۔"

جب لوگوں نے اس کا تجربہ کیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ساء الدین نے تہجد کا ستارہ حجرے ہی میں سے دیکھ لیا تھا اور وہ ہمیشہ سے صاف نظر آ رہا تھا۔ شاید لوگوں کو پہلی بار ان کے کشف اور بزرگی کا علم ہوا تھا۔

آہستہ آہستہ ساء الدین کی شہرت چاروں طرف پھیلنے لگی اور انہیں بھی ان کے ارادت مندوں نے گھیرنا شروع کر دیا۔ دہلی اور اس کے مصافقات کے لوگ ان کا غائبانہ ذکر سن کر بلائے لگے۔ آخر انہیں بیانہ جانا پڑا۔ بیانہ کے لوگوں نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے مرید ہونے لگے۔ بیانہ کے بعد آپ ناگور چلے گئے اور وہاں بھی آپ کے ارادت مندوں نے آپ کو اپنی آنکھوں پر بٹھایا اور اپنے دلوں میں جگہ دی۔ ایک نیک اور پارسائے عورت نے آپ سے درخواست کی کہ اسے کچھ خدمت کا موقع دیا جائے۔

آپ نے پوچھا۔ "تو میری کیا خدمت کرنا چاہتی ہے؟"

عورت نے عرض کیا۔ "حضرت! میرے پاس ایک گائے کے سوا کچھ بھی نہیں، چنانچہ میں نے یہ سوچا تھا کہ اس کا کچھ دودھ آپ کو پہنچا دیا کروں لیکن آپ کی اجازت اور منظوری سے۔ اس کے بغیر نہیں۔"

آپ نے اجازت دے دی۔ "اچھا جب تک میں ناگور میں ہوں تہجد کو اجازت ہے کہ مجھے دودھ پہنچا دیا کرو۔" اس کے بعد وہ عورت آپ کی بندۂ بے دام ہو گئی۔ آپ کچھ دن بعد کجرات تشریف لے جانے لگے۔ اس عورت کو

کتنی عجیب سی بات ہے جو سنے گا کیا کہے گا؟“
آپ نے نرمی سے فرمایا۔ ”قاضی بدر الدین! آج تو آپ ہی امامت کریں گے۔“
جمالی نے عرض کیا۔ ”حضرت! قاضی صاحب، ہمارے ہیں۔ آپ کی موجودگی میں کوئی اور امامت کیوں کرے؟“
قاضی صاحب کو شلی تو پھر بولے۔ ”حضرت! میں ایک عاجز اور گناہ گار بندہ آپ کی موجودگی میں کس طرح امامت کر سکتا ہوں۔“

آپ نے جمالی سے کہا۔ ”جمالی! کیا تو میری مخالفت کر سکتا ہے؟“
جمالی نے عاجزی سے عرض کیا۔ ”کوئی سوال نہیں پیر و سرشد۔“
آپ نے فرمایا۔ ”پھر تو خاموش رہ۔“ اس کے بعد پھر قاضی کو حکم دیا۔ ”آپ نماز پڑھ جائیں۔“
قاضی صاحب مزید انکار نہیں کر سکے۔ امامت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے برآواز بلند آیات قرآنی پڑھنا شروع کر دیں۔ قاضی علم تجوید سے نا بلد تھا اس لیے آپ کے عالم مرید جمالی کو قاضی کی قرأت پسند نہیں آئی۔ جمالی کو ایسا لگا گویا کوئی شہسوار گھوڑا اہلکائے چلا جا رہا ہے۔ آواز کی سختی اور لہجے کی درشتی، قرأت کی تیز رفتاری نے سب سے زیادہ جمالی کو بد مزہ کر دیا تھا چنانچہ جیسے ہی نماز ختم ہوئی اور قاضی نے سلام پھیرا، جمالی نے کھڑے ہو کر قاضی کو ڈانٹ دیا۔
پوچھا۔ ”اے قاضی! کیا اس طرح نماز پڑھائی جاتی ہے؟“

قاضی نے کہا۔ ”کیوں، میری قرأت اور تلاوت میں تمہیں کیا غامی یا خرابی نظر آئی؟“
جمالی نے جواب دیا۔ ”اے مخدوم! عجیب صفت شکر امام ہو کہ اپنے تیز رفتار قرأت کے گھوڑے کو اتنا تیز بھاگ دیا کہ نمازیوں اور مقتدیوں کی صفیں درہم برہم ہو گئیں۔“
قاضی شرمندہ ہو گیا اور کچھ کہے سے بغیر وہاں سے چلا گیا۔

جمالی کا یہ انداز مخاطب شیخ سماء الدین کو ذرا بھی پسند نہیں آیا۔ ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا مگر اس وقت جمالی سے کچھ بھی نہ کہا۔ دوسرے دن صبح جمالی کو اپنے حجرے میں طلب کیا اور سوال کیا۔ ”جمالی! تو عالم ہے اس لیے یہ ضرور جانتا ہوگا کہ دل آزاری کتنا بڑا گناہ ہے۔“

جمالی نے خوفزدہ لہجے میں جواب دیا۔ ”ہاں میں دل آزاری کے گناہ سے واقف ہوں۔“
شیخ نے فرمایا۔ ”کل تو نے قاضی کا بڑا دل دکھایا۔ میں تو اسی وقت لرز گیا تھا۔“
جمالی نے سبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اگر مجھ سے یہ گناہ سرزد ہو گیا تھا تو آپ مجھ کو ڈانٹ سکتے تھے۔ اسی وقت نوک دیتے، میں ہرگز برانہ مانا۔“

شیخ نے جواب دیا۔ ”جمالی! میں صرف اس لیے خاموش رہا کہ تو خود جس گناہ کا مرتکب ہوا تھا میں اس کا ارتکاب کیوں کروں۔ اگر میں تجھ کو سب کے سامنے ڈانٹ ڈپٹ دیتا تو تو بہتوں کے سامنے ذلیل ہو جاتا۔ تو نے قاضی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔“

جمالی نے پوچھا۔ ”حضرت! پھر اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟“
شیخ نے جواب دیا۔ ”یہ کہ آؤ ہم دونوں قاضی کے پاس چلیں اور اس سے معافی مانگیں۔ اگر وہ ہمیں معاف کر دے گا تو خدا بھی ہمیں معاف کر دے گا لیکن اگر اس نے معاف نہ کیا تو تمہیں روز قیامت بڑی شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔“
جمالی کو رونا آ گیا۔ شیخ سماء الدین کی باتوں نے جمالی کو رلا دیا تھا۔ وہ دونوں اٹھے اور قاضی کے حجر پہنچ گئے جب قاضی کو یہ معلوم ہوا کہ شیخ سماء الدین اپنے مرید جمالی کے ساتھ آئے ہوئے ہیں تو وہ نہایت متوہانہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پوچھا۔ ”حضرت! آپ نے زحمت کیوں کی؟ مجھ کو بلوایا ہوتا، میں خود آ جاتا۔“

شیخ نے جمالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”قاضی صاحب! کل اس نے آپ کی شان میں جو گستاخی کی تھی اور جس طرح شرمندہ کیا تھا، آپ کو اس کا پورا پورا حق پہنچتا ہے کہ اس کو بھرے مجمع میں اسی طرح شرمندہ کریں۔“
قاضی نے کہا۔ ”حضرت! میں غلطی پر تھا، میں قاضی ہوں اور بیاد کی حکومت پر بھی فائز ہوں، مجھ کو عظیم تجوید سے واقف ہونا چاہیے تھا لیکن انوس کہ میں نہیں جانتا۔“

بڑا قس ہوا اور رو ہانسی ہو گئی۔ پوچھا۔ ”حضرت! آپ پھر۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ دوبارہ کب تشریف لائیں گے؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”جب خدا حکم دے گا تو آ جاؤں گے۔“

چنانچہ آپ کچھ عرصہ کور میں رہے اور یہاں سے کجرات چلے گئے۔ آپ کے چلے جانے کے بعد عورت کی جائے کوئی چرا کر لے گیا۔ یہ بہت پریشان ہوئی اور اس پریشانی میں اس کی نیند اڑ گئی۔ عورت نے تین شب دروز اس کرب میں گزارے، اس کے بعد وہ سکون کی خاطر نوافل ادا کرنے لگی۔

ایک دن وہ نوافل ادا کرنے کے بعد آنکھیں بند کر کے پڑ رہی۔ کچھ دیر بعد نیند نے اسے مدہوش کر دیا۔ اس نے ایسا محسوس کیا گویا شیخ سماء الدین اس کے پاس کھڑے ہیں اور پوچھ رہے ہیں۔ ”عورت! کیا بات ہے تو پریشان کیوں ہے؟“
عورت نے جواب دیا۔ ”آپ مجھ سے میری پریشانی کا سبب پوچھ رہے ہیں حالانکہ آپ روشن ضمیر ہیں۔“
آپ نے امیر ار کیا۔ ”اگر تو اپنی پریشانی خود اپنی زبان سے بیان کر دے گی تو اس سے کیا فرق پڑ جائے گا۔“
عورت نے بھرائی ہوئی آواز میں عرض کیا۔ ”حضرت! جس گائے کا دودھ اور دہی وغیرہ میں آپ کو پہنچایا کرتی تھی، آپ کی عدم موجودگی میں کوئی اس کو چرا کر لے گیا۔ بتائیے اب میں کیا کروں؟“

آپ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”بس اتنی سی بات نے تجھ کو اداس کر رکھا ہے؟“
عورت نے کہا۔ ”حضرت! یہ اتنی سی بات نہیں ہے، یہ بہت بڑی بات ہے میرے لیے۔“
آپ نے فرمایا۔ ”مت اداس ہو، وہ گائے تجھے واپس کی جا رہی ہے۔ اس کو سنبھال کے رکھ۔“

عورت کی فرط خوشی میں آنکھ کھل گئی۔ وہ بے چینی سے کھڑی ہو گئی اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اسنے میں اس کے کانوں نے گائے کی آواز سنی۔ اس کو اپنی سماعت پر اعتبار نہیں آیا لیکن گائے برابر بولتی رہی۔ عورت مکان کے اس حصے میں گئی جہاں گائے باندھی جاتی تھی۔ وہاں اس نے گائے کو بندھا ہوا دیکھا۔ اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے گائے کی پشت اور پیٹ پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ وہ حیران تھی کہ آخر یہ گائے آئی کہاں سے۔ وہاں کوئی آس پاس ایسا شخص بھی نہیں تھا جو اس کی کسی بات کا جواب دے سکتا۔ آخر اس نے گائے سے سوال کیا ”تجھے کون لے گیا تھا؟“

گائے نے بڑی مصومیت سے عورت کی طرف دیکھا اور چمکی کرنے لگی۔
عورت نے دوسرا سوال کیا۔ ”اور اب تجھے لایا کون ہے؟“
گائے نے چمکی کرتے ہوئے گردن ہلا کر سر کی ہلکی اڑائی اور ہمیں ہمیں کرنے لگی۔

عورت نے کہا۔ ”میں جانتی ہوں تجھے یہاں کون لایا ہے؟ اس میں یقیناً حضرت شیخ سماء الدین کا ہاتھ ہوگا۔ ان کے سوا دوسرا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔“ اسنے میں کسی شخص نے دستک دی۔ عورت نے دروازے کی آڑ سے پوچھا۔ ”کون ہے؟“
باہر سے کسی نے جواب دیا۔ ”بی بی! ابھی کچھ دیر پہلے میں نے ایک شخص کو گائے کے ساتھ اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔ وہ ابھی تک باہر واپس نہیں آیا۔“

عورت حیران تھی کیونکہ اندر کوئی شخص بھی نہیں تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ”جمالی یہاں تو کوئی بھی نہیں، حالانکہ میری گمشدہ گائے موجود ہے۔“
یہ معام بھی حل نہیں ہو سکا کہ وہ مرد کون تھا۔

☆☆☆

شیخ سماء الدین کو جو لوگ ملے تھے ان میں حامد بن فضل اللہ جمالی کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ جمالی بذات خود عالم تھے اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ سیر و سیاحت میں گزارا تھا مگر جب شیخ سماء الدین سے ملے تو انہی کے ہورہے۔ آپ جمالی سے بے حد محبت کرتے تھے۔ آپ بیان میں قیام کے دوران حاضرین اور معتقدین کے سامنے وعظ فرمایا کرتے تھے اور جب نماز کا وقت آتا تھا تو خود یا کسی اور کو امامت کے لیے کھڑا کر دیتے۔ عصر کی نماز کے بعد مغرب کا وقت آیا تو آپ نے حاضرین پر ایک اچھٹی سی نظر ڈالی اور بیان کے حاکم قاضی بدر الدین کو حکم دیا کہ مغرب کی نماز پڑ جائیں۔

قاضی صاحب نے انکساری سے کام لیا، بولے۔ ”حضرت! آپ کی موجودگی میں، میں امامت کروں۔ واللہ یہ

اٹھارہ سال کا ان کا واحد فرزند تھا۔ میرے باپ نے ساری ہمدرد میرے قبضے میں آئی۔ ان دنوں میرے حسن کا بڑا چرچا تھا اور میں جدمیر سے بھی گزرتا لوگ مجھ کو دیکھ جاتے۔ عورتیں اور لڑکیاں میری راہ روک کر کھڑی ہو جاتیں اور مجھ سے طرح طرح کے سوال کرنے لگتیں۔ ان دنوں میں شراب بھی بہت پیا کرتا تھا۔ عورتیں، شراب اور جوا۔ یہی میرے شغل تھے۔

ان دنوں صوفی بابو اسحاق کا بھی بڑا چرچا تھا۔ ایک دن میں اپنے گھوڑے پر سوار بابو اسحاق کی خانقاہ کے پاس سے گزرا اس وقت بابو اسحاق خانقاہ کے در پر اپنے مریدوں میں گھرے کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے جو دیکھا تو بولے تو کچھ بھی نہیں، بس ایک ننھا مسافرا حیلان تھا کہ میرے رسید کر دیا۔ اس ڈھیلے کی چوٹ نے مجھ کو بے ہوش کر دیا اور میں اپنے گھوڑے سے گر گیا۔ بابو اسحاق میرے پاس آئے اور میرے کان میں کہا: ”وجیبہ! یہ فسق و فجور کب تک؟ آخر تو اس طرح کب تک بہکتا بہکتا رہے گا میں تیرا انتظار کر رہا ہوں۔“

میں نے یہ آواز خواب و خیال کی طرح سنی اور کچھ کچھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کسی کی آواز ہے چنانچہ جب میں ہوش میں آیا تو اپنے آپ پر بابو اسحاق کو جھکا ہوا دیکھا وہ مجھے نصیحتیں کر رہے تھے اور یہ نصیحتیں میرے دل و دماغ میں خون کی طرح گردش کر رہی تھیں۔ میں نے ان سے کہا: ”بابا! میں تائب ہوا۔ میں نے توبہ کی اور آئندہ آپ یا کوئی بھی مجھ کو فسق و فجور میں مبتلا نہیں دیکھے گا۔“

اس کے بعد انہوں نے مجھے سہارا دیا اور اپنے حجرے میں لے گئے اور اپنے کسی مرید سے پانی طلب کیا۔ تھوڑا سا پانی خود پی لیا اور بقیہ مجھے پلا دیا۔ بس یہ چھوٹا پانی مجھ میں انقلاب کا سبب بن گیا۔ مجھ کو دنیا اور مال و دولت سے نفرت سی پیدا ہو گئی۔ میں کئی دن تک ان کی خانقاہ میں گزار پڑا آخر ایک دن میں نے ان سے اپنے گھر جانے کی اجازت طلب کی۔ بابو اسحاق نے پوچھا: ”گھر جا کر کیا کرو گے؟“

میں نے جواب دیا: ”بابا! میں ان تمام چیزوں سے بچھا چھڑانا چاہتا ہوں، جنہوں نے مجھے کہیں کا بھی نہیں رکھا تھا۔“ میں اپنے گھر گیا اور اپنا سارا مال و اسباب لا کر بابو اسحاق کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔ کہا: ”بابا! آپ اس کو اپنے ہاتھوں سے مستحقین میں تقسیم فرمادیں۔“

بابا نے اسے تقسیم کر کے مجھے مبارک باد دی کہ اب میں اس لائق ہوں کہ مجھ پر اعتبار کیا جائے۔ شیخ ساء الدین نے اپنے بزرگ صوفی کی پڑاؤ آپ جتنی سنی توبہ حد خوش ہوئے اور انہیں ان کی کامیابی پر مبارک باد پیش کی۔ شیخ وجیبہ نے کہا: ”بابا! ساء الدین! مجھ سے زیادہ خوش قسمت تو تم ہو کہ کسی تلقین اور تبلیغ کے بغیر ہی اپنی منزل مراد پائی، ایسا بہت کم ہوتا ہے۔“

شیخ ساء الدین نے فرمایا: ”یہ اللہ کا فضل ہے جس کو جتنا چاہے دے دے۔“ شیخ ساء الدین واپس وہی پہنچے تو وہاں ایک ہجوم کو اپنا منتظر پایا۔ یہ پٹھان فرماں روا بہلول لودھی کا زمانہ تھا۔ آپ کی خانقاہ میں ہر قسم کے لوگ جمع ہو گئے۔ ان میں سلطان بہلول کے فرمان نویس شہاب خان کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ آپ نے اس سے پوچھا: ”تو یہاں کیوں آیا ہے؟“

شہاب خان نے جواب دیا: ”حضور سے ملاقات کرنے، حضور کی زیارت کی خاطر۔“ آپ نے بیزارگی سے فرمایا: ”اوبہ بخت تو یہاں جاسوسی اور خبر گیری کی خاطر آیا تھا۔ مجھ سے جموت بولنے کی کوشش نہ کرو نہ خواہ مخواہ شرمندہ ہوتا پڑے گا۔“

شہاب خان نے جواب دیا: ”حضرت! جو چاہیں فرمادیں۔ در نہ حقیقت تو یہ ہے کہ میں خبر گیری کے لائق نہیں ہوں۔“

آپ نے فرمایا: ”بہر حال شہاب خان! اگر تو ایسا کرے گا تو بہت برا کرے گا۔“ شہاب خان آپ کے پاس کچھ دیر رہا۔ اس کے بعد اٹھ آیا۔ اس نے خبر گیری اور جاسوسی کے لیے ایک ایسے نوجوان کا انتخاب کر لیا کہ ادھر کسی کی نظر کسی قسم کی چٹائی کھائے گی اور شہاب خان کا بیٹا اس کو لے کر اپنے باپ کے پاس چلا جائے گا۔

شیخ نے فرمایا: ”وہ کچھ بھی سنی مگر بھائی کو اس لب و لہجہ میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں اس کے ساتھ اس لیے آیا ہوں کہ تم سے معافی دلواؤں، خدا کے لیے تم اس کو معاف کر دو ورنہ اس کی آخرت برباد ہو جائے گی اور یہ کہیں کا بھی نہیں رہ جائے گا۔“

قاضی نے عاجزی سے کہا: ”حضرت! آپ کیا فرما رہے ہیں۔ بھائی عالم ہیں۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں کہ انہیں معاف کروں اور پھر یہ کہ بھائی بھائی سے کوئی لفظ بھی تو ہوئی ہو۔“

شیخ نے اصرار کیا: ”قاضی! اگر معاف نہیں کرو گے تو میں بھائی کے ساتھ یہیں قہار سے در پر رہ پڑوں گا اور اس وقت تک گزار ہوں گا جب تک کہ تم معاف نہیں کرو گے۔“

قاضی نے ٹھک آ کر کہا: ”اچھا جناب میں نے معاف کیا۔ میرے خدا نے معاف کیا۔“ اس کے بعد پوچھا: ”اب تو آپ خوش ہوئے اور ہمیں معاف کیا۔“

شیخ نے کہا: ”ہاں اب میں خوش ہوں، بے حد خوش۔“ آپ بھائی کے ساتھ گھر چلے گئے اور راستے بھر یہی سمجھاتے رہے کہ خبردار آئندہ کسی کی دل آزاری نہ کرنا۔ اگر کرو گے تو بھگتو گے۔

بھائی نے بھی وعدہ کیا کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں سرزد ہوگی۔

☆☆☆

آپ نے بیاندہ بھی چھوڑ دیا اور دہلی چلے گئے۔ یہ جگہ آپ کو بہت اچھی لگی اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہیں آپ نے شادی بھی کر لی۔ بھائی یہاں بھی موجود رہے۔ انہیں اپنے بھائی کی جدائی بھی گراں گزرتی تھی۔ ان دنوں گجرات میں شیخ وجیبہ الدین گجراتی کا بڑا چرچا تھا۔ ان کی بابت یہ مشہور تھا کہ صاحب کشف بزرگ ہیں۔ شیخ ساء الدین نے سوچا: ”چلو ان سے ملاقات کر لو پتہ کر۔“

شیخ ساء الدین نے ایک عام اور غیر معروف آدمی کی حیثیت سے گجرات کا سفر کیا اور پوچھتے پوچھتے شیخ وجیبہ الدین کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت شیخ مذکور اپنے ارادت مندوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ انہوں نے جیسے ہی شیخ ساء الدین کو دیکھا ادب سے کھڑے ہو گئے اور بے اختیار ان کی طرف بڑھے اور ان سے بغل گیر ہو گئے۔ شیخ ساء الدین نے اس ایک سوئیس سالہ بزرگ کو سینے سے جو لگا یا تو ایک عجیب سی فرحت محسوس ہوئی اور سینہ طمانیت سے لبریز ہو گیا۔ شیخ ساء الدین نے پوچھا: ”حضرت! آپ نے مجھ کو پہچانا؟“

انہوں نے جواب دیا: ”اے دین کے آسمان تجھ کو کون نہیں پہچانے گا۔ میں تجھ کو اس وقت سے جانتا ہوں جب تو اس خاکدان میں آیا بھی نہیں تھا۔“

وجیبہ الدین نے سبحان اللہ سبحان اللہ کا نعرہ لگا دیا اور شیخ ساء الدین کے ساتھ بیٹھ گئے۔ آخر میں جب یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو بے حد خوش اور سرور نظر آتے تھے۔ پھر تو ان دونوں کی ملاقاتیں ہر روز ہی ہونے لگیں۔

ایک دن شیخ ساء الدین نے شیخ وجیبہ سے پوچھا: ”حضرت! آپ کی بابت کچھ باتیں مشہور ہیں، میں انہیں آپ کی زبان سے سنا چاہتا تھا۔“

شیخ وجیبہ الدین نے پوچھا: ”کون سی باتیں؟“ وہ مسکرا رہے تھے۔

شیخ ساء الدین نے جواب دیا: ”یہ کہ آپ نے اس کو بچے میں کس طرح قدم رکھا تھا؟ اور وہ کون سے غیر معمولی واقعات تھے جن کے زیر اثر آپ نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی؟“

شیخ وجیبہ الدین نے نظریں جھکا لیں۔ فرمایا: ”اب میں اپنے فسق و فجور کے ماضی کو کیا دہراؤں۔“

شیخ ساء الدین نے کہا: ”حضرت! اس میں بڑی عبرتیں ہیں۔ اگر سناویں گے تو میں ان سے عبرت پکڑوں گا اور ان غلطیوں سے بچ جاؤں گا جن سے آپ بچ کر نکل آئے۔“

شیخ وجیبہ الدین ذرا سی دیر کے لیے چپ ہو گئے۔ پھر فرمانے لگے: ”ساء الدین! یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں ملک اختیار الدین کا بیٹا ہوں اور ملک موصوف غیر و شاہ تخلق کے رشتے دار تھے۔ جب میرے باپ کا انتقال ہوا تو میں

سکتا ہو تو میں حاضر ہوں۔"

سلطان نے کہا: "حضرت! میں آپ کی شفقت اور محبت کا امیدوار ہوں۔" آپ نے فرمایا: "عدل سے حکومت کرو اور اللہ کے خوف سے دل کو آباد رکھو، پھر دیکھ اللہ تیرے لیے کیا کچھ کرتا ہے۔"

سلطان نے عرض کیا: "حضرت! میں نے یہ سن رکھا ہے کہ یہ دنیاوی شہراں بادشاہ نہیں ہوتے اصل بادشاہ تو درویش ہوتے ہیں اور دنیا کے بادشاہ درویشوں کی صورت کے ریزہ چمکے ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟" آپ نے فرمایا: "سلطان! بادشاہ کو چاہیے کہ اگر وہ اندر سے درویش نہیں ہے تو ظاہر میں درویش کی وضع قطع اختیار کرے کیونکہ یہ وضع قطع اس کو برائیوں سے بچائے گی۔" اس کے بعد آپ نے فرمایا: "سلطان! تین قسم کے لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے محروم رہتے ہیں۔ اول وہ بوڑھا، جو بوڑھا ہونے کے باوجود گناہ آلود زندگی گزارے۔

"دوسرا وہ جوان جو توبہ پر یقین رکھتا ہو اور اس امید پر گناہ میں گرفتار ہو کہ جب چاہے گا توبہ کر لے گا اور نیک بن جائے گا۔

"تیسرا وہ بادشاہ جو اپنی ہر سرائی کی حصولیابی پر قادر ہو مگر پھر بھی اپنی سلطنت کے چراغ کو بجھوت کی آندھی سے مغل کر دے۔"

سلطان نے عاجزی سے عرض کیا: "اب حضور! اس کی وضاحت بھی فرمادیں تو بڑا اکرم ہو گا۔" آپ نے فرمایا: "میں گناہ کار بوڑھے کو حکم دوں گا اور سرزنش کروں گا کہ اے سفید بالوں والے سیاہ باطن! اس لحاظ پڑو اور درویش زوال دور میں تو کس امید پر گناہ کر رہا ہے۔ کیا توبہ امید کر سکتا ہے کہ تیرے بڑھاپے کی دیوار کی طرح مضبوط ہو سکے؟ جب یہ امید نہیں ہے تو پھر تو غفلت میں پھنس کر گناہوں کی قوت سے اس کی قوت کو کیوں کھوئے دے رہا ہے۔

"میں جوان کو اس طرح سرزنش کروں گا کہ اے غافل اور ناجبر! کارنو جوان! موت اور زندگی کا اختیار خدا کو حاصل ہے۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں اور موت کا کوئی وقت نہیں پھر تو اس امید میں کہ جوانی میں گناہ کر کے بڑھاپے میں توبہ کر لی جائے گی؟ بلاوجہ کیوں صحرائے معصیت میں گموم رہا ہے۔ تو اپنے انجام پر نظر رکھو اور اس فریب میں مت مبتلا رہو کہ تودہ اپنی بھی بوڑھا بھی ہو گا۔

"غافل بادشاہ کو اس طرح متنبہ کیا جائے کہ اے غافل بادشاہ! بجھوت کا تعلق اور اس کا فائدہ محض اس دنیا تک ہے۔ کام دہ کر جو آخرت میں بھی ساتھ دے، اپنے اعمال کی کھیتی میں درویش کا بیج ڈالنے والا امیق ترین انسان ہے۔"

اس کے بعد آپ نے اچانک سلطان بھلول لودھی کو مخاطب کیا: "اے سلطان! تجھ کو بڑھاپے میں سلطنت ملی ہے اس لیے تو اپنے دل کو اللہ کے خوف سے آگاہ رکھ۔ اور ممکنہ حد تک خدا کا شکر ادا کرتا رہ کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے کہ اگر تم نے شکر ادا کیا تو میں تمہیں زیادہ عطا کروں گا۔ برخلاف اس کے اگر تو نے غفلت اختیار کی اور گناہوں میں مشغول ہو گیا تو اس کے لیے بھی خدا کا ڈراوا موجود ہے۔ اس نے فرمایا ہے کہ اگر تم نے کفر کیا تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔"

سلطان کے دل پر آپ کی نصیحتوں کا اتنا شدید اثر ہوا کہ وہ رونے لگا۔ اس کی ڈاڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی۔ اس نے نہایت عاجزی سے عرض کیا: "اے حضرت! مجھ کو گناہوں سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی درویشوں کی محبت میرے دل میں آہستہ آہستہ ترقی کر رہی ہے شاید یہی بات میری بخشش اور نجات کا سبب بن جائے۔"

سچ کے سریدوں کو باہر بڑی بے چینی ہو رہی تھی کہ اندر بیروں میں مشاغل اور سلطان بھلول میں معلوم نہیں کس قسم کی باتیں ہو رہی ہیں۔ سریدوں نے ایک ساتھ آپ کے حجرے میں داخلے کا منصوبہ بنایا اور اجازت کے بعد اندر چلے گئے۔ وہاں انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ سلطان کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ وہ اس طرح رورہا تھا کہ اس کے دونوں ہونٹ بری طرح تھر تھرا رہے تھے اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

آپ نے سلطان کو حکم دیا: "اے نیک دل سلطان! جا اور اسی طرح خشیتِ الہی سے حکومت کرتا رہ۔"

کچھ دیر بعد سلطان چلا گیا۔

آپ نے اس سے پوچھا: "نوجوان! تیرا نام کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا: "بندے کو کچھ کہتے ہیں۔"

آپ نے منہ بنا کر کہا: "تجھے یہ سب کچھ نام نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ اس کے آگے پیچھے بھی کچھ ہو چاہیے تھا۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ایک سرید نے عرض کیا: "حضرت! اس کو اس کے باپ شہاب خان نے بھیجا ہے۔ فقرہ کی محفل میں جا سوسوں اور مجرّدوں کا کیا کام؟"

آپ نے فرمایا: "نہیں، ایسا نہ کہو۔ اس کو محفل میں رہنے دو یہ ہمارا کیا لے گا۔"

جہانی نے غصے میں کہا: "حضرت! یہ کوئی اچھا نوجوان نہیں ہے، میں اس کو یہاں نہیں دیکھ سکتا۔ ابھی نکال باہر کرتا ہوں۔"

آپ نے جہانی کو روکا فرمایا: "جہانی! صبر صبر، جلد بازی اور جوش سے مت کام لے۔"

جہانی نے سوچا، ذرا دیر بعد جب شہاب خان کا بیٹا یہاں سے جانے لگے گا تو یہ باہر نکل کر اس سے وہ سب چیمیں لیں گے جس میں جا سوسی اور مجرّی کی ہاتھیں لکھی ہوں گی۔

آپ نے جہانی کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے فرمایا: "جہانی! اب تم حد سے بڑھ رہے ہو۔ ایک کام سے میں نے تمہیں روک دیا تو اب اسے دوسری طرح سے کرنے کا ارادہ کیوں؟"

جہانی نے عرض کیا: "حضرت! میں نے توبہ کی اور باز آیا مگر آپ اس کو بھی تو کچھ کہیے۔"

آپ نے فرمایا: "ہر جگہ اپنے محبوب کا طالب موجود ملے گا وہ ہوشیار ہو یا مست، اسی طرح ہر جگہ مقامِ عشق ہے، وہ مسجد ہو یا گلیا۔"

شہاب خان کے بیٹے محمد کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ وارفتہ وار خود رفتہ اپنی جگہ سے اٹھا اور آپ کے قدموں میں گر گیا، رورور بولا: "حضرت! مجھے معاف کر دیجیے میں بہت شرمندہ ہوں۔"

آپ نے فرمایا: "تو اپنا کام کر، میں نے تو تجھے نہیں روکا۔"

محمد نے جواب دیا: "اب اور کیا کیجیے گا، میرے اندر ایک آگ سی لگی ہوئی ہے۔ خدا کے لیے اس کے لیے کچھ کیجیے، ورنہ میں مایہ ہے آپ کی طرح تر ہتا رہوں گا۔"

آپ نے فرمایا: "اچھا اب چپ چاپ بیٹھ جا اور توبہ واستغفار کر، خدا بہتر کرے گا۔"

اس نے توبہ کی تو اسے سکون ملا، وہ یہاں سے اٹھ کر باپ کے پاس گیا اور اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ اب وہ شیخ ساء الدین کا سرید ہو چکا ہے۔ اس لیے ان خدمات کی بجا آوری کی اس سے امید نہ کی جائے جواب تک انجام دینا رہا ہے۔ اب وہ تائب ہو چکا ہے۔

شہاب خان کو بڑی مایوسی ہوئی لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس نے سلطان بھلول لودھی کو بھی ساء الدین کے حلقہ جوشوں میں دیکھا۔ آپ اپنے سریدوں اور ارادت مندوں میں گھرے بیٹھے تھے اور انہیں نصیحتیں فرما رہے تھے۔ اسی دوران ایک سرید باہر سے اندر داخل ہوا اور عرض کیا: "سلطان بھلول لودھی اذن باریابی چاہتا ہے، کیا حکم ہے؟"

آپ اٹھ کر اپنے حجرے میں جاتے ہوئے بولے: "اس کو میرے پاس بھیج دو۔"

کچھ دیر بعد سریدوں اور ارادت مندوں نے دیکھا۔ سلطان نہایت عاجزی و انکساری سے اندر داخل ہوا اور آپ کے حجرے میں چلا گیا۔ سلطان نے خود کو شیخ ساء الدین کے قدموں میں گرا دیا۔ لیکن آپ نے اس کو اٹھا کر اپنے سامنے بٹھالیا۔ پوچھا: "کیا بات ہے سلطان۔ تو پریشان تو نہیں؟"

سلطان نے عرض کیا: "حضرت! میں نادوم ہوں کہ اتنی قربت ہونے کے باوجود میں حضور کی خدمت میں حاضری دینے سے قاصر رہا۔"

آپ نے فرمایا: "اس کی کوئی ضرورت تو نہ تھی۔ پھر بھی اگر اس میں تیری کوئی مشا ہو اور تجھ کو کسی قسم کا فائدہ پہنچ

جو پور کا فرماں روا سلطان حسین شرقی دہلی پر نظر میں رہے پور سے ہندوستان کی حکمرانی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں سازش کا بھی سہارا لیا اور سلطان بہلول لودھی کے اسرا میں سے بعض کو توڑ لیا اور یہ حرم و طمع میں سازشیں کرنے لگے۔ لودھی دربار کا امیر سلطان احمد جلوانی سازشی اور نڈر آدمی اور کاکڑ کا روح رواں تھا۔ ایک دن سلطان احمد جلوانی فتح سماء الدین کی خدمت میں متوجہ ہو گیا اور عاجزی سے عرض کیا: "حضرت! آپ بھی کے کام آتے ہیں، میری بھی مدد فرمائیے۔"

آپ نے فرمایا: "سلطان احمد! تو خود لودھی دربار کا اتنا بڑا امیر ہے کہ دوسروں کے کام آسکتا ہے میں تیری کیا مدد کروں۔"

سلطان احمد جلوانی نے آپ کے سریدوں کی طرف دیکھتے ہوئے عرض کیا: "حضرت! میں کچھ تھکیہ میں عرض کرتا چاہتا ہوں۔"

آپ نے فرمایا: "اگر قلب میں کسی قسم کی کھوٹ نہیں ہے تو اس کا اظہار سب کے سامنے بھی ہو سکتا ہے لیکن شاید ایسا نہیں ہے۔" اس کے بعد آپ نے سریدوں کو اشارے سے غم دیا کہ باہر چلے جائیں۔

جب بالکل تھکیہ ہو گیا تو سلطان احمد جلوانی نے ایک بار پھر اصرار اور کچھ گرسرکشی میں عرض کیا: "حضرت! بات دراصل یہ ہے کہ جو پور کا فرماں روا سلطان حسین شرقی خاص طاقت ور اور دبدبے کا فرماں روا ہے۔ اس وقت اس کی طاقت کا کوئی دوسرا منکران نہیں۔ ان خصوصیات کے علاوہ وہ بلا کا مردم شناس بھی ہے۔ اس نے اپنے ارد گرد نہایت لائق آدمی جمع کر رکھے ہیں۔ اب اس کا ارادہ ہے کہ پور سے ہندوستان پر حکومت کرے۔ اس نے لودھی دربار کے امرا کو نہیں دلایا ہے کہ انہیں شایان شان مناصب دیے جائیں گے چنانچہ لودھی دربار کے بیشتر امرا نے یہ متفقہ فیصلہ کیا ہے کہ سلطان حسین شرقی کی مدد کریں، وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر وہ پور سے ہندوستان کا بادشاہ ہو گیا تو اسلام کی بڑی خدمت کرے گا اور دین کے لیے جاگیریں وقف کر دے گا۔"

آپ نے پوچھا: "مگر تو یہ تو بتا کہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟"

جلوانی امیر نے جواب دیا: "آپ سے سلطان حسین شرقی کے حق میں فتح و نصرت کی دعا میں۔"

آپ نے دوسرا سوال کیا: "اچھا جلوانی امیر میرے ایک سوال کا اور جواب دے دے پھر میں فیصلہ کروں گا کہ تیری مدد کروں یا نہ کروں۔"

جلوانی امیر نے پوچھا: "کیجیے سوال۔ میں، اللہ نے چاہا تو ضرور جواب دوں گا۔"

آپ نے فرمایا: "بہلول لودھی نے اب تک اسلام کے خلاف کتنے کام کیے ہیں؟"

جلوانی امیر نے جواب دیا: "شاید ایک بھی نہیں۔"

آپ نے فرمایا: "اس نے بھی کسی کو نقصان پہنچایا؟"

جلوانی نے جواب دیا: "شاید نہیں، لیکن وہ ترقیاں جلدی جلدی نہیں دیتا۔ ہم لوگ کب تک اس کا انتظار کریں گے۔"

آپ نے اٹھ کر بیٹھے ہوئے جلوانی امیر کو قہر آلود نظروں سے گھورا۔ فرمایا: "سلطان احمد جلوانی! تو نے اور تیرے باپ نے لودھی دربار کا تک کھایا ہے اس لیے اپنے آقا کے خلاف اس طرح سوچنا اور اس کے دشمن کا ساتھ دینا تک حرامی اور ننداری ہے۔ جو کہ کسی شریف شخص کو زیب نہیں دیتی۔ جاؤ اور سلطان بہلول لودھی کا ساتھ دو کیونکہ لوح محفوظ میں سلطان حسین شرقی کی شکست اور بہلول لودھی کی فتح تحریر ہے پھر ایسے شخص کا ساتھ کیوں دیا جائے، جس کا خدا خود ساتھ نہیں دے رہا۔"

چنانچہ آپ بہت دیر تک جلوانی امیر کو سمجھاتے رہے اور پیش آمدہ واقعات کی خیال اور قیاسی نظر کشی کرتے رہے، آخر میں فرمایا: "جلوانی! تو یہ بات یاد رکھ کہ دور کے ذحول سہانے، سلطان حسین شرقی تجھ سے کیے ہوئے وعدے میں سے ایک پر بھی پورا نہیں اترے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ تجھے اور تیرے ساتھی امیروں کو ننداری کے جرم میں قتل کرادے کیونکہ جو لوگ انہوں کا ساتھ نہیں دیتے، ان پر دنیا کے فاسق بھی اعتبار نہیں کرتے۔ اس لیے میرا مخلص مشورہ یہ ہے کہ تم

سب سلطان بہلول لودھی کا ساتھ دو اور جو کچھ بھی لینا ہے اس سے لو۔"

سلطان جلوانی خاموش ہو گیا۔ آپ نے اس کو ایک بار پھر سمجھایا اور اس کے دل و دماغ میں یہ بات بخدادی کر اس جنگ میں سلطان بہلول لودھی حق پر ہے اور خدا اس کے ساتھ ہے۔

چنانچہ جلوانی مان گیا اور دوسرے سازشی اور باغی امرا نے بھی جلوانی امیر کا ساتھ دیا اور آپ نے ان سب کے حق میں بڑی دعائیں کیں۔ جب تک سلطان بہلول لودھی زندہ رہا، اس کو اس سازش کا حال نہیں معلوم ہو سکا۔

☆☆☆☆

ایک دن آپ تخت پر بیٹھے کھڑے تھے۔ اس وقت ان کے سر پر غلام جہانی بھی وہاں پہنچ گئے۔ آپ نے انہیں مسکرا کر دیکھا اور مزاح پر سی کی، پھر پوچھا: "جہانی! میرے ساتھ کھانا پسند کرو گے؟"

جہانی نے عرض کیا: "اس سے زیادہ میری خوش قسمتی کیا ہوگی کہ میں آپ کا لاش کھاؤں نہ کہ یہ آپ کے ساتھ تناول کروں۔" زبے قسمت، زبے نصیب۔

آپ نے مسکرا کر فرمایا: "میں جو کچھ کھا رہا ہوں، اگر تم بھی اسے کھاؤ گے تو اس کے لیے ریاضت درکار ہے۔"

جہانی نے جواب دیا: "میں ہر قسم کی ریاضت کے لیے تیار ہوں۔"

آپ نے ایک بار پھر مسکرا کر فرمایا: "جہانی! سوچ لو میں تو پابندی کی بات کر رہا ہوں۔"

جہانی نے پھر وعدہ کیا: "میں وعدہ جو کر رہا ہوں ریاضت کا۔"

آپ نے کھانے میں جہانی کو شریک کر لیا۔ جہانی نے جیسے ہی پہلا لقمہ منہ میں رکھا، منہ بنانے لگے۔ پتلی مریضوں والی پھوڑی، مکی بھیجی تھی اور بودا بھی۔ پھوڑی میں جو روغن استعمال ہوا تھا، وہ کچھ تھا جہانی نے منہ بنا کر باورچی کو آواز دی: "سازوار (خانساں) کدھر چلا گیا، ذرا ادھر تو آتا۔"

سازوار بھاگا بھاگا آیا اور آپ سے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ بولا: "ارشاد۔"

جہانی نے اس کو ڈانٹنا شروع کر دیا: "اوبہ بخت یہ کھانا تو نے کھا یا ہے؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی: "ہاں، کیوں۔ کوئی خاص بات؟"

جہانی نے کہا: "ذرا کچھ کھو تو دیکھ۔"

اس نے جواب دیا: "مجھ میں اتنی ہمت کہاں کہ پیر و مرشد کی اجازت کے بغیر ان کے آگے سے لقمہ لوں۔"

جہانی نے ہنسنے میں کہا: "میں جو کہہ رہا ہوں، ذرا کچھ کے تو دیکھ۔"

فتح سماء الدین نے مسکرا کر پوچھا: "جہانی! کیا بات ہے؟ تو اتنا ناراض کیوں ہے؟"

جہانی نے کہا: "حضرت! جو بات میں کہنا چاہتا ہوں، آپ جانتے ہیں۔ مجھے خیرت ہے کہ آپ نے اس کو ڈانٹا کیوں نہیں۔ سرزنش کیوں نہیں کی۔"

آپ نے پوچھا: "لیکن میں اس کو کیوں ڈانٹوں؟"

جہانی نے کہا: "حضرت! اس ذلیل انسان نے پھوڑی جو پکائی ہے۔ اس کے چاول کپے ہیں اور جو روغن استعمال کیا ہے وہ کچھ ہے۔"

آپ نے فرمایا: "کیا میں نے تجھ سے یہ پہلے ہی نہیں کہہ دیا تھا کہ اس... کھانے کے لیے تجھ کو ریاضت کرنا پڑے گی۔ تو نے اس کا وعدہ بھی کیا تھا۔ پھر یہ وعدہ خلافی کیوں؟"

جہانی نے عاجزی سے عرض کیا: "حضرت! میں نے کون سی وعدہ خلافی کی۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتا۔"

آپ نے فرمایا: "میرے چل اور غصے سے بچتے رہنا بھی عبادت ہے۔ میں نے اسی ریاضت کی تجھ سے بات کی تھی۔ اسی کا وعدہ لیا تھا۔"

جہانی نے شرم و ندامت سے سر جھکا لیا اور خانساں سے کہا: "جہانی واقعی میں نے وعدہ خلافی کی ہے اور میں بہت نادم ہوں۔ مجھ کو معاف کر دو۔"

خانساں بہت شرمندہ تھا مگر جہانی کے مجز و اصرار نے اسے مجبور کر دیا اور اس نے معاف کر دیا۔

☆ ☆ ☆
اس دور ان جمالی کی طبیعت خراب رہنے لگی، بھوک جاتی رہی اور صحت گرنے لگی، جمالی کو کسی طبیب کی ضرورت تھی۔

ایک دن صبح کے سرید نے جمالی کو بتایا کہ بنگال سے ایک طبیب آیا ہوا ہے اور وہ کہتا ہے کہ تمہارے مرض کا علاج کروں گا۔ جمالی نے اشتیاق ظاہر کیا کہ اس طبیب سے ملاقات کرانی جائے۔

چنانچہ اس طبیب کو جمالی سے ملوایا گیا۔ طبیب نے ان کا حال پوچھا اور پارے کا ذرا سا کشتہ کھانے کے لیے دیا۔ طبیب نے جمالی کو یقین دلایا۔ "جناب پارے کا یہ ذرا سا کشتہ آپ کو تندرست و توانا کر دے گا۔"

جمالی نے کہا۔ "کیا اور کشتہ بھی مل جائے گا؟"

طبیب نے جواب دیا۔ "اس کا اثر تو دیکھ لو اور بھی مل جائے گا مگر یوں نہیں، اگر ضرورت محسوس کی تو۔"

جمالی نے ایک ہفتے کے اندر یہ فرق محسوس کیا کہ پورے جسم میں توانائی کی لہری دوڑ گئی۔ بھوک کھل کر نکلنے لگی اور صحت سنبھلنے لگی۔ جمالی نے طبیب سے دوبارہ ملاقات کی اور رازداری سے کہا۔ "طبیب صاحب! میں سمجھتا ہوں اگر آپ مجھ کو ایک خوراک اور مرحمت فرمادیں تو میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

طبیب نے کہا۔ "جناب! میں سمجھتا ہوں، بس ایک ہی خوراک کافی ہے زیادہ نقصان کر جائے گا۔"

جمالی نے کہا۔ "اچھا تب پھر مجھ کو پھونکنے کا نسخہ ہی بتا دیجیے کیونکہ آپ اگر بنگال چلے گئے تو میں یہ نسخہ خود ہی تیار کروں گا۔"

طبیب نے جواب دیا۔ "میں دو چار دن میں پارے کو پھونکنے کا عملی مظاہرہ کروں گا بس اس سے سیکھ لیں۔"

جمالی کا شوق فروں تر ہونے لگا۔ "اس میں دو چار دن کی کیا بات ہے، ابھی آج ہی کیوں نہیں۔"

طبیب نے کہا۔ "میں جو کہہ رہا ہوں۔ میں نسخہ کھسوا بھی دوں گا اور عملی ترکیب بھی بتا دوں گا۔"

اس بات کو کئی دن گزر گئے اور چار پانچ دن کے بعد یہ طے پایا کہ جب طبیب اپنے وطن جانے لگے تو جمالی کا کام کر دے گا لیکن اس آخری دن سے پہلے ہی صبح نے جمالی کو طلب کر لیا۔ پوچھا جمالی اتیری طبیعت کا کیا حال ہے؟

جمالی نے جواب دیا۔ "بھروسہ بالکل صحیح ہے۔"

آپ نے پوچھا۔ "پھر مزید کشتے کی ضرورت کیوں محسوس ہو رہی ہے؟"

جمالی کو حیرت ہوئی کہ یہ بات جبر و مرشد کو کس طرح معلوم ہوئی کیونکہ طبیب نے یہ بات ہر ایک سے چھپائی تھی۔ یہاں تک کہ جس سرید نے طبیب کو جمالی سے ملوایا تھا، اس کو بھی کشتے کی بات نہیں معلوم تھی کیونکہ طبیب اس کا چہ چاہتا تھا۔

جب جمالی نے کوئی جواب نہیں دیا تو شیخ نے انہیں سمجھانا شروع کر دیا۔ "جمالی! تو نہیں جانتا۔ اس طبیب کا کشتہ کچا رہ جاتا ہے اس لیے اگر تو نے اس کا پھونکا ہوا کشتہ کھایا تو تیرے جسم کو سخت نقصان پہنچ جائے گا اور اگر تو نے اس سے نسخہ حاصل کر کے خود پھونکا تو وہ اور زیادہ کچا رہ جائے گا اور تو ناقابل تلافی نقصان اٹھا جائے گا اس لیے میرا کہنا مان اور کشتوں کے چکر میں نہ پڑ۔"

جمالی نے دبی زبان میں عرض کیا۔ "حضرت! میری صحت خراب جو رہتی ہے، اس کا میں کیا کروں؟"

آپ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے اور آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "خدا یا! میں جمالی کو بہت عزیز رکھتا ہوں یہ بتا رہا ہوں کہ اس کو صحت یاب کر دے، یہ پریشان رہتا ہے اس کو سکون بخش دے، خدا یا! جمالی تیرا نیک بندہ ہے اور عالم بھی ہے۔ اس کے علم سے انسانوں کو فائدہ پہنچے ہیں اور آئندہ بھی پہنچتے رہیں گے۔ اس پر اپنی نظر کرم رکھ اور صحت و توانائی عطا فرما۔"

جمالی کو سخت حیرت تھی کہ آپ کی دعائیں طمانیت، سکون اور صحت و تازگی بن کر ان کے جسم و روح میں ملول کر رہی تھیں۔ جمالی نے چند دنوں کے اندر ہی خود کو بالکل صحت یاب اور توانا پایا۔

بنگالی طبیب اپنے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے جمالی سے ملے گیا، اس نے جمالی کے چہرے پر قشنگی اور تازگی

محسوس کی تو پوچھا۔ "کیا بات ہے جمالی! کیا میرا کشتہ اب بھی اثر دکھا رہا ہے؟"

جمالی نے جواب دیا۔ "میں! کسی دوا اور کہاں کا کشتہ؟ یہ تو تازگی اور قشنگی حضرت جبر و مرشد کی دعاؤں کے طفیل ہے جب سے انہوں نے میرے حق میں دعا کی ہے میں بہت خوش اور صحت مند ہو رہا ہوں۔"

اس وقت بنگالی طبیب کو حضرت شیخ کے مقام اور مرتبے کا کسی قدر اندازہ ہوا، وہ حضرت شیخ کے پاس پہنچا اور ان سے درخواست کی کہ اس کے حق میں دعا فرمادیں۔

آپ نے فرمایا۔ "تو اللہ کی مخلوق کو اپنے تجربوں کی نذر نہ کر۔ جب تو ایسا ہو جائے گا کہ لوگ تیری شکایتیں نہ کر سکیں، اس وقت میں تیرے حق میں ضرور دعا کروں گا۔"

بنگالی طبیب مایوس ہو کر اپنے وطن واپس چلا گیا۔

☆ ☆ ☆
شیخ سماء الدین کو جب یہ معلوم ہوا کہ جمالی حج کو جا رہے ہیں تو انہیں تاکید کر دی کہ جلدی واپس آجائے۔

جمالی حج کے لیے گئے تو ایک مدت تک ان کی خیریت ہی نہیں معلوم ہو سکی۔ شیخ سماء الدین ان کے لیے بے چین رہنے لگے۔ ادھر جمالی واپسی میں بہت پریشان ہوئے، یہاں تک کہ قافلے سے بچھڑ گئے اور ادھر ادھر بھٹکنے لگے، شہروں و دیروں جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھاتے رہے لیکن کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔

جمالی ایک دن صحرا میں کمزے حد نظر تک پہنچے ہوئے ریت کے تودوں اور مسندوں کو خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے پاس پانی کا جڑ خیرہ تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر ان کی وحشت میں اضافہ ہو رہا تھا کہ اب کیا ہوگا؟

جمالی نے مصیبت بھائی اور مسجد سے میں گر کر گزرائے کہ خدا یا! میں نے حج کر لیا اور مدینہ منورہ کی زیارت بھی کر لی۔ اب میں اپنے جبر و مرشد کی خدمت میں پہنچنا چاہتا ہوں، میری مدد کر اور میرے دل سے خوف اور شک و شبہ کو دور فرما۔"

جمالی مصیبت پر گرے یہ دعا کر رہے تھے کہ ایک طرف سے ایک گھڑ سوار آیا اور ان کے پاس رک کر گھوڑے سے اتر اور جمالی کے ہاتھ میں ایک مشکیزہ تھا دیا کہا۔ "حضرت! جب تک آپ کو دافر مقدار میں پانی نہیں ملتا میرا مشکیزہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ اس سے کام لے لیں، پھر دیکھا جائے گا۔"

جمالی نے اس شخص کا شکریہ ادا کیا اور بعد میں اپنی اس غلطی پر خالص شرمندہ ہوئے کہ وہ اس شخص کا نام اور پتا نہیں معلوم کر سکے۔

جمالی نے اس مشکیزے کو دور ان سفر ہمیشہ اپنے پاس رکھا مگر پھر معلوم نہیں اس کو کس نے غائب کر دیا۔ ایک مدت بعد جمالی نے سورت کی بندرگاہ پر قدم رکھا اور دہلی جانے کا منصوبہ بنایا۔ یہاں انہیں بارہا ایسا محسوس ہوا گویا وہ اپنے جبر و مرشد کے پاس کمزے ہیں اور وہ انہیں بڑی نرمی سے ڈانٹ رہے ہیں۔ پوچھ رہے ہیں۔ "جمالی! کیا بات ہے؟ اتنا وقت کہاں ضائع کر دیا؟ میں تو تیرا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔"

جمالی نے فوراً رخصت سفر باندھا اور دہلی روانہ ہوئے۔ جب وہ اپنے جبر و مرشد کی خدمت میں پہنچے تو شیخ سماء الدین کے ایک بیٹے نے جمالی کو بتایا کہ ابھی چند دن پہلے والد بزرگوار آپ کو بہت یاد کر رہے تھے اور وہ دعا ان کی ایجاب قبولیت کو پہنچی اور آپ یہاں آ گئے۔

جمالی نے اپنا سر شیخ کے قدموں میں رکھ دیا اور کچھ دیر روتے رہے۔

اب شیخ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ جمالی کو اپنے سامنے بٹھا کر پوچھا۔ "جمالی! میں نے ایک عجیب سا خواب دیکھا۔ کیا تجھ کو پتا ہے کہ میں نے کیا دیکھا؟"

جمالی نے نفی میں گردن ہلا دی اور منہ بانہ عرض کیا۔ "نہیں، کچھ بھی نہیں۔ آپ ہی بتائیں گے تو خواب کا علم ہو جائے گا۔"

شیخ نے کہا۔ "میں نے دیکھا۔ میں سلطان شمس الدین اتش کے ساتھ حوض شمس کے کنارے کھڑا ہوں۔ سلطان

سراب

ڈاکٹر شیر شاہ سید

انسان محبت میں کمپنی کبھی کس قدر آگے نکل جاتا ہے اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب کمپنی ہلٹ کر ایک نظر چھوڑے ہوئے رستوں کو دیکھتا ہے مگر... جانے کیسی اداسی نگاہوں کو زنجیر کر لیتی ہے کہ درد چھکے سے دل میں کڑوا ہوا محسوس ہوتا ہے... ایسا ہی ایک سفر انہوں نے وہیں طے کیا تھا لیکن حاصل کچھ نہ تھا...

ایک جان دو قالب جوڑے کی تنہائیوں کا قصہ



.... نا ہے

”جاوید فوراً چلیں شادی کے گھر فوراً“

اس کے چہرے کی وحشت دیکھ کر میں پریشان ہو گیا۔ ”بتاؤ تو کسی کیا بات ہے؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

صبح سویرے کا وقت تھا اور میں گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا کہ عذرا نے مجھے جھنجھوڑا دیا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا، اس کا چہرہ سرخ تھا اور جسم بھی شدید کانپ رہا تھا۔ میں گھبرا گیا۔ ”کیا ہوا، کیا ہوا خیریت تو ہے، سب ٹھیک ہے“

اتش حوض کے پاس کی زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھ رہے ہیں۔
”سبحانہ الدین! کیا تم جانتے ہو کہ تمہاری آخری آرام گاہ یہ ہے؟“

میں نے جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتا، آپ فرماتے ہیں تو یہی میری آرام گاہ ہوگی۔“
جمالی نے یہ خواب سنا تو انہیں رونا آ گیا۔ زار و قطار رونے لگے۔ ”سبحانہ الدین! یہ تو میری آخری آرام گاہ ہے۔“
ایک دن سچ نے کہا۔ ”جمالی! میرا ایک بیٹا ہے عبد اللہ بیابانی۔ اس نے تو عمری میں گھر بار چھوڑ دیا اور اللہ کی تلاش میں بن کر راہ لی، پتا نہیں کہ اب وہ کہاں ہوگا؟“
جمالی نے عرض کیا۔ ”پیر و مرشد! اگر آپ کو اپنے بیٹے کی یاد ستا رہی ہے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کہیں نہ کہیں وہ موجود ضرور ہے اور خیریت سے ہے۔“
سچ نے کہا۔ ”جمالی! تو نہیں جانتا یہ میرا آخری زمانہ ہے پتا نہیں کب میرے مالک کا بلاوا آ جائے اور میں تھکے ہوئے جواری کی طرح کچھ کہے سے بغیر ہی اس سفر پر روانہ ہو جاؤں۔“
جمالی نے آہستہ سے کہا۔ ”پیر و مرشد! آپ مایوسی کی باتیں نہ کیجیے، ابھی آپ ہم میں بہت دنوں تک رہیں گے۔ آپ اداس نہ ہوں۔“

سچ نے جواب دیا۔ ”جمالی! یہ ساری تسلی دلا سے کی باتیں ہیں ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ میرا وقت پورا ہو چکا ہے۔“
اس گفتگو کے بعد سچ نے ہر کسی سے ملنا جلنا ترک کر دیا، استغراق اور محویت میں اضافہ ہو گیا۔ ایک دن مغرب کی نماز پڑھ کر جمالی کو طلب کر لیا اور ان سے بڑی گرجوٹی سے ملے۔ ”جمالی! میرے نہ ملنے سے تو اداس تو نہیں ہوا؟“
جمالی نے جواب دیا۔ ”پیر و مرشد! میں اداس تو بہت ہوا مگر اس میں آپ کی رشا دیکھ کر یہ اذیت بھی بھیل گیا۔“
سچ نے کہا۔ ”اچھا اب کہیں نہ جانا۔ پتا نہیں کب حدائی کی گھڑی آ جائے۔“
جمالی کو رونا آ گیا۔ لیکن سچ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پھر عشا سے پہلے اٹھے اور جمالی سے کہا۔ ”جمالی! میں وضو کرتا چاہتا ہوں۔“

جمالی نے عرض کیا۔ ”حضرت! مغرب کا وضو تو آپ کر چکے ہیں۔ کیا وہ کافی نہیں ہے؟“
آپ نے فرمایا۔ ”نہیں۔ میں نے دستور بنالیا ہے کہ ہر نماز سے پہلے وضو ضرور کر لوں، چنانچہ اس پر میں بڑی سختی سے عمل کر رہا ہوں۔“
عشا کی نماز پڑھ چکے کے بعد آپ اپنے بستر پر لیٹ گئے اور جمالی سے کہا۔ ”جمالی! تو میں چلا، میرا وقت پورا ہو چکا اور وہ خالق حقیقی میرا منتظر ہے۔“

جمالی نے کچھ کہنے کے لیے انہی منہ کھولا ہی تھا کہ سچ کی روح پرواز کر گئی۔
وصال کی خبر آنا فانا ہر طرف پھیل گئی اور لوگوں کے پرے کے پرے آنے لگے۔ جنازے میں دو دو رنگ سری بر نظر آ رہے تھے اور جمالی یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ سچ کو حوض شمس کے قریب وہیں دفن کیا گیا جس جگہ کو وہ سلطان اتش کے ساتھ پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔

جمالی نے ان کی تاریخ وصال کی مرشد انس و ملک شاہ الدین چورفت اے جمالی بر سریر عرش آہ گام او بہشت خلد آہ بنام او اگر پرمد کے سال تاریخش بگو (بہشت) آہ ہر نام او
۹۰۱=۱۹۶۷+۷۰۵

اذا کرامہ، محمد غوثی شکاری۔ اخبار الانوار، فتح عبدالحق محدث دہلوی۔ حجاز انعام، میر علی شیر قاسمی۔ بزم صوفیہ، سید مبارک الدین عبدالرحمن۔ خزینۃ الامنیۃ، مفتی نظام مسرور لاہوری۔ سفینۃ الاولیاء، شہزادہ داراشکوہ۔ تاج فیروز شاہی، ضیاء الدین برنی۔ حضرت بولی قندار، اقبال ملار الدین

ماخذات

”خیریت تو ہے؟ سب ٹھیک ہے؟“

”پتا نہیں کیا بات ہے۔ ابھی شاز یہ بھائی کا فون آیا تھا کہ منیر بھائی زندہ ہیں، مگر یہ ہیں، حق پہنچے ہیں۔ ہمیں بلایا ہے اس نے۔“ عذرا نے ٹھہرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”کیا بات کر رہی ہو؟ پانچ دن پہلے تو ہم نے منیر بھائی کو دفن کیا ہے، اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا ہے میں نے۔ چھوٹ چھوٹے سفید کفن میں، پھر سنی کی مندر پر سلیب رکھ کر اس پر دھیرے دھیرے سنی ڈالی گئی۔ سب نے دعا کی تھی ان کی بخشش کے لیے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“ میں نے جواب دیا تھا۔

”ایسا ہی ہوا ہے جاوید، شاز یہ بھائی نے تفصیل سے بتایا ہے کہ صبح سویرے فجر سے پہلے وہ پہنچے ہیں۔ وہ تو اسی وقت فون کرنے والی تھی مگر انہوں نے منع کر دیا تھا اور اب نہادھو کر ناشتا وغیرہ کر کے وہ سو رہے ہیں تو شاز یہ بھائی نے مجھے بتایا ہے بلکہ بلایا ہے۔ چلیں جلدی سے تیار ہو جائیں۔ میرے خدا جانے کیا ہو رہا ہے ہم لوگوں کے ساتھ۔“

”تم صحیح کہہ رہی ہو؟“ وہ شاز یہ بھائی کی ہی آواز تھی کسی نے مذاق تو نہیں کیا ہے؟“ میں نے پھر بے چینی سے پوچھا۔

”کیسی بات کر رہے ہیں جاوید، میں نے بیس منٹ ان سے بات کی ہے۔ تفصیل سے بتاتی ہوں، تیار تو ہوں آپ جلدی سے۔“

میں پریشان سا اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلا گیا تھا۔

منیر میرے کزن تھے۔ چچا جان کے سب سے چھوٹے بیٹے، مجھ سے تین سال بڑے۔ بچپن سے ہی بہت دوستی تھی میری ان سے۔ ہم دونوں کا اسکول بھی ایک ہی تھا۔ وہ مجھ سے سینئر تھے اور میں تقریباً ان کے ہی بخش قدم پر چلتا ہوا اسکول سے کالج، کالج سے آئی بی اے اور آئی بی اے سے ایم بی اے کر کے نکلا تھا۔ انہیں ایک ملٹی ٹیکسل ادارے میں بہت اچھی نوکری مل گئی اور میں نے بینک سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہوں پر اچھا کام کر رہے تھے۔

پھر ان کی زندگی میں ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔ شاز یہ ان کی زندگی میں بکا پک داخل ہو گئیں، ذات برادری سے الگ لوگ، چچا اور چچی جان کے لیے بالکل ہی قابل قبول نہیں تھے، نہ بھائیوں کو اور نہ ہی بہنوں کو۔ منیر

چھوٹے تھے، اچھے تعلیم یافتہ تھے، اچھا کام کر رہے تھے۔ ان کے گھر کے آخری فرد جس کی شادی ہوئی تھی بہت دھوم دھام سے۔ بہنوں کو ارمان نکالنا تھے۔ چچا اور چچی نے اپنے پرانے دوست کی بیٹی سے منگنی بھی کر دی تھی ان کی اور اب شاز یہ بیچ میں آگئی تھیں۔

شاز یہ پڑھی لکھی تھیں اور خوب صورت بھی۔ منیر بھائی کے ایک دوست کی چھوٹی بہن، کوئی بھی انہیں دیکھ کر ان کی محبت میں گرفتار ہو سکتا تھا۔ بچپن کی خوب صورتی، کراچی کی تعلیم، ایک اعلیٰ ماحول اور پھر وہ شہر کے سب سے بڑے انگریزی اخبار میں نوکری کر رہی تھیں۔ منیر بھائی کا متاثر ہونا اور ان سے مرعوب ہو جانا کوئی اچھنبے کی بات تو نہیں تھی۔ انہوں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ گھر والے اتنی مخالفت کریں گے۔ وہ تو ہنسنے بولنے، مسکراتے، مگنکنا تے، خوش رہنے والے آدمی تھے اور ساتھ میں بڑا مان تھا انہیں اپنے آپ پر، بھائی بہنوں پر اور خاندان کے دوسرے لوگوں پر۔

اس سے پہلے کہ بات گھر والوں تک پہنچتی انہوں نے شاز یہ بھائی کو پروپوز کیا، ان کی رضامندی حاصل کی اور وعدے بھی کیے جو کیے جاتے ہیں اور ساتھ شاز یہ کے گھر والوں کو بھی اپنے دوست کی مدد سے تیار کر لیا کہ وہ لوگ اپنی بیٹی کا ہاتھ غیر بچائیوں میں دے دیں۔

مگر بات اس وقت بڑی خراب ہو گئی جب انہوں نے چچا جان کو شاز یہ کی تصویر دکھا کر کہا کہ ان لوگوں کے گھر رشتہ لے کر جائیں۔ منیر بھائی کے گھر والے بھی رشتہ لے کر نہیں گئے۔ دو سال تک گھر میں کشمکش چلتی رہی۔ ناراضی، بحث، سہارہ، بھائی بہنوں کا کھانا، چچا جان کا فصر، چچی جان کی جذباتی تقریریں، سب جانتے ہوئے، سمجھتے ہوئے منیر بھائی اپنی بات پر اڑے رہے کہ شادی اگر ہوگی تو شاز یہ سے ہوگی، ورنہ نہیں ہوگی۔

ایک دن انہوں نے خاموشی سے گھر چھوڑ دیا۔ اپنا سامان لے کر میرے پاس آ گئے۔ میں نے عذرا سے شادی کر لی تھی اور خوش و خرم زندگی گزار رہا تھا۔ ابو، امی، بھائی جان کے پاس اسلام آباد میں تھے اور گھر میں بڑی کشادگی تھی۔ منیر بھائی ہمارے ساتھ چھ مہینے رہے۔ اس عرصے میں انہوں نے اپنا الگ مکان لیا، میری اور عذرا کی مدد سے اس کا سامان خریدا اور اسے مکان سے گھر میں تبدیل کر دیا۔ اس دوران میں ہر طریقے سے یہ کشمکش بھی کرتے رہے کہ کسی طرح سے گھر والوں کو

راضی کر لیں کہ وہ لوگ شاز یہ کے رشتے کو قبول کر لیں مگر انہیں کامیابی نہیں ہو سکی۔

ایک دن سادہ طریقے سے چند دوستوں کی موجودگی میں اور میرے جیسے رشتے داروں کے ساتھ ان کی برات شاز یہ کے گھر پہنچی اور نکاح کے بعد شاز یہ کی رخصتی کرا کے وہ اسے گھر لے آئے تھے۔

زندگی اپنی نئی ڈگر پر چل نکلی تھی۔ نہ وہ اپنے گھر والوں کو بھولے اور نہ ہی ان کے گھر والوں نے انہیں معاف کیا لیکن یہ ضرور ہوا کہ ہم لوگ ان کے اور وہ ہمارے بہت قریب آ گئے۔ عذرا اور شاز یہ کی خوب دوستی ہو گئی تھی جو روز بروز بڑھتی ہی چلی گئی۔ میرے دو بچے ہوئے، دو بیٹیاں، ان کے بھی چھ سال کے عرصے میں دو بیٹے اور ایک بیٹی ہوئی۔ ہم دونوں خاندانوں کا جیسے ایک چھوٹا سا یونٹ بن گیا تھا۔ عید، بقوعید، سالگرہ کی دعوتیں، ساتھ کھانا اکثر و بیشتر اور ساتھ ہی گھومنا، کبھی کبھی پکنک سمندر کے کنارے یا بچوں کی سالگرہ، گئے برسوں میں کتنے قریب آ گئے تھے ہم لوگ۔

منیر کو شاز یہ سے شدید محبت تھی مگر شاز یہ تو جیسے منیر کی پھارن تھیں۔ بے انتہا چاہتی تھیں، اپنی جان دینے کو تیار۔ انہیں شدید احساس تھا کہ منیر بھائی نے ان کے لیے اپنے پورے خاندان کو چھوڑ دیا ہے اس کا شدید غم بھی تھا انہیں۔ بڑی کوششیں کی تھیں اپنے طور پر انہوں نے کہ منیر بھائی کے گھر والے انہیں معاف کر دیں اور اپنے بیٹے کو، بھائی کو گلے لگا لیں۔ اگر باپ نہ سکی تو کم از کم بہنیں اور بھائی ہی کسی طرح کا تعلق رکھیں منیر سے، مگر ایسا ممکن نہیں ہو سکا۔ وہ تو ہر شرط ماننے کو تیار تھیں، سب کچھ کرنے کو تیار۔

میں کبھی نہیں سمجھ سکا کہ چچا جان اور چچی جان نے اس رشتے کو اتنا بڑا مسئلہ کیوں بنالیا تھا اور یہ بھی میں کبھی نہیں سمجھ سکا کہ ایک آخری چھوٹے بھائی کے لیے دو بہنوں اور دو بھائیوں کے دلوں میں کوئی پیار، محبت، شفقت، الفت کیوں نہیں جاگی، کیوں ان لوگوں نے انہیں اکیلا چھوڑ دیا، تنہا صرف اس وجہ سے کہ وہ شادی اپنی مرضی سے کرنا چاہتے تھے، اپنی زندگی اس کے ساتھ گزارنا چاہتے تھے، جو انہیں پیارا ہے، جو ان سے پیار کرتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ چچا اور چچی جان کی شدید محبت تھی جس نے ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو مفقود کر دیا تھا۔

وہ انہیں، اپنے آخری بچے کو نوٹ کر شدت سے چاہتے تھے۔ شاید انہوں نے کبھی انہیں بڑا نہیں سمجھا۔ ان کے لیے منیر بھائی چھوٹے تھے، بالکل چھوٹے جن سے انہیں شدید پیار تھا۔ جنہیں شاید ہمیشہ ان کی ضرورت تھی اور انہوں نے اس پیار، اس محبت کو پامال کر دیا، اس کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی گئی۔ یہ سوچتے کبھے بغیر کہ ماں باپ اور خاص کر ان جیسے ماں باپ جو کبھی بھی ان کے لیے برا نہیں کریں گے، برا نہیں سوچیں گے اور جو کچھ ان کے لیے پسند کریں گے وہ زمانے سے بڑھ کر ہوگا۔ وہ منیر بھائی کی پسند کو اپنی محبت کی توہین سمجھتے رہے اور اس جھوٹی اما کے اسیر ہو کر رہ گئے جس نے منیر بھائی اور ان کے خاندان کے درمیان سات سمندروں کا فاصلہ پیدا کر دیا تھا۔

شاز یہ بھائی کو غیر ضروری طور پر یہ احساس جرم تھا اور منیر بھائی کے دل میں فصر اور ایک احساس بے بسی جس نے ان کے اندر ایک اداسی سی پیدا کر دی تھی، ان حالات نے ان دونوں کو اور بھی زیادہ قریب کر دیا اور دونوں ہی ایک دوسرے کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی دنیا ان دونوں کی ذات میں ہی تھی۔

بچوں کی پیدائش کے بعد گھر میں رونق تھی اور منیر بھائی اپنے کام میں بے پناہ ترقی کر رہے تھے لیکن اکثر ان کی باتوں سے ایسا لگتا جیسے اندر ہی اندر انہیں شدید دکھ ہے کہ ان کے خاندان نے انہیں اور انہوں نے اپنے خاندان کو چھوڑ دیا ہے۔

پھر ایک دن مجھے پتا لگا تھا کہ وہ اپنے سالانہ میڈیکل چیک اپ کے لیے گئے تھے جہاں کچھ ٹیسٹ وغیرہ ہوئے ہیں اور ان کے خون میں کوئی سرنول کا لیول بڑھا ہوا ہے۔ اسی شام ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے رپورٹ کی تفصیل بتائی تھی۔ سگریٹ وہ پیتے نہیں تھے، کبھی کبھار کسی پارٹی میں سال میں تین چار دفعہ بیئر یا وائن پی لی تو پی لی مگر انہیں شرابی نہیں کہا جاسکتا تھا۔

شاز یہ بھائی بہت پریشان ہو گئی تھیں۔ گائے بکری کا گوشت گھر میں بند ہو گیا۔ تیل بھی استعمال کم کیے کر دیا گیا۔ مٹھائی اور روغنی چیزوں پر پابندی لگ گئی۔ سبزیاں پھل زیادہ سے زیادہ آنے لگے، روزانہ ٹھیلنے کی ضد اور انہیں خوش رکھنے کی کوشش۔ شاز یہ بھائی کا بس چلتا تو ان کی رگوں میں سرایت کر جاتیں، کوئی سرنول کے چھوٹے بڑے قطروں جیسے بے شمار ذرات کو رگوں، شریانوں، دل کے

خانوں سے چھان کر باہر نکال لائیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کی محبت جنوں کی حد تک بڑھ گئی ہے اور وہ ان کے لیے بہت پریشان رہنے لگی ہیں۔

پھر اچانک یہ خبر آئی کہ منیر بھائی کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ شام کو گھر واپس آئے تھے اور اپنے بائیں ہاتھ اور بازو میں درد اور بھاری پن کی شکایت کی تھی۔ شاز یہ بھائی نے آہستہ آہستہ بازوؤں کو دبایا، کندھوں پر مساج کیا تو انہیں کچھ اچھا محسوس ہوا تھا۔ دونوں یہ سوچ ہی رہے تھے کہ چل کر ڈاکٹر کو دکھائیں مگر یکایک انہیں سینے میں شدید درد اٹھا اور اس سے پہلے کہ میں پہنچتا، ایبویٹس آتی، وہ شاز یہ بھائی، بچوں اور دوستوں کو چھوڑ کر چلے گئے۔ نہ سلام نہ وصیت نہ یار سے گلے لگے اور نہ ہی آخری دفعہ ہاتھوں کو ہاتھتے کو چومنے دیا۔

بڑی اداسی اور غم کے ساتھ انہیں دفن کیا، ہم لوگوں نے۔ اپنے ہاتھوں سے انہیں نہلایا، جنازے کو خوشبوؤں میں بسایا، قبرستان لے جا کر متوں مٹی تلے دبا دیا تھا انہیں۔

جانے گزشتہ چار دن کیسے گزرے۔ کل پہلی رات تھی جو آخری پہر میری آنکھ لگی اور صبح صبح عذرا نے جگا دیا کہ منیر بھائی زندہ ہیں۔ میں جلدی جلدی تیار ہوتا رہا اور ایک ساعت میں یہ سارے خیالات میرے ذہن کے پردے پر تیز رفتار فلم کی طرح چل گئے۔ میں کنفیوزڈ تھا، پریشان اور خوفزدہ بھی۔ جانے کیا، کیا میرے ذہن میں پک رہا تھا۔ یہ تو صرف اخباروں میں پڑھا تھا کہ غلطی سے زندہ آدمی کو دفن کر دیا گیا جو بعد میں لوٹ آیا مگر منیر بھائی۔۔۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ انہیں میں نے چھوٹا، نہلایا تھا وہ مردہ تھے، بالکل مردہ۔

راستے میں عذرا نے بتایا کہ شاز یہ بھائی نے بتایا تھا صبح صبح اذانوں سے بھی پہلے دروازے پر دستک ہوئی تھی، انہوں نے ہی دروازہ کھولا تو سانسے منیر بھائی کھڑے تھے، کفن سے اپنے جسم کو ڈھانپے ہوئے، شیو بڑھا ہوا تھا۔ بال منہ اور کفن پر ہر طرف مٹی کے نشان تھے۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے بڑی مشکل سے قبر سے اپنے آپ کو نکالا تھا، غلطی سے انہیں زندہ دفن کر دیا گیا تھا۔ ان کے ہاتھوں پر نشان تھے، زخمی ناخن، وہ نہائے، شاز یہ بھائی نے انہیں شلوار قمیص دی تھی اور اپنی پسند کا آلیٹ کھا کر اب وہ تھکے ہارے بیڈروم میں سو رہے ہیں۔ بڑی شدید غم آگینی ہے، تھکا ہارا جسم ٹوٹ گیا

ہوگا۔ اس کے بعد شاز یہ بھائی نے سب سے پہلے صبح ہوتے ہی ہمیں بلا یا تھا۔

میرا تو جیسے سرگھوم گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، ہم سب لوگ اتنے باکھل نہیں ہو سکتے کہ ایک زندہ آدمی اور مردہ لاش میں فرق نہ کر سکیں۔ کوئی جان نہیں تھی ان میں۔ ڈاکٹر گھر پر موت کا سرٹیفکیٹ بنا کر گئے تھے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کہوں، میں خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔ دل میں دوسو سے لے ہوئے، جانے کہاں کہاں کی سوچ ذہن میں آتی رہی۔ کنفیوز۔۔۔۔۔ خوف زدہ۔۔۔۔۔ پریشان ایک عجیب سا احساس جانے کیا ہونے والا ہے۔

ہم نے ان کے گھر پر آہستہ سے دستک دی۔ شاز یہ بھائی نے فوراً دروازہ کھول دیا تھا گھر میں ابھی تک پھولوں اور عطری کی خوشبو تھی۔ لاؤنج میں دریاں بھی ہوئی تھیں اور چھوٹی ٹیبل پر سپارے رکھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ جنازے کو گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔

شاز یہ بھائی کا چہرہ کھلا ہوا تھا، وہ بے تابی سے عذرا کے گلے لگ گئی تھیں۔ ”وہ واپس آ گئے، عذرا واپس آ گئے بالکل ٹھیک ٹھاک۔ شکر ہے اور والدے کا، بڑی غلطی ہو گئی تھی ہم لوگوں سے۔ جانے مٹی تکلیف اٹھائی ہوگی انہوں نے۔ آسان تھوڑا ہے اس طرح سے مٹی کے ڈھیر سے زندہ بچ کر نکل آنا۔“ انہوں نے لاؤنج کے کونے میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے بڑے جذباتی انداز سے کہا تھا۔

”مگر بھائی کہاں ہیں وہ؟“ میں نے آہستہ سے پوچھا تھا۔

”ہاں چلو میں دکھاتی ہوں۔ سو رہے ہیں۔ ابھی اٹھ جائیں گے دو تین گھنٹے میں۔ پھر بات ہوگی مگر آؤ دیکھ لو ان کو۔“ وہ کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی تھیں۔

بیڈروم کی طرف جاتے ہوئے کوریڈور سے پہلے میری نظر ڈائمنگ ٹیبل پر پڑی جہاں پلیٹ میں انڈوں کا بنا ہوا آلیٹ سوکھ سا گیا تھا۔ بیڈروم میں بستر پر چادر پھیلی ہوئی تھی جیسے کسی کو اڑھایا گیا ہو، صاف دھلی ہوئی استری کی ہوئی قمیص کے ساتھ ازار بند پروئی ہوئی شلوار بستر کے کونے پر پڑی ہوئی تھی، بستر خالی تھا۔

شاز یہ بھائی دروازے پر کھڑی۔۔۔۔۔ خالی بستر کو بکتی رہیں، چکر انہیں اور پھر بے ہوش ہو کر دھڑام سے زمین پر گر پڑیں۔

کولن۔۔۔۔۔ ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا اور غیر معمولی حالات میں بھی اپنے آپ کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرتا لیکن رائس جیسے لوگوں کو برداشت کرنا اتنا آسان ثابت نہیں ہوتا۔ پہلی ہی ملاقات میں اس کا دل چاہا کہ رائس کا خاتمہ کر دے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اسے مارنے کے طریقوں پر بھی غور کرنے لگا تھا۔ کوئی ایسا طریقہ جو دیکھنے میں حادثہ معلوم ہو مثلاً بم دھماکا یا آتش زدگی وغیرہ۔ یہ اس کی بہت بری

عادت تھی۔ ذرا سی بات کو لے کر وہ اتنی گہرائی میں چلا جاتا کہ بعد میں خود اسے اپنا وقت ضائع ہونے پر افسوس ہونے لگتا۔ حالانکہ رائس جو کچھ کر رہا تھا، اس کے لیے اسے موردِ انزامِ خبر راج بننے نہیں تھا کیونکہ کولن کو اس کے بارے میں پہلے سے ہی سب کچھ معلوم تھا اور جو کچھ ہو رہا تھا، اس میں حیران ہونے والی کوئی بات نہیں تھی۔

کولن نے اپنے کام کا آغاز چار کابکوں سے کیا

آخری قفقہ

شرعباس

دنیا میں جانے کتنی بیماریاں ایسی ہیں جن کا علاج صرف دوائوں سے ممکن نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے۔۔۔ چند ہوشیار لوگوں کی خدمات اور شراکتیب کی بھی ضرورت ہوتی ہے لیکن۔۔۔ کبھی کبھی زیادہ ہوشیاری دکھانے سے ہاروں کا بھی ساتھ چھوٹ جاتا ہے اور پوش و بپوش تھکانے نہیں رہتے مگر یہاں تو کوئی شراکتیب ازمانے سے قبل ہی اس کی زندگی کی سائنسیں ہی ختم ہو گئی تھیں۔

تمام عمر میں کرنے کے خواب دیکھنے والے کی بے بس زندگی کا احوال



حالانکہ اسے زیادہ لوگ بھی مل سکتے تھے لیکن ایسی صورت میں وہ شاید ان سب کو یکساں وقت اور توجہ نہ دے پاتا۔ اسے اس کام کا متحمل معاوضہ مل رہا تھا اور یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس فیس کے عوض اپنے گاہکوں کا پورا پورا خیال رکھے۔ اس کے پہلے چار گاہکوں میں راکس، جولی، گیتا اور کلیر راکس شامل تھے۔ راکس اور جولی سرکاری ملازم تھے اور اسی عارضے کی وجہ سے کسی بھی وقت ان کی ملازمت ختم ہو سکتی تھی جبکہ گیتا ایک اسپتال میں لیبارٹری اسسٹنٹ کے طور پر کام کر رہی تھیں۔ البتہ کلیر راکس کا معاملہ ان سب سے مختلف تھا۔ اسے کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ خالی بیٹھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اسے یہ سوزی مرض لاحق نہ ہوتا تو وہ بہت اچھی درکار ثابت ہو سکتی تھی۔ کولن کے یہ چاروں گاہک ایڈ (Add) میں مبتلا تھے جس کا ایڈ جیسی بیماری سے کوئی تعلق نہیں۔

عام خیال یہی ہے کہ یہ عارضہ بچوں کو لاحق ہوتا ہے اور بڑے اس سے متاثر نہیں ہوتے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر بچپن میں اس بیماری کا علاج نہ کیا جائے تو عمر کے ساتھ ساتھ یہ بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اکثر بچے اپنے کلاس ورک، ہوم ورک اور دوسری سرگرمیوں پر پوری توجہ نہیں دیتے جس کی وجہ سے ان کی تعلیم متاثر ہوتی ہے۔ اکثر اوقات والدین یا انچری ہدایات مور سے نہیں سنتے۔ اسی طرح کئی مرتبہ وہ ایسا کام کرنا پسند نہیں کرتے جس میں بہت زیادہ ذہنی مشقت درکار ہو۔ اسی غائب دماغی کے سبب کئی مرتبہ انہیں اپنی کتابوں، کامیوں، پینسل اور کھلونوں سے بھی ہاتھ دھو پڑ جاتا ہے۔ توجہ نہ دینے کے سبب ان کی یادداشت کمزور ہونے لگتی ہے اور وہ بہت سی باتیں بھول جاتے ہیں۔ اسی لیے پردائی کے سبب ان سے کام میں غلطیاں سرزد ہونے لگتی ہیں۔ وہ اپنا کام وقت پر شروع نہیں کر پاتے یا اس میں دیر کر دیتے ہیں اور ان سب مسائل کی جڑ توجہ کی کمی ہے جسے ADD یعنی Attention deficit disorder کہا جاتا ہے۔

کولن کا خیال تھا کہ اگر اس مرض کی صحیح اور بروقت تشخیص نہ کی جائے تو اس کی علامات بار بار ظاہر ہوتی ہیں اور لوگوں کو نارمل زندگی گزارنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ اس کے چاروں گاہکوں کے ساتھ بھی یہی صورت حال تھی۔۔۔۔۔ اگر ایک بچہ کلاس کا ماحول خراب کرے، اپنا کام کرنا بھول جائے یا بان اسٹاپ بولتا رہے تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ پرنسپل کے کمرے میں بلا کر اسے سمیٹ

کردی جائے کی لیکن کوئی بالغ ایسی حرکتیں کرنا شروع کر دے تو اسے لازماً اس کا خیالہ بگھٹتا پڑتا ہے۔ ایسے لوگوں کی شناخت کوئی مشکل کام نہیں۔ کوئی بھی شخص جو تنصیلات پر توجہ نہیں دیتا، بے پردائی کے سبب اس سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، وہ اپنے کام پر توجہ مرکوز نہیں کرتا اور دوسرے کی بات غور سے نہیں سنتا، اسے یہ عارضہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ بھی اس زمرے میں شمار ہوتے ہیں جن کی زندگی میں بے ترتیبی ہو۔ جو اپنی چیزیں کہیں رکھ کر بھول جاتے ہوں یا چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپے سے باہر ہو جاتے ہوں۔

ایسے لوگوں کو مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں ایک ایسے شخص کی خدمات حاصل کرنا پڑتی ہیں جو کوچ کا کام کر سکے۔ صرف ڈاکٹر کے پاس جانا اور اس سے دوائیں لکھوانا ہی کافی نہیں۔ جبکہ دوا کے استعمال میں بے احتیاطی ہی نت نئے مسائل کا سبب بن سکتی ہے۔ اگر دوا کی کم خوراک لی جائے تو وہ بے اثر رہے گی اور زیادہ خوراک لینے کی صورت میں دل کا دورہ پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے لوگوں کو روزمرہ معاملات میں بھی کوچ کی ضرورت ہوتی ہے جو انہیں مسلسل راہنمائی دیتا رہے۔

راکس کا شمار بھی ان لوگوں میں کیا جاسکتا ہے۔ اس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ تھی۔ اسکول کے زمانے سے ہی اس کا یہ حال تھا کہ وہ کسی کام پر توجہ نہیں دیتا تھا۔ اسی لیے اس کے گھر ہمیشہ کم آتے تھے۔ وہ جب بھی رپورٹ کارڈ لے کر گھر آتا تو باپ اس کی توضیح چیمبروں سے کرتا۔ کولن کا خیال تھا کہ والدین کے اس طرز عمل سے معاملات مزید بگڑ جاتے ہیں۔ راکس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ اس کے علاج پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ ماں اس کی حالت دیکھ کر روتی اور باپ چختا چلاتا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کہیں بھی تک کر کام نہ کر سکا اور اسے چند ماہ بعد جاب تبدیل کرنے کی ضرورت پیش آ جاتی۔

وہ خود بھی اس صورت حال سے پریشان تھا پھر اس نے اپنے ایک دوست سے اس بیماری کے بارے میں سنا تو اسے محسوس ہوا کہ یہ ساری علامات تو اس میں بھی ہیں۔ پھر اس نے اس موضوع پر ایک کتاب پڑھی اور ڈاکٹر کے پاس چلا گیا جس نے تصدیق کی کہ راکس نے کتاب میں جو کچھ پڑھا، وہ بالکل درست ہے۔ وہ نہ تو احمق ہے اور نہ ہی ست۔۔۔۔۔ اسے صرف ایڈ ہے اور اگر وہ اپنے ہتھیار صحیح طرح استعمال کرے تو نارمل انداز میں زندگی گزار سکتا ہے۔

ڈاکٹر نے اس کے لیے کچھ دوائیں تجویز کیں اور یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ اپنے لیے ایک کوچ کی خدمات حاصل کرے کیونکہ یہ دوائیں بھی اسی وقت کارآمد ہوں گی جب انہیں صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے گا۔ اس کے روزمرہ معاملات سدھارنے میں کوچ ہی اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ راکس نے اخبار میں اشتہار دیکھ کر کولن سے رابطہ کیا۔ وہ بچوں کے لیے کام نہیں کرتا تھا کیونکہ انہیں سنبھالنے کے لیے جس صبر، تحمل اور برداشت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ کولن میں نہیں تھی۔ اس کے علاوہ بچوں کے مقابلے میں بالغ افراد سے معاوضہ بھی زیادہ ملتا تھا۔ کولن کا کام صرف اتنا تھا کہ وہ اپنے گاہک کے گھر جاتا۔ اس کے ساتھ پورا دن گزارتا اور اس کے بارے میں ہر بات کا بخور جائزہ لیتا۔

راکس کی زندگی اسپانیشی کے پینالے کے مانند تھی اور کولن کو اس کا ایک ایک ٹکڑا الگ کر کے ترتیب سے رکھنا تھا۔ گوکہ یہ ایک وقت طلب کام تھا لیکن پچھتر ڈالرز فی گھنٹہ کے عوض کولن یہ مشقت برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ گوکہ راکس کے ساتھ اس کی پہلی ملاقات کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھی۔ کولن نے محسوس کیا کہ وہ کچھ خوف زدہ ہے لیکن اس کے لیے اسے سو روزہ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا تھا۔ وہ جن حالات میں زندگی گزار رہا تھا، اسے دیکھتے ہوئے یہ کیفیت قابل فہم تھی اور اس میں شرمندگی کا تاثر بھی نمایاں تھا۔ کولن کو اس کے گھر کی حالت دیکھ کر بھی بہت افسوس ہوا۔ ایک عجیب سی ناگوار بو بچے پورے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

خوش قسمتی سے کولن کو اپنے جذبات پر قابو پانے میں کمال حاصل تھا۔ اصل قصور تو خود اس کا تھا۔ اگر وہ اخبار میں اشتہار نہ دیتا تو راکس اس سے رابطہ ہی نہ کرتا۔ اب وہ یہاں آئی گیا ہے تو اسے راکس پر غصہ کرنے یا دوا پس جانے کے بارے میں سوچنے کے بجائے صورت حال کا خنڈ سے دل سے جائزہ لینا چاہیے۔ چنانچہ اس نے ایک گہری سانس لی اور مسکراتے ہوئے راکس سے بولا۔

”کیوں نہ ہم آج سے ہی اپنا کام شروع کر دیں؟“ توقع کے مطابق کولن کو ابتدا میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن چند ملاقاتوں کے بعد حالات بہتر ہونا شروع ہو گئے۔ کولن نے اس کے لیے ایک ایسا نظام وضع کیا جس کی مدد سے وہ ضرورت کے وقت اپنی چیزیں تلاش کر سکتا۔ مثال کے طور پر اسے انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ سے خطوط وصول اور ہے تھے کہ اس نے گزشتہ کئی برسوں سے ٹیکس ادا نہیں کیا ہے۔ کولن نے فوری طور پر اس کے لیے

ایک اکاؤنٹ کا بندوبست کیا جو اس کے ٹیکس کے معاملات سنبھال سکے۔ اسی طرح راکس نے ایک سرچ انجن میں بھی اپنا حصہ ڈال رکھا تھا اور وہاں سے ہر مہینے راکس کے طور پر دس بارہ ہزار کا چیک آتا تھا۔ وہ یہ سارے چیک دراز میں رکھتا گیا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ ان ٹیکس کو اپنے بینک اکاؤنٹ میں جمع کر دینا چاہیے تھا لیکن اپنی بے پردائی اور سستی کے سبب وہ ایسا نہ کر سکا۔

کولن اس کا ذمے دار راکس کے باپ کو سمجھتا تھا کیونکہ اس نے بھی بیٹے کے مرض کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور ہمیشہ اسے ست اور احمق ہونے کا طعنہ دیتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ راکس بھی اپنے آپ کو نکلا اور ناراض سمجھنے لگا لیکن کولن کی کوششوں سے راکس کی زندگی میں تبدیلی آتی شروع ہو گئی تھی۔ انکم ٹیکس والوں کے ساتھ اس کے مسائل حل ہو چکے تھے اور اس کے بینک اکاؤنٹ میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ گھر کی حالت بھی کافی بہتر ہو گئی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ راکس کو ایک گرل فرینڈ مل گئی تھی جس پر وہ ضرورت سے زیادہ توجہ دے رہا تھا۔ کولن کو اس کا معاوضہ باقاعدگی سے مل رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے حصے کا بونس وصول کرنے میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کی اور راکس کو یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کبھی بھی اس کے چیک بینک میں جمع ہونے کے بجائے کولن کے گھر کیسے پہنچ جاتے ہیں۔

جولی کی عمر اٹھائیس سال تھی۔ وہ سنہری بالوں، خوب صورت چہرے اور متناسب جسم والی لڑکی تھی اور واضح فٹن کے آفس آف مینجمنٹ اور بجٹ یعنی ادائیگی میں اکاؤنٹ کے طور پر کام کرتی تھی۔ اس کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا کہ وہ کوئی کام وقت پر نہیں کر سکتی تھی۔ حالانکہ کولن کا خیال تھا کہ ایڈ میں مبتلا لوگ حساب کتاب میں اچھے ہوتے ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ کئی اہم شخصیات اور تخلیقی صلاحیتوں کے حامل افراد اس عارضے میں مبتلا تھے۔ جن میں آئن سٹائن، سابق صدر ابراہام لنکن اور جان کینیڈی وغیرہ شامل تھے۔ جولی کا خیال تھا کہ وہ اپنے طور پر اس مسئلے سے نمٹ سکتی ہے چنانچہ اس نے ایک جدید طرز کا فون خریدا جس میں آپ اپنا شیڈول، ای میل اور فون نمبرز اسٹور کر سکتے ہیں اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ایک گھنٹے بعد الارم بجتا جو اسے شیڈول کے مطابق کام کرنے کی یاد دہانی کرواتا۔ چند ہی دنوں بعد وہ ان آوازوں سے بیزار ہو گئی اور اس نے انہیں نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ اس کے باوجود الارم کی آواز اس کے

دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برسی تھی۔ جگ آکر اس نے وہ فون گھر پر رکھ دیا۔

کولن نے اس مسئلے کا حل یہ نکالا کہ حمام الارم کنسل کر دیے اور جولی سے پوچھا کہ اس کے نزدیک سب سے اہم مصروفیت کیا ہے۔ جولی نے جواب دیا کہ وہ اپنی دوامی وقت پر لیٹا چاہتی ہے۔

”ٹھیک ہے، ہم سب سے پہلے ہی الارم لگاتے ہیں۔“
”میری ماں کو بھی دو آؤں کی ضرورت ہوتی ہے اور مجھے یہ ڈیوٹی ادا کرنی ہوتی ہے۔“ جولی بے چین ہوتے ہوئے بولی۔

”ایک الارم یہ بھی سکی لیکن اس سے زیادہ نہیں۔ فی الحال یہی دو کافی ہیں۔“

یہ تجربہ کامیاب رہا اور کچھ عرصے بعد جولی کو الارم لگانے کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ اب پہلے سے بہتر محسوس کر رہی تھی اور اپنا ہر کام وقت پر کر رہی تھی۔ کولن اگر اس کے پاس نہ ہوتا تب بھی نیلی فون پر اسے یاد دہانی کرواتا رہتا۔ اب اس کی جنونی کیفیت میں بھی کسی آگئی تھی اور وہ اپنی شخصیت کو نکھارنے پر توجہ دینے لگی تھی۔ اس لیے جب ایک دن اس نے بتایا کہ اس کے ساتھ کام کرنے والا لڑکا اس میں دلچسپی لے رہا ہے تو کولن کو کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

گپتا کی کہانی بھی اس سے ملتی جلتی تھی۔ گوکہ وہ اسکول اور کالج کے زمانے میں اچھے نمبروں سے پاس ہوتا رہا لیکن عملی زندگی میں آنے کے بعد اسے مختلف صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ بھولنے کی عادت کی وجہ سے وہ اب تک تین نوکریوں سے ہاتھ دھو چکا تھا۔ آخری ملازمت ختم ہونے سے پہلے وہ اپنے دفتر کی سیکریٹری بنی تھی اس کے ساتھ ڈیننگ کر رہا تھا۔ وہ بھی گپتا کو پسند کرتی تھی لیکن نہیں جانتی تھی کہ جس شخص سے شادی کرنے والی ہے، وہ بھولنے کے مرض میں مبتلا ہے۔ بعض اوقات وہ اس کی انہی حرکتوں پر چراغ پا ہو جاتی۔ ایک مرتبہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ڈائننگ روم میں رنگ کروانا چاہیے، کام شروع ہو گیا تو گپتا کو خیال آیا کہ مزید رنگ کی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ وہ رنگ خریدنے کے لیے قریبی دکان تک چلا گیا لیکن اس کی واپسی رات گئے ہوئی۔ بنیسی کا حصہ کے مارے برا حال تھا۔ وہ کولن پر چلاتے ہوئے بولی۔

”اس نے کچھ کیا رکھا ہے۔ میں اس کی ماں ہوں جو ہر وقت اس کی دلچسپی بھال کرتی رہوں۔“

اس طرح کی صورت حال میں کولن ہی ان دونوں

میں صلح کروایا کرتا تھا۔ پہلے تو وہ ان دونوں کو ساتھ بٹھا کر بات کیا کرتا تھا کہ وہ مکمل کر اپنے دل کی بات کہہ سکیں پھر اس نے ان سے ٹیبلٹ دیکھو ملاقاتیں شروع کر دیں۔ اس نے کچھ وقت بنیسی کے ساتھ بھی گزارا، وہ اس کے ساتھ لمبی ڈرائیو پر گیا۔ بنیسی کو وہ جگہ بہت پسند آئی اور اس نے کولن کے ذوق کی بہت تعریف کی۔ واقعی وقت گزارنے کے لیے اس سوشل سے اچھا ماحول کہیں نہیں مل سکتا تھا۔

اس کے بعد گپتا اور بنیسی پہلے سے بہتر نظر آنے لگے۔ کولن ہر مہینے گپتا سے اپنا چیک وصول کر لیتا۔ اس کی محنت بار آور ثابت ہو رہی تھی۔ دوسری جانب بنیسی بھی کولن کے ساتھ بڑی گرم جوشی سے پیش آ رہی تھی اور یہ سب اس سوشل کے ماحول کا اثر تھا جہاں وہ کولن کے ساتھ بعد میں بھی جاتی رہتی تھی۔ اس طرح دیکھا جائے تو اس کھیل میں ہر کھلاڑی اپنے آپ کو فائدہ سمجھ رہا تھا۔

☆☆☆

کلیرانس کا مسئلہ مختلف نوعیت کا تھا۔ کسی کام پر توجہ نہ دینا یا بھول جانا ایک الگ مسئلہ ہے لیکن جب اسے دوسرے مسائل سے جوڑ دیا جائے تو معاملہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ چھتیس سالہ کلیرانس تنہا رہتی تھی۔ براؤن بالوں اور متناسب جسم کے ساتھ وہ قابل قبول لگتی تھی لیکن اس کا چہرہ سیاٹ اور کسی بھی تاثر سے عاری تھا۔ شہر میں اس کا کوئی رشتے دار نہیں تھا لہذا وہ اپنی ذات کے خول میں بند تھی۔ شہر کی ایک معروف شاہراہ سے ذرا ہٹ کر اس کا ایک خوب صورت سامان تھا جہاں ٹریفک کا شور بالکل نہیں سنائی دیتا تھا۔ اس کا مکان قیمتی فرنیچر اور آئل پینٹنگز سے آراستہ تھا جو پہلی ہی نظر میں دیکھنے والوں کو متاثر کرتا تھا۔

کلیرانس نے اپنے کوچ کولن کا خوش دلی سے استقبال کیا اور اسے اپنے مکان کا ہر حصہ دکھایا۔ وہ گیراج میں بھی کئی جہاں کولن نے ایک اسپورٹس کار دیکھی تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس کار کا طاقتور انجن صرف چار سیکنڈ میں ساٹھ میل کی رفتار پکڑ لیتا تھا اور اس کی انتہائی حد دو سو میل فی گھنٹہ تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کار کی مالیت کیا ہوگی لیکن اسے ہمیشہ سے ہی اس طرح کی کار چلانے کی خواہش تھی۔ وہ اچھی حالت میں نہیں تھی اور لگتا تھا کہ برسوں سے کسی نے اسے نہیں چلایا۔ کولن نے پہلی نظر میں ہی اس کار کو اپنی ترجیحات میں شامل کر لیا۔

کلیرانس کی ظاہری حالت اور شان و شوکت دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں

ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگ اسے درست سمجھتے ہوں لیکن صرف پیسے کمانے کے لیے ہی کام نہیں کیا جاتا۔ بہت سے لوگ اپنی قابلیت اور صلاحیت کو استعمال کرنے یا اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے بھی کام کرتے ہیں۔ اس طرح انہیں گھر سے باہر نکلنے اور ایک نئے بندھے معمول کے مطابق زندگی گزارنے کا موقع ملتا ہے۔ کولن کے لیے ایک ایسی صورت کو کوچ کرنا بہت مشکل تھا جو کوئی کام نہ کر رہی ہو۔

پہلی ہی ملاقات میں اس نے اپنی کلائنٹ سے اس موضوع پر تفصیل سے بات کی۔ کلیرانس بہت سے کام کر سکتی تھی لیکن وہ کسی ایک کے بارے میں بھی یک سوئیں تھی۔ اس نے کولن کی خدمات اسی لیے حاصل کی تھیں کہ وہ اس مسئلے میں اس کی مدد کرے اور کولن یہی سوچ رہا تھا کہ وہ کلیرانس کی کیا مدد کر سکتا ہے۔ اسے سمجھنے میں کچھ وقت لگا لیکن بہت جلد وہ اس کا مددی ہو گیا۔ کلیرانس دہرے مزاج کی عورت تھی اور موسم کی طرح اس کا سوؤ بدلتا رہتا تھا۔ کبھی وہ شیرنی کی طرح ہوجاتی اور ذرا ذرا سی بات پر دہانے لگتی اور کبھی اسے اتار اڑا دیا۔ بالائی کلاس کے سامنے اپنے تمام مالی معاملات کھول کر رکھ دیتی۔ کولن ہی کریڈٹ کارڈ مل اور قسطوں کی ادائیگی کے بارے میں اسے یاد دلاتا پھر انہوں نے ایک ٹرک منگوا یا جو اسپورٹس کار کو بھیج کر درکشاپ لے گیا۔ انہوں نے مطلوبہ سامان کی فہرست تیار کی اور کلیرانس نے وہ سامان خرید کر ان کے حوالے کر دیا۔ کولن یہ سب دیکھ کر بہت خوش ہو رہا تھا اور اب اسے اس دن کا انتظار تھا جب وہ گاڑی تیار ہو کر درکشاپ سے آتی اور وہ کلیرانس کو پہلو میں بٹھا کر لمبی ڈرائیو پر جاتا۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری ہونے کا وقت قریب آ رہا تھا۔

اس دوران وہ کلیرانس کی دلجوئی کرتا رہا۔ اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ وہ دونوں بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آئے تھے۔ کلیرانس تنہائی اور ڈپریشن کا شکار تھی۔ اسے کولن کی قربت ملی تو اس کا اعتماد بحال ہونا شروع ہو گیا۔ کولن نے اپنے ہر کلائنٹ کے لیے ایک دن مقرر کیا ہوا تھا لیکن کلیرانس کو وہ اس سے بھی زیادہ وقت دے رہا تھا۔ اس کی محنت رنگ لائی اور کلیرانس جاب پر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ جس دن اسے انٹرویو کے لیے جانا تھا، اسی روز اس کی اسپورٹس کار بھی درکشاپ سے بن کر آگئی۔ کولن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ فوراً ہی گاڑی لے کر نکل جائے لیکن اس نے جلد بازی کرنے کے بجائے انتظار کرنا مناسب سمجھا۔

کلیرانس کئی سال بعد کسی ملازمت کے لیے انٹرویو دینے جا رہی تھی لہذا اسے اپنے آپ کو ذہنی اور جسمانی طور پر تیار کرنا تھا۔ وہ بوکھلائی بوکھلائی پھر رہی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کولن نے اسے پرسکون رکھنے کی کوشش کی اور کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

”نہیں، ایسا نہیں ہے۔“ وہ چلتا ہے ہوئے بولی۔ ”تم ایسا کہہ رہے ہو لیکن میں جانتی ہوں کہ کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔“

”مجھے بتاؤ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ کولن نے پیار سے پوچھا۔

”بہت سے کام کرنے ہیں، میں کیا بتاؤں؟“ وہ جھنجھلاتے ہوئے بولی۔

”کوئی بات نہیں، تم ایک ایک کر کے بتاتی جاؤ۔“ کلیرانس نے بے چارگی سے اس کی طرف دیکھا اور رد ہانسی آواز میں بولی۔ ”میرے پاس بالکل بھی وقت نہیں ہے اور ابھی ڈیڑھ گھنٹوں کا کم پڑے ہیں۔ مجھے اپنے بال بنانے ہیں، ڈرائیو کلینر سے پزیرے لانا ہیں، سی وی کا پرنٹ نکالنا ہے۔“

”اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ میں تمہارے کپڑے لے آتا ہوں۔“ کولن نے اپنی خدمات پیش کیں۔

”تم... تم میرے لیے یہ کام کرو گے؟“ وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

”کیوں نہیں۔“ کولن نے پیار سے اس کا ہاتھ تھاما اور بولا۔ ”میں تمہارے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں اور یہ کوئی انوکھا کام نہیں ہے۔ آخر میں اپنے پزیرے لے کر بھی آتا ہوں۔“

یہ وہ الفاظ تھے جو اس کی زبان سے ادا ہوئے لیکن دل میں وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اسپورٹس کار میں سواری کرنے کا اس سے بہتر موقع پھر کبھی نہیں مل سکتا تھا۔ اگر وہ اس کی قیمتی کار لے کر کہیں نکل جاتا تو وہ بھی اسے تلاش نہیں کر سکتی تھی کیونکہ کولن اس کا اصلی نام نہیں تھا۔ وہ اپنے کسی کلائنٹ کو اصلی نام نہیں بتاتا تھا۔ کلیرانس اور اس کے درمیان رابطے کا واحد ذریعہ اس کا سیل فون تھا اور پولیس بھی اس نمبر کے ذریعے کولن تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ جب تک کلیرانس اپنی گاڑی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرواتی تب تک وہ کار سمیت بہت دور نکل چکا ہوتا۔ وہ ایسے کئی لوگوں کو جانتا تھا جو چوری کی کئی قیمتی گاڑیاں آدمی قیمت پر

خرید لیا کرتے تھے۔ یہ سوچ اس کے دماغ میں ابھرنے لگی تھی لیکن ابھی اس نے اس سلسلے میں کوئی واضح پلان ترتیب نہیں دیا تھا۔ ویسے بھی وہ ٹھنڈا کر کے کھانے کا عادی تھا۔ جلد بازی میں اکثر کام بگڑ جاتے ہیں۔ اس لیے وہ اس بار سے میں انہی طرح سوچ بچار کرنے کے بعد ہی کوئی قدم اٹھانا چاہ رہا تھا۔

اس نے کلیر انس کے چہرے پر پیار بھری نظر ڈالی اور باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا لیکن کلیر انس کے فون کی گھنٹی کی آواز سن کر رک گیا۔ اس نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف سے کوئی عورت بول رہی تھی۔ اس نے اپنا تعارف کلیر انس کی ماں کے طور پر کر دیا اور بیٹی سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ کلیر انس نے منہ بناتے ہوئے ریسیور لے لیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے ماں کی بے وقت مداخلت ناگوار گزری ہے۔ کون کچھ فاصلے پر کھڑا ان کی گفتگو سن رہا۔ کلیر انس بے دلی سے ماں کی باتیں سن رہی تھی۔ غالباً ماں اسے اپنی عادت کے مطابق مشورے دے رہی تھی اور وہ باتیں بتا رہی تھی جن کے بارے میں وہ پہلے سے جانتی تھی۔ کچھ دیر تک وہ ماں کی گفتگو سنی رہی پھر جھلا کر فون رکھ دیا لیکن اس کے چہرے پر برہمی کے آثار نمایاں تھے۔

”کون تھا؟“ کولن نے جانتے بوجھتے انہماں بنے ہوئے کہا۔

”میری ماں۔“ وہ جھلاتے ہوئے بولی۔ ”یہ بڑھیا مجھے تباہ کرنے پر تکی ہوئی ہے۔ سمجھتی ہے جیسے میں کچھ جانتی ہی نہیں۔ ہر وقت اٹنے سیدھے مشورے دیتی رہتی ہے۔ میں نے خواہ مخواہ تمہارا وقت برباد کیا۔ مجھے چاہیے تھا کہ تمہارے جانے کے بعد اس کا فون ریسیور کرتی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ کولن خوش دلی سے بولا۔ ”مجھے امید ہے کہ تم کوئی اہم بات نہیں بھول رہی ہوگی اور شاید اس نے تمہیں اسی لیے فون کیا ہو؟“

”تم میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو حالانکہ اس کے نزدیک ہر بات ہی اہم ہوتی ہے۔ اس کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ دن بھر کا ڈیج پر لپٹی چاکلیٹ کھاتی رہتی ہے اور نیوی پر اپنے شیئرز کو بڑھاتا ہوا دیکھتی رہتی ہے اور وہ دھن دھن سے مجھے فون پر ہدایات دیتی رہتی ہے۔“

”گناہ ہے وہ بہت دولت مند ہے؟“ کولن نے پوچھا۔

”جیسا میرے لیے بھی کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ یقین کرو، میں اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ایک ملین ڈالرز

بھی خرچ کر سکتی ہوں کیونکہ اس کے مرنے کے بعد سب کچھ میرا ہی ہوگا۔“

کولن نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”شاید تمہاری مار انسی کی بجلی وجہ ہے کہ وہ اب تک زندہ کیوں ہے یا دوسرے الفاظ میں کہہ لو کہ خزانے پر سناپ بن کر کیوں بیٹھی ہوئی ہے۔“

”تم اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔“ کلیر انس نے اس کے ہاتھ کی پشت پر اپنی انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں ایک حلقہ حقیقت بتانا چاہ رہی ہوں۔ اس کے بعد تمہیں صورت حال کا اندازہ ہو جائے گا۔“

کولن نے بے یقینی سے محضی دیکھی۔ کافی وقت ہو گیا تھا اور ابھی کئی کام ننانے تھے لیکن کلیر انس باتوں میں لگ کر سب کچھ بھول گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، کلیر انس نے ایک بار پھر بولنا شروع کر دیا۔

”واقعی کچھ بھی میں سوچتی ہوں کہ اسے اب تک مرجانا چاہیے تھا۔ تم جانتے ہو کہ اس کی صحت ٹھیک نہیں رہتی جس کی وجہ سے اسے بہتر زندگی گزارنے میں مشکل پیش آرہی ہے۔ تم خود ہی فیصلہ کرو کہ کیا میں ایسا سوچنے میں حق بجانب نہیں ہوں۔“

”یقیناً! ان حالات میں تمہارے لیے اپنے جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہے۔“ وہ پیار سے اس کا گلہ جھپٹاتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہارے کپڑے لے کر آتا ہوں۔ جب تک تم نہادھو کر فریض ہو جاؤ اور اپنے بال بھی سنوار لو۔“

”تمہارے بغیر میں کیا کروں گی؟“ وہ اس کے قریب آ کر ایک ادا سے بولی۔

”تم مجھے تصور میں یاد کرتی رہنا تو تنہائی محسوس نہیں ہوگی۔“

☆ ☆ ☆

گیراج کا دروازہ کھولتے وقت کولن نے اسپورٹس کار کو دیکھ کر سر ہلایا اور اسے اپنی حماقت پر فحشی آنے لگی۔ وہ شخص ایک کار کے لیے یہاں سے فرار ہونے کے بارے میں سوچ رہا تھا جو کلیر انس اور اس کی ماں کی دولت کے معمولی حصے کے بھی برابر نہیں تھی۔ کلیر انس نے اپنی ماں کے بارے میں جو گوبر افشانی کی تھی، وہ سننے کے بعد کولن کا ذہن مختلف خطوط پر کام کر رہا تھا۔ کلیر انس نے اپنی ماں کی صحت کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، اس کے مطابق وہ چند دنوں یا مہینوں کی مہمان تھی اور کسی بھی وقت اس کے مرنے کی خبر آسکتی تھی۔ پھر کلیر انس ہی اس کی لاکھوں کی جائیداد کی واحد وارث ہوتی اور ظاہر ہے کہ وہ اس حالت میں اتنی بڑی جائیداد کا انتظام نہیں سنبھال سکتی تھی۔

اسے یقیناً ایک ایسے شخص کی ضرورت ہوتی جو اس کی مدد کر سکے۔ جس پر اسے پورا بھروسہ ہو اور اس کام کے لیے کولن سے بہتر اور کون ہو سکتا تھا اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب وہ اس کے قریب رہے۔ اس کے چھوٹے مرنے کا کام کرتا رہے اور اسے یہ احساس دلانے کے کولن سے بڑھ کر اس کا کوئی دوست اور بھروسہ نہیں ہو سکتا۔

کولن محسوس کر رہا تھا کہ کلیر انس کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ بن چکا ہے اور وہ اپنے کام کے لیے اس کی طرف دیکھتی ہے۔ پہلے ان کے درمیان کوچ اور کلائنٹ کا تعلق تھا اور کولن کی ذمہ داری صرف اتنی تھی کہ وہ کلیر انس کو ہارل زندگی گزارنے میں مدد دے سکے لیکن اب اس تعلق کا دائرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ کلیر انس کے روئے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کولن کو صرف کوچ ہی نہیں بلکہ اپنا دوست اور بھروسہ بھی سمجھنے لگی ہے ورنہ کچھ بھی اپنی محنت کی گارنٹی اس کے حوالے نہ کرتی۔ وہ بھی کتنا بے وقوف تھا کہ سونے کے ڈھیر کو چھوڑ کر ایک سکے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ماں کے مرنے کے بعد کلیر انس بالکل تنہا رہ جائے گی اور ایسی صورت میں صرف وہی اس غلام کو پرہیز کر سکتا ہے۔

کولن لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگنے کا قائل تھا۔ جب کلیر انس اس پر پوری طرح اعتماد کرنے لگتی اور اسے یقین ہو جاتا کہ وہ اس کی ذات کے لیے ہرگز بڑھ چکا ہے تو کسی بھی سہانی شام وہ اسے شادی کا پروپوزل دے سکتا تھا۔ کلیر انس کی بے کیف زندگی میں یہ پیشکش ہوا کا تازہ جھوٹا ثابت ہوتی اور وہ بچے ہوئے پھل کی طرح اس کی جموئی میں آ جاتی۔ کلیر انس سے شادی کرنے کے بعد وہ بلا شرکت غیر سے اس کی تمام دولت اور جائیداد کا مالک بن جاتا۔ گوکہ نام کلیر انس کا ہی ہوتا لیکن عملاً سب کچھ اس کے اختیار اور تصرف میں ہوتا پھر..... وہ ایک دس گزیاں خرید سکتا تھا۔ کلیر انس تو ویسے ہی ایڈ کے عارینے میں جتا تھی۔ اس کی توجہ کسی ایک کتے پر مرکوز نہیں رہ سکتی تھی اور ایک سینکڑے پہلے بھی ہوئی بات بھی اسے یاد نہیں رہتی تھی پھر وہ کولن سے کیا حساب کتاب کرتی۔ اس کے اطمینان کے لیے یہی کافی تھا کہ اس کے شوہر نے سارا انتظام خوش اسلوبی سے سنبھال لیا ہے۔

کلیر انس کو راستے سے ہٹانا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ کوئی بھی حادثہ اسے بے آسانی دوسری دنیا تک پہنچا سکتا تھا۔ کسی کو اس پر شک نہ ہوتا۔ اس کی میڈیکل ہسٹری اور بیک گراؤنڈ سے بھی واقف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کلیر انس کس بیماری میں مبتلا ہے۔ حادثے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

وہ ایک انسانی خوراک ہی اس کے دل کی دھڑکن بند کر دیتی اور اس کی موت کا من کر لوگ ہمساف میں سر جلاتے اور اس کی تعریف میں چند لکھت کہہ کر آگے بڑھ جاتے۔ لیکن وہ ایسا کیوں سوچ رہا ہے؟ اسے کوئی خطرہ مول لینے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کلیر انس کے زندہ رہنے یا مرنے کے لیے اسے کیا فرق پڑتا ہے؟ وہ اس کی زندگی میں بھی تیش و آرام سے رہ سکتا ہے۔

کار کا انٹیشن آن کرتے ہی اس کا دل جلیوں اٹھنے لگا۔ اس کی زندگی کا وہ یادگار لمحہ آئی گیا تھا جس کا اسے عرصے سے انتظار تھا۔ کار کا انجن فرایا اور سینکڑوں میں کار ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ وہ ایک سوئیس کی رفتار سے کنٹری روڈ پر جا رہا تھا اور اس جگہ سے نصف میل کے فاصلے پر تھا جہاں یہ سڑک روٹ ایک سو چالیس سے ملتی تھی اور اس پر ہر وقت ٹریفک چلتا رہتا تھا۔ مین اسی وقت اس کا سیل فون بجنے لگا۔ دوسری طرف سے کلیر انس بول رہی تھی۔

”ہیلو ڈارلنگ! کیا بات ہے؟“ کولن نے پوچھا۔

اسے یوں لگا جیسے کلیر انس بدحواسی میں چلا چلا کر چھو کہنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن وہ اس کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ رہا تھا۔ اس نے کلیر انس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”ڈیر! اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟ سکون سے بات کرو۔“

”گیراج والوں کا فون آیا تھا لیکن میں نہیں بتانا بھول گئی۔ انہیں گاڑی میں مزید کام کرنا ہے اور اس کے لیے کچھ پارٹس درکار ہیں۔“

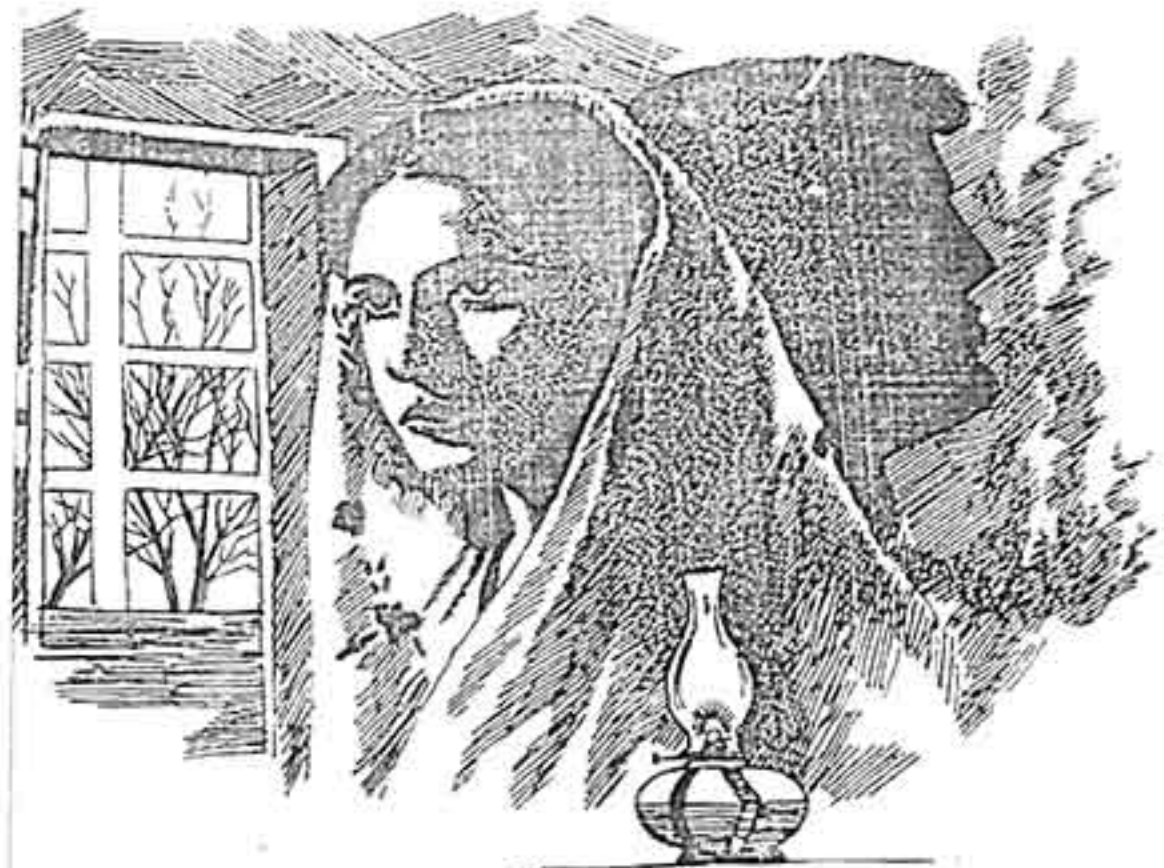
”کیسے پارٹس؟“ کولن نے چونکتے ہوئے کہا۔

”انہوں نے کہا تھا کہ تمہیں بتادوں۔ کوشش کے باوجود وہ یہ پارٹس حاصل نہیں کر سکے۔“

”ظاہر ہے کہ یہ کار نہیں سال پرانی ہے اور اس کے پرزے درختوں پر نہیں اگتے۔ باقی داؤے انہیں کون سے پارٹس درکار ہیں؟ میں کوشش کرتا ہوں۔“

کولن نے اس کے چیخنے کی آواز سنی۔ وہ مذہبی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ”بریک..... انہیں گاڑی کے بریک تبدیل کرنے ہیں۔“

کولن کا ہر بے اختیار بریک پر گیا۔ روٹ ایک سو چالیس کی کراسنگ قریب آ چکی تھی۔ کولن کا جسم پسینے میں نہا گیا۔ فطری طور پر اس کا ہاتھ ہارن پر گیا لیکن وہ بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ اب اس کے پاس آخری قہقہہ لگانے کی بھی مہلت نہ تھی۔



راہ گم

نابید سائنات اختر

کوئی ریت کے محل خواہ کتنے ہی خوب صورت بنالے لیکن ...
مضمون ملی کے نام پر مذاق ثابت ہوتے ہیں۔ خواب تک تو بات
سمجھ میں آتی ہے مگر جب کوئی کسی کی زندگی کو ہی مذاق بنالے
تو چلتے پھرتے وجود بھی کالی بن کر رہ جاتے ہیں۔ بالخصوص
جب کوئی رشتوں کے تقدس کو بھی پامال کر کے خود کو پارسا
ثابت کرنا پھرے تو ہر جذبے سے ایمان اٹھ جاتا ہے۔ ازدواجی زندگی
میں غلطی کسی ایک کی ہوتی ہے مگر بھگتنا پورے خاندان کو پڑتا
ہے ... وہ جو اپنی رنگینیوں کی خاطر گھر کے سارے موسموں کو
خزاں کا رنگ دے گیا تھا ... اسے کسی کی قربت میں بہت سے
رشتوں کو دوری میں بدل کر بھی اپنے رفیق کی رفاقت اس نے
آئی ... آتی بھی کیسے ... جو اپنی رنگینیوں میں زندگی کی
سنگینیوں کو میلا بیٹھا تھا ... اسے تو یاد ہی نہ رہا گھر کی عزت کو
لقیروں کو سو نہ کر پردیس کا نئے والے تمام عمر کے لیے اپنے ہی گھر
میں پردیس بن جاتے ہیں۔ وہ بھی ایسی ہی غلطی کی پاداش میں
زندگی کی بڑی آزمائش سے گزر رہا تھا پھر کیسے اس کی ہمسفر
اس سے متغیر ہو کر اس کی دلجوئی کر سکتی تھی ... یہی قدرت کا
قانون ہے ... بہار کے موسم میں پت چیتڑ نہیں آتی اور پت چیتڑ میں
پھول نہیں کیلتے۔

تہائی میں شیطانی کھیل کیلئے والے ہوں پرستوں کا انجام عبرت

”سن رے ہوں میٹا۔“

کھٹکھی۔

میں نے
محسوس ہوئی۔

کر سکتی ہوں جو ہوگی۔ ہم اس خوف آپا۔ اس کے لئے

ہاں میرے
تھا۔ مومو اور سنی کا
دونوں اب میری
شروع ہو چکی تھی۔

دہم نے کیا تھا۔

اپنی سچی خبر
آپا! ماں!

نے گئی ہے۔ مجھے
کہہ رہے تھے
ت ہوگی۔ وہ یہ
مگر "معاذ اللہ"

”اچھا آپا! پھر

”ای۔ شا۔“
بھری۔ میں نے

یہی حکم صاحب
دیکھو صاحب
کارخ کیا حالانکہ
رشتے کہتے

☆☆☆
☆☆☆☆☆

ہے۔ ہم دونوں بیسیں میں اور ایک بھائی سے بڑے تھے اور میٹا مجھ سے چھوٹی۔

بے وہ کالنج کی گزیا تھی جس کے ذرا سی غصے
رشتہ رہتا ہو۔

پسند تھی اور اس نا پسندیدگی کا سبب امریکا

میں ہمیشہ ان کی حوصلہ شکنی کر دیا کرتی
تقدمی سے ڈرتے رہے۔

”کیا کروں یار، اسی کے آگے بولنے کے لئے کہتا ہوں۔“

روں کی۔ آخر کوماں ہیں یار۔ میں آنے کا وقت تو برباد نہیں کر سکتا۔“

”ہاں اگر میں امی کے خلاف گیا تو ای

”امریکا جانے کا لالچ ہے؟“ میں نے
 ”نہیں..... امریکا تو میں کیسے بھی جاسکتا

"ای کوہِ راض نہیں کر سکتا۔"

والدین صرف آزمانے کو پتا

"او کے۔" میرا موٹر بگڑ گیا۔

میں نے کہا: "میرا بچہ چاہ رہا ہے تمہیں شو۔
تمہیں بھیگ رہی تھیں۔"

سہمی۔ مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا۔
شادی کے وقت مختار ایک مٹی

مختار نے مجھے ایک پرسکون

ہم موصوفی تھے۔ مختار اور دونوں بچے
میرے اور آسودگی میں گزرے

ہمارے دونوں بچوں کی اسکو

نے مجھے ایک گاڑی گفٹ کر دی تھی۔ میں جب اور

26 اگست 2015ء

دانش نے بھاری بات پر کہا۔
"تو پھر کہیں اور جانے کی کیا ضرورت ہے؟" مختار

نے اس کے کندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔
"مختار بھائی! روزگار کی خاطر مجھے نہ جانے کتنے
مرے اور یہاں رہنا ہو۔ اپنی رہائش کا بندوبست تو کرنا
پڑے گا۔"

"اے یاد چھوڑو۔ کہیں نہیں بس یہیں۔ تمہاری
وجہ سے ہمیں بھی پردیس، پردیس نہیں لگن، تنہائی کا احساس
نہیں ہوتا۔ یہ احساس رہتا ہے کہ ہم دو بھائی ہیں۔"

"آپ کی محبت ہے مختار بھائی۔"

"بس تم کہیں نہیں جا رہے۔ ہمارے ساتھ ہی
رہو گے۔ ہم ادھر ادھر چلے جائیں تو پھر مجبوری ہے۔" مختار
نے میری جانب دیکھتے ہوئے اپنی بات کی تائید
چاہی۔ "کیوں ایسا نہیں دیکھ کر کہہ رہا ہوں؟"

"بالکل۔" میں نے تائید کی۔
"تو بھی اب تو تمہاری بھائی نے بھی نصیحت کر دیا۔ تم
کہیں نہیں جا رہے۔"

"ہاں چاہو ہم آپ کو کہیں نہیں جانے دیں گے۔"

میں بھی اپنے ذہنی کامنوا ہوا۔
"پلیز چاہو! سو سو جسم التجا بن گئی۔ دانش نے میری
طرف دیکھا۔

"خوش قسمت ہو جو سب تمہاری منت سماجت
کر رہے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"سوچ لیں۔ میرے جسے کی روٹی کسی اور کو نہیں
آپ ہی کو پکا پڑے گی۔"

"مائی بلیو۔" میں نے بے شاشت سے کہا۔
"پھر سوچ لیں؟"

"ارے روٹیاں پکانے سے تمہاریاں گھبراتی ہیں۔
ہمارا دل بہت بڑا ہے۔"

مختار نے اپنا ہاتھ پھر دانش کے کندھے پر رکھا اور
مجھے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دانش سے فخر یہ
ہوئے۔ "یار ہم نے کچھ دیکھ کر ہی ان سے شادی کی ہے۔"

"مختار بھائی! یہ تو میں کیا سارا خاندان جانتا، جانتا
ہے کہ آپ کی چوائس بہت اعلیٰ ہے۔"

دانش کی بات پر میں نے منہ چاڑ کر مختار کی طرف
دیکھا۔ وہ مسکرا رہے۔ ان کی نگاہوں میں میرے لیے
واشگاف محبت تھی۔ ہم سب کے اصرار پر دانش کو اپنے
دوستوں کے ساتھ جا کر رہنے کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

ہو جاتے۔
"دانش میاں! آن میری والہی فرادیر سے ہوگی۔

اپنی بھائی اور بچوں کا خیال رکھتا۔"

"آپ فخری نہ کریں۔" دانش انہیں بڑی سعادت
مندی سے اطمینان دلاتا۔
"مگنہ بوائے، یاد تمہارے ہوئے سے میں تمہاری
طرف سے بڑا ریسکسٹ ہو گیا ہوں۔"

دانش، مجھے اور بچوں کو گلے پھانسنے کے لیے باہر
لے جاتا۔ گھر میں ہوتا تو بچوں کے ساتھ ہستا، بدلتا، عیبتا،
چائے کا بہت رسیا تھا۔ دن میں چھٹی چائے پاتا دو۔

"بھائی چچاں تمی ہے۔ چائے کی ایک چپالی چل
جائے گی۔" وہ خوش مزاجی سے کہتا۔
"چائے کی پیالی ایک نہیں دو حاضر تمہارے گم پیا
کرو۔" گائے ہو جاؤ گے۔ ٹکی والے ریسٹیکٹ کروں
گے۔" مجھے بھی مذاق سو جاتا۔

"پر دانش۔"

"ہاروا کرتی پڑے گی دیور جی۔ ساری زندگی
کنوارے تھوڑی رہو گے۔"

"کنواروں کے بڑے مزے ہوتے ہیں۔"

"مائی دے دے کیا؟"

"چھٹی والے دن کوئی چادر کا کونا کھینچ کر جگانے والی نہیں
ہوتی۔ فرمائشوں کی لسٹ نہیں تھامنا پڑتی۔ سل فون کی چینگ کا
خطرہ نہیں ہوتا۔ آپ ہوتے ہیں اور آپ کی زندگی۔"

"چھٹی والے دن چادر کا کونا کھینچ کر جگانے والی
آپ کے سر ہانے بیڈنی بھی تو رکھتی ہے۔ فرمائشوں کی لسٹ
تھامتی ہے تو آپ کے مکان کو گھر بنانے کے لیے۔ آپ کا
سل فون چیک کرتی ہے تو آپ کے کہیں گم ہو جانے کے
خوف سے۔" وہ زور سے ہنستا۔

"ہمارے ابا کہتے ہیں کنوارے کی زندگی دیوانے کی
زندگی ہوتی ہے۔ شادی بندے کو پاگل بنانے سے بھاتی ہے۔"

"آپ انہیں کوٹ کر رہی ہیں جن کے کبے پر کچھ
کہنا۔ یہ تاب، یہ مجال یہ جرأت نہیں مجھے۔"

"شادی میں دیر مت کرنا۔ جلدی شادی کے بہت
فائدے ہوتے ہیں۔" میں مشورہ کرتا کہتی۔
"مثلاً؟"

"مجھے اور مختار کو ابھی بیس ڈالنی کی ضرورت نہیں پڑی
اور بچے بڑے ہو گئے۔" میں فخر سے کہتی۔
"یہ تو ہے۔"

"میرا پرست کرنا۔ جیسے ہی میں پندرہ ٹکی سے
شادی کر لیوں۔"

"ارے تو۔"

"اصولاً نے سے خدا بھی منجاتا ہے۔"

"معاشر میں میری یہ مذہب کیجیے۔"

"نہیں ٹکی چاہتے ہو؟" ایک روز میں نے چاہا۔
"ہاں۔ آپ مجھے بھائی چاہیے۔ دو گت، ایک گت اور
سیف چاہیے۔" اس نے قرت جواب دیا۔
"نہیں ایک بات بتاؤں؟"

"ہی۔" وہ ہنسنے لگا۔
"سیف جسے میں دھکا ہے۔ ہم کسی سے یہ گت اور
نیرنگ بھی اپنی غرض سے تخت ہی ہوتے ہیں۔"

"یہ مطلب؟"

"میں جو جسے مختار کے سے گت، درگت، گت، گت، گت
ہوں تو اس سے کہ میں خود کو محفوظ اور خوش رکھتا چاہتی ہوں۔
مردت عورت کو محفوظ اور خوشی کا احساس رہتا ہے۔"

"آپ کو مختار بھائی سے محبت نہیں؟"

"ہر شخص اپنی محبت میں دوسروں سے محبت کرتا ہے۔"

"مگر رگنی۔" اس نے میری بات نہ سمجھ سکے پر کہا۔
"اچھا چھوڑو۔ تم فضول کی بحث میں کیوں پڑ
گئے۔ سیدھی ہی بات ہے شادی بروقت۔"

"میں نے آپ کا گرفتار مشورہ پلو میں باندھ لیا ہے۔"

☆ ☆ ☆

مختار کو کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے کوالا لپور جانا
تھا۔ بچوں کے استقامت نہ چل رہے ہوتے تو شاید میں بھی
بچوں کے ہمراہ ان کے ساتھ کوالا لپور جانے کی فرمائش
کر دیتی۔ نئی نئی جگہیں کھوینے پھرنے کا مجھے بہت شوق تھا۔
میں مختار سے اکثر کہا کرتی تھی۔ "اگر میں عورت نہیں مرد
ہوتی تو ابن بطوطہ کی جانشین بنتی۔"

"شکر ہے کہ تم مرد نہ ہو گیں ورنہ میں کہاں مارا مارا پھرتا۔"

"آپ جیسے وینڈم اور کماؤ مرد کو لڑکیوں کی کیا کی۔"

میں ان کے منہ سے اپنی تعریف سننے کو کہتی۔
"یار، تم جیسی مجھے کوئی اور کہاں ملتی۔ جسے بنانے
کے بعد تو اللہ نے وہ سانچہ ہی تو ڈیا ہوگا۔ ون اینڈ اوٹی۔"

"جناب! ہر بندہ ون اینڈ اوٹی ہی ہوتا ہے۔"

"کھوتک بھی ہونے لگی ہے، دوام۔ ذرا پس
پڑے تو غر جیسی ایک اور آذر کردوں گا۔" مختار مجھے
چمکھنے کو کہتے۔

”مقل کروں گی۔“
”کسے؟“
”آپ کو اور۔“
”اور؟“
”اس کو تنگ کو۔“

مختار قبیلہ مار کر ہنسنے پھر کہتے۔ ”آفرآل ہو تو عورت
ی۔ دوسری کے ذکر سے بھی چڑتی ہو۔“
”ذکر سے۔“ میں مختار کو گھورتی۔ ”میں اس تصور سے بھی
چڑتی ہوں کہ آپ میرے علاوہ کسی اور عورت کو دیکھیں گی۔“
”یو آر مائی لو۔ یو آر مائی ڈارلنگ۔ تمہارے سوا
کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتا میں۔“ مختار مجھے مجبوراً نہ
نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہتے۔

حقیقت بھی یہی تھی کہ مختار مجھ سے غیر معمولی محبت
کرتے تھے۔ ہم دونوں جہاں جاتے مرکز نگاہ بن جاتے۔
ہمارے درمیان گہری ذہنی ہم آہنگی تھی۔ مختار سے شادی
کے بعد شروع شروع میں مجھے حنان کا خیال آیا ہو تو اور بات
لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں یہ بالکل ہی بھول گئی
تھی کہ بھی حنان نام کا میرا ایک کزن میری محبت ہوا کرتا
تھا۔ جس کے بتا بیٹے کا تصور بھی محال تھا میرے لیے۔ میں
زندہ تھی۔ حنان کے بغیر اور خوش بھی۔

مختار کا نفرض میں شرکت کے لیے کوالا پور جانے
لگے تو انہوں نے دانش سے کہا۔ ”یار، اپنی بھالی اور بچوں کا
خیال رکھنا۔“
”آپ فکری نہ کریں۔“ دانش نے انہیں اطمینان دلایا۔
”تمہارے ہوتے مجھے فکر تو خیر نہیں مگر۔“ مختار کی
نگاہیں مجھ پر تھیں۔

”مگر۔۔۔؟“ دانش کے لہجے میں تجسس آمیز بے تابی تھی۔
”یہ جو تمہاری بھالی ہیں نا۔۔۔۔۔ ان سے ایک دن کی
دوری بھی مجھے شاق گزرتی ہے۔“
”بچوں کے ایگزامز نہ ہوتے تو میں آپ کو اکیلا
جانے دیتی بھلا؟“

”اور کیا میں جاتا چھوڑ کر؟“
”آپ فکر نہ کریں مختار بھالی، میں یہاں ہوں نا۔“
”تھینک یو یار۔“ مختار نے دانش کا شانہ چھتھایا۔
”تمہارے ہونے سے بڑا سہارا ہے مجھے۔“
مختار کو اکیلا پور چلے گئے۔ میں، بچے اور دانش انہیں
ان پورٹ تک چھوڑنے گئے۔ ان پورٹ سے واپسی پر گھر کے
راستے میں دانش نے گاڑی ڈرائیو کرنے کے ساتھ ہمیں اپنی

باتوں میں بھی لگے رکھا۔ میں سمجھ سکتی تھی کہ وہ مختار کے
جانے کے بعد مجھے اور بچوں کو اداس دیکھ کر ہمیں اپنی باتوں
سے بھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے پہلے مختار اس طرح
مجھ سے اور بچوں سے دور بھی نہ گئے تھے۔ لیکن جانا بھی ہوتا
تو میں اور بچے انوٹ انگ بنے ان کے ساتھ ہوتے۔
☆☆☆

مختار کو اکیلا پور مجھے تیسرا دن تھا۔ بقول ان کے وہ
وہاں مصروف بہت تھے لیکن جیسے ہی وقت ملتا، وہ مجھ سے اور
بچوں سے فون پر بات کرتے۔ وہ ہمیں اور ہم انہیں بہت مس
کر رہے تھے۔ چوتھی شب میں نے بڑا عجیب سا خواب
دیکھا۔ جیسے میں تیز آمدی میں سنی اور سوسو کے ساتھ کھڑی
ہوں۔ دونوں مجھ سے ہنسنے ہوئے ہیں۔ خوف زدہ ہیں۔ تیز
ہوا زمین سے ہمارے پاؤں اکھیرے دیتی ہے۔ میں
پریشان ہوں کہ خود کو سنبھالوں یا بچوں کو سہارا دوں۔ بچے
خوف زدہ ہو کر رونے لگتے ہیں۔ میں مختار کو پکارتی ہوں۔
”مختار۔۔۔۔۔ مختار۔۔۔۔۔ مختار۔۔۔۔۔“ مگر مختار کا کہیں پتا
نہیں پھر جیسے کوئی کہتا ہے مختار کی ڈیڈ باڈی تو اسپتال میں
پڑی ہے۔

میری آنکھ کھلی تو میرا دل بری طرح دھچک دھچک کر رہا
تھا۔ خوف سے میرا پورا جسم اٹھنے جا رہا تھا۔ صبح کی سی کیفیت
تھی۔ مجھے شدید ڈر لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی میں مختار
کے بارے میں کچھ عجیب و غریب خواب بار بار دیکھتی رہی
تھی۔ جیسے وہ بیمار ہیں۔ کہیں چلے گئے ہیں اور میں انہیں
ڈھونڈتی پھر رہی ہوں یا پھر ان کے ایکسیڈنٹ کی خبر ملتی ہے
لیکن اس خواب نے تو مجھے جی جان سے لرزادیا۔ شاید مختار
گئے ہوئے نہ ہوتے تو میں انہیں اپنے قریب سوتے دیکھ کر
خواس بھال کر لیتی مگر ان کی عدم موجودگی نے میرے خوف
میں مزید اضافہ کر دیا۔ بچے میرے کمرے میں سو رہے
تھے مگر انہیں چکا کر ان سے یہ کہنا کہ میں خواب میں ڈر گئی تھی
حاجت ہوتی۔ ویسے بھی صبح دونوں کا ہنسنے تھا۔ میں نے خود کو
تسلی دینے اور نارمل ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہی بلکہ
خوف اور جسم کی اینٹن میں لہجہ یہ لہجہ اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔
میں انھی اور دروازہ کھول کر دانش کے کمرے تک جا پہنچی۔
تین چار مرتبہ دستک دی۔ دروازہ کھلا تو دانش میرے روبرو
تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بے ساختہ چونکا۔ اس کے کچھ پوچھنے سے
قبل ہی میں نے از خود کہا۔ ”دانش میں ڈر گئی ہوں۔“
”کس سے؟“

”خواب میں۔“ میرا بدن ہنوز لرز رہا تھا بلکہ دانت

راد لکھ

بچنے لگے تھے۔
”ارے آپ تو بری طرح کانپ رہی ہیں۔“ اس
نے کہا۔
”مجھے تسلی دو۔ مجھے تسلی دو دانش۔ مختار کو فون
کرو۔ فوراً واپس آ جائیں۔“
”ریٹیکس۔“
”میں نے تجہت برا خواب دیکھا ہے۔“ میں سر تاپا
کانپ رہی تھی۔

”خواب۔۔۔۔۔ خواب ہوتے ہیں بھالی۔ کچھ نہیں
ہوتا۔“ اس نے مجھے تسلی دینے کی کوشش کی۔
”نہیں دانش۔ نہیں۔“ میں نے اس کی بات کی نفی
کی۔ میں نے جو خواب دیکھا تھا، اس کے خوف سے نہیں
نکل پارہی تھی۔ تند و تیز ہوا بچوں کا سہم کر مجھ سے لپٹ
جاتا۔ میرا مختار کو پکارنا، کوئی جواب نہ ملنا اور پھر کسی کا یہ کہنا
کہ مختار کی ڈیڈ باڈی تو اسپتال میں پڑی ہے۔ مجھے یوں لگ
رہا تھا جیسے وہ سب کچھ خواب نہیں حقیقت تھی اور اگر حقیقت
نہیں بھی تھی تو اسے حقیقت بن جاتا تھا۔ خوف پہنکاریں مارتا
میری رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ میرا عالم خواب سے حقیقت کی
دنیا میں لوٹ آتا اور دانش کا مجھے بار بار تسلی دینا بھی کچھ کام
نہ کر رہا تھا۔ میرے جسم پر طاری لرزہ بڑھتا ہی چلا گیا۔
دانت مسلسل کھٹکاتے چلے گئے۔ میرے سر میں چیونٹیاں سی
رہنے لگیں۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ میں بول بھی نہیں پارہی
تھی۔ مجھے اپنے خوف و بدن میں گوش پوست کی نرم و ملائم
زبان کے بجائے سخت لکڑی کا ایک ٹکڑا ملنے تک پھنسا محسوس
ہو رہا تھا۔ میں گرنے لگی تھی کہ دفعتاً مجھے دانش نے اپنے
بازوؤں میں سنبھال لیا۔

”آپ کو اسپتال لے چلوں؟“ اس نے کہا۔
شاید میں نے اثبات میں سر ہلایا ہو۔ پہلے اس نے
اپنی جیکٹ بند سے اٹھا کر میرے شانوں پر ڈالی پھر مجھے
سہارا دے کر گاڑی تک پہنچا۔ مجھے بچوں کے اکیلے پن کا،
گھر کا، کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ مجھے گاڑی میں ڈال کر دانش
تیز رفتاری سے اسپتال روانہ ہو گیا۔ راستے میں وہ بار بار
پوچھتا رہا۔ ”آر یو آل رائٹ؟“
”آل رائٹ؟“

میری حالت لہجہ بہ لہجہ ابتر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اسپتال
پہنچے تو میں اپنے قدموں پر گاڑی سے اترنے کے قابل نہ تھی۔
دانش لپک کر وہیل چیئر لے آیا۔ مجھے اپنے بازوؤں کا سہارا
دے کر وہیل چیئر پر بٹھایا اور ایمرجنسی میں لے گیا۔ ڈیوٹی

ڈاکٹر نے میری نبض دیکھی بلند پریش چیک کیا اور ڈیوٹی نرس کو
مجھے فوری انکشن لگانے کی ہدایت کی۔ بعد میں دانش نے
مجھے بتایا کہ میرا بلند پریش خطرناک حد تک بڑھ گیا تھا۔ گھٹنا
ڈیڈ گھٹنا میں آبزرویشن میں رہی۔ اس دوران دوسرے مجھے
دانش روم جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ دانش تمام وقت
میرے آس پاس رہا۔ انکشن لگانے سے بلند پریش کم ہوا تو
ڈیوٹی ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا ہوا تھا؟“
”ڈاکٹر! یہ سوتے میں خواب دیکھ کر ڈر گئی تھیں۔“
میرے بجائے دانش نے جواب دیا۔

ڈاکٹر کی حس مزاح تیز تھی۔ ”خواب سوتے ہی میں
دیکھے جاتے ہیں۔“ اس کی اردو اس کے پاکستانی یا انڈین
ہونے کی گواہ تھی۔ دانش جھینپ کر مسکرا دیا۔
ڈاکٹر نے بڑے دوستانہ انداز میں دانش کے شانے
پر ہاتھ دھرتے ہوئے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ”بیویوں کو
اتنا خوف زدہ نہیں رکھنا چاہیے کہ بے چاریاں سوتے میں بھی
ڈر جائیں۔“
”آئی ایم سوری ڈاکٹر یہ۔۔۔۔۔ میری بھالی ہیں۔“
”اوہ!“ ڈاکٹر چونکا۔ ”ان کے سپیڈ؟“
”وہ آج کل یہاں نہیں ہیں۔“
”آئی سی۔“ ڈاکٹر نے میری طرف توجہ کی اور اپنی
خوش طبعی کے اظہار سے باز نہ رہا۔ ”اردو زبان کی ایک
ضرب الفشل ہے یہاں ہمارا گھر نہیں ہمیں کسی کا ڈر نہیں پھر
بھلا آپ کیوں ڈر گئیں؟“

”تھینک یو دیری بچ ڈاکٹر۔“ میں جو اپنی حالت
میں اب بہت بہتری محسوس کر رہی تھی، وہی آواز میں بولی۔
”میاں کا خوف بھگانے کا شکریہ ادا کر رہی ہیں؟“
ڈاکٹر مسکرایا۔

”جی نہیں۔۔۔۔۔ وہ تو بہت اچھے ہیں۔ ہر لحاظ سے ایک
آئیڈل شوبر۔“
”ڈاکٹر! انہوں نے انہی کے بارے میں خواب
دیکھا تھا۔“ دانش نے کہا۔
”کیا وہ اتنے ہی خوف ناک ہیں؟“
”قابل رشک حد تک وینڈسم ڈاکٹر۔“
”اوہ!“ ڈاکٹر نے مجھے دیکھا۔

”ہمارے خاندان میں ان دونوں کو چاند سورج کی
جوڑی سمجھا جاتا ہے۔“ ڈاکٹر کی بے تکلفی نے دانش کو بھی بے
تکلف کر دیا تھا۔
”کبھی موقع ملے تو تموا بیے گا ان سے۔“ ڈاکٹر نے

”اچھے اچھے خواب دیکھا کیجیے۔“

”انسان کے اپنے بس میں تھوڑی ہوتا ہے۔“

”ہوتا ہے۔ انسان دن بھر جن خیالات اپنے دل و دماغ میں بسائے رکھتا ہے وہی رات کو خواب بن جاتے ہیں۔ آپ آج کل دن بھر مختار بھائی کے بارے میں سوچتی رہتی ہیں۔ ان کی طرف سے فکر مند رہتی ہیں اس لیے آپ نے ان کے بارے میں ایسا پریشان کن خواب دیکھا۔“

”او خدا یا! بہت خوف ناک خواب تھا۔“

”ریلیکس..... خواب بس خواب ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے اوپر اتنا نہیں طاری کرنا چاہیے۔“

”تم نہ ہوتے تو میں آج رات خوف سے مر ہی جاتی دانش۔“

وہ میرے نزدیک آکھڑا ہوا اور مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی کیفیت تھی جس نے مجھے نظریں چرانے پر مجبور کر دیا۔ یکا یک وہ نیچے بیٹھ گیا۔

”آپ مرجاتیں تو دانش کیسے زندہ رہ پاتا۔“ اس نے کہا۔ میں نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔

”آئی لو یو۔“ اس نے کہا پھر وہ ایک سانس میں بولتا ہی چلا گیا۔ ”مجھے آپ کتنی اچھی لگتی ہیں کاش..... میں آپ کو اپنا دل کھول کر دکھا سکتا۔ میرا جی چاہتا ہے مختار بھائی سے آپ کو چھین کر محفل کی کسی ڈبیا میں چھپا کر اپنی شرٹ کی فرنٹ پاکٹ میں رکھ لوں تاکہ میرے دل کی ہر دھڑکن کو آپ کی قربت کا احساس رہے۔ میرا جی چاہتا ہے محفل کی اس ڈبیا کو اپنی جیب میں چھپا کر میں دور، بہت دور چلا جاؤں جہاں کوئی اس ڈبیا کو مجھ سے نہ چھین سکے۔ آپ بولتی ہیں تو میرا جی چاہتا ہے آپ کو سنے جاؤں۔ آپ مسکراتی ہیں تو میں اپنے ہوش کھونے لگتا ہوں۔ آپ کی ہنسی مجھے پاگل کر دیتی ہے۔ میں نے اپنے خواب آپ کے تصور سے سجا رکھے ہیں۔ آئی لو یو..... آئی میڈلی لو یو۔“

میں دم بخود تھی۔ یکا یک اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کر دیے اور گڑگڑا کر بولا۔ ”آپ کو اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم مجھے کبھی روکیے گا مت..... میں ساری زندگی اسی طرح آپ کے قدموں میں بیٹھا رہنا اور آپ سے محبت کرتے رہنا چاہتا ہوں۔ آپ کے بغیر میری زندگی ادھوری ہے..... میں ادھوری زندگی نہیں جینا چاہتا۔ میں آپ کے قدموں میں زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔“ میں گنگ تھی۔

مجھ سے کہا۔

”جی ضرور۔“

”اب کیسا محسوس کر رہی ہیں آپ؟“ ڈاکٹر نے میری نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

”بہت بہتر۔“

”گڈ۔“ ڈاکٹر نے نرس کو میرا بلڈ پریشر پھر چیک کرنے کی ہدایت کی۔

”اب آپ گھر جاسکتی ہیں لیکن دو تین دن تک بلڈ پریشر چیک کروانی رہیں۔“

”او کے۔“

”اور ہاں۔“ ڈاکٹر نے انگلی کھڑی کی پھر اس کا رخ دانش کی طرف کرتے ہوئے بولا۔ ”ایسا دیور خدا ہر بھالی کو دے۔ یہ اگر اتنی رات گئے آپ کو اسپتال لے کر نہ پہنچتے تو آپ کسی بڑی ایمرجنسی سے بھی دوچار ہو سکتی تھیں۔“

”اٹ واز مائی ڈیوٹی۔“ دانش نے کہا۔

ڈاکٹر نے دانش کو ستائشی نگاہوں سے دیکھا۔ میں بیڈ سے نیچے اترنے لگی تو دانش نے جو مجھے گھر سے اسپتال لاتے ہوئے بے تکلفی سے اپنا سہارا دیتا رہا، اب قدرے ہچکچاتے ہوئے مجھے بیڈ سے اترنے کو اپنے ہاتھ کا سہارا دیا۔

گھر واپس پہنچے تو دونوں بچے اسی طرح گہری نیند میں تھے۔

”اب آپ آرام سے سو جائیے۔ صبح جلدی اٹھنے کی ضرورت نہیں۔ میں بچوں کو ناشتا بھی بنا دوں گا، اسکول بھی پہنچا دوں گا بلکہ واپسی پر بھی انہیں پک کر لوں گا۔“ دانش نے مجھ سے کہا۔

”مجھے خیند نہیں آرہی، لاؤنج میں بیٹھوں گی۔“

”چلیے تو پھر میں بھی آپ کے ساتھ بیٹھتا ہوں۔“

”مختار کی اگر تم سے بات ہو تو انہیں کچھ مت بتانا۔“

”کیوں؟“

”خواجہاں پریشان ہوں گے بلکہ بچوں کو بھی نہ بتانا،

وہ مختار کو بتانے سے باز نہ رہیں گے۔“

”او کے۔“

”مجھے تو خیند نہیں آرہی۔ صبح ہونے میں ابھی دو

ڈھائی گھنٹے ہیں، تم جا کر سو جاؤ صبح آفس بھی جانا ہوگا۔“

”آپ دوبارہ ڈرنکیں تو؟“ دانش کی حس مزاح

بھی پھڑکی۔

”بہت خوفزدہ کر دینے والا خواب تھا۔“ میں نے

جھرجھری لی۔

”مجھے اپنے سے دور جانے کو تو نہیں کہیں گی نا کبھی؟“ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں دہل رہی تھی۔ یہ حقیقت تو اس خواب سے بھی زیادہ دہشت ناک تھی۔ میری آواز، الفاظ سب نہ جانے کہاں گم ہو گئے تھے۔

”میرے اس جرم کی آپ کی طرف سے مجھے جو بھی سزا ملے قبول ہے لیکن میں بے بس ہوں۔ آپ سے محبت کیے بنا نہیں رہ سکتا۔“

میں نے اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ نہ جانے کتنی دیر خاموشی سے گزری پھر کایک مجھے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں پر بھاری انگلیوں کا لمس محسوس ہوا۔ میں نے ہزبڑا کر اپنے ہاتھ چہرے سے ہٹا لیے۔

سے نکال ہی نہ دیں۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
 "گھر کے باہر فریٹ لگا دوں گا۔"
 "بی بیو دانش... تمہارے ساتھ کیا کیا ہے
 اور تم انہی کے ہنسنے بٹسنے گھر کو آگ لگانا چاہتے ہو۔"
 "اوهو... یہ آپ نے کیسے سمجھا۔ خدا خواست میں
 ایسا تو نہیں جانتا۔"
 "تو پھر کیا چاہتے ہو؟"

مگر میں چھوڑ کر دوسرے ملک چلے گئے تھے۔ بجا کہ ان کی
مجبوری تھی مگر یہ تو سوچنا چاہیے تھا انہیں کہ..... جوان بیوی
کے ہوتے وہ اپنے نو جوان کزن کو گھر میں کیوں چھوڑے
جا رہے تھے۔ کبھی بچے دانش پر فہم آنے لگتا۔ احسان
فراموش! خائن! جس شخص نے اسے سگے بھائیوں کی سی
عزت دی اسی کے گھر میں نقب لگانے کے درپے تھا۔

آپ کی طبیعت جو ٹھیک نہیں تھی۔ اس نے کہا۔
 "طبیعت ٹھیک ہو یا نہ ہو، بچے بہر حال میری اسے
 داری ہیں۔ میں اکھڑے اکھڑے انداز میں ہوں۔
 وہ چند دن بچے خاموش کھڑا رہا مگر اس نے دو ٹوک سے
 میں کہا۔ "نہ میری تذلیل، نہ آپ کی بارگاہی کون مجھے
 میرے اسے سے نہیں بنا سکتا۔"
 "قر جاؤ۔ بچوں کو میں خود لے جاؤں گی۔"
 "اوکے۔" اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ
 میں دل کر رہ گئی۔ ایسے تو بخیر نہ بھی نہیں دیکھا تھا۔
 بچے چھٹی کے بعد اسکول سے نکلے تو مجھے دیکھ کر سخت
 مایوس ہوئے۔
 "آپ کیوں آگئیں، چاچو نے کہا تھا وہ ہمیں پک
 کرنے آئیں گے۔ اوگاؤ۔ ہمیں ان کے ساتھ مزہ کرنا تھا۔"
 "زیادہ فری نہ ہوا کرو چاچو کے ساتھ۔" سنی اور
 موسو نے ایک دوسرے کو دیکھا۔
 "آپ کیوں چلیں ہوئی ہیں؟" سنی نے کہا۔
 "مجھے کیا ضرورت ہے چلیں ہوئے کی سمجھاری
 ہوں جسبیں۔ قہار سے سکے چاچو تو ہیں نہیں وہ۔"
 "پاپا کے فرسٹ کزن تو ہیں۔" موسو بولی۔
 "ہاں تو اسی لیے جسبیں زیادہ فری نہیں ہوتا چاہیے
 اس سے۔"
 "یہ بات آپ اتنے دنوں بعد کیوں سمجھاری ہیں؟"
 سنی چبکا۔
 "کیا مطلب؟"
 "اب تو ہمیں جتنا فری ہوتا تھا وہ بچے۔" سنی نے
 ادا ہالی انداز میں کہا اور موسو سے اپنی بات کی تائید چاہی۔
 "کیوں موسو؟"
 "ہاں۔" موسو نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔
 "آپ کو ہوا کیا تھا؟" سنی نے جو فرسٹ سیٹ پر
 میرے ساتھ بیٹھا تھا، اپنے بازو سینے پر باندھتے ہوئے رخ
 میری طرف کیا۔
 "کب کیا ہوا تھا؟" میں نے تجاہل عارفانہ سے کہا۔
 "رات۔ چاچو بتا رہے تھے آپ کی طبیعت
 خراب ہو گئی تھی۔"
 "ہاں بس ایسے ہی تھوڑا سا درو اور ہلکا سا
 لہر پیر۔" میں نے ہانپنے والے انداز میں کہا۔
 "ایچھے بچوں کی طرح جو نہیں رہیں۔" مقبی نشست پر
 جینی موسو اچھی دونوں نشستوں کے درمیان سے منکال کر بولی۔

"کیا مطلب؟" میں چوگی۔
 "بر وقت بس کام، کام، کام۔ پاپا آئیں گے تو
 شکایت کروں گی آپ کی۔"
 "اچھا دادی جان کروینا۔" میں نے اپنی توجہ سڑک
 پر مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔
 "ماما۔ یاد آپ پاکستان سے کوئی میڈ کیوں نہیں
 منگوائیں۔ میرے فریڈ جوڈت کی کمی نے تو اپنے کاؤس سے
 ایک میڈ اذھر منگوادگی ہے۔ سارے کام کرتی ہے ان کے۔"
 "تمہارے پاپا نے مگر میں میڈ کے لیے کوئی جگہ نہ
 دی ہے۔ پورا ایک کمر اتوا اپنے اس کزن کو دے رکھا ہے۔"
 "یہ مین چاچو؟" موسو مگر پیچھے سے پہلے کی طرح نہماگی۔
 "بس۔ آئی مین چاچو۔"
 "یہی از سوسوٹ ماما۔ سنی نے مدافعتی لہجے میں کہا۔
 "پاکستان سے میڈ منگوائیں تو اسے رہنے کو جگہ بھی تو
 دینی پڑے گی۔"
 "اوکے۔" منگوائیں۔" دانش کی حمایت میں
 سنی نے میڈ منگوانے کے خیال سے فوراً ہی دستبرداری
 اختیار کر لی۔
 "آئی لوج ماما۔" موسو نے عقب سے میرے گے
 میں اپنی ہاتھیں حائل کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اپنے
 ہونٹ ان کے نرم و گداز بازو سے مس کر دیے۔
 "میری زندگی۔ میری روح۔" میں نے دل ہی
 دل میں کہا۔
 دانش بھی حائل اور موسو میری زندگی میری روح
 تھے۔ دانش کو میرے بخیر اور بچوں کے درمیان آنے کا
 کوئی حق نہیں تھا۔

"اچھا تو پھر ایسا کرتے ہیں، میں جاتا ہوں
 پاکستان۔ تم دونوں اپنی ماما اور چاچو کے ساتھ نہیں رہو۔"
 بخیر نے مذاق کہا۔ میرا دل اچھل کر تعلق میں آن اٹکا۔
 "آپ ہم سے بچنے کے لیے تو آیا کریں گے
 ؟" میرا خیال تھا بچہ بخیر کی بات کی نفی کریں گے لیکن سنی
 کہنے اطمینان سے راضی ہو گیا تھا۔
 "اں ہاں یاد۔ کیوں نہیں۔" بخیر نے بچے کی بات
 کو مذاق میں لیتے ہوئے مجھے دیکھ کر چپکے سے آنکھ دہائی۔
 "دیکھ اینڈ پاپا؟" موسو نے پوچھا۔
 "میرا رات اپنی کڑیا بنی کے خوابوں میں۔" بخیر نے
 موسو کے سلی بالوں میں اپنی انگلیاں نہایت محبت سے
 گھماتے ہوئے کہا۔
 "بعض خواب انسان کی زندگی کو ٹیپٹ بھی کر دیتے
 ہیں۔" میں کہتا چاہتی تھی مگر نہ کہہ پائی۔
 مذاق میں ہونے والی اس بات پر بخیر اتنے سنجیدہ
 ہو گئے کہ انہوں نے کراچی کے خندوش حالات اور بچوں کی
 بہتر تعلیم کے پیش نظر مجھے اور بچوں کو دعویٰ میں رکھنے اور خود
 پاکستان میں اپنی نئی تعیناتی پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ بچوں کی
 خواہش کے برخلاف میں نے بخیر سے اپنے اور بچوں کے
 بھی پاکستان جانے کی بات کی تو وہ بولے۔
 "یہاں بچوں کے لیے بہتر تعلیم کے مواقع زیادہ ہیں۔
 یہاں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کے لیے اعلیٰ تعلیم اور
 بہتر جاب کے لیے انگلینڈ، امریکا جانا بھی آسان ہوگا۔"
 "مگر آپ تو نہیں ہوں گے ہمارے ساتھ۔"
 "ساتھ تو میں وہاں بھی نہیں ہوں گا۔ جسبیں اور بچوں
 کو کراچی میں رہنا پڑے گا اور مجھے اپنی ڈیوٹی پلیم کر پڑے۔"
 "کراچی میں تو سب ہوں گے یہاں میں ایکی کیسے
 رہ سکتی ہوں؟" میں نے جرح کی۔
 "ایکی کہاں دانش ہوگا؟ قہار سے پاس۔" میں کیا
 کہتی ان سے، کیا بتاتی انہیں۔ برسوں بعد اب اپنی غلطی کا
 احساس ہوتا ہے۔ مجھے سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا بخیر کو۔
 "آئی دل مس ہو۔" میری آنکھیں بھر آئیں اور
 آواز بھرا گئی۔
 "تم کیا سمجھتی ہو، میں جسبیں مس نہیں کروں گا مگر میری
 مجبوری اور بچوں کا مستقبل۔" دانش دن رات ترقی کر رہا ہے۔
 پورپ والوں کے لیے ہالینڈ سے ریزورٹ جتا جا رہا ہے۔
 قسمت والوں کو ملتا ہے دانش میں رہنے کا موقع۔ میری اتنی انجی
 جاب اور اتنے مالی وسائل نہ ہوتے تو میں بھی نہیں سوئی کتا تھا

تھیں اور بچوں کو دینی میں رہنے کا۔ فہرست سرگرمیوں میں ان کا
 کہ میری دوبارہ تنگی یا اس پاس چاہت ہو جائے۔
 میرے سحر والوں کو معلوم ہو کہ میں بخیر سے ساتھ
 پاکستان واپس لوٹنے کی خواہش مند تھی تو یہاں نے بھی میری
 حوصلہ شکنی کے لیے ہر حربہ آزمایا اور مجھے کی ہاں میں ہاں ملانی۔
 "بخیر ٹھیک تو کہہ رہے ہیں۔ کیا کرو گی یہاں آکر۔
 آئے دن بنگا سے، شہر بند، بازار بند، اسکول کاٹ بند نہ جان
 محفوظات مال محفوظات۔" ابو نے کہا۔
 "جو یہاں سے نکل گیا، وہ اتنی میں ہے۔" امی
 بولیں۔ دانش خاموش قہر شانی بنار ہوا اور میں دل ہی دل میں
 ذوقی، کانپتی رہی۔ ساتھ جانے کے لیے بخیر کی منت
 سماجت کرتی رہی۔ ہواوی جو بخیر چاہتے تھے۔
 مجھے اور بچوں کو دینی میں چھوڑ کر بخیر پاکستان چلے گئے۔
 "قہار ہی صرف ایک فون کال پر میں چلی نکلتی
 سے قہار سے پاس ہوں گا۔" انہوں نے مجھے سلی دی۔
 کاش۔ بخیر جانے کے بھی بھی چلی نکلتی تھیں۔
 بھی اتنی دیر ہو جاتی ہے کہ منزل تک پہنچتے پہ ہم اپنے
 پیادوں کو ہمیشہ کے لیے کھو جیتے ہیں۔
 مجھ سے اگر یہ غلطی ہوئی کہ میں نے بخیر کو اس رات
 کی کٹھا سے نہ آگاہ رکھا تو بخیر سے یہ غلطی ہوئی کہ انہوں
 نے اپنے نوجوان کزن پر اندھا دھند کرتے ہوئے اسے
 میرا اور بچوں کا کیرئیر بگاڑ دیا۔ کی راہ دکھائی۔
 مجھے اور بچوں کو دینی میں چھوڑ کر بخیر پاکستان چلے
 گئے اور وہاں انہوں نے شمالی علاقہ جات میں اپنے مقام
 تعیناتی پر اپنی منہمی ڈے دار ہاں سنبھال لیں۔ اپنے قیام و
 طعام کے لیے انہوں نے ایک خوش حال گھرانے میں بطور
 بے انگ گیسٹ بندوبست کر لیا۔ مجھ سے اور بچوں سے وہ
 باقاعدہ بات کرتے۔ رابطے کے جدید ذرائع نے ہمارے
 لیے وہ آسانیاں فراہم کر رکھی تھیں جن کا چند برسوں پہلے
 تصور بھی نہ تھا۔ دانش ہمارے ساتھ تھا اور بخیر جس چٹلی کے
 ساتھ بے انگ گیسٹ کے طور پر رہ رہے تھے، بقول بخیر
 نہایت اچھے اور خیال رکھنے والے لوگ تھے۔ صاحب خانہ کی
 دو بیٹیاں تھیں۔ ایک شادی شدہ دوسری کنواری اور کسی این جی
 او کی کارکن۔ بخیر کے بقول بڑا مطمئن اور مہذب سا گھرانہ تھا
 جہاں انہیں بالکل اپنایت کا ماحول میسر آ گیا تھا۔ بخیر خوش
 تھے کہ انہیں خیر لوگوں میں اپنایت مل گئی تھی اور میں اپنے ہی
 گھر میں اجنبیت کا شکار تھی۔ دانش کی موجودگی مجھے عدم

اور روشن خیال بیوی دیکھنا چاہتا ہوں۔ یقین رکھو جہاں ہوں جس کے ساتھ بھی ہوں تمہارا ہی رہوں گا۔ یار اتم جیسی خوب صورت بیوی کے ہوتے میں کسی اور طرف بھٹک سکتا ہوں بھلا۔

”نفل کروں گی اسے بھی جو آپ کو بھگائے اور آپ کو بھی۔“ میں نے جارحانہ تیروں سے کہا۔ مختار زور سے ہنس دیے۔

دانش کی بات نے میرے دل کے واسے کو پھر سے اکسادی۔ مختار کا فون آیا تو میں نے ان سے کہا۔ ”ایک بات بتائیے اس لڑکی میں انوالو ہیں آپ؟“

”کیوں شک کرتی ہو مجھ پر؟“ مختار نے کہا۔

”مجھے لگ رہا ہے۔“

”پاکل ہو تم۔“ مگر میرے دل سے وہم رخن نہ ہوا۔

اگلی بار جب مختار دعویٰ آئے تو مجھے اپنے اور ان کے درمیان اس لڑکی کی موجودگی کا وہم مستقل ستا رہا۔

”آپ اس لڑکی میں انوالو ہیں؟“ میں نے مختار سے کہا۔

”فرض کرو۔۔۔۔۔ ہوں تو؟“ میں نے مختار کو بے یقینی سے دیکھا۔

”آپ انوالو ہیں؟“ میں نے گویا تصدیق چاہی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ہوں۔“

”کیوں۔۔۔۔۔ کیوں ہیں؟“

”کیونکہ تم میرے پاس نہیں ہوتی ہو۔“

”یہ میری چوائس تھی یا آپ کا فیصلہ؟“ میں غرائی۔

”جو بھی سہی۔“ انہوں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”وہ سچ ہے خیرت، ذلیل لڑکی۔“

”شی ازمانی دائف۔“

”دہات!“ میں نے آنکھیں پھاڑ کر مختار کو دیکھا۔

”میں اس سے شادی کر چکا ہوں۔“

میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور زور سے چلائی۔ دونوں بچے گھبرا کر کمرے سے نکل آئے۔

”کیا ہوا۔۔۔۔۔ کیا ہوا ما؟“

”اپنے باپ سے پوچھو۔“ میں نے مختار کی طرف اٹکی اٹھائی۔

”کیا ہوا پاپا؟“

”کچھ نہیں۔“ مختار نے بچوں سے نظریں چراتی تھیں۔

”کچھ کیسے نہیں ہوا۔“ میں دہاڑی۔ ”تمہارے ان شریف ابا جان نے دوسری شادی کرنی ہے۔“ میں نے

بچوں کو بتایا۔

دونوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور منہ کھلے رہ گئے۔

دونوں شاکہ نظر آتے تھے۔

مجھ پر یگانہ سا طاری ہونے لگا۔ مختار کا مگر بیان بکڑ کر میں نے انہیں بری طرح بھنبھوزا۔ میں یقیناً بچوں سے بھی زیادہ صدمے میں تھی۔ مختار سر جھکا کر بھرم بنے کھڑے تھے۔ مختار پر میرا بھروسہ پارہ پارہ ہو چکا تھا۔

یہ میری زندگی کا وہ اندہ ہنگامہ صدمہ تھا جس نے میرے دل کو قبرستان کی طرح ویران کر دیا۔ عورت کی زندگی میں اس عذاب سے بڑا دوسرا کوئی عذاب نہیں شاید کہ اس کے ہوتے اس کے مرد کی زندگی میں کوئی دوسری عورت آجائے۔

اعتزاف حقیقت کے بعد مختار دونوں دعویٰ میں رہے۔

ہمارے کمرے الگ ہو گئے۔ نگاہیں بدل گئیں اور آنے والے دنوں میں راستے بھی۔ بعض حادثے کتنے دل نگار ہوتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

مختار کے جانے کے بعد دانش نے جو، ان کی موجودگی میں خاموش قہقہہ شانی بنا رہا تھا، میرا صدمہ بنانے کی کوشش کی۔

”میں نے آپ سے کہا تھا۔“

میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں اس صدمہ گراں میں اپنے دل کا بوجھ ہٹا کرنے کے لیے ایک شانے کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ دانش نے اپنا شانہ پیش کر دیا۔

”میں اس شخص کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”مگر خود کو تو سزا دے دیں۔“ دانش نے کہا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اس نے آنسو پونچھنے کے لیے مجھے نشہ پیچہ پیش کیا۔

”جو شخص آپ کا وفادار نہیں آپ اس کے لیے آنسو کیوں بہا رہی ہیں؟“ اس نے کہا۔

”وہ میرا شوہر، میرے بچوں کا باپ ہے۔“

”اب صرف آپ کا شوہر نہیں رہا اور ہو سکتا ہے کہ صرف آپ ہی کے بچوں کا باپ بھی نہ رہا ہو۔ کوئی اور دعوے دار بھی دنیا میں آجائیں۔“

میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے میری دلجوئی کی۔

”روٹی کیوں ہیں۔۔۔۔۔ میں ہوں تا۔۔۔۔۔ ساری زندگی آپ کے قدموں میں بیٹھ کر گزارنے کا آرزو مند۔ اس سے دوسروں نے لیں، میں آپ سے شادی کر لوں گا۔“ میں نے ہلکا کر اسے دیکھا۔

”تا کہ لوگوں کو بھنے کا موقع ملے۔“

”لوگوں کی کون پر داکرتا ہے۔ ویسے بھی ہم ان لوگوں سے بہت دور ہیں جن کی پروا کی جاسکتی ہے۔“ میں نے دانش کو تنبیہ نظروں سے دیکھا۔

”ہم اور بھی دور چلے جائیں گے امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا تاکہ آپ تک کسی کی آواز ہی نہ پہنچ سکے۔“

”اور لوگ مختار کی دوسری شادی کو برحق سمجھیں۔۔۔۔۔“

عزیزوں، رشتے داروں میں چہ میگوئیاں ہوں کہ میں تمہارے ساتھ انوالو ہو گئی تھی اس لیے مختار نے انتقام دوسری شادی کی اور میری بدکرداری پر مجھے آزاد کر دیا۔ تم سے شادی کے بعد مجھے کسی سے بدکرداری کی سند لینے کی تو ضرورت نہیں رہے گی۔ تم سے میری شادی میری بدکرداری کا ثبوت ہوگی۔“ میں نے تند و خف لہجے میں کہا۔

”اوکے۔۔۔۔۔ آپ اگر اسی شخص کے نام سے بندھے رہنا چاہتی ہیں تو مجھے یہ بھی قبول ہے۔“

میں نے چونک کر دانش کو دیکھا۔ وہ مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔

مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔

”میں پھر بھی آپ ہی کا رہوں گا۔“

☆ ☆ ☆

دانش کی دلجوئی نے میرے دل پر مختار کی بے وفائی سے نکلنے والے گھاؤ پر مرہم کا کام کیا۔ دانش دن بہ دن میرے قریب سے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ہم گناہ کی دلدل میں اتر گئے۔

مختار نے اپنی ذمہ داریاں بھلا میں نہ معمول بدلا۔ وہ اسی طرح میری اور بچوں کی کفالت کرتے رہے۔ مبینا دو دو مہینا بعد دعویٰ آتے اور چند دن رہ کر واپس چلے جاتے۔

میرے اور ان کے تعلقات میں جو سرد مہری آگئی تھی، وہ کم ہو کر نہ دی۔ وہ آتے تو دانش نہایت مؤدب اور محتاط ہو جاتا۔ ان کے جاتے ہی اس کی نگاہوں میں میرے لیے دوسری کیفیت ڈولنا شروع ہو جاتی۔ مختار سے مستقل ناراضگی اور دوری کے باوجود مجھے دانش کے ہونے سے اپنی زندگی میں مرد کی کمی کا احساس نہ ہوتا۔ بچوں کی موجودگی میں ہمارے درمیان جو لحاظ حائل رہتا، ان کی عدم موجودگی میں

سنہری کرنیں

☆ کا میاں کا صرف یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کتنے بلند خیالات کے مالک تھے بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ آپ کیا کچھ کر سکتے ہیں۔

☆ انسان اپنی غلطیوں کا بہترین وکیل اور دوسروں کی غلطیوں کا بہترین جج ہوتا ہے۔

☆ دوستوں کے غم میں ہر حال میں شامل ہوا کرو لیکن خوشیوں میں تب تک نہ جاؤ جب تک وہ آپ کو خود نہ بلائیں۔

☆ تم وہ نہیں ہو جو جہنم میں نظر آتے ہو بلکہ تم اصل میں وہ ہو جو جہنم کی آگ میں ہو۔

☆ اپنا فائدہ سوچے بنا سب کے ساتھ اچھائی کرو کیونکہ جو لوگ پھول تقسیم کرتے ہیں، ان کے ہاتھوں میں خوشبو ضرور رہ جاتی ہے۔

☆ اللہ کو عبادت سے اور مخلوق کو اخلاق سے راضی رکھو۔ دنیا اور آخرت دونوں میں خوش رہو گے۔

☆ کم ترین علم وہ ہے جو زبان پر رہے اور بلند ترین علم وہ ہے جو کردار سے ظاہر ہو۔

☆ مرسلہ۔ آخر شاہ عارف، ڈھوک جمن جہلم ☆ ☆ ☆

☆ کچھ لوگوں کو ہم سے بہت مسئلے ہوتے ہیں لیکن یہ ان کے مسئلے ہیں ہمیں بالکل فکر نہیں کرنی چاہیے۔

☆ قدرت یقیوں کو سائے دینے والے درختوں کے سائے لیے کر دیا کرتی ہے۔

☆ جب تم عزیزوں، رشتے داروں، اولاد اور دوستوں سے چڑنے لگو تو جان لو اللہ تم سے ناراض ہے اور جب تم اپنے دل میں دشمنوں کے لیے رحم محسوس کرنے لگو تو سمجھ لو تمہارا خالق تم سے راضی ہے۔

☆ مرسلہ۔ رضوان تنولی کریم آبادی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

”تھینک یو آپا، آپ دانش کا اتنا خیال رکھتی ہیں۔“ وہ کہتی۔

”دانش اور تم میرے لیے دو تھوڑی ہو میٹھا۔“ میں اپنے دل کے چور کو گول مول جواب کی آڑ میں منہ چھپانے کا موقع فراہم کرتی۔

”تھینک یو آپا..... بہن ہو تو آپ جیسی۔ میں تو اپنی کوئینز سے بھی کہتی ہوں میری آپا فرشتہ ہیں فرشتہ۔ میرے میاں کا اپنے بچوں کی طرح خیال رکھتی ہیں۔“

مجھے میٹھا کے طمانچے کی دھمک اپنے دل پر محسوس ہوئی۔

دونوں بچوں کے انگلیٹھ چلے جانے کے بعد تو میری اور دانش کی کمیٹنگی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ ہمیں جیسے کسی کا خوف ہی نہ رہا تھا۔ مختار اب دہی آنے کے بجائے بچوں سے ملنے کے لیے انگلیٹھ چلے جاتے۔ میں گناہ آلود زندگی کی دلدل میں گردن تک اتر گئی تھی۔

دونوں بچے انگلستان کی ہوشربا زندگی میں ایسے مست ہو گئے تھے کہ انہیں خود سے کم ہی میری یاد آتی۔ مجھے ان کو اپنی موجودگی کا احساس خود دلانا پڑتا۔

”خود بھی فون کر لیا کرو۔“ میں انہیں پیار سے گھڑکتی۔

”مام! بہت بڑی لائف ہے یہاں کی..... دہی سے بھی زیادہ۔“ جواب ملتا۔

”بکو اس مت کرو۔“

”ریلی۔“ مجھے یقین دلانے کی کوشش ہوتی۔ ”آدھا دن تو انڈر گراؤنڈ ایک اسٹیشن سے دوسرے پر دوڑتے لپکتے ہی گزر جاتا ہے۔ پلک جھپکی نہیں کہ ٹری بن یہ جاوہ جا۔“

”خیر تم مجھے یاد کرو یا نہ کرو، میں تمہیں بھولنے والی نہیں۔“ میں جنتی۔

”مام! آپ جیسی ڈینٹ اور گریس فل ماں کو کون بھول سکتا ہے۔ بس ذرا مصروفیت زیادہ رہتی ہے..... ہاں

چاچو کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں۔“

”آپ کا خیال تو رکھتے ہیں نا؟“

”ہاں، ہاں۔“

”میٹھا خالہ سے کہیں ان کی غلطی معاف کر دیں۔“

”کون سی غلطی؟“

”دانش چاچو کی ان سے شادی کرنے کی غلطی۔“

”غلطی کیسی؟“

”چاچو دہی میں خالہ پاکستان میں..... دس ازناٹ

مارل۔ ہسپینڈ اور وائف کو ایک ساتھ رہنا چاہیے۔“

”تمہیں زیادہ بڑا بننے کی ضرورت نہیں..... وہ دونوں اپنا اچھا برا خوب سمجھتے ہیں۔“

”او کے..... او کے مدر ڈیر..... فائن..... کہیں تو کان بھی پکڑ لوں؟“

”ایک ہاتھ میں تو فون ہوگا۔“ مجھے مذاق سوچھا۔

”دوسرے سے دونوں کو باری باری پکڑ لینے میں کیا برائی ہے۔“

”اچھا بس زیادہ شوخی مت دکھاؤ۔“

”مام! آپ بھی ادھر ہی آ جائیں..... ہم دونوں کے پاس۔“

”نہیں بھئی، میں یہیں اچھی ہوں۔“

”اچھی تو آپ ہر جگہ ہی ہیں۔“ میری بات کو ذومعنی انداز میں لیا جاتا۔ ”آجائیں، آجائیں بڑا مزہ آئے گا آپ کو یہاں۔“

”آئی تو ہوں دو مرتبہ میرا تو بالکل دل نہیں لگا۔“

بچوں کے انگلیٹھ جانے کے بعد میں بھی دو مرتبہ ان سے ملنے کے لیے انگلیٹھ گئی تھی اور دونوں مرتبہ دانش نے مجھے جلدی واپسی کا پابند رکھا تھا۔

”مر جاؤں گا تمہارے بغیر۔“ اس نے کہا تھا۔

”تم بھی میٹھا کے پاس ہو آؤ۔“

”کہیں چلا جاؤں، کسی کے پاس چلا جاؤں..... تمہارے بغیر دل نہیں لگتا۔“

”میرا اپنا بھی یہی حال ہے اب۔“

یہ سچ تھا کہ دانش کو کھودینے کا خوف مجھے دونوں مرتبہ بچوں کے پاس سے جلدی دہی واپس کھینچ لایا تھا۔

☆☆☆

سات سال گزر گئے۔ پہلے امی کو فالج ہوا اور وہ دو

ڈھائی ماہ بستر علالت پر رہ کر اپنے ابدی سفر پر روانہ ہوئیں۔ امی کو ایک برس بھی نہ گزرا تھا کہ ابو کو بھی نمونیہ نے

آدبو چا اور وہ بھی امی سے جا ملے۔ میٹھا کے لیے اب

پاکستان میں بیٹھے رہنے کا کوئی جواز نہ رہا۔ اس نے دانش

کے سامنے دو آپشنز رکھے۔ پہلا یہ کہ وہ خود بھی پاکستان

آجائے اور دونوں مل جل کر کمائیں اور اچھی زندگی

گزاریں۔ دوسرا یہ کہ اگر وہ دہی سے واپس نہیں آنا چاہتا تو

اسے بھی دہی بلا کر اپنے ساتھ ہی رکھے۔ اسے اپنے ساتھ

رکھنے کی صورت میں دانش اور میرا راستہ ایک کیسے رہ سکتا

تھا۔ میٹھا کو پاکستان ہی میں رکھنے کے لیے دانش نے بہانے

ترانے شروع کر دیے۔
 "گھروں کے کرائے بہت ہیں۔ میں انور ڈنٹس کر سکتا۔"
 "آپ کے ساتھ رہ لیں گے؟"
 "آپ بے چاری پر میری بارگاہ ہے جو کہ اب تم بھی۔"
 "بے منت گرو پا کر کس گے۔"
 "وہ برائیاں میں کی اور کس کس چیز کی بے منت کریں گے۔ گھر کے کرائے کی، کھانے پینے کی یا یونیٹی بلز کی۔ میں انور ڈنٹس کر سکتا۔"
 "میں بھی جا ب کر لوں گی۔"
 "دینی میں جا ب ملنا اب پہلے کی طرح آسان نہیں رہا ہے۔ بہت دھکے کھانے پڑتے ہیں اور اکثر تو دھکے کھانے کے بعد بھی نہیں ملتی جا ب۔"
 "میں پاکستان میں بھی تو آ سکتی رہ سکتی ہوں۔"
 "اکیلی کی کیا بات۔ میری امی ہیں بن بھائی ہیں۔" "بن بھائی سب اپنے اپنے گھر کے۔ آپ کی امی بھی بڑے بھائی بھائی کے ساتھ رہتی ہیں۔"
 "تو تم بھی انہی کے ساتھ رہ لیں۔"
 "میری شادی آپ سے ہوئی ہے۔ آپ کے بھائی بھائی کے ساتھ رہنے کے لیے نہیں ہوئی۔"
 "بہر حال میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔"
 "بیٹا نے دانش کی شکایت مجھ سے کی۔"
 "لفظی جھگڑا ہے بیٹا۔" میں نے بے رحمی سے کہا۔
 "میری فلفلی؟" وہ چوکی۔
 "ہاں۔ تمہیں شادی کے بعد دانش کے ساتھ ہی رہنا چاہیے تھا۔ تم تو امی ابو کے ساتھ چپکی بیٹھی رہیں۔"
 "انہیں میری ضرورت تھی نا آپ۔" بیٹا جیسے شاگ میں تھی۔
 "تمہیں اپنے شوہر کی ضرورت بنتا چاہیے تھا۔ جو لڑکیاں شادی کے بعد بھی سیکے میں دل لگائے نہیں رہتی ہیں، شوہر کی ضرورت نہیں پاتیں۔"
 "یہ آپ کہہ رہی ہیں آپ۔ آپ کو پتا ہے میں شادی کے بعد مجھے میں کس لیے بیٹھی رہی۔ میں تو شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی، آپ نے مجھے مجبور کیا۔ مجھے تین دلا یا کہ دانش کو شادی کے بعد میرے پاکستان میں رہنے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"
 "وہ تو دانش کو اب بھی نہیں ہے۔ تم اطمینان سے پاکستان میں رہو۔"

"مگر اب حالات بدل چکے ہیں۔ امی ابو کے بعد میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ مجھے دانش کی ضرورت ہے۔"
 "مگر دانش کو شاید تمہاری ضرورت نہیں۔"
 "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"
 "جو میں نے محسوس کیا وہ تمہیں بتا دیا۔"
 "لیکن مجھے دانش کی ضرورت ہے۔ مجھے تعلیمی کی ضرورت ہے۔ شادی کو اتنے سال گزر گئے اور میری گود اب تنگ خالی ہے۔ دانش کے ساتھ رہوں گی تو ہی تعلیمی سنے گی نا آپ۔ اب تنگ تو بس وہ یہ کہتے رہے ہیں جب ہم دونوں ساتھ رہیں گے تو بچے کی سوچیں گے۔ بڑا چاہے میں تو بچے پیدا نہیں کیے جاتے آپ۔ ایک وقت ہوتا ہے۔ اب دیکھیے نا آپ خود بھی جوان دکھائی دیتی ہیں۔ آپ کے بچے بھی جوان ہو گئے۔ کیا میں بوڑھی ہو کر ماں بنوں گی۔"
 "دانش سے پوچھو۔" میں نے بڑی بے نیازی سے کہا۔
 "آپ سمجھا نہیں؟ انہیں۔"
 "میں تو اسے کب کا سمجھا چکی تھی کہ اگر اسے میرا بن کر رہنا ہے تو بیٹا کو ماں نہ بننے دے۔ ماں بن کر کمزور سے کمزور عورت بھی شوہر کو ہاندھ کر اس سے اپنا رشتہ مضبوط کر دیتی ہے۔ دانش کو بیٹا سے نہیں، مجھ سے اپنا تعلق مضبوط رکھنا تھا۔ بیٹا کو دانش کے بھائی بھادج کے گھر رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔"

پانچ سال اور ماضی کی آغوش میں جا دیکے۔ زندگی کا نقش مزید پلٹ گیا۔ سنی اور موسومہ جن کے بغیر جیسے کا تصور بھی نا ممکن تھا میرے لیے، اتنے دے پاؤں میری زندگی سے نکلے کہ مجھے خبر ہی نہ ہونے دی۔ سنی کو ایک آئرش لڑکی نے اپنی سنہری زلفوں کا اسیر کر لیا اور دونوں دیکھا ہی گناہ آلود زندگی گزارنے لگے جیسی کہ برسوں سے میں اور دانش گزار رہے تھے۔ موسومہ کو یونیورسٹی میں اپنے ایک مصری۔ ہم جماعت سے پیار ہوا اور دونوں نے قاہرہ جا کر شادی کر لی۔

مختار کو برین ہیمز ہوا۔ ان دنوں وہ ساڈھ افریقہ میں تعینات تھے۔ برین ہیمز کے نتیجے میں وہ چلنے پھرنے اور پونے سے معذور ہو گئے۔ ان کی دوسری بیوی جو کچھ سمیٹ سکتی تھی، سمیٹ کر اپنے دونوں بچوں کے ساتھ اپنی بڑی بہن کے پاس امریکا چلی گئی جو شادی کے بعد سے وہیں مقیم تھی اور بہن کو امریکا بلانے میں مددگار تھی۔ مجھے مختار کو اپنے پاس لانا پڑا۔ سنی

اور موسومہ کو خبر ملی تو وہ دونوں باپ کو دیکھنے کے لیے دینی آئے۔
 "ڈیڈ ان لائی ماما کہ آپ ان کا خیال رکھنے کو ہیں۔" موسومہ نے کہا۔
 "لیکن مجھے اسی کی دیکھ بھال میں مشکل ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔
 "کوئی لڑکا نوکر رکھ لیں جو ڈیڈ کو لک آفر کرنے میں آپ کی مدد کر سکے۔" سنی نے مشورہ دیا۔
 "جب مجھے تمہارے باپ کی ضرورت تھی تب تو وہ دوسری عورت کے ساتھ رنگ رلیاں مٹاتے رہے۔" میں نے گھڑکیا۔
 "کم آن ماما۔ ڈیڈ نے ہمیں کسی چیز کی کی تو نہیں ہونے دی۔" موسومہ نے باپ کے دفاع میں کہا۔
 "جس شخص نے ساری زندگی آپ کی ضرورتوں کا خیال رکھا ہو، اس کا ایسے وقت میں تو بہت خیال رکھا جانا چاہیے۔" سنی نے باپ سے ہمدردی کا اظہار کیا۔
 "اب اس سے زیادہ کیا خیال رکھوں گی۔ دقت پر نا شہ وقت پر کھانا، صاف ستھرا لباس، ستر، ہسٹ۔"
 "ان کا دل بھی بھلا یا کریں۔ پاس بیٹھ کر اچھی اچھی باتیں، اچھا میوزک، ان سے ان کے بہن بھائیوں کی باتیں۔" موسومہ بولی۔
 "اتنا نا تو وقت نہیں ہوتا میرے پاس۔"
 "مدر ڈیئر۔" موسومہ میرے گلے میں اپنی ہانہیں ڈال کر مجھے پیار کرتے ہوئے بولی۔ "اس عمر میں وقت ہی تو ہوتا ہے آدمی کے پاس۔"
 "آپ کو بھی ایک ساتھی کی ضرورت تو ہے نا۔" سنی نے کہا۔
 "جو مجھے آرام پہنچا سکے۔" میں نے سنی کو تنگی نظروں سے دیکھا۔
 "اوکے۔ اوکے ماما۔" سنی دونوں ہاتھ صوبو کھڑے کرتے ہوئے مسکرایا۔ "ناؤ سیز فائر۔ اب آپ کی اور ڈیڈ کی ہنگامی صلہ ہو جانی چاہیے۔"
 "ورنہ۔" موسومہ نے لقمہ دیا۔
 "ورنہ؟" میں نے سوالیہ نظروں سے موسومہ کو دیکھا جو بڑی معنی خیز نگاہوں سے سنی کو دیکھ رہی تھی۔
 "ہم لوگ پھر بھی آپ سے ملنے کے لیے نہیں آئیں گے۔ کیوں سنی؟"
 "میں۔" سنی نے موسومہ کی بات کی پر جوش تائیدی۔
 "ان کا اپنا گھر ہے، وہ تو رہے ہیں۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"آپ انہیں خوش رکھیں۔"
 "مجھے باتیں دینے کی ضرورت نہیں۔" میں نے موسومہ کو گھورا۔
 "اپنے اور دانش کے سچ مٹا کر آنا مجھے انتہائی درد کھل رہا تھا۔ موسومہ اور سنی چند دن رو کر پھر اپنے اپنے مقام پر واپس چلے گئے۔ مختار کی معذوری میرے اور دانش کے لیے نہایت قیمتی تھی۔"

بیٹا اپنی ساس کے ساتھ دانش کے بڑے بھائی کے گھر میں رہ رہی تھی۔ اس کی ملازمت جاری تھی۔ اکثر اپنے بچے بریک کے دوران یا پھر رات کو اس کا فون آجاتا۔ امی ابو کے بعد دانش سے اپنی دوری پر وہ بہت اداس رہنے لگی تھی۔ مجھ سے بات کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی۔ رات کو جب اس کا فون آتا تو اکثر دانش بھی اس کی باتیں اور ریمیز کر رہا ہوتا۔
 "آپ نے تو اتنے سال مختار بھائی کے بغیر گزارے ہیں۔ آپ کو تو پتا ہے نا آپا مرد کے بغیر عورت کی زندگی کتنی احموری ہوتی ہے۔" اس کی آواز دکھ میں ڈوبی ہوئی۔
 "میری طرح بہت کر دیشا۔" میں اسے اوپری دل سے دلا سادتی۔
 "آپ کے پاس سنی اور موسومہ تو ختم نا آپا۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔" وہ روہاکی ہو جاتی۔
 "اللہ سے دعا کرتی رہا کرو۔"
 "بہت کرتی ہوں آپا گھر۔۔۔ بچے آسمان سے تو نہیں پکٹتے۔ دانش بچے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔ بوڑھے ہو کر بچے پیدا کرنے کی سوچیں گے شاید یا کیا پتا تب بھی نہ سوچیں۔" وہ اور دھکی ہو جاتی۔
 "میں تمہارے لیے بہت دعا کرتی ہوں بیٹا۔" میں جھوٹ موٹ کہتی۔
 "بیٹا بوجھل آواز اور اداس لہجہ میں مجھے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیتی۔ دانش نزدیک ہوتا تو میں اس سے کہتی۔ "سن رہے تھے نا تم؟" وہ اثبات میں سر ہلاتا۔
 "بیٹا کو بچے کی بڑی خواہش ہے۔" میں اپنی بات پر وزیدہ لگا ہوں سے اس کے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کرتی۔
 "سننا ہے ماں بچنے کی خواہش ہر شادی شدہ عورت کو ہوتی ہے۔" وہ کہتا۔
 "سننا تو یہ بھی ہے کہ باپ بچنے کی خوشی مرد کو عورت سے زیادہ ہوتی ہے۔" ایک روز میں نے کہا۔
 "عورت بے چاری باپ جو نہیں بن سکتی۔" اس نے پھر کے منہ سے کہا پھر اپنی ہی بات پر زور سے قہقہہ مار کر ہنسا۔

کر کے خوش خبری سنائی کہ وہ امید سے تھی۔
 ”آئی ایم سوپسی آپا!“ اس کے لہجے میں کسی الہیلی تار کی
 سی کھنک تھی۔
 ”می ٹو میٹا!“ مجھے اپنی آواز کی اندھے کنویں سے آتی
 محسوس ہوئی۔

”اوہ اٹس ونڈر فل آپا..... میں اس خوشی کو اب محسوس
 کر سکتی ہوں جو آپ نے سنی اور مومو کو کنسیو کرنے پر محسوس کی
 ہوگی..... آپ اس خوشی کے احساس کو الفاظ میں تو بیان نہیں
 کر سکتے نا آپا۔“ اس کے لفظ لفظ سے خوشی پھوٹے پڑ رہی تھی۔
 ”ہاں میٹا!“ مجھے اپنا دل منوں بوجھ تلے دبا لگ رہا تھا۔
 مومو اور سنی کا ذکر کر کے اس نے میرا دل اور دکھا دیا تھا۔ وہ
 دونوں اب میری زندگی میں کہاں تھے۔ ان کی اپنی اپنی زندگی
 تھی۔ دونوں بہت مگن تھے اپنی اپنی دنیا میں کبھی کبھی مجھے اور
 مختار کو فون کر لیتے۔ کھلے ہاتھوں پیسے بھجوا دیتے یا ہماری
 سالگرہوں پر ہمیں دس کریتے۔ فون پر پیار کر لیتے اور
 بس..... ان کے اور اپنے تعلق کو اتار کی، اتنا محو و خود ہم نے کیا
 تھا گلہ کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ مختار تو ان کے فون کا جواب دینے
 سے بھی قاصر تھے۔ فون ان کے کان سے لگا دیا جاتا تو ان کی
 آوازیں سن کر اپنے منہ سے مبہم سی آوازیں نکالتے۔
 ”آپا دانش کہتے ہیں کہ وہ مستقل پاکستان آ جائیں
 گے..... اپنے بچے کی خاطر..... ہے نا اچھی خبر؟“
 ”اچھی خبر!“ میرا دل بیٹھ رہا تھا۔

”آپا ماں بننا کیسا زبردست تجربہ ہوتا ہے۔ عورت کے
 پاؤں زمین پر ہی نہیں رہتے۔ ہواؤں میں اڑنے لگتی ہے
 جیسے..... مجھے اپنا آپ اتنا اپورٹنٹ لگ رہا ہے۔ دانش کہہ
 رہے تھے کہ انہیں معلوم ہے مجھے اب لمحہ لمحہ ان کی ضرورت
 ہوگی..... وہ کہہ رہے تھے اب میرے پاس ہی رہیں گے۔“
 میٹا بولے جارہی تھی، ہواؤں میں اڑ رہی تھی اور میں گنگ تھی
 گہرے پانیوں میں ڈوبتی چلی جارہی تھی۔

☆☆☆

دانش پاکستان سے واپس لوٹا تو اس نے مجھ سے
 نظریں چرا رکھی تھیں۔ وہ وار فٹنگی، وہ والہانہ پن جس کا وہ
 مجھے عادی بنا چکا تھا انداز تھا۔ میں منتظر رہی کہ وہ کچھ کہے اور
 کچھ نہیں تو میٹا کے امید سے ہونے کی خبر ہی سنائے مگر وہ چپ تھا
 اور میں زیادہ دیر انتظار کی کوفت نہیں اٹھا سکتی تھی سو میں نے
 اسے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے خود ہی پہل کی۔ ”خوشخبری سنی
 ہے میں نے۔“ اس کے رد عمل کا جائزہ لینے کے لیے میں نے
 اپنی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کر رکھی تھیں۔ اس کی

خاموشی نہ نوٹی۔

”میٹا تو بہت خوش ہوگی؟“

”ہاں۔“ اس نے فقط اتنا ہی کہا۔

”اور تم؟“

وہ خاموش رہا۔

”تم خوش ہو؟“

وہ پھر چپ رہا۔

”میٹا بتا رہی تھی تم نے پاکستان میں اس کے ساتھ ہی
 رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ میں جیسے کسی دیوار سے ہمکلام تھی۔

اس نے ایک نظر مجھے دیکھا پھر نظریں چرا کر بولا۔ ”میں
 اپنی جاب سے ریزائن کر رہا ہوں۔“

ملازمت سے اس کے استعفیٰ کا سبب پوچھنا ضروری نہ
 تھا۔ سو میں نے کہا۔ ”تم میٹا کو یہاں بھی تو بلا سکتے تھے۔“ میری
 آواز گہرے صدے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا پھر نظریں چرا تے ہوئے
 بولا۔ ”مشکل ہو جاتی۔“

”مشکل! کیسی مشکل؟“

”اس کی موجودگی میں“ میں آپ کی طرف نہ دیکھ پاتا
 اور آپ کی موجودگی میں اس سے نظریں نہ ملا پاتا۔ ”یکا یک اس
 کے لہجے میں تیزی آگئی۔“ آپ مختار بھائی کے ساتھ پاکستان
 کیوں نہیں شفٹ ہو جاتیں؟“

میں نے اسے شاکی نگاہوں سے دیکھا۔ ”خود مشکل میں
 پڑنا نہیں چاہتے اور مجھے مشکل میں ڈالنا چاہتے ہو۔“ میری
 آواز میں درد اٹھ آیا۔ ”مجھے اب یہیں رہنا ہے..... مختار کے
 ساتھ..... شاید یہی ایک رشتہ باقی رہ گیا ہے میری زندگی
 میں..... بچے اپنے راستوں پر نکل گئے..... بہن سے اپنا رشتہ
 میں نے اپنے ہاتھوں مسخ کر دیا ہے..... کاش!..... کاش!“ میں
 جو اپنے جذبات کی رو میں اس سے بات کرتے کرتے کھڑکی
 تک جا پہنچی تھی اپنا رخ پلٹ کر اسے گھائل نظروں سے دیکھتے
 ہوئے کئی سے بولی۔ ”کاش! میں شیطان کے بہکائے میں نہ
 آئی ہوتی۔“

وہ کچھ ایسے شپٹا گیا جیسے میں اسی کو شیطان کہہ رہی ہوں۔
 میری آنکھیں بچھتاوے کے آنسوؤں سے بھگنے لگیں۔
 میرا حلق درد کی شدت سے چنچنے لگا۔ ”مختار کی دوسری شادی
 میرے لیے کتنا ہی بڑا صدمہ کسی مجھے اپنی آبرو کی حرمت کا
 پاس رکھنا چاہیے تھا۔ مرد تو کبھی بھی بہک سکتا ہے عورت کو ثابت
 قدم ہونا چاہیے۔ اگر میں اس کڑی منزل سے ثابت قدمی سے
 گزر جاتی تو آج..... آج میٹا کی طرح سرخرو ہوتی..... اس روز

جب وہ فون پر مجھ سے بات کر رہی تھی تو اس کی آواز میں کسی قاح کا سا غور تھا..... اس نے تمہارا انتظار کیا اور سرخوڑی میں نے بے صبری دکھائی اور اپنی ہی نظروں میں گر گئی۔ "میری آواز بھرا گئی۔ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ کر میں نے اپنا ہزیمت زدہ چہرہ اس سے چھپالیا۔ مجھے اس کے بھاری قدموں کی چاپ اپنے نزدیک ہوتی سنائی دی پھر اس کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ "آئی ایم سوری۔"

میں نے اپنے چہرے پر سے ہاتھ ہٹا لیے۔ وہ مجرم کی طرح نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ میری نگاہیں بھی آپ ہی آپ جھک گئیں۔ "ہم دونوں ہی گناہ گار ہیں۔ میری آواز احساسِ ندامت سے بوجھل گئی۔ "قصور وار مختار بھی ہیں جنہوں نے جوان بیوی کو ایک نامحرم مرد کے ساتھ چھوڑ کر گھر سے جاتے ہوئے یہ نہیں سوچا کہ آدم اور حوا کو جنت سے نکلوانے والا شیطان مسلسل ان کی راہ کھوٹی کرنے کو ان کے تعاقب میں ہے..... اس نے خدا سے کہا تھا تا دایمیں بائیں، آگے، پیچھے ہر طرف سے تیرے بندوں کی راہ ماروں گا..... مختار کو سوچنا چاہیے تھا کہ ان کے اندھے اعتماد کا نتیجہ ان کے گھر کی بربادی بھی ہو سکتا ہے۔" میں ہل بھر کو تھمی پھر میں نے اپنا رخ کھڑکی کی جانب پھیرتے ہوئے کہا۔ "خدا ہماری غلطیوں پر ہمیں سزا دینے کے لیے آسمان سے ہم پر لٹھ نہیں برساتا..... ہماری خطاؤں کی سزا ہمیں اور ہی طرح ملتی ہے..... بس حساب کتاب سمجھنا پڑتا ہے..... مختار کی دوسری شادی کا انتقام لینے کے لیے میں اپنے راستے سے ہٹ گئی جو بہر حال میری بہت بڑی اور ناقابلِ معافی بھول تھی..... میں ایک کے بعد ایک اپنے رشتے کھوٹی چلی گئی..... کیا ضرورت تھی مجھے سنی اور مومو کو اپنی زندگی سے نکالنے کی..... انہیں نکالا تو خود بھی تنہا رہ گئی..... مختار کو ان کی دوسری بیوی چھوڑ گئی اور بچے بھی ان سے دور لے گئی..... مختار زبان سے اظہار نہیں کر سکتے تو کیا ہوا مگر اپنے بچے یاد تو آتے ہوں گے انہیں..... اس یاد کا کرب مختار کے سوا کون محسوس کر سکتا ہے..... اور وہ بچے جن کے بہتر مستقبل کے لالچ میں مختار مجھے پردیس میں ایک نامحرم کے ساتھ چھوڑ گئے تھے اپنی اپنی دنیا میں اتنے کم ہیں کہ انہیں کم ہی میری اور اپنے باپ کی یاد آتی ہے۔" میری آواز ڈوبنے لگی، لہجے میں درد چھل گیا۔ "یہ وہ وقت تھا جب مجھے اور مختار کو اپنے بچوں اور بچوں کے بچوں کے ساتھ مل بیٹھ کر اپنی زندگی کا یہ دور گزارنا چاہیے تھا مگر ہم اپنی ہی غلطیوں کے ہاتھوں خسارے سے دوچار ہو چکے ہیں....."

اوہ خدا! خسارے کا یہ احساس کتنا کرب انگیز ہے۔" پچھتاوے کے احساس سے میرے جڑے بھینچ گئے۔ "آئی ایم پارٹ آف اٹ..... میں بھی اس خسارے کا حصہ ہوں۔" مجھے اپنے.... عقب سے دانش کی ندامت میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

میں بلی اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اقرارِ جرم اس کہانی کا اختتام نہیں ہے..... جانتے ہو ہم سے جو گناہ سرزد ہوا ہے اس کی سزا کیا ہے؟" وہ بت بنا مجھے دیکھ رہا تھا۔

"رحم۔" میں نے کہا۔ "ہم دونوں کو سنگسار کیا جانا چاہیے..... اسلام ایک شادی شدہ عورت اور شادی شدہ مرد کے درمیان ناجائز تعلقات کی یہی سزا تجویز کرتا ہے..... بھرے مجمع میں اپنے اور پرانے ہم پر اتنے پتھر برسائیں کہ ہم جان سے جاتے رہیں مگر..... ہم دونوں میں سے کس میں اتنی ہمت ہے کہ یہ سزا برداشت کر سکے اور اس سے پہلے اپنے اس گناہ کا دنیا کے سامنے اعتراف کر سکے۔" اس نے پھر ایک نظر مجھے دیکھا۔

میرا سر جھک گیا۔ آواز شدتِ ندامت سے بوجھل ہو گئی۔ "ہم انسان گناہ کے راستے پر قدم رکھتے ہوئے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ گمراہی شیطان کا راستہ ہے..... شیطان جواز لے لے ہم انسانوں کا دشمن ہے اور ہمیں اللہ کے راستے سے ہٹانے کے لیے کبھی دایمیں کبھی بائیں اور کبھی آگے، پیچھے سے ہمیں گمراہ کرنے کی تاک میں رہتا ہے..... اور ہم اچھی طرح یہ جانتے ہوئے بھی کہ رحمان کا راستہ اور ہے شیطان کا اور..... پھر کیوں بھٹک جاتے ہیں..... کیوں اپنی راہ کھوٹی کر بیٹھتے ہیں؟"

دانش نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کر دیے۔ "مجھے معاف کر دیجیے گا۔ میں نہیں جانتا میری غلطیوں کی سزا مجھے کیا ملے گی اور میری ہونے والی اولاد میرے کتنے قریب ہوگی یا میری طرح..... آپ بس مجھے معاف کر دیجیے گا۔"

میں عرقِ ندامت میں ڈوبنے لگی۔ "ہمیں اس سے معافی مانگنی ہے۔" میں نے آسمان کے رخ پر اپنی انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ میری پلکیں بھیگ رہی تھیں۔ وجود لرز رہا تھا اور دل جیسے ڈوب رہا تھا۔

ہر سیاہ کار، گناہ گار کی طرح میں بھی اسی رب سے معافی کی طلب گار تھی جو اوپر بیٹھا ہماری جلوت ہی نہیں خلوت میں بھی ہمیں دیکھ رہا ہے۔